چراغوں کو بجھا نہ دینا
نگہت سیما

چراغوں کو بجھا نہ دینا

نگہت سیما

القریش پبلی کیشنز

سرکلر روڈ چوک اُردو بازار لاہور

فون: 042-37652546 ، 042-37668958

www.alquraish.com E.mail:info@alquraish.com

معیاری اور خوبصورت کتابیں

با اہتمام محمد علی قریشی

باراوّل 2010ء

مطبع .... نیّر اسد پریس لاہور

ڈیزائن .... ذاکر

کمپوزنگ .... کلائمکس گرافکس

قیمت .... -/300 روپے

انتساب:

میری ان سب دوستوں کے نام........

جن کے خلوص و محبت کی میں

ہمیشہ قرض دار رہی ہوں

فہرست

چراغوں کو بجھا نہ دینا 7

مسافتیں بے نشاں ٹھہریں 77

مرگِ گل سے پیشتر 181

وہ ہوا کے رُخ بھی بدل گئے 308

چراغوں کو بجھا نہ دینا

پتا نہیں لوگ میرے معاملے میں خود غرض کیوں ہو جاتے ہیں' مجھے کبھی سمجھ میں نہیں آیا۔ بچپن سے لے کر اب تک جب بھی کوئی بات ہوئی' لوگوں نے میرے معاملے میں خود غرضی کا ثبوت دیا۔ ماما' پاپا اور سب سے بڑھ کر زیب نے' جب میں چھوٹی تھی' تو مجھے معلوم نہیں تھا کہ زیب سے میرا کیا رشتہ ہے' ایک طویل عرصہ تک میں یہی سمجھتی رہی کہ زیب میری بہن ہے۔ بڑی بہن، زیب عمر میں مجھ سے کوئی تین سال بڑی تھی' اور ماما پاپا کی از حد لاڈلی' جب کہ ماما پاپا نے مجھ پر کبھی توجہ نہیں دی تھی' شاید میں ان چاہی تھی۔ شاید ایک بیٹی کے بعد وہ بیٹے کی توقع کر رہے تھے' سو میری آمد انہیں پسند نہیں آئی تھی۔ برسوں میں یہی سوچتی رہی تھی' اور اپنے آپ میں ہی سمٹتی چلی گئی تھی۔ یہ احساس کہ ہم ناپسندیدہ ہیں' ہم ان چاہے ہیں، بے طلب، بے خواہش ہی جھولی میں آگرے ہیں، شاید احساس انسان کو اپنے ہی اندر گم کر دیتا ہے۔ سو میں بھی اپنے اندر کھو گئی تھی' گم ہو گئی تھی۔ مجھے یاد نہیں کہ کبھی بچپن میں، میں نے ضد کی ہو، روئی ہوں یا شرارت کی ہو۔ ہاں زیب بچپن میں بہت ضدی تھی' اور ماما' پاپا اس کی ہر ضد مانتے بھی تھے' اور پھر وہ فرمائشیں بھی بہت کرتی تھی' جیسے ہی پاپا دفتر سے آتے وہ بھاگ کر ان سے لپٹ جاتی۔ میرا جی چاہتا تھا کہ میں بھی بھاگ کر ان سے لپٹ جاؤں' اور زیب کی طرح ان سے فرمائشیں کروں۔ پاپا مجھے گود میں بٹھائیں' مجھے پیار کریں اور مجھ سے پوچھیں۔ ''ہاں تو ہمارا بیٹا کیا لے گا۔''

اور میں انہیں بتاؤں کہ مجھے چھوٹا سا گڑیا کا گھر چاہیے' اور ایک پیاری سی نیلی آنکھوں والی گڑیا' بالکل ایسی ہی جیسی زیب کے پاس ہے' اور زیب تو بالکل ہی مجھے اپنے گڑیا کو ہاتھ نہیں لگانے دیتی تھی۔ ایک بار جب زیب کھیلتے کھیلتے گڑیا ٹی وی لاؤنج میں رکھ کر چلی گئی تھی' تو میں نے اٹھا لیا تھا' اور ابھی اسے گود میں رکھ کر تھپک ہی رہی تھی کہ زیب آ گئی' اور اس نے مجھ

سے گڑیا چھین لی' اور مجھے زور سے تھپڑ مارا۔

''تم نے میری گڑیا کو ہاتھ کیوں لگایا۔''

میں نے ماما کی طرف دیکھا' جو اسی وقت ٹی وی لاؤنج میں آئی تھیں' اور پھر پاپا کی طرف جو مجھ سے بالکل بے نیاز اخبار پڑھ رہے تھے۔

''بری بات ہے عینی بیٹے بہن کی گڑیا کیوں لی آپ نے؟'' اور وہ آنسو جو زیب کا تھپڑ کھا کر بے اختیار آنکھوں میں آ گئے تھے' وہاں ہی خشک ہو گئے تھے۔ ماما نے زیب کو کچھ نہیں کہا تھا' اور مجھے ڈانٹ دیا تھا۔

زیب گڑیا ہاتھ میں اٹھائے پاپا کے پاس جا کر بسورنے لگی تھی۔

''پاپا دیکھیں عینی نے میری گڑیا لے لی تھی۔''

پاپا نے بھی تیسی نظروں سے مجھے دیکھا تھا۔

''ہاں بیٹا یہ تو بہن کی گڑیا ہے نا۔ پاپا آپ کو اپنی گڑیا لا دیں گے۔''

ماما نے پھر میری طرف دیکھا تھا' اور میں وہاں سے سر جھکائے باہر آ گئی تھی' اور بہت دیر تک باہر چپ چاپ بیٹھی رہی تھی' پھر ماسی شہر بانو کی بیٹی کے ساتھ کھیلنے کے لیے سرونٹ کوارٹرز کی طرف چلی گئی تھی' یہ کوارٹرز سڑک پار کر کے تھے' اور یہاں ملک مختار احمد کے ملازمین رہا کرتے تھے' اور کوارٹرز سے ملحق ان کی بڑی سی کوٹھی تھی' اور یہ تینوں کوارٹرز ان کے پچھلے لان کی طرف تھے' اس لیے میری دوستی اس کی بیٹی سے ہو گئی تھی' اور میں اکثر اس سے کھیلنے چلی جاتی تھی' کیونکہ زیب کبھی کبھی مجھے اپنے ساتھ نہیں کھیلاتی تھی' سو اس روز بھی ماسی شہر بانو کی بیٹی پنو کے ساتھ کھیلنے چلی گئی تھی' اور بہت دیر تک ہم اکڑ بکڑ کھیلتے رہے تھے' اور جب شام ہونے لگی تھی' تو ماسی شہر بانو ذرا دیر کے لیے اپنے کوارٹر میں آئی تھی۔

''بٹی اب تم گھر جاؤ' اندھیرا ہونے والا ہے۔''

اور پھر وہ اپنے کوارٹر کے دروازے پر اس وقت کھڑی ہو کر مجھے دیکھتی رہی تھی' جب تک میں نے سڑک پار نہیں کر لی تھی' اور ماسی شہر بانو کا اس طرح مجھے سڑک پار کرتے ہوئے دیکھنا بہت اچھا لگتا تھا۔ خود بخود میری گردن بلند ہو جاتی تھی' میں بھی کسی کے لیے اہمیت رکھتی ہوں۔ کسی کو میری فکر بھی ہے۔ کوئی میرے لیے بھی پریشان ہو سکتا ہے، اور یہ احساسِ تفاخر گھر میں داخل ہوتے ہی کسی کونے میں دبک جاتا' پاپا ماما مجھے سرسری سا دیکھتے۔

''کہاں چلی گئی تھیں تم۔''

''پنو کے ساتھ کھیل رہی تھی۔''

اور اچھا کہہ کر ماما زیب کی طرف متوجہ ہو جاتیں' اور اس روز بھی ایسا ہی ہوا تھا' میں دیر تک پنو سے کھیلتی رہی تھی' اور پھر ماسی شہر بانو گھر کے دروازے تک مجھے چھوڑ گئی تھی۔

''اپنی اماں کو میرا اسلام دینا' ابھی صاحب لوگوں کے لیے کھانا بنانا ہے۔ اس لیے اندر نہیں آؤں گی' اور میں چپکے سے اندر آ کر ٹی وی لاؤنج میں بیٹھ گئی تھی' اور ٹی وی دیکھنے لگی۔ ماما کچن میں تھیں' اور زیب پاپا کے پاس بیٹھی اپنا ہوم ورک کر رہی تھی۔ مجھے یاد آیا کہ مجھے بھی اپنا ہوم ورک کرنا ہے' سو میں بیگ اٹھا کر پاپا کے پاس چلی آئی تھی۔ میرا جی چاہتا تھا کہ پاپا مجھے بھی ہوم ورک کروائیں' لیکن پاپا کے پاس بہت وقت نہیں ہوتا تھا' کئی بار میں پاپا کے پاس بیگ لے کر گئی تھی' اور ابھی پاپا میری کتاب ہاتھ میں لیتے ہی تھے کہ یا تو زیب ضد کرنے لگتی کہ اسے آئسکریم کھانے جانا ہے' یا پاپا کو کوئی اور کام یاد آ جاتا' اور اس روز بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ پاپا نے زیب کا ہوم ورک ختم کروانے کے بعد مجھے دیکھا تھا۔

''ہاں تو آپ کو کیا ہوم ورک ملا ہے بیٹا۔''

میں نے سر اٹھا کر پاپا کی طرف دیکھا تھا' اور پھر کتنی ہی دیر یونہی انہیں دیکھتی رہی تھی۔ ان کے چہرے پر کتنی شفقت تھی' آنکھوں میں کتنی ملائمت تھی۔ بے اختیار انہوں نے اپنے ہاتھ آگے بڑھا کر میرے دائیں رخسار کو نرمی سے تھپتھپایا' اور پھر ایک دم اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

''میں ابھی آتا ہوں بیٹا۔''

اور میں انہیں جاتے دیکھتی رہی تھی' حالانکہ میرا جی چاہا تھا کہ ان سے کہوں پاپا آج آپ کہیں نہ جائیں' اور مجھے یوں ہی دیکھتے رہیں' ایسے ہی اور میرے رخسار کو تھپتھپاتے رہیں' اور وہ آنسو جو اندر ہی کہیں تھم گئے تھے' اس وقت میری آنکھوں میں جمع ہونے لگے' اور میں نے گھٹنوں پر سر رکھ لیا' اور چپکے چپکے رونے لگی۔

زیب اپنا بیگ بند کر کے جا چکی تھی' لیکن میں وہاں ہی بیٹھی رہی' اور پاپا آ گئے۔ ان کے ہاتھ میں ڈبا تھا ''عینی بیٹا میں آپ کے لیے گڑیا لایا ہوں۔ بالکل ویسی گڑیا' جیسی زیب کے پاس ہے' نیلی آنکھوں والی یہ دیکھو۔'' پاپا نے گڑیا نکال کر مجھے دکھائی۔ میں نے حیرت سے پاپا کو دیکھا' اور پھر میرے اندر خوشی کی تتلیاں رقص کرنے لگیں' میری نم آنکھوں میں ہنسی کے جگنو دمکنے لگے ہونٹ کھل گئے۔

میں نے بے اختیار ڈبہ پاپا کے ہاتھوں سے لے لیا' اور گڑیا نکال کر دیکھنے لگی۔ کتنی

خوبصورت گڑیا تھی۔ زیب کی گڑیا سے بھی زیادہ خوبصورت اور بڑی' میں نے گڑیا کو دونوں ہاتھوں میں مضبوطی سے پکڑے پکڑے پاپا کی طرف دیکھا' وہ مجھے ہی دیکھ رہے تھے' اور ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ پاپا اکثر سنجیدہ رہتے تھے' اور اس سے وہ مسکراتے ہوئے اتنے اچھے لگ رہے تھے کہ میں بے اختیار انہیں دیکھنے لگی' اور گڑیا پر میری گرفت کمزور ہوگئی۔ میں اتنے دھیان سے پاپا کو دیکھ رہی تھی کہ مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ کب زیب نے اندر سے آ کر میرے ہاتھ سے گڑیا لے لی۔ میں نے تڑپ کر اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''نہیں یہ میری ہے' پاپا میرے لئے لائے ہیں۔''

لیکن اس نے میری طرف دھیان نہیں دیا' اور گڑیا کو ہاتھ میں پکڑے خوشی سے پاپا سے لپٹ گئی۔

''کتنی خوبصورت گڑیا ہے پاپا یہ میں لوں گی۔''

''بیٹا یہ تو میں عینی کے لئے لایا ہوں' آپ کے پاس پہلے سے ہے نا۔''

پاپا نے اس کے ہاتھ سے گڑیا پکڑ لی' مگر اس نے ہاتھ پیچھے کرلیا۔

''نہیں پاپا یہ میں لوں گی۔ آپ میرے والی عینی کو دے دیں۔''

''نہیں بیٹا یہ عینی کی ہے' آپ کے پاس ہے نا اپنی۔''

''نہیں میں یہ ہی لوں گی۔''

وہ ضد کرنے لگی' پاپا نے بے بسی سے مجھے دیکھا' میں خاموش سر جھکائے ان کے سامنے سے ہٹ آئی' ایک لفظ کہے بغیر اور اپنا بیگ بند کرنے لگی۔ پاپا اسے بہلانے لگے کہ وہ اسے بھی ایک گڑیا لا دیں گے' مگر وہ ماما' ماما کہہ کر چیخنے لگی۔ ماما بھاگتی ہوئی کچن سے آئیں تو وہ ان سے لپٹ گئی' اور زور زور سے رونے لگی۔

''کیا ہوا...... کیا ہوا میری جان۔''

ماما نے اسے لپٹا لیا' میرا حلق نمکین ہونے لگا' اور مجھے یقین ہوگیا کہ اب وہ گڑیا مجھے نہیں مل سکتی۔ وہ زیب کو ہی ملے گی۔ ماما اس کی کوئی خواہش کبھی رد نہیں کرتی تھی۔

''ماما یہ گڑیا میں نے لینی ہے۔''

''یہ تمہاری ہی ہے بیٹا۔''

ماما نے اسے تسلی دی۔ میری سماعتیں ادھر ہی لگی ہوئی تھیں' لیکن بظاہر میں اپنے بیگ میں کتابیں رکھ اور نکال رہی تھی' جیسے اس واقعے سے میرا کوئی تعلق نہ ہو۔

''نہیں تاجی یہ گڑیا میں عینی کے لئے لایا ہوں۔ زیبی کے پاس تو پہلے بھی ہے گڑیا۔''

''نہیں نہیں میں یہ لوں گی' میرے والی آپ عینی کو دے دیں۔''

وہ مزید اونچا اونچا رونے لگی۔

''آپ بھی کمال کرتے ہیں انور! اتنی سی بات پر بچی کو رلا دیا۔''

''یہ اتنی سی بات نہیں تاجی! یہ گڑیا عینی کے لیے لایا ہوں۔''

پاپا نے آہستگی سے کہا' لیکن ماما نے جیسے ان کی بات سنی ہی نہیں۔

''جاؤ بیٹا۔'' انہوں نے زیب کو خود سے الگ کیا۔

''اپنی گڑیا بہن کو لا دو اور یہ تم رکھ لو۔''

''تاجی اس طرح زیب کی ہر خواہش ہر ضد پوری کر کے تم اسے بگاڑ تو نہیں رہی ہو۔''

''نہیں وہ بگڑے گی نہیں۔''

ماما کے لہجے میں یقین تھا۔

بچپن میں ہر خواہش پوری ہوئی ہے' اس کی سو اب اگر کوئی خواہش پوری نہ ہوئی تو یہ بگڑ جائے گی۔''

پاپا خاموش ہو گئے۔ عینی نے گڑیا لا کر میرے قریب رکھ دی تو میں نے نگاہ اٹھا کر بھی گڑیا کی طرف نہیں دیکھا' اور اپنا بیگ اٹھا کر باہر جانے لگی' تو پاپا نے بے اختیار کہا۔

''عینی بیٹا میں کل آپ کو اور گڑیا لا دوں گا۔ بالکل ایسی ہی۔''

''انور بیکار وعدے مت کرو بچی سے' جانتے ہو ابھی فلیٹ کی قسط بھی دینی ہے' اور اس ماہ اور یہ اتنی قیمتی گڑیا اس فضول خرچی کی گنجائش نہیں ہے میرے پاس۔ اور پھر زیب کی گڑیا اچھی خاصی تو ہے۔ بچوں نے کھیلنا ہی ہوتا ہے۔ ماما تیکھی نظروں سے پاپا کی طرف دیکھتی ہوئی جھکیں' اور زیب والی گڑیا اٹھا کر میری طرف بڑھائیں۔

''لو بیٹا!''

مگر میں تیزی سے باہر نکل گئی۔ میرا اندر نامعلوم آنسو سے بھیگتا جا رہا تھا۔ مجھے پتا تھا پاپا اپنا وعدہ پورا نہیں کر سکیں گے۔ صرف فلیٹ کی قسط ہی ادا نہیں کرنا ہوتی' اور بھی کئی چھوٹے موٹے خرچ نکل آتے ہیں۔ پاپا ایک کمپنی میں کلرک تھے' اور یہ ماما کی عقلمندی تھی کہ وہ بہت سمجھداری سے گھر کا خرچ چلا رہی تھیں' اور انہوں نے نہ صرف گھرداری کی کئی چیزیں اکٹھی کر لی تھیں۔ پچھلے سال ایک فلیٹ بھی بک کرا لیا تھا' اور بچت کر کے کمیٹیاں ڈال کر وہ اس کی قسط ادا

کرتی تھیں۔ ماما اور پاپا دونوں ہی بے حد سنجیدہ تھے' میں نے بہت کم انہیں ہنستے ہوئے دیکھا تھا۔ ہاں ثیب کے ساتھ کبھی کبھار وہ ہنس بول بھی لیتے تھے' اس کی ضد پر لڈو کھیل لیتے۔ کہانیاں سناتے۔ دراصل نہ پاپا کے پاس اور نہ ماما کے پاس بہت زیادہ وقت ہوتا تھا۔ پاپا آفس سے آکر کچھ دیر آرام کرتے۔ کبھی کبھار زیب کو کچھ دیر ہوم ورک کرواتے۔ پھر ایک ٹیوشن سنٹر پر چلے جاتے' جہاں وہ پارٹ ٹائم جاب کرتے تھے۔ ماما بھی کسی نہ کسی کام میں معروف رہتی تھیں' کبھی کڑھائی کر رہی ہیں' کبھی جرسی بن رہی ہیں' اور کبھی کچھ مسز الطاف کی قمیض ہے، یہ زینت خالہ کی جرسی ہے۔ یہ فلاں کی ہے' یہ فلاں کی۔ بچپن میں وہ زیب کے استفسار پر بتایا کرتی تھیں' اور مجھے بہت غصہ آتا تھا' دل ہی دل میں کہ ماما سب کے پڑوسیوں اور عزیز رشتہ داروں کے لیے کام کرتی رہتی ہیں' اور کبھی ان کے دل میں یہ خیال نہیں آیا کہ وہ میرے فراک پر پھول بنا دیں۔ میرے دوپٹے پر کڑھائی کر دیں۔ ان کے ہاتھ بڑی صفائی تھی۔ سب ہی تعریف کرتے تھے۔ زیب تو ضد کر کبھی کبھی اپنے کپڑوں پر ان سے کڑھائی کروا لیتی تھی' لیکن میں خاموش ہی رہتی تھی' اور اندر ہی اندر کڑھتی رہتی تھی' یہ تو بہت بعد میں مجھے پتا چلا کہ جب میں نویں کلاس میں تھی کہ ماما دراصل یہ کام قیمتاً کرتی ہیں' اس روز خالہ زینت مجھے پنو کی طرف جاتے ہوئے رستے میں مل گئی تھیں' اور انہوں نے مجھے دو سو روپے دیئے تھے' اور کہا تھا تاجی کو دے دینا' ابھی صرف ایک سوٹ کے پیسے ملے ہیں دوسرے سوٹ کے ملے تو بھجوا دوں گی۔ اور اس روز مجھ پر انکشاف ہوا تھا کہ ماما کتنی محنت کر رہی ہیں، اس روز میرا جی چاہا تھا کہ میں ماما کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لوں، انہیں چوموں' انہیں پیار کروں' ماما کس قدر محنت کرتی تھیں، لیکن مجھے اپنے جذبوں کا اظہار کرنا کبھی بھی نہیں آیا تھا' لیکن لاشعوری طور پر میں اسکول سے آکر کوشش کرتی تھی کہ گھر کے کاموں میں ماما کا ہاتھ بٹا دوں' آٹا گوندھ دوں' روٹی بنا لوں، چائے بنا دوں۔ جو بھی میرے لیے ممکن ہوتا تھا' میں کر دیتی تھی۔ تب ماما ایک ممنون سی نظر مجھ پر ڈال کر اپنے کام میں مصروف ہو جاتی تھیں' لیکن اس روز جب ماما نے پاپا کو میرے لئے گڑیا لانے سے منع کیا تھا' اس روز مجھے ماما پر بہت غصہ آیا تھا' میں نے مڑ کر ماما کی طرف نہیں دیکھا تھا' حالانکہ انہوں نے دوبارہ مجھے آواز بھی دی تھی' مجھے پتا تھا میں مڑ کر دیکھوں گی تو ماما مجھے ایسی نظروں سے دیکھیں گی' جن میں التجا ہو گی' مان ہو گا' یقین ہو گا۔ پتا نہیں کیوں ماما ہمیشہ مجھے ایسے دیکھتی تھیں۔ ان نظروں سے وہ زبان سے کچھ نہیں کہتی تھیں' لیکن لگتا تھا جیسے ان کی نظریں کہہ رہی ہوں۔

''میرا مان رکھ لو، مجھے شرمندہ نہ کرو۔ میری بات مان لو۔''

اور یہ نظریں ہمیشہ مجھے کمزور کر دیتی تھیں۔ میں پیچھے ہٹ جاتی۔ زیب فاتحانہ نظروں سے مجھے دیکھتی اور ماما کی آنکھیں یکدم مجھے ممنونیت کے ان دیکھے آنسوؤں سے بھری دکھائی دینے لگتی تھیں' اور یہ ممنون نگاہ بہت جلد میرے دکھ کو کم کر دیتی تھی' لیکن اس روز میں نے مڑ کر نہیں دیکھا تھا' اور پھر اس روز کے بعد بھی کئی بار ماما نے مجھے یاد دلایا کہ زیب کی گڑیا میرے لیے ہے' اور میں اس سے کھیلتی کیوں نہیں' لیکن پتا نہیں کیوں میرا جی نہیں چاہا۔ ماما نے ایک روز اسے نیا فراک سی کر پہنا دیا' جس پر سفید فرل بھی لگائی تھی۔ پنک سفید کلر کا سفید فرل والا فراک پہن کر وہ گڑیا بہت اچھی لگنے لگی تھی' اور میرا جی چاہا تھا کہ میں اسے لے کر پنو کے گھر جاؤں' اور اسے دکھاؤں' لیکن پھر مجھے یاد آ گیا تھا کہ ماما نے میری گڑیا زیب کو دے دی تھی' اور یہ وہی زیب کی پرانی گڑیا ہے۔ ماما گڑیا مجھے دکھا کر پر امید نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھیں' لیکن میں نے اسے ہاتھوں سے پرے کر دیا۔

''مجھے گڑیا سے کھیلنا پسند نہیں ہے۔''

''اور ہمارے بیٹے کو کیا پسند ہے۔ کون سا کھیل؟''

پاپا اچانک ہی آ گئے تھے' اور ان کا موڈ بہت خوشگوار تھا۔

''کچھ نہیں۔''

میں سنجیدہ سی تھی۔

''مجھے کچھ پسند نہیں ہے۔''

''ارے واہ...... وہ جو اتنی دیر پنو کے گھر جا کر کھیلتی ہو۔ وہ کون سا کھیل ہے۔''

''اکڑ بکو اور کیڑا کیڑی۔''

''اچھا۔''

پاپا نے دلچسپی سے مجھے دیکھا' اور پاپا کو یوں اپنی طرف متوجہ پا کر میرے اندر ہمیشہ کی طرح پھول کھل اٹھے۔

''پاپا۔''

میں خوشی خوشی انہیں بتانے لگی کہ اکڑ بکو کیسے کھیلتے ہیں۔

اکڑ بکو بمبا بھو
اسی نوے پورے سو
سو میں پھنس گیا دھاگا

چور نکل کر بھاگا

میں لہک لہک کر گانے لگی' تب ہی زیب آنکھیں ملتی ہوئی وہاں گئی، شاید وہ سو رہی تھی۔

''پاپا۔''

وہ ان کے بازو سے لپٹ گئی۔

''آپ میرے لیے مارکر کلر لائے ہیں۔''

''بالکل لائے ہیں جناب۔''

پاپا اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ میں کچھ دیر کونے میں کھڑی رہی کہ شاید پاپا ابھی میری طرف دیکھیں گے' اور میں انہیں بتاؤں گی کہ کل جب پنو چور بنی تھی' اور بھاگ کر اندر کی کوٹھی میں چلی گئی تھی' تو میں اسے ڈھونڈتے ہوئے لان میں چلی آئی تھی' اور اِدھر اُدھر درختوں کے پیچھے اسے دیکھ رہی تھی کہ ملک مختار باہر آ گئے تھے' اور انہوں نے بہت پیار سے میری رخسار تھپتھپائے تھے اور کہا تھا۔

''کتنی پیاری بچی ہے۔ بیٹا آپ کا نام کیا ہے؟''

اور جب میں نے بتایا تھا میرا نام نور العین ہے' لیکن سب مجھے عینی کہہ کر بلاتے ہیں تو انہوں نے پھر کہا تھا کہ'' آپ کا نام بھی بہت پیارا ہے۔ بھئی شہر بانو یہ بچی جب آئے تو مجھ سے ضرور ملایا کرو۔''

لیکن پاپا نے تو پھر میری طرف دیکھا ہی نہیں تھا' وہ زیب کی طرف متوجہ ہو گئے تھے' اور ہمیشہ ایسا ہی ہوتا تھا' زیب کی موجودگی میں' میں انہیں دکھتی ہی نہیں تھی' میں کچھ دیر کھڑی رہی' اور پھر مایوس ہو کر ہمیشہ کی طرح پنو کی طرف چلی گئی۔

ماسی شہر بانو ملک مختار احمد کی دور پار کی عزیزہ تھیں' شوہر کی وفات کے بعد ان کی کوٹھی میں آئی تھیں' اور ایک طرح سے پوری کوٹھی کا انتظام ان کے ہاتھ میں ہی تھا۔ تمام ملازمین ان کی نگرانی میں ہی کام کرتے تھے۔ ملک مختار احمد زیادہ تر زمینوں پر رہتے تھے۔ بیوی کا انتقال ہو چکا تھا' اور دونوں بیٹے ملک سے باہر تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ یہ سب باتیں مجھے پنو نے بتائی تھیں۔ ملک مختار پنو سے بھی پیار کرتے تھے' اور انہی کے کہنے پر ماسی شہر بانو نے اسے اسکول میں داخل کروایا تھا' وہ جب بھی زمینوں سے آتے پنو سے یا ماسی شہر بانو سے کہہ کر مجھے بلواتے' اور جن دنوں وہ یہاں رہتے تب تو روز ہی میں ادھر جایا کرتی تھی' اور وہ مجھ سے اور پنو سے باتیں کرتے رہتے تھے' اپنے بیٹوں کی جو ملک سے باہر تھے' اور اپنی بیوی کی جس کی فرمائش پر

انہوں نے یہاں شہر میں گھر بنایا تھا، میں وہاں خوب چہکتی' خوب باتیں کرتی۔ وہ ساری باتیں' جو میں ماما اور پاپا سے کرنا چاہتی تھی' میں ان سے کر لیتی تھی' اور گھر میں خاموش کونوں کھدروں میں چھپی رہتی۔ اب میں پاپا کے آفس سے آنے کے بعد بھاگ کر دروازے کے پیچھے چھپ کر انہیں زیب سے لاڈ کرتے دیکھنے کی کوشش نہیں کرتی تھی' کئی دفعہ میں نے محسوس کیا تھا' کہ ایک بار گھر میں داخل ہو کر پاپا کی نظریں ادھر ادھر مجھے کھوجتی ہیں' پھر سرسری سے انداز میں وہ ماما سے پوچھتے۔

''عینی کہاں ہے۔''

''کمرے میں ہو گی۔''

ماما بھی لاپروائی سے کہتیں' اور میں اگر باہر آ بھی رہی ہوتی تو واپس پلٹ جاتی۔ میں سوچتی ہوں کہ اگر ملک مختار احمد مجھے پیار اور محبت نہ دیتے تو شاید میں ذہنی مریضہ یا بہت جھینپو اور ڈل سی لڑکی ہوتی، سہمی سہمی سی' لیکن ملک مختار احمد کے ہاں جانے سے میرے اندر اعتماد پیدا ہو گیا تھا۔ ایک بار انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ ان کی ایک بیٹی تھی' اگر وہ زندہ ہوتی تو بالکل میرے جیسے ہوتی' اور انہوں نے اس کا نام بھی نور العین رکھا تھا' لیکن وہ صرف دس دن زندہ رہ کر چلی گئی تھی' اور جب پہلی بار انہوں نے مجھے اپنے لان میں پنو کو ڈھونڈتے دیکھا تھا' اور میں نے انہیں بتایا تھا کہ میرا نام نور العین ہے' تو انہیں یوں لگا تھا' جیسے میں ان کی بیٹی ہوں نور العین ...... اور اس روز میں سارا دن سوچتی رہی تھی کہ کتنا اچھا ہوتا' اگر میں ملک مختار احمد کی بیٹی ہوتی اور زیب ماما پاپا کی ... اور اس روز میں دوبارہ ادھر چلی گئی تھی' اور مختار احمد'' ملک ہاؤس'' سے باہر نکل رہے تھے۔

''کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ اللہ میاں سے کہہ کر مجھ اپنی بیٹی بنا لیں۔''

''وہ کیسے؟''

انہوں نے دلچسپی سے مجھے دیکھا تھا۔

وہ یونہی چھوٹی چھوٹی باتوں میں دلچسپی لیتے تھے' اور سوال کرتے رہتے تھے۔

''وہ ایسے کہ آپ اللہ میاں سے دعا کریں کہ میں آپ کی بیٹی ہو جاؤں' تو اللہ میاں اپنے فرشتوں سے کہیں گے تو وہ مجھے آپ کے گھر چھوڑ جائیں گے۔ مجھے ایک بار زیب نے بتایا تھا کہ تمہیں فرشتے یہاں چھوڑ گئے تھے۔''

''اچھا ہم اللہ میاں سے دعا کریں گے' لیکن اگر فرشتے آپ کو ہمارے گھر چھوڑنے نہ

آئے تو پھر بھی آپ ہماری بیٹی ہو، ٹھیک ہے نا۔''

''ٹھیک ہے۔''

میں نے سر ہلا دیا تھا' لیکن دل ہی دل میں کتنے روز تک دعا کرتی رہی تھی' کہ فرشتے مجھے ''ملک ہاؤس'' میں چھوڑ آئیں' اور ہر روز صبح اٹھ کر دیکھتی تھی کہ میں ملک ہاؤس میں ہوں یا اپنے گھر میں۔ اور پھر خود کو اپنے گھر اور کمرے میں پا کر مایوس ہو جاتی تھی' پتا نہیں کیوں میں چاہتی تھی کہ میں ملک صاحب کی بیٹی بن کر یہاں سے چلی جاؤں۔ شاید میں دل ہی دل میں ماما اور پاپا سے خفا رہتی تھی۔ مجھے پاپا کا زیب کو مجھ پر ترجیح دینا اچھا نہیں لگتا تھا' یہ نہیں کہ مجھے زیب سے محبت نہیں تھی۔ میں چاہتی تھی کہ پاپا ماما میری حق تلفی نہ کریں' اور میرے حصے کی چیزیں زیب کو نہ دیا کریں۔ بچپن میں بہت بار ایسا ہوا کہ پاپا میرے لیے کوئی چیز لائے' تو زیب کے ضد کرنے پر ماما نے وہ زیب کو دے دی' یا ماما نے میرے لیے کوئی کپڑا خریدا' تو وہ زیب کو پسند آ گیا' ایسے میں ماما کی نظریں میرے چہرے پر ٹک جاتی تھیں۔ وہی التجا کرتی نظریں، ان سے میری طرف بھٹکتیں اور میں ان کی نظروں کے سامنے پگھل جاتی۔ حالانکہ جب میں کلاس سیونتھ میں پڑھتی تھی' تو اسکول میں فنکشن پر پہننے کے لیے ماما نے میرے بہت خوبصورت سوٹ لیا تھا' اور پھر اس پر اپنے ہاتھوں سے کڑھائی کی تھی' اور ابھی وہ اسے سلائی کرنے کے لیے بیٹھی ہی تھیں' کہ زیب اسکول سے آ گئی' ان دنوں وہ میٹرک میں تھی۔

''اللہ! ماما کتنا خوبصورت سوٹ یہ میرے لیے لائی ہیں نا آپ۔''

''نہیں بیٹا یہ عینی کا ہے۔ اس کے اسکول میں فنکشن ہے۔''

''پلیز ماما یہ تو آپ مجھے دے دیں' عینی کے لیے اور لے آئیں، اچھا سا ریڈی میڈ۔''

''مگر۔''

''پلیز ماما۔''

زیب نے ماما کے گلے میں بانہیں ڈال دیں' اور پھر مڑ کر پاپا کی طرف دیکھا۔

''پاپا آپ کہیں نا ماما سے۔''

''ہاں تاجی! یہ زیب کو بنا دو۔ عینی کے لیے شام کو ریڈی میڈ لے آئیں گے۔''

تب ماما نے بے بسی سے مجھے دیکھا تھا' اور پھر پاپا کو' پھر دوبارہ ان کی نظریں میری طرف اٹھی تھیں۔ وہی التجا کرتی معذرت کرتی نظریں' اور میں ہمیشہ کی طرح بنا بولے وہاں سے ہٹ گئی تھی' اور پھر شام کا پاپا نے دوبارہ کہا تھا کہ میں ان کے ساتھ بازار چلوں' وہ صبح فنکشن میں پہننے

کے لیے میری پسند کے کپڑے دلوا دیں گے' لیکن میں سر درد کا بہانہ کیے لیٹی رہی۔ تب وہ ماما کو ساتھ لے کر خود ہی سوٹ لے آئے تھے' لیکن یہ سوٹ پہن کر مجھے وہ خوشی نہیں ہوئی تھی' جو ماما کے ہاتھ کا کڑھا ہوا سوٹ پہن کر ہوتی' میرا بہت جی چاہا تھا کہ میں زیب کو منع کر دوں' ماما سے کہہ دوں کہ میں اپنا سوٹ زیب کو ہرگز نہیں دوں گی' لیکن میں نہ کہہ سکی تھی' اور اس روز میں فنکشن سے آ کر ملک ہاؤس گئی' تو میں نے ملک صاحب سے کہا تھا' کتنا اچھا ہوتا کہ میں آپ کی بیٹی ہوتی' اور تب انہوں نے مجھے پہلی بار ڈانٹا تھا کہ میں انہیں ملک صاحب کیوں کہتی ہوں' بھلا بابا کیوں نہیں کہتی' اور یوں میں نے انہیں بابا کہنا شروع کر دیا تھا' اور ماما اور پاپا سے کچھ اور بھی دور ہو گئی تھی' اور زیب سے تو پہلے ہی کم بات ہوتی تھی' کیونکہ ہمارے اسکول بھی مختلف تھے' وہ انگلش میڈیم میں پڑھتی تھی' اور میں اردو میڈیم میں۔ ایک بار پاپا نے کہا تھا کہ وہ ایک دو ٹیوشن اور لے لیتے ہیں' اور مجھے بھی زیب کے اسکول میں داخل کروا دیتے ہیں' لیکن ہوا یوں کہ میری انگریزی بھی کمزور تھی' اس لیے مجھے وہاں داخلہ نہ مل سکا' اور زیب نے میرا خوب مذاق اڑایا تھا۔ پاپا اور ماما کے سامنے مجھے نالائق کہا تھا۔

''اصل میں بیٹا عینی نالائق نہیں ہے' لیکن چونکہ شروع سے اس نے دوسرے اسکول میں پڑھا ہے' اس لیے کورس وغیرہ میں فرق ہے۔''

بابا نے بڑی آہستگی سے کہا تھا' لیکن زیب ہمیشہ مجھے اردو میڈیم کہہ کر چھیڑا کرتی تھی' لیکن جوں جوں میں بڑھی ہوتی گئی' میں نے اس کی باتوں کا برا منانا چھوڑ دیا تھا' پتا نہیں کیوں مجھے لگتا تھا جیسے وہ بہت خود غرض ہے۔ اسے ماما اور پاپا سے محبت نہیں ہے' اسے ماما کا ذرا بھی خیال نہیں تھا۔ وہ اپنے کالج سے آ کر اپنے کمرے میں گھس جاتی تھی۔ گانے سنتی رہتی یا کتابیں پڑھتی رہتی تھی' اس نے کبھی ماما کا ہاتھ نہیں بٹایا تھا۔ ان دنوں میں نویں میں تھی' اور مجھے خود ہی ادراک ہو گیا تھا کہ ماما پر بہت بوجھ ہے' اور وہ یقیناً تھک جاتی ہوں گی۔ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ انہیں کوئی کام وقت پر دینا ہوتا' تو وہ رات گئے تک بیٹھی کام کرتی رہتی تھیں۔ ایسے میں صبح اٹھ کر ناشتہ بھی بنایا کرتی تھی' اور ماما ممنون نظروں سے دیکھتیں اور پتا نہیں کیوں یہ ان کی ممنون نظر مجھے اندر تک ہلا دیتی۔ میں سمجھ نہ پاتی کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ ماما اس طرح کیوں دیکھتی ہیں مجھے۔ کئی دفعہ میرا جی چاہا کہ میں ان سے پوچھوں۔

''ماما آخر کچھ کہتی کیوں نہیں اور اس طرح کیوں دیکھتی ہیں' لیکن میں جو ملک مختار احمد سے ہر موضوع پر بات کرتی تھی۔ ماما یا پاپا سے کبھی کوئی بات نہیں کر سکتی تھی' اور اگر کبھی کرنا بھی چاہتی

تو کوئی نہ کوئی بات ہو جاتی' اور میں پھر اپنے اندر سمٹ جاتی۔"

ماما کسی بات پر زیب کو ترجیح دے دیتیں، پاپا اس کے مقابلے مجھے اگنور (نظر انداز) کر دیتے' تو میرے اندر اداسیاں سی اتر آتیں۔ اب میں بچی نہیں تھی' اور میں ہر بات کو بہت شدت سے محسوس کرتی تھی' اگرچہ اس کا اظہار نہیں کرتی تھی' اور یہ ساری اداسیاں ملک ہاؤس جا کر ختم ہو جاتیں۔

بابا سے باتیں کر کے مجھے بہت سکون ملتا تھا' اب تو وہ اکثر یہاں ہی رہتے تھے' ان کی طبیعت کچھ خراب رہتی تھی' اس لیے ان کے ڈاکٹرز نے انہیں شہر میں رہنے کے لئے کہا تھا۔ پھر اچانک انہوں نے بیٹوں کے پاس امریکہ جانے کا پروگرام بنالیا' اور ان کے جانے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ ان کا وجود میرے لیے کتنی بڑی نعمت تھا' اور ان کے ہونے سے میری کتنی محرومیوں کی تلافی ہو جاتی تھی' اور کتنے خلاءُ ہو جاتے تھے۔ اب تو میں پروین کی طرف بھی کم ہی جاتی تھی' کبھی بہت دل گھبراتا' تو چلی جاتی' اور پھر ہم دونوں پورے ملک ہاؤس میں چکراتے پھرتے، انہیں دنوں فلیٹ کی اقساط بھی مکمل ہوگئیں' اور پہلی بار میں نے بابا کے چہرے پر خوشی دیکھی۔ تین بیڈ رومز کا یہ فلیٹ بہت خوبصورت تھا' لیکن ملک ہاؤس سے کچھ دور تھا' سو فلیٹ میں شفٹ ہونے کے بعد پینو کے پاس میرا جانا ایک طرح سے ختم ہوگیا' اب وہ بات تو تھی نہیں کہ میں سڑک کراس کر کے ان کے کوارٹر میں پہنچ جاتی۔ ایک دو بار وہ ماسی شہر بانو کے ساتھ ملنے آئی تھی' اور ایک بار پاپا میرے کہنے پر مجھے اس کے گھر چھوڑ آئے تھے' اور شام کو ماسی شہر بانو نے مجھے گھر پہنچا دیا تھا' یعنی ملک مختار ابھی تک امریکہ میں ہی تھے۔ پینو نے بتایا کہ ایک بار انہوں نے فون کیا' اور میرا بہت پوچھ رہے تھے' میں بھی انہیں بہت یاد کرتی تھی' لیکن میرا بھلا ان سے کیا رشتہ تھا۔ میں فلیٹ میں آ کر اور بھی اداس اور خاموش ہوگئی تھی۔ ماما زیب کی فرمائش پر اس کا کمرہ سیٹ کرنے میں مصروف ہوگئی تھیں۔ ہر روز کوئی نہ کوئی فرمائش کر دیتی تھی کہ اسے اپنے کمرے کے لیے یہ چاہیے' وہ چاہیے' اور ماما اس کی فرمائش پوری کرنے کی کوشش میں ہلکان ہوئی جاتی تھیں' ایک بار پاپا نے دبے لفظوں میں اسے سمجھایا۔

"زیب ابھی گنجائش نہیں ہے ماما کو تنگ مت کیا کرو' جب گنجائش ہوگی تو تمہارا کمرہ خود تمہاری خواہش کے مطابق سیٹ کر دیا جائے گا' عینی بھی تو ہے اس کا کمرہ بھی تو دیکھو۔"

"عینی کا تو ٹیسٹ ہی نہیں ہے۔ اسے بھلا کیا پتا کہ کمروں کی ڈیکوریشن کیسے کی جاتی ہے۔ سارا وقت تو وہ ماسی شہر بانو کے کوارٹرز میں گھسی رہتی تھی' اس کا ٹیسٹ تو وہی ہوگا نا پاپا جب کہ

میری فرینڈز تو بڑے اونچے گھرانوں کی ہیں' بچی پاپا ان کے بیڈ رومز دیکھ کر آنکھیں کھل جاتی ہیں۔"

اور میری آنکھوں کے سامنے ملک ہاؤس کے کمرے گھوم گئے تھے۔ بابا کا بیڈ روم کتنا شاندار تھا۔ ڈرائنگ روم اور ٹی وی لاؤنج میں کتنا قیمتی فرنیچر تھا' اور کتنے خوبصورت ڈیکوریشن پیسز تھے۔ لیکن میں نے ماما پاپا سے کوئی فرمائش نہیں کی تھی' کہ مجھے بھی زیب کی طرح اپنا کمرہ سجانا ہے' حالانکہ اب پاپا کبھی کبھی مجھ سے پوچھ لیا کرتے تھے کہ مجھے کچھ چاہیے اور میں ہمیشہ ہی نفی میں سر ہلا دیا کرتی تھی۔ ان دنوں میں میٹرک میں آ گئی تھی' اور کبھی کبھی بابا کو یاد کر کے بے حد اداس ہو جاتی' ایسے ہی اداس دنوں میں نانو آسٹریلیا سے آ گئیں۔ اپنے شعور میں پہلی بار میں نے انہیں دیکھا تھا' وہ ایک طویل عرصہ سے اپنے بیٹوں کے پاس آسٹریلیا میں مقیم تھیں۔ ہمارے گھر چونکہ فون نہیں تھا' اس لیے کبھی کبھار سال میں ایک یا دو بار پڑوس میں ان کا فون آ جاتا تھا' اور صرف ماما ہی جا کر بات کر لیتی تھیں واپس آ کر وہ مختصر بتا دیتیں۔

"اماں کا فون تھا' خیریت سے ہیں۔" ان کی آمد ماما کے لیے جہاں حیرت کی بات تھی' وہاں وہ خوش بھی تھیں۔ میرے لیے ان کا آنا نہ آنا برابر تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ بھی ماما اور پاپا کی طرح زیب کو مجھ پر ترجیح دیں گی' لیکن ایسا نہیں ہوا تھا' بالکل غیر متوقع طور پر نانو نے مجھے بہت اہمیت دی تھی۔

"ارے یہ عینی ہے نا۔"

گھر میں داخل ہوتے ہی وہ میری طرف متوجہ ہوگئی تھیں۔

"بالکل تمہاری کاپی ہے' بچپن میں تم بالکل ایسی ہی تھیں' یوں ہی دبلی پتلی اور لمبی سی۔"

انہوں نے پاس کھڑی زیب کی طرف نہیں دیکھا تھا' اور مجھے گلے سے لگا لیا تھا۔

"اور یہ زیب ہے۔"

مجھے الگ کرتے ہوئے سرسری نظروں سے انہوں نے زیب کو دیکھا تھا۔

"ہے اماں!"

"کیسی ہو بیٹی۔"

انہوں نے زیب سے یونہی سرسری سا پوچھا تھا' اور میں نانو کے اس رویے پر از حد حیران ہو رہی تھی' زیب بھی کچھ کم حیران نہیں تھی' اور پھر نانو نے جب اپنا اٹیچی کھولا تو میرے ماما اور پاپا کے لیے بہت کچھ تھا۔ لیکن زیب کے لیے صرف ایک پرفیوم اور ایک سوٹ پیس' میرے لیے نانو

بہت سارے گفٹ لائی تھیں۔ پرس، سوٹ، جیولری، جوتے، پرفیوم۔

"اماں آپ زیب کے لئے کچھ نہیں لائیں۔"

ماما کچھ خاموش سی تھیں۔

"لائی تو ہوں۔"

"لیکن اماں صرف ایک سوٹ اور پرفیوم جب کہ عینی کے لیے۔"

"کمال کرتی ہو تم تاجی! عینی میری نواسی ہے' جب کہ زیب سے میرا کوئی رشتہ نہیں ہے۔"

اور لمحہ بھر کے لیے میں ششدر سی رہ گئی تھی۔ یہ نانو کیا کہہ رہی تھیں۔

"اماں آپ بھی۔"

ماما نے میری طرف دیکھتے ہوئے کچھ الجھتے ہوئے نانو سے کہا۔

"ہم نے زیب کو کبھی یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ وہ۔"

"ہاں لیکن وہ تم جانو میرے لیے جو عینی ہے' وہ زیب نہیں ہوسکتی۔"

"اماں! انور کیا کہیں گے کیا سوچیں گے کہ میں...... آپ جو کچھ لائی ہیں دونوں میں تقسیم کردیں۔"

"یہ کیسے ہوسکتا ہے تاجی۔"

"اماں پلیز میری عمر بھر کی ریاضتوں کو ضائع تو نہ کریں۔" ماما کی آواز بھرا گئی تھی' اور پھر ان کی نظریں میری طرف اٹھیں' وہی التجا کرتی نظریں' جن میں کبھی التجا ہوتی' کبھی مان ہوتا' کبھی یقین اور کبھی معذرت' میں نے خاموشی سے سب گفٹ ماما کی طرف دھکیل دیئے' اور اپنے کمرے میں آ گئی۔ میرے اندر کوئی احساس نہ تھا' میں تو عادی تھی اس سلوک کی' ہاں مجھے الجھن تھی کہ زیب کون ہے' اگر میں ماما کی سگی بیٹی ہوں تو کیا وہ پاپا کی بیٹی ہے۔ شاید پاپا نے ماما سے پہلے کسی اور سے شادی کی ہو...... پھر کیا ہوا ہوگا۔ کیا پاپا نے اسے چھوڑ دیا یا وہ وفات پا گئی۔ اس رات مجھے نیند نہیں آئی۔ زیب کون ہے اگر وہ ماما یا پاپا دونوں کی بیٹی نہیں ہے' تو پھر ماما اور پاپا دونوں ہی اسے اتنا چاہتے کیوں ہیں؟ مجھ سے بھی زیادہ میں نے سوچا تھا نانو سے ہی پوچھوں گی' لیکن نانو سے کچھ پوچھنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ نانو نے خود ہی مجھے بتا دیا۔ زیب پاپا کی بہن تھی یعنی میری پھوپھو۔"

میں کتنی ہی دیر تک بے چینی سے انہیں دیکھتی رہی۔

"ہاں جھوٹ تھوڑا ہی بول رہی ہوں بھئی تاجی کے منگنی ہوگئی تھی' حالانکہ ابھی وہ کم عمر تھی' نیا

نیا کالج میں داخلہ لیا تھا' لیکن تمہاری دادی اماں کو اچانک ہی معدے کی تکلیف ہوئی' پتا چلا کہ کینسر ہے' لیکن پھر تو انہوں نے دلہیز ہی پکڑ لی' وہ اپنی زندگی میں بیٹے کی شادی کرنا چاہتی تھیں۔ جب منگنی ہوئی تھی تو خیال تھا کہ تین چار سال تک تاجی بی اے کر لے' اور انور بھی تعلیم ختم کر لے تو شادی ہوگی' لیکن بس موت کا ہاتھ پڑ گیا تھا عاصمہ بہن کو تمہارے ماموں نے تو کہہ دیا کہ وہ اتنی کم عمری میں تاجی کی شادی نہیں کریں گے' لیکن تمہارے نانا ابا کو زبان کا پاس تھا' جو مرحوم دوست سے تین سال قبل کیا تھا' سو انہوں نے حامی بھر لی' انور خود ان دنوں پڑھتا تھا' غالباً ایف اے میں تھا' اور زیب تقریباً دو سال کی تھی۔ دونوں بہن بھائیوں میں سولہ سال کا فرق تھا' بس خدا کے کھیل ہیں۔ انور کے بعد عاصمہ کی کوئی اولاد نہ ہوئی' اور پھر اتنے عرصہ بعد زیب آئی' ایسا لگتا تھا جیسے عاصمہ کو انور کی شادی کا ہی انتظار تھا' زیب کو تاجی اور انور کے حوالے کر کے شادی کے تین ماہ بعد ہی وہ اللہ کو پیاری ہوگئی۔"

نانو سے تفصیل سن کو میرے دل میں زیب کے لئے موجود محبت کم ہونے کے بجائے زیادہ ہوگئی' اور ماما اور پاپا کا مقام میری نظروں میں بلند ہوگیا پاپا کی تو خیر وہ بہن تھیں' لیکن ماما کا کردار واقعی بلند تھا' لیکن نانو اکثر ماما سے الجھتی رہتیں۔

"تم عینی کے ساتھ بہت زیادتی کر رہی ہو تاجی! تم نے اچھا نہیں کیا۔ زیب کا اپنا مقام ہے اس کا اپنا۔" زیب کو اس انکشاف پر کوئی خاص حیرت نہیں ہوئی تھی۔ شاید وہ پہلے سے جانتی تھی' یا اگر نہیں بھی جانتی تھی' تو اسے کوئی خاص فرق نہیں پڑا تھا۔ وہ پہلے کی طرح ہی پاپا اور ماما سے لاڈ کرتی اور ضدیں منواتی تھی' ایسے میں اب بھی وہ ہمیشہ کی طرح بالکل اگنور کر دیتی' بلکہ میں نے محسوس کیا کہ اب وہ جان بوجھ کر ایسی حرکات زیادہ کرنے لگی تھی' جس سے مجھے تکلیف ہو۔ میں پاپا سے بات کرنے لگتی' تو وہ فوراً ٹوک کر انہیں اپنی طرف متوجہ کر لیتی۔ ماما کی نظروں میں میرا مذاق اڑا کر میری اہمیت کم کرنے کی کوشش کرتی۔ میری اہمیت تھی ہی کہاں' جسے وہ کم کرنے کی کوشش کر رہی تھی' مجھے ہنسی آتی' لیکن نانو چڑتی تھیں۔ ماما اس کی سائیڈ لیتیں' مجھے اگنور کرتیں تو نانو ان سے الجھ پڑتیں۔

"تاجی! ہر بات اپنی حد میں اچھی لگتی ہے' تم نے تو عینی کی شخصیت کو الجھا دیا ہے۔ اس عمر میں بھلا بچیاں یوں خاموش اور چپ رہتی ہیں کیا۔"

"اماں یہ بچپن سے ہی ایسی ہے' آپ پریشان نہ ہوں خاموش اور کم گو سی ہے۔"

"اور تم نے کبھی غور نہیں کیا کہ یہ کیوں صم بکم ہوگئی ہے' تمہاری بیٹی ہے وہ تاجی۔"

نانو میرا کیس لڑ رہی تھیں' مجھے دل میں بہت خوشی ہوئی تھی کہ کوئی تو ہے' جس نے ماما کو احساس دلایا۔ میرا خیال تھا کہ ماما کو احساس ہو جائے گا کہ انہوں نے اب تک مجھ سے زیادتی کی ہے' میری حق تلفی کی ہے' میرے حصے کی محبتیں بھی زیب کو دی ہیں' وہ زیب سے ضرور محبت کرتیں' لیکن مجھ سے میری محبتیں نہ چھینتیں' لیکن میری سوچ کے برعکس نانو کی اس جدوجہد اور کوشش کا حاصل یہ نکلا کہ نانو نے فیصلہ سنا دیا کہ وہ مجھے اپنے لے کر جائیں گی' یوں بھی پاکستان میں وہ اکیلی ہوں گی' وہ بہت عرصہ بعد پاکستان آئی تھیں' اور انہوں نے ماموں سے کہہ دیا تھا کہ اب وہ پاکستان میں ہی رہیں گی۔

"مگر اماں......"

"میں تمہاری کچھ نہیں سنوں گی' ارے اچھی خاصی بچی کی شخصیت تباہ کر کے رکھ دی ہے تم نے' گم صم رہتی ہے' نہ ہنسی نہ مذاق' نہ شوخی' اس عمر میں تو پارہ بھرا ہوتا ہے لڑکیوں میں۔"

"نہیں میں نہیں جاؤں گی نانو کے ساتھ' بھلا میں وہاں پاپا ماما کو چھوڑ کر کیسے جا سکتی ہوں' اور پھر زیب بھی تو ہے' ان تینوں کے بغیر' نہیں۔" میں نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا کہ میں نانو سے صاف صاف کہہ دوں گی کہ مجھے ان کے ساتھ نہیں جانا' اور پھر میرے جانے سے ماما پر بھی تو کام کا بوجھ پڑ جائے گا' ابھی تو میں کام کر دیتی ہوں۔"

"ٹھیک ہے اماں۔"

ماما نے آہستگی سے کہا۔

"میٹرک کا امتحان دے لے تو میں کراچی بھجوا دوں گی آپ کے پاس یہاں تو......"

اور میرے اندر جیسے کچھ ٹوٹ سا گیا' تو ماما کو مجھ سے اتنی سی محبت بھی نہیں کہ وہ ایک بار ہی نانو سے کہہ دیتیں کہ وہ مجھے ان کے ساتھ نہیں بھیجیں گی۔ پاپا نے بھی کچھ نہیں کہا' کوئی احتجاج نہیں کیا' سو جب امتحان کے بعد ماما نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں نانو کے پاس جانا چاہتی ہوں' تو میں نے اثبات میں سر ہلا دیا' بھلا جب ماما اور پاپا کو ہی میری ضرورت نہ تھی' تو مجھے یہاں رہ کر کیا کرنا تھا۔

"نانو کا گھر بہت خوبصورت تھا' اور آسٹریلیا جانے سے پہلے وہ گھر میں اپنی ایک دور کی عزیزہ کو چھوڑ گئی تھیں' وہ اب بھی وہاں ہی مقیم تھیں' مختصری فیملی تھی۔ ایک بیٹا' ایک بیٹی نانو کے آنے پر انہوں نے چاہا کہ وہ کہیں اور منتقل ہو جائیں' لیکن نانو نے انہیں جانے نہ دیا۔

"لو میں اکیلی جان ہوں...... بھلا میرے ایک کے رہنے سے تمہیں کیا فرق پڑے گا۔"

سو وہ بھی وہاں ہی مقیم تھے۔ بیٹی تقریباً ہم عمر تھی' بیٹا چھوٹا تھا۔ نانو مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔ پاپا ایک دن ٹھہر کر جانے لگے' تو میرے پاس رک کر انہوں نے میرے سر پر ہاتھ رکھا۔ پتا نہیں کیوں مجھے لگا جیسے ان کا ہاتھ لرز رہا ہو۔

"اگر دل نہ لگے تو فون کر دینا میں آ کر لے جاؤں گا۔" ان کی آواز آہستہ تھی۔ میں نے سر ہلا دیا' لیکن میں نے کبھی فون نہیں کیا' حالانکہ میرا دل ایک دن بھی نہیں لگا' نانو میرا دل بہلانے کی بہت کوشش کرتی تھیں' مجھے ہنسنے بولنے کی تلقین کرتی تھیں' شاپنگ کے لئے لے جاتیں' کہیں کوئی فنکشن ہوتا محض میری وجہ سے اٹینڈ کرتیں' لیکن میں روز بروز مزید خاموش ہوتی گئی۔ بھلا جب چپ اندر ڈیرے ڈالے بیٹھی ہو تو باہر لاکھ ہنگامے کھڑے کر لو' اندر کی چپ نہیں ٹوٹتی اور یونہی میں نے دو سال بتا دیئے' اس دوران دو بار ماما' پاپا اور زیب ملنے آئے' لیکن میں ایک بار بھی لاہور نہیں گئی۔ کسی نے بھی مجھے لاہور آنے کے لئے نہ کہا۔ نہ ماما نے' نہ پاپا نے' نہ ہی زیب نے۔ میں نے سوچا تھا میں کبھی واپس نہیں جاؤں گی' ہمیشہ نانو کے پاس رہوں گی' لیکن میں نے جو سوچا' وہ کبھی نہیں ہوا۔ نانو کو ماموں ہمیشہ واپس بلاتے رہتے تھے کہ بہت رہ لیا پاکستان اب آ جائیں' لیکن نانو کہتی تھیں۔

"نہیں بھئی اب تو تم ہی آؤ گے یہاں' میں نہیں آؤں گی۔" لیکن ماموں اچانک بیمار ہو گئے۔ ہارٹ کی تکلیف تھی نانو کو جانا پڑا' اور میں واپس لاہور آ گئی۔ نانو نے مجھے یقین دلایا تھا کہ وہ بہت جلد واپس آ جائیں گی' اور مجھے لے آئیں گی' لیکن ان کا قیام طویل ہوتا گیا' اور پاپا نے مجھے کالج میں داخل کروا دیا' تب میں تھرڈ ایئر میں تھی' اور زیب یونیورسٹی میں۔ وہ بے حد خوبصورت ہو گئی تھی' خوبصورت ہیئر سٹائل' بات کرنے میں ایک غرور سا' اعتماد سا' میں حیران سی اسے دیکھتی رہتی تھی۔ کاش میں اسے پھوپھو کہہ سکتی' کیسا خوبصورت رشتہ تھا میرا اور اس کا' لیکن کتنے فاصلے تھے ہمارے درمیان' وہ اب بہت کم مجھ سے بات کرتی تھی' بلکہ پہلے بھی ہم زیادہ بات نہیں کرتے تھے۔ ہاں ماما پاپا سے اس کی اب بھی اس طرح دوستی تھی۔ وہ اسی بے تکلفی سے اب بھی اپنی فرمائشیں کیا کرتی تھی' لیکن دو سال نانو کے گھر رہنے کی وجہ سے مجھے لگا تھا' جیسے میں ماما پاپا سے اور بھی دور ہو گئی ہوں' ایسے میں مجھے ملک مختار احمد یاد آ گئے' پتا نہیں میں انہیں یاد بھی ہوں گی یا نہیں' پتا نہیں وہ کہاں ہوں گے' اپنے بیٹوں کے پاس امریکہ میں یا یہاں۔ کیا خبر ملک ہاؤس میں آج کل کون رہتا ہے۔ ماسی شہر بانو کے متعلق بھی ماما کو کچھ پتا نہ تھا کہ وہ کیسی ہیں؟ کہاں ہیں؟ ایک روز میں کالج سے واپسی پر سیدھی ادھر چلی گئی "ملک ہاؤس" کے گیٹ کے پاس

رک کر لمحہ بھر کو میں نے نیم پلیٹ پڑھی "ملک ہاؤس" اور پھر چکر کاٹ کر بیک سے ماسی شہر بانو کے کوارٹر میں چلی گئی۔

"ارے تم بٹی۔"

"شہر بانو جو دھوپ میں بیٹھی کچھ سلائی کر رہی تھی' مجھے دیکھ کر ایک دم خوش ہو گئی۔"

"تم تو ایسی گئیں کہ پھر لوٹ کر آئی ہی نہیں ہو۔"

"بس وہ نانو نے آنے ہی نہیں دیا۔"

"ہاں تمہاری اماں نے بتایا تو تھا۔"

"وہ پینو کدھر ہے؟" میں نے ادھر ادھر دیکھا۔

"اس کی تو شادی کر دی ہے۔"

"اتنی جلدی۔"

"ہاں بس کچھ جلدی ہی کر دی' بڑی فکر تھی مجھے اس کی' سوچتی تھی مجھے کچھ ہو گیا تو اس کا کیا بنے گا۔ اب خوش ہے اپنے گھر میں' میاں اچھا ہے' ساس خیال رکھتی ہے' تم بتاؤ۔ اماں کیسی ہیں' تمہاری زیب کی شادی وادی ہو گئی۔"

"نہیں ابھی تو پڑھ رہی ہے اور بابا کیسے ہیں؟ کہاں ہیں آج کل۔"

"بابا کون ملک صاحب۔"

"ہاں۔"

"آج کل گھر پر ہی ہیں' بہت خوش ہوں گے تمہیں دیکھ کر' کئی بار تمہارا پوچھتے ہیں۔"

"تو میں جاؤں۔"

"ہاں ہاں کیوں نہیں جاؤ۔"

"اور تو کوئی نہیں ہے نا گھر میں ان کے بیٹے وغیرہ۔"

"نہیں کہاں آتے ہیں وہ یہاں' ملک صاحب نے تو بہت کوشش کی' لیکن بہانے بنا دیتے ہیں' امریکہ راس آ گیا ہے ان کو۔"

شہر بانو نے ٹھنڈی سانس لی' اور میں کچن کے پچھلے دروازے سے ہوتی ہوئی ٹی وی لاؤنج میں آ گئی۔ ملک مختار احمد بالکل سامنے بیٹھے اخبار دیکھ رہے تھے۔

"بابا......" میں نے آہستہ سے کہا۔

میں سوچ رہی تھی پتا نہیں وہ پہچانیں گے بھی یا نہیں۔ انہوں نے اخبار سے نظریں اٹھائیں'

ایک لمحہ میری طرف دیکھا' اور پھر بے اختیار کھڑے ہو گئے۔

"ارے یہ تو میری بٹی...... میری عینی۔"

"بابا آپ نے مجھے کیسے پہچان لیا۔"

"بابا کہنے والی اس دنیا میں صرف ایک ہی ہستی ہے' اور وہ ہے ہماری پیاری بٹی نور العین! ارے کہاں چلی گئی تھیں تم بلی۔ میں تمہیں روز یاد کرتا تھا' کیا تم بھی یاد کرتی تھیں۔"

"ہوں لیکن روز نہیں کبھی کبھی۔" میں نے شرارت سے انہیں دیکھا۔

مجھے ایک لمحہ کے لئے بھی اجنبیت محسوس نہیں ہوئی تھی' جیسے میں آج پانچ برسوں بعد یہاں آئی تھی' بلکہ مجھے لگ رہا تھا' درمیان میں یہ سال آئے ہی نہ تھے۔ بابا سے باتیں کرتے ہوئے میری چپ خود ہی ٹوٹ گئی تھی۔ میں نے بابا سے بہت باتیں کیں' اپنی کلاس فیلوز کی ٹیچرز کی اور نانو کی' اور سب سے بڑھ کر سمندر کی' سمندر کتنا بڑا اور وسیع تھا' دور تک پھیلا ہوا۔ اگر میں سمندر میں چھلانگ لگا دوں تو کیا ہو...... پہلی بار جو خیال سمندر دیکھ کر میرے ذہن میں آیا تھا' وہ میں نے بابا کو بتایا' تو وہ دیر تک ہنستے رہے۔

"تم سے اسی خیال کی توقع کی جا سکتی ہے' اسی لئے کہ تم بہت عقلمند ہو۔"

"وہ تو میں ہوں۔"

میں نے گردن اکڑائی۔

اور اگر اس وقت پاپا' ماما' زیب مجھے یوں بابا سے پٹر پٹر باتیں کرتے دیکھتے تو حیران رہ جاتے۔

بابا کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کرتے ہوئے مجھے وقت گزرنے کا خیال ہی نہ رہا۔

"بیٹا گھر بتا کر آئی تھیں نا۔" شہر بانو نے آ کر پوچھا تو میں یکدم کھڑی ہو گئی۔

"ارے اتنی دیر ہو گئی' میں تو کالج سے چلی آئی تھی۔"

"چلو میں چھوڑ آتی ہوں۔"

"نہیں اب کوئی سڑک پار کر کے تو نہیں جانا' کافی دور ہے واپس کیسے آئیں گی۔"

"تو اس وقت اکیلی کیسے بھیج دوں۔"

یہاں ملک ہاؤس میں محبتوں کے وہی انداز' وہی رنگ تھے' کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا۔ کہیں کہیں جیسے وقت ٹھہر جاتا ہے' کچھ بھی تبدیلی نہیں آتی' اور کہیں لمحہ لمحہ تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں۔

''شہر بانو ڈرائیور سے کہو گاڑی نکالے' اور تم ساتھ چلی جاؤ۔''

''مگر بابا......''

میں نے کچھ کہنا چاہا' لیکن انہوں نے ہاتھ اٹھا کر کچھ کہنے سے روک دیا۔

پاپا ابھی تک دفتر سے نہیں آئے تھے۔ ماما گیلری میں کھڑی تھیں' مجھے اور ماسی شہر بانو کو دیکھ کر ان کی آنکھوں میں اطمینان اتر آیا۔

''اتنی دیر کر دی۔''

''ماسی کی طرف چلی گئی تھی۔''

''بتا کر تو جاتیں۔''

''سوری آئندہ بتا کر جاؤں گی۔''

میں کتابیں کمرے میں رکھ کر کچن میں گھس گئی۔ اب میں ہر ہاف ڈے کو بابا سے ملنے چلی جاتی۔ ماما کو میں بتا دیتی تھی' اور ہمیشہ کی طرح ماسی شہر بانو ڈرائیور کے ساتھ مجھے چھوڑ جاتی تھی۔ بچپن کی نسبت اب بابا سے باتیں کر کے زیادہ مزا آتا۔ بہت دوستی ہو گئی تھی میری ان سے۔

''بابا......''

ایک روز میں نے ان سے پوچھا۔

''آپ حمزہ اور ارسلان بھائی کو یہاں کیوں نہیں بلا لیتے۔ اتنے اکیلے ہوتے ہیں۔''

''وہ آتے ہی نہیں۔''

بابا اداس ہو گئے۔

''ارسلان کی تو بیوی امریکن ہے' اور وہ کسی طرح پاکستان آنے کو تیار نہیں جبکہ حمزہ کا بہانہ ہے کہ وہ اپنی تعلیم مکمل کر کے ہی آئے گا' حالانکہ میں جانتا ہوں وہ کبھی نہیں آئے گا کبھی نہیں۔''

''آپ کو انہیں وہاں بھیجنا ہی نہیں چاہیے تھا۔''

''ہاں یہ غلطی ہو گئی' دراصل ہماری بیٹی اس وقت ہمارے پاس نہیں تھی' اس لئے کسی نے مشورہ ہی نہیں دیا۔''

''ایک حل ہے میرے پاس۔'' میں نے چٹکی بجائی۔

''کیا......؟''

''آپ حمزہ بھائی کی شادی کسی پاکستانی لڑکی سے کر دیں' ایسی پاکستانی لڑکی سے' جسے امریکہ جانے کا شوق نہ ہو۔''

''ہوں' یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں۔'' ان کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

''میں آج ہی حمزہ سے بات کروں گا۔''

''لیکن پہلے لڑکی تو تلاش کر لیں بابا۔''

''لڑکی تو تلاش کرنے کی ضرورت نہیں' پہلے حمزہ سے بات ہو جائے۔'' بابا مسکرائے۔

میں کبھی کبھی بہت حیران ہوتی تھی' کہ بابا کتنے مختلف ہیں' نہ کوئی غرور' نہ کوئی اور ہی جاگیرداروں والی بات' اور میرے استفسار پر وہ کتنی ہی دیر ہنستے رہے تھے۔

''میں جاگیردار نہیں ہوں' معمولی سا زمیندار ہوں۔''

''اگر معمولی زمیندار ایسے ہوتے ہیں' تو پھر بڑے جاگیردار کیسے ہوتے ہوں گے۔'' میں نے حیرت سے سوچا تھا' اتنا وسیع گھر ہے' ملازم اور سب کا خرچ...... پھر حمزہ اور ارسلان کو بھی وہ روپے بجھوایا کرتے تھے' لیکن بابا ہمیشہ خود کو معمولی زمیندار ہی کہتے تھے۔ بابا میرے اندھیرے کمرے کا ایک ایسا روزن تھے' جس سے روشنی کی کرنیں چھن چھن کر اندر آ رہی تھیں۔ میرے اختیار میں ہوتا' تو میں ہر روز ہی بابا سے ملنے چلی جاتی' مجھے یوں لگتا تھا' جیسے یہ گھر میرا ہو' بس غلطی سے میں نے ماما پاپا کے ہاں جنم لے لیا تھا' مجھے تو یہاں اس گھر میں جنم لینا تھا' اور میں اکثر بابا سے اس کا گلہ کرتی تھی کہ اللہ میاں کے خزانے میں ایسی کون سی کمی آ جاتی' اگر اللہ میاں مجھے ماما پاپا کے گھر بھیجنے کے بجائے یہاں بھیج دیتے' اس گھر میں...... وہاں تو میں ایک ناپسندیدہ' ان چاہی بچی تھی۔ جہاں میری ضرورت نہ تھی' اور یہاں میری کتنی ضرورت تھی بابا کو...... میں نہ جاتی' دیر ہو جاتی تو وہ اداس ہو جاتے۔ خود میں بھی اداس ہو جاتی۔ بابا کے مہمان آتے تو بابا مجھے بلوا بھیجتے' اور میں ماسی شہر بانو کے ساتھ مل کر سب ارینج کر دیتی تھی۔ بابا بہت خوش ہوتے۔ یہ سب میں نے نانو کے گھر سیکھا تھا۔ نانو نے حتی الامکان میری شخصیت کو چمکانے کی کوشش کی تھی۔ میرے احساس کمتری کو ختم کرنا چاہا تھا' لیکن میری شخصیت کو صحیح نکھار بابا نے دیا تھا۔ ان کی محبتوں اور شفقتوں نے میرے اندر کے خلا پُر کیسے تھے' میری ذات کو اعتماد بخشا تھا۔ میرے نامعلوم آنسو پونچھے تھے۔ ایک روز میں نے بابا سے سب کہہ دیا تھا۔ اپنے سارے درد' ساری محرومیاں جمع کر کے بابا کی جھولی میں ڈال دی تھیں' اور خود مطمئن سی ہو گئی تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے دوست بن گئے تھے۔ میں چاہتی تھی بابا خوش رہیں' حمزہ یا ارسلان بھائی پاکستان آ جائیں۔ سو میں اکثر بابا سے پوچھتی تھی کہ انہوں نے حمزہ سے بات کی۔

''وہ کیا کہتا ہے اب آئے گا وہ۔''

"پتا نہیں۔"

بابا اداس ہو جاتے۔

"وہ وعدہ تو کرتا ہے آنے کا' لیکن مجھے یقین نہیں ہے۔"

"بابا آپ نے شادی کی بات کی۔"

"کی تھی۔"

"پھر......"

"وہ کسی لڑکی کو دیکھے بغیر اپنی زندگی میں شامل کرنے کیلئے تیار نہیں ہے۔"

"تو آپ انہیں بلوا لیں نا' اور جس لڑکی سے اس کی شادی کرنا چاہتے ہوں' ان سے ملوا دیں۔"

"ہوں۔"

وہ سوچ میں پڑ جاتے۔

پھر اچانک ہی وہ بہت خوش نظر آنے لگے۔ اب وہ اکثر حمزہ کی باتیں کرتے رہتے۔ انہوں نے مجھے اس کی ڈھیروں تصویریں دکھائیں۔ بچپن سے لے کر اب تک کی بے شمار تصاویر...... وہ ایک سمارٹ سا لڑکا تھا۔

"حمزہ بہت جلد آنے والا ہے۔" انہوں نے مجھے بتایا۔

"تو پھر بابا آپ نے اس کے لئے لڑکی تلاش کی۔"

"مجھے لڑکی تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

بابا نے مسکرا کر مجھے دیکھا' اور پھر یکدم ہی اپنی خواہش بیان کر دی۔ میں حیران سی انہیں دیکھتی رہی۔

"بابا میں......"

"ہاں...... تم...... عینی بیٹا' مجھے مایوس نہیں کرنا۔ حمزہ آ جائے تو پھر میں تمہارے والدین کے پاس آؤں گا۔"

"میں بابا سے محبت کرتی تھی' اور میں نے بچپن سے اس گھر میں بابا کی بیٹی بن کر آنے کی دعا کی تھی' سو میں نے سر جھکا دیا' یوں اب ہمارے درمیان حمزہ کے بارے میں باتیں ہونے لگیں۔

اس کی پسند' ناپسند' اس کی اچھائیاں برائیاں' اس کی عادات۔ وہ کھانے میں کیا پسند کرتا

ہے؟ کب جاگتا ہے؟ کیسی موسیقی پسند کرتا ہے؟ کون سے کھیل اچھے لگتے ہیں؟

بابا نے حمزہ کے متعلق اتنی باتیں کی تھیں کہ مجھے وہ اجنبی نہیں لگتا تھا۔ میں نے اسے دیکھا نہیں تھا' لیکن مجھے لگتا تھا' جیسے میں نے اسے بچپن سے دیکھ بھال رکھا ہو۔ میرے اور بابا کے درمیان خود بخود ایک خاموش معاہدہ سا ہو گیا تھا' اور ہم دونوں اپنی اپنی جگہ حمزہ کے منتظر تھے۔ کبھی کبھی بابا بہت مایوس نظر آنے لگتے۔

"یہ حمزہ آنے میں اتنی دیر کیوں کر رہا ہے عینی؟"

"شاید ابھی ان کی سٹڈی ختم نہیں ہوئی ہو گی۔"

"ہیں اس کا تو رزلٹ بھی آ گیا۔ اس نے کہا تھا وہ ذرا ریلیکس ہونے کے لئے گھومنے جا رہا ہے' اور اب تو وہ گھوم پھر کر واپس نیویارک آ گیا ہے۔ یہ تنہائی مجھے مار ڈالے گی بیٹا۔"

ان کے عزیز رشتہ دار تو تھے' لیکن اپنے بیٹوں سے جدائی انہیں اندر ہی اندر کھائے جا رہی تھی۔

"یوں کریں بابا آپ خود چلے جائیں نیویارک' اور انہیں لے آئیں۔" میں نے مشورہ دیا۔

بابا کو میری بات پسند آئی تھی' اور وہ سچ مچ ہی نیویارک جانے کی تیاری کرنے لگے تھے' ان کا خیال تھا کہ وہ کچھ دیر واشنگٹن میں ارسلان بھائی کے پاس ٹھہر کر نیویارک حمزہ کے پاس چلے جائیں گے' لیکن وہ اچانک ہی بیمار پڑ گئے' اور دو دن ہسپتال رہنے کے بعد جب وہ گھر آئے تو پہلے سے زیادہ مایوس تھے۔ ڈاکٹر نے انہیں سفر کرنے سے منع کر دیا تھا۔ ان دنوں میں تقریباً روز ہی جاتی تھی' اور دیر تک ان کے پاس بیٹھی ان سے باتیں کرتی۔ انہیں اپنے ہاتھ سے دوائیاں دیتی' سوپ پلاتی...... اور وہ مجھ سے ہر روز عہد لیتے کہ حمزہ آ گیا تو...... اور میں ہر روز ہی ان سے وعدہ کر لیتی...... وہ خوش ہو جاتے' پھر سے خواب دیکھنے لگتے۔ ایک روز میں گئی تو وہ بہت خوش تھے' ان کے چہرے پر سرخی تھی' اور آنکھوں میں بے تحاشا چمک۔

"حمزہ آ رہا ہے پرسوں شام کی فلائٹ ہے۔" پھر میں آؤں گا تمہارے ماما پاپا کے پاس اور پتا ہے میں ان سے بہت لڑوں گا کہ انہوں نے ہماری اتنی پیاری بیٹی کا خیال نہیں رکھا' لہٰذا میں اسے اپنے گھر لے جاؤں گا۔"

"وہی باتیں' جو ہمیشہ وہ مجھ سے کرتے تھے۔ کرتے رہے' امیدیں' خواب' وسوسے' خدشے' تمہارے ماما پاپا تو انکار نہیں کریں گے۔"

"نہیں بھلا وہ کیوں انکار کریں گے۔ آپ اتنے اچھے تو ہیں' اور پھر برسوں سے سب آپ کو جانتے ہیں ملاقات نہ سہی' لیکن پہچان تو ہے نا۔"

"اور پھر میری بیٹی بھی تو سفارش کرے گی نا میری۔"

"بالکل بابا۔"

میں دوستوں کی طرح ان سے بے تکلف تھی۔ یہ اچھا ہو گیا تھا کہ حمزہ آ رہا تھا۔ میرے بی اے کے پیپر شروع ہونے والے تھے' اور میں سوچتی تھی کہ اتنے بہت سارے دن نہ آ سکی' تو بابا اداس ہوں گے۔ وہ بیمار بھی تو تھے نا...... اور اب حمزہ آ جائے گا' تو پریشانی نہیں ہو گی۔ میں بہت مطمئن ہو کر بابا کو یہ بتا کر کہ میں اب پیپرز کے بعد ہی آؤں گی' گھر آنے لگی تو بابا نے پوچھا۔

"اور حمزہ سے ملنے نہیں آؤ گی۔"

"آ جاؤں گی آپ کے حمزہ سے ملنے لیکن بابا۔" میں نے شرارت سے انہیں دیکھا۔

"فرض کریں مجھے آپ کے حمزہ پسند نہ آئے تو۔"

"تو......"

ایک لمحہ کے لئے بابا کا رنگ متغیر ہو گیا' مگر دوسرے ہی لمحے انہوں نے اپنا ایک بازو میرے گرد لپیٹتے ہوئے میرے سر پر پیار کیا۔

"کوئی بات نہیں...... ہمیں اپنی بیٹی کی پسند' اپنی خوشی سے زیادہ عزیز ہے۔ تمہیں حمزہ پسند نہ آئے تو تم بلا جھجک اسے ریجکٹ کر سکتی ہو۔"

"بابا......"

اس محبت' اس شفقت پر میرے اندر جل تھل ہونے لگی' مجھے لگا جیسے میرا وجود پانی بن کر بہہ جائے گا۔ میں نے یکدم بابا کا ہاتھ تھام لیا۔

"بابا...... یہ تو حمزہ ہے آپ کا بیٹا۔ آپ کے وجود کا حصہ میں...... اگر آپ میرے لئے اپنے کسی ادنٰی ملازم کو بھی پسند کرتے' تو میں اسے ناپسند نہیں کر سکتی تھی۔ آپ نہیں جانتے بابا آپ نے میرے لئے کیا کیا ہے۔ میرے اندر کی محرومیاں' میرے خلا آپ کی شفقتوں نے پُر کیے۔ آپ نہ ہوتے نانو مجھے اپنے ساتھ لے کر نہ جاتیں' تو شاید میں...... ایسی نہ ہوتی' جیسی اب ہوں۔ بابا آپ کو پتا ہے نا میں کیسی تھی۔ ڈرپوک' سہمی سہمی خوفزدہ سی۔"

"میری آنکھوں کے سامنے اپنا آپ آ گیا' دروازوں کے پیچھے چھپ چھپ کر ماما اور پاپا

کو زیب کے لاڈ اٹھاتے دیکھتی ہوئی' ڈرتی سہمی اور اپنے ہی اندر سمٹی ہوئی نور العین اب اپنے کالج کی بہترین سٹوڈنٹ تھی' ہر جگہ آگے تھی' تو صرف بابا کی وجہ سے۔

میری آنکھیں برس پڑیں۔

"آپ نہیں جانتے بابا' آپ کو نہیں پتا' آپ میرے لئے کیا ہیں۔ میں آپ کی خوشیوں کے لئے اپنی زندگی قربان کر سکتی ہوں۔"

"تم سچ مچ میری بیٹی ہو' میری اپنی نور العین' اور تم دیکھنا حمزہ بہت اچھا ہے' بہت پڑھا لکھا' بہت فراخ دل۔" بابا نے میرے ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگائے تو ان کی آنکھیں بھی بھیگ رہی تھیں۔

اس رات جب میں سونے کے لئے لیٹی' تو میں نے حمزہ کے متعلق سوچنا چاہا' لیکن میرے تصور میں اس کی کوئی شبیہ نہ بن پائی' حالانکہ میں نے اس کی ڈھیروں ہی تصویریں دیکھ رکھی تھیں۔

اگلے دو دن میں پڑھائی میں بہت مصروف رہی' چند دن بعد پیپرز ہونے والے تھے۔ ڈیٹ شیٹ آ چکی تھی' میں نے کچھ نامکمل نوٹس مکمل کیے۔ ٹائم ٹیبل ترتیب دیا۔ کالج سے جا کر ڈیٹ شیٹ اور رول نمبر لیا' اور مجھے خیال آیا کہ حمزہ تو آ چکا ہو گا' اور بابا کہیں گے کہ میں حمزہ سے ملنے بھی نہیں آئی۔ اور بابا تو بہت ہی خوش ہوں گے' اور مجھے انہیں مبارکباد تو دینی چاہئے جا کر' وہ کیسے میری چھوٹی چھوٹی خوشیوں کا خیال رکھتے ہیں' اور مجھے گفٹ دینا' اور مبارکباد دینا کبھی نہیں بھولتے' میں گیمز میں فرسٹ آؤں' کوئی تقریری مقابلہ ہو' ٹیسٹ ہوں اور میں...... سو کالج سے رول نمبر لے کر حسب معمول میں نے تین نمبر ویگن لی' جو بالکل گھر کے سامنے والے سٹاپ پر رکی تھی' اور ملک ہاؤس پہنچ گئی۔ بابا واقعی بہت خوش تھے' خوشی ان کی آنکھوں' ان کے چہرے' ان کے پورے وجود سے چھلک رہی تھی۔

"مبارک ہو بابا بہت بہت۔"

میں نے راستے سے خریدے ہوئے پھول ٹیبل پر رکھے۔

"میں نے سوچا ذرا دیر کو آپ کے حمزہ صاحب سے مل ہی آئیں' ورنہ میرے پاس بالکل بھی وقت نہیں ہے' بہت سارا پڑھنا ہے' پتا ہے صرف چھ دن بعد پہلا پیپر ہے' لیکن میں صرف آپ کی خاطر آپ کی خوشی میں شریک ہونے کے لئے آئی ہوں۔ کہاں ہیں آپ کے حمزہ صاحب' بلوایئے تاکہ میں ان سے ملاقات کا شرف حاصل کر سکوں۔"

"تم بہت تیز ہوگئی ہو بیٹی' مجھے ڈر ہے کہیں بے چارہ حمزہ۔"

"خیر وہ اتنے بے چارے بھی نہیں ہوں گے' امریکہ سے آئے ہیں' ویسے اگر آپ کو ڈر ہے تو آپ اپنا فیصلہ بدل سکتے ہیں۔" میں نے شرارت سے بابا کی طرف دیکھا۔

"خبردار جو فضول بات کی۔"

بابا نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے تنبیہ کی' اور بتایا کہ حمزہ سو رہا ہے۔

دراصل ہم باپ بیٹا جب سے وہ آیا ہے' مسلسل باتیں کر رہے ہیں۔ کل رات سے بالکل نہیں سوئے میں نے اسے تمہارے متعلق بتا دیا ہے' سب کچھ۔"

"اور آپ کے صاحبزادے نے فرمایا کہ۔"

"نو ڈیڈ ہم ادھر پاکستان میں شادی نہیں بنا سکتا' پاکستانی لڑکی ادھر ہمارے ساتھ نہیں چلے گا۔" میں نے لہجہ بگاڑ کر کہا تو بابا بے اختیار ہنس دیئے۔ "اسے شوخ و چنچل لڑکیاں پسند ہیں تمہاری جیسی۔"

بابا کی آنکھوں میں میرے لئے بے تحاشا محبتیں اور شفقتیں تھیں' لمحہ بھر کو میرے اندر اداسی سی پھیل گئی۔

"اور اگر جو کبھی بابا مجھے میرے اپنے گھر میں دیکھ لیں' تو انہیں یقین نہ آئے گا کہ یہ میں ہوں' پتا نہیں اپنے گھر کے اندر میری ساری صلاحیتیں' سارا اعتماد کہاں چلا جاتا تھا' کوئی بات کرنا بھی چاہتی تو نہ کر پاتی۔

"او کے بابا اب میں چلوں' آپ کے حمزہ صاحب تو سو رہے ہیں' اور مجھے پڑھنا ہے۔"

"ہاں ہاں جاؤ' اور خوب پڑھائی کرو۔"

میں ایک دو روز میں خود ہی حمزہ کو لے کر تمہارے گھر آؤں گا۔ شاید کل ہم گاؤں جائیں گے' آپا سے ملنے۔"

"کیسے لائیں گے بابا کان سے پکڑ کر۔"

میں ہنستی ہوئی بابا کو خدا حافظ کہہ کر چلی آئی۔ بابا کو اتنا خوش دیکھ کر میں خود بھی خوش ہوگئی تھی' سو بہت خوشگوار موڈ کے ساتھ گھر میں داخل ہوئی تھی۔ ماما کچن میں تھیں' اور زیب ٹی وی لاؤنج میں بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی' حالانکہ اب وہ فارغ تھی' لیکن پھر بھی اسے خیال نہیں آتا تھا کہ ماما سارا دن مصروف رہتی ہیں' کبھی ان کا ہاتھ بھی بٹا دیا کرے۔ میں نے کچن میں جھانکا' سارے چولہے جل رہے تھے۔

"کیا کوئی آ رہا ہے۔"

"ہاں تمہارے پاپا کے کچھ دوست وغیرہ ہیں۔"

دراصل پاپا نے فیک ہینڈ لے لیا تھا' اور اب ایک دوست کے ساتھ مل کر اپنا کاروبار شروع کیا تھا' جس کی وجہ سے ان کا حلقہ احباب بڑھ گیا تھا' اچھا منافع بخش کاروبار تھا' اور اب ماما کو کام کرنے کی ضرورت نہ رہی تھی۔ کبھی کبھار اپنے کاروباری دوستوں کو پاپا گھر پر ہی لنچ یا ڈنر پر بلا لیتے تھے اور میں ماما کے ساتھ کوکنگ میں مدد کر دیتی تھی' لیکن آج...... میرے پیپرز ہونے والے تھے' اور میں نے ٹی وی لاؤنج میں آ کر زیب سے کہا۔

"زیب ماما کی ہیلپ کر دو' وہ اکیلی لگی ہوئی ہیں۔"

"تم خود کیوں نہیں کر لیتیں۔"

اس نے میری طرف مڑ کر دیکھے بغیر اونچی آواز میں کہا۔ میں اسے بتانا چاہتی تھی کہ مجھے اپنے پیپر کی تیاری کرنا ہے' لیکن ہمیشہ کی طرح کچھ نہ کہہ سکی اور پلٹ کر کچن میں آ گئی۔ میں نے دیکھا ماما کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی تھی' اور چہرے پر اداس سا تاثر۔

"کیا محبتوں اور شفقتوں کا صلہ یوں ہی دیا جاتا ہے زیب ہمدانی۔"

میں نے دل ہی دل میں سوچا۔

"ماما نے تو تمہیں مجھ پر بھی فوقیت دی ہمیشہ' لیکن تم۔"

"لایئے ماما چکن میں بنا لیتی ہوں' آپ بریانی کا کر لیں۔" میں دیکھ رہی تھی کہ ماما بریانی کے لئے گوشت کو دہی لگا رہی تھیں۔

"تم جا کر پڑھ لو میں کر لوں گی۔ ویسے بھی ابھی ٹائم ہے آرام سے ہو جائے گا۔ ڈنر پر آنا ہے۔"

لیکن میں خاموشی سے کام کرتی رہی۔ میں نے سوچا تھا رات کو پڑھ لوں گی' ماما کبھی کبھی کام کرتے کرتے ایک معذرت کرتی نظر مجھ پر ڈال دیتی تھیں۔ میرا جی چاہا میں ماما کو بتا دوں کہ ملک مختار صاحب کیا سوچ رہے ہیں' اور یہ کہ وہ ایک دو روز میں میرے گھر آئیں گے' لیکن میں کچھ بھی نہ کہہ سکی' اور کام ختم کر کے ماما کی ممنونیت بھری نظر کا انعام لے کر اپنے کمرے میں آ گئی۔

میں نے خود کو پڑھائی میں گم کر دیا تھا' ایک آدھ بار میں نے بابا اور حمزہ کے متعلق پوچھا تھا کہ پتا نہیں وہ گاؤں سے آ گئے ہیں یا نہیں۔ دو تین دن تو ہو گئے تھے مجھے بابا کے گھر سے

آئے۔

اس روز میں اپنے لئے چائے بنانے آئی' تو میں نے سوچا' تب ہی ماما ڈرائنگ روم سے باہر آئیں۔ ان کی آنکھوں میں ستارے سے کوندر ہے تھے' انہوں نے ایک بھرپور نظر مجھ پر ڈالی تھی۔

''وہ ملک مختار صاحب آئے ہیں تمہارے بابا۔'' ان کے ہونٹوں کے کونوں پر ہلکی سی مسکراہٹ چمک کر بجھ گئی۔

''ان کے ساتھ ان کا بیٹا بھی ہے امریکہ سے آیا ہے۔''

''کیسا ہے وہ......؟''

میں نے اشتیاق سے پوچھا۔

''اچھا ہے' کیا تم نے پہلے کبھی نہیں دیکھا اسے۔''

''نہیں وہ ابھی تو آیا ہے امریکہ سے۔''

''وہ تمہارا بہت پوچھ رہے ہیں۔ میں نے بتایا پڑھ رہی ہے' لیکن اب اٹھ گئی ہو تم ہی چائے لے آؤ۔ تمہارے پاپا بھی گھر پر نہیں ہیں' میں ان کے پاس بیٹھتی ہوں تم کباب بھی فریج سے نکال لینا۔ پاپڑ بھی تل لینا۔''

''اچھا۔''

بابا پہلی بار ہمارے گھر آئے تھے۔ خوشی میرے اندر لہرا رہی تھی۔ میں نے ماما کی ہدایت کے مطابق کباب بھی گرم کر لئے تھے اور بھی جو کچھ ہو سکا تھا کر لیا' اور جب ٹرالی سجا کر میں اپنی طرف نگاہ ڈالی تو میرے کپڑے ملگجے اور شکن آلود سے تھے' بال بکھرے ہوئے تھے۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے بال پیچھے کر کے پونی میں کسے' دو دنوں سے میں کمرے میں گھسی پڑھ رہی تھی۔ بابا کو بھی تو پتا ہے کہ میں پڑھائی میں مصروف ہوں' اور وہ ان کے حمزہ صاحب کیا کہیں گے بھلا' کہنا کیا ہے میں تو بابا کی پسند ہوں' کالج میں آ کر میں خاصی خود آگاہ بھی ہو گئی تھی' اور مجھے پتا تھا کہ اس ملگجے سے لباس میں بھی میں اچھی ہی لگ رہی ہوں گی۔ میری فرینڈز کہتی تھیں میری آنکھیں بہت خوبصورت ہیں۔ میرا رنگ بہت فیئر ہے' اور یہ کہ مجھ میں بہت اٹریکشن ہے' لیکن ہوا یوں کہ جب میں چائے لے کر گئی تو حمزہ نے ایک سرسری سی نظر مجھ پر ڈالی اور زیب سے باتیں کرنے لگا۔ مجھے دیکھتے ہی بابا کے چہرے پر رنگ اتر آئے۔

''کیسی ہے میری بیٹی! بھئی میں بہت اداس ہو جاتا ہوں تمہارے بغیر کب ختم ہوں گے

تمہارے پیپر۔''

''ابھی تو شروع بھی نہیں ہوئے۔ دو دن بعد پہلا پیپر ہے۔'' میں نے کن انکھیوں سے حمزہ کی طرف دیکھا۔

بابا سے بہت حد تک ملتا جلتا' وہ مجھے ذرا بھی اجنبی نہ لگا۔

''ارے حمزہ اس سے ملو یہ میری بیٹی ہے عینی۔'' حمزہ نے میری طرف دیکھا' یونہی سرسری سی نگاہ تھی۔ بے تاثر سی۔

''السلام علیکم۔''

میں نے آہستگی سے کہا' تو اس نے سر کی جنبش سے میرے سلام کا جواب دیا اور زیب نے اس سے کوئی بات پوچھ کر اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ زیب کی طرف مڑتے' اور اس کی بات کا جواب دیتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جو چمک لہرائی تھی' وہ میری نظروں سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔ میرا احساس کمتری عود آیا' میں اپنے اندر سمٹتی چلی گئی۔ زیب کی موجودگی میں تو میں یوں بھی کسی کو نہیں دکھتی تھی۔ بابا کے متوجہ کرنے پر حمزہ پھر میری طرف متوجہ ہوئے تھے' کچھ پوچھا بھی تھا' لیکن میرے ہونٹ سل گئے تھے' پھر میں اٹھ آئی۔

''پتا نہیں کیا ہو گیا تھا مجھے' میں نے اپنے کمرے میں آ کر سوچا۔ بابا کیا کہتے ہوں گے کہ میں' لیکن خیر پیپرز کے بعد بابا کو منا لوں گی' اور ان حمزہ صاحب کو بھی دیکھ لوں گی۔ بڑے آئے امریکہ پلٹ' پھر شاید پاپا آئے تھے' انہوں نے بابا اور حمزہ کو کھانے پر روک لیا تھا۔ ایک بار میں پانی پینے کے لئے اٹھی' تو میں نے دیکھا کہ زیب حمزہ کو شاید اپنا کمرہ دکھانے کے لئے لے جا رہی تھی۔ کھانے کے وقت ماما نے مجھے بلایا' لیکن میں نے معذرت کر لی' پتا نہیں کیوں بابا اور حمزہ کے سامنے جاتے ہوئے جھجک ہو رہی تھی۔ ماما نے بھی مجبور نہیں کیا۔ اس روز صبح ناشتہ کرتے ہوئے میں نے دیکھا ماما کے چہرے پر بڑا سکون اور طمانیت تھی' اور ان کی آنکھوں میں مسرت کے جگنو سے اترے ہوئے لگتے تھے۔

''شاید پاپا کو بہت زیادہ منافع ہوا ہے۔'' میں نے ناشتہ کرتے ہوئے سوچا۔

تب ہی ماما اتنی خوش ہیں۔ ناشتہ کرتے ہوئے کئی بار میں نے ماما کی نظریں اپنے چہرے پر محسوس کیں' اور کمرے میں آ کر غیر ارادی طور پر میں آئینے کے سامنے کھڑی ہو گئی' بھلا مجھ میں آج کیا خاص بات ہو گئی ہے' جو ماما مجھے اس طرح دیکھ رہی تھیں' لیکن میں تو بالکل ویسی ہی تھی' ہمیشہ جیسی پتا نہیں کیوں ماما مجھے اس طرح دیکھ رہی تھیں۔ تھوڑی دیر میرا ذہن الجھا رہا' پھر میں

اپنی پڑھائی میں مگن ہو گئی۔ اس روز عجیب بات ہوئی زیب بہت دیر تک آ کر میرے کمرے میں بیٹھی رہی۔ اس کے چہرے پر بڑا نرم نرم سا تاثر تھا' اور وہ مجھ سے میری پڑھائی کے متعلق پوچھتی رہی' خود اس نے فلسفے میں ماسٹر کیا تھا' اس نے مجھ سے میرا ارادہ پوچھا تھا۔

"پتا نہیں شاید میں انگلش لٹریچر میں ماسٹر کروں' یہ تو رزلٹ کے بعد ہی فیصلہ کروں گی۔"

میں از حد حیران سی اس کے سوالوں کے جواب دیتی رہی تھی۔

"کسی مدد کی ضرورت تو نہیں۔"

"نو ناٹ ایٹ آل۔"

یہ زیب کو یکا یک کیا ہو گیا تھا' وہ تو کبھی بھی اس طرح میرے پاس آ کر نہیں بیٹھی تھی۔ اپنے آپ میں مگن' ماما پاپا کی محبتوں سے لبریز' اسے شاید کبھی بھی میری ضرورت نہیں رہی تھی۔

"عینی یہ حمزہ کے بابا سے ملنے تو تم جاتی رہتی ہو اکثر۔" بات کرتے کرتے اچانک اس نے پوچھا۔

"ہاں بابا نے مجھے اپنی بیٹی بنا رکھا ہے' جب میں بچپن سے کھیلنے جاتی تھی تب سے۔"

"ان کا فون نمبر کیا ہے؟"

"فون نمبر تو مجھے معلوم نہیں تھا' کبھی ضرورت ہی نہیں پڑی تھی۔ میں تو خود ہی چلی جایا کرتی تھی ان سے ملنے' لیکن بھلا زیب کو اس کی کیا ضرورت تھی۔ میری سوالیہ نظریں ان کی طرف اٹھیں۔

"بھابی..... آئی مین ماما پوچھ رہی تھیں۔" اب وہ کبھی کبھی ماما کو بھابی بھی کہہ دیا کرتی تھی' خاص طور پر اس وقت جب اس کی فرینڈز آئی ہوتی تھیں۔

"اوہ شاید بابا نے حمزہ کے لئے ماما سے بات کی ہے' اور اب ماما نے انہیں جواب دینا ہو گا' لیکن ماما نے مجھ سے تو بات تک نہیں کی۔ شاید میرے امتحان کی وجہ سے' اور حمزہ بائے نیچر پتا نہیں کیسا ہے' بات تو ابھی تک ہوئی ہی نہیں' خیر امتحان کے بعد دیکھیں گے حضرت کو اور اب جیسا بھی ہو میرے لئے تو صرف یہ بات اہمیت رکھتی ہے کہ وہ بابا کا بیٹا ہے۔ ایک بار بابا نے مجھے ایک کتاب دی تھی انعام' اس میں ان کا وزیٹنگ کارڈ تھا۔ یقیناً ان کا نمبر اس پر ہو گا۔ مجھے اچانک یاد آیا تھا' اور پھر میں نے شلف سے کتاب نکالی' تو کارڈ موجود تھا۔ زیب نے لے لیا' اور کچھ دیر بیٹھی بابا اور حمزہ کے متعلق' ان کے گھر کے متعلق مختلف سوال کرتی رہی' اور پھر خود ہی اسے خیال آیا کہ میرا وقت ضائع ہو رہا ہے' تو وہ سوری کر کے اٹھ گئی۔ اس کے جانے کے بعد بھی میں

کتنی ہی دیر تک اس کی اس آمد اور اس بدلے ہوئے رویے کے متعلق سوچتی رہی۔

اگلے دس دن بہت مصروف تھے۔ مسلسل پیپرز ہو رہے تھے' اور میں چاہت کے باوجود بابا کی طرف نہیں جا سکی تھی' اس دوران بابا ایک بار پھر آئے تھے' اکیلے اور ذرا کی ذرا میرے کمرے میں بھی آئے تھے' میں آنکھیں بند کیے ورڈز ورتھ پر تنقیدی نوٹ رٹ رہی تھی' وہ مجھے کامیابی کی دعا دے کر چلے گئے تھے۔

آخری پیپر دے کر میں سیدھی ملک ہاؤس گئی تھی۔ بابا لان میں کرسی بچھائے اخبار چہرے پر ڈالے نیم دراز تھے۔

"بابا....."

میں نے اخبار ان کے چہرے سے ہٹا لیا' اور تھوڑا سا جھک کر قدرے اونچی آواز میں کہا' تو بابا نے آنکھیں کھول دیں۔

"تم اگر اتنا نہ چیختیں تو بھی میں نے تمہاری آہٹ پہچان لی تھی۔"

"آپ کیسے رہے بابا! خوب مزے ہو رہے ہوں گے حمزہ صاحب کے ساتھ' رات گئے تک گپ لگتی ہو گی اور پھر....."

"عینی تمہارے پیپر کیسے ہوئے بیٹا۔"

"اے ون۔" میں نے چٹکی بجائی۔

"اے گریڈ تو پکا ہے۔"

"انشاء اللہ۔"

"جی جناب اب بلائیے اپنے حمزہ صاحب کو' اور ذرا ٹھیک ٹھاک تعارف کروائیے۔"

بابا میرے چہرے پر نگاہیں جمائے خاموشی سے مجھے دیکھتے رہے۔

"حمزہ تو گھر پر نہیں ہے۔"

"کہاں گئے ہیں..... یہاں بھی دلچسپیاں ڈھونڈ نکالیں۔" میں شریر ہو رہی تھی۔ بابا کے ساتھ شرارت کر کے مجھے مزہ آتا تھا۔

"زیب کے ساتھ شاپنگ کرنے گیا ہے۔"

"زیب کے ساتھ۔"

ایک لمحہ کو میں حیران رہ گئی' لیکن دوسرے لمحہ میں نے سوچا شاید بابا نے ماما پاپا سے بات کر لی ہے' اور ماما نے شاید زیب کو بھیجا ہو کہ وہ حمزہ کے ساتھ جا کر اس کی پسند کی چیزیں لے لے۔

میرے رخساروں پر رنگ جھلک آیا۔ بابا مجھے بغور دیکھ رہے تھے۔

"تم اتنی پیاری ہو..... اتنی اچھی ہو پھر...... پھر پتا نہیں کیوں حمزہ نے تمہیں......"

وہ خاموش ہو گئے' لمحے کے ہزارویں حصے میں مجھے ادراک ہو گیا کہ حمزہ نے مجھے ناپسند کر دیا ہے' حالانکہ اس نے مجھے دیکھا ہی کیا تھا' بس ایک نظر ڈالی تھی۔ شاید وہ ایک نظر ہی فیصلہ کن تھی۔

"تو آپ اس لئے اداس ہیں بابا۔" میں ہنسی۔

حالانکہ اس میں اداسی کی تو کوئی بات نہیں' یہ تو پہلے سے طے تھا۔ حمزہ نے آپ کو بتا دیا تھا کہ اگر آپ کی پسند کی ہوئی لڑکی انہیں پسند نہ آئی' تو آپ انہیں شادی کے لئے مجبور نہیں کریں گے۔"

"ہاں لیکن مجھے یقین تھا کہ وہ تمہیں......"

میرے دل میں حمزہ کے لئے کوئی ایسا جذبہ موجود نہ تھا۔ میں نے تو صرف بابا کی خاطر اسے سوچا تھا' سو مجھے کوئی خاص دکھ نہیں ہوا۔

"ٹھیک ہے بابا' ہم ان کے لئے کوئی اور لڑکی دیکھتے ہیں' میری فرینڈز میں کتنی ہیں' ایسی جو اتنی خوبصورت ہیں کہ حمزہ صاحب تو بس انہیں دیکھتے ہی رہ جائیں۔ پیپرز تو ختم ہوئے۔ کل سے ہم اپنی مہم شروع کرتے ہیں' جانے مت دیجئے گا۔ بس اب آئے ہوئے ہیں تو قابو کر لیں نہیں تو ارسلان بھائی کی طرح ہاتھ سے نکل جائیں گے۔" بابا اداس سے مجھے دیکھتے رہے' ان کی آنکھیں گیلی ہو رہی تھیں۔

"یہ اداسی ختم..... میں تو ہمیشہ سے آپ کی بیٹی ہوں' اور ہمیشہ آپ کی بیٹی رہوں گی...... اور سنیں میں کل آؤں گی تو ذرا تفصیلی ملاقات کروں گی' آپ کے حمزہ صاحب سے سال بھر سے ان کی باتیں سنتے سنتے کان پک گئے ہیں' ذرا پتا تو چلے کہ کتنے پانی میں ہیں صاحب بہادر۔"

میں نے بابا کو ہنسانے' انہیں خوش کرنے کی ہر ممکن کوشش کی' لیکن بابا کی اداسی ختم نہیں ہوئی تھی۔ وہ جب بھی نظر اٹھا کر مجھے دیکھتے ان کی آنکھیں مجھے گیلی گیلی لگتیں۔

اور انہیں اداس نہ ہونے کی تلقین کر کے' اور دوسرے دن آنے کا وعدہ کر کے میں گھر چلی آئی۔ خلاف توقع پاپا گھر پر تھے' اور ماما کی طبیعت کچھ خراب سی تھی۔

"کیا ہوا......؟" میں گھبرا گئی۔

"کچھ نہیں بس معمولی سا بی پی لو ہو گیا تھا۔" ماما کی نظریں میرے چہرے پر ٹک سی گئیں۔

"تو ڈاکٹر......"

"ہاں ڈاکٹر نے چیک کیا ہے۔"

پاپا بے حد سنجیدہ لگ رہے تھے' میں وہاں ہی بیٹھ گئی۔ ماما کا چہرہ بہت زرد لگ رہا تھا' شاید ابھی تک ان کی طبیعت بحال نہیں ہوئی تھی۔

"صرف بی پی کا ہی پرابلم ہے نا۔" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔"

ماما نے آنکھیں بند کر لیں' پتا نہیں کیوں مجھے لگا جیسے ماما کی آنکھیں گیلی گیلی سی تھیں' بالکل بابا کی آنکھوں کی طرح' میں اور پاپا کچھ دیر وہاں ہی بیٹھے رہے' پھر بابا اٹھ کھڑے ہوئے۔

"باہر آ جاؤ بیٹا ماما کو آرام کرنے دو۔" میں خاموشی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"بیٹا...... وہ۔"

پاپا شاید کچھ کہنا چاہتے تھے۔

"جی پاپا۔"

میں اپنے کمرے کی طرف جاتے جاتے پلٹ آئی۔

"وہ تمہارے پیپرز کیسے ہوئے؟"

زندگی میں پہلی بار شاید پاپا نے میرے پیپرز کا پوچھا تھا۔ اٹھارہ انیس سال کی اس زندگی میں پاپا نے مجھ سے کتنی باتیں کی ہوں گی' میں اگر سارے جملے جو پاپا نے مجھ سے اب تک کہے تھے' اور میری یادداشت میں تھے اکٹھے کر کے دیکھتی تو شاید دو صفحوں سے زیادہ نہ ہوتے۔"

"اچھے ہو گئے ہیں۔"

میرا اندر گرجنے لگا' اور برسات امڈ آئی تھی۔ میں ہونٹ بھینچے کھڑی تھی۔

"وہ بیٹا ملک صاحب آئے تھے نا۔ بہت اچھے آدمی ہیں۔"

"جی پاپا۔"

"اچھا ٹھیک ہے تم جاؤ' آرام کرو۔"

اور کمرے میں آ کر کتنی ہی دیر تک میں سوچتی رہی کہ پاپا مجھ سے کیا کہنا چاہتے تھے' یقیناً کوئی بات تھی وہ جو کہنا چاہتے تھے اور نہیں کہہ پا رہے تھے' اور پھر جلد ہی مجھے پتا چل گیا کہ وہ کیا بات تھی' بابا نے پہلے روز ہی جب وہ حمزہ کے ساتھ آئے تھے' تو ماما سے میرے لئے بات کر لی تھی' اور ان سے کہا تھا' کہ وہ میری خاطر آئے ہیں' اور اب مسئلہ یہ تھا کہ زیب حمزہ میں دلچسپی لے

رہی تھی' اور اس کا کہنا تھا کہ حمزہ بھی اسے پسند کرتا ہے۔ لہٰذا ملک صاحب سے کہا جائے کہ وہ عینی کے بجائے پہلے زیب کا رشتہ کرنا چاہتے ہیں' کیونکہ حمزہ بابا کا دل نہیں دُکھانا چاہتا' لیکن حمزہ شاید بابا کا دل دُکھا چکا تھا' تب ہی تو وہ بے حد افسردہ اور اداس لگ رہے تھے۔

''تو یہ بات تھی' تب ہی تو اس روز حمزہ زیب کے ساتھ شاپنگ کے لئے گیا ہوا تھا' اور زیب نے فون نمبر بھی تو لیا تھا' دل کے اندر اداسی کہرے کی طرح اترنے لگی' تو میں گھبرا کر بابا سے ملنے کے لئے اپنے کمرے سے باہر آئی' ماما تھکی تھکی سی ٹی وی لاؤنج میں بیٹھی جانے کیا سوچ رہی تھیں۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں بابا کی طرف جا رہی ہوں۔ ان کی نظریں اٹھیں' وہی التجا کرتی' مان مانگتی نظریں اور یہ نظریں ملک ہاؤس تک میرا تعاقب کرتی رہیں۔ مجھ سے التجا کرتی رہیں۔ بابا اپنے بیڈ روم میں تھے' شاید ان کی طبیعت ٹھیک نہ تھی۔

''کیا ہوا بابا......؟''

''کچھ نہیں یونہی آرام کرنے کو جی چاہا تھا۔''

وہ اٹھ کر بیٹھ گئے' اور بہت دیر تک یونہی مجھے دیکھتے رہے۔

''تم اتنے دن آئی کیوں نہیں؟''

''یوں ہی تھکن اتار رہی تھی امتحان کی۔''

''ہاں زیب بھی کہہ رہی تھی کہ تم تھکن اتار رہی ہو۔''

''زیب......''

''میں ذرا سا چونکی' لیکن پھر سنبھل گئی۔''

''ہاں وہ آتی رہتی ہے حمزہ کے پاس۔'' انہوں نے نگاہیں چرا لیں۔

''بابا......''

میرے اندر وہ لڑکی بیدار ہوگئی' جو ماما کی ملتجی نظروں سے ہار کر اپنی پسندیدہ چیز سے زیب کے حق میں دستبردار ہو جایا کرتی تھی۔

''بابا آپ حمزہ کی شادی زیب سے کیوں نہیں کر دیتے۔ میرا خیال ہے حمزہ کی بھی یہی خواہش ہے۔''

بابا خاموش بیٹھے رہے۔ وہ بہت کمزور اور اداس لگ رہے تھے۔

''حمزہ بہت بیوقوف ہے' اور وہ تمہاری پھوپھو۔''

''ارے بابا والدین اپنے بچوں کو ساری عمر بیوقوف ہی سمجھتے رہتے ہیں' حالانکہ ایسا ہوتا

نہیں ہے۔ اب حمزہ کے پاس اتنی بڑی بڑی ڈگریاں ہیں' تو وہ بیوقوف کہاں سے ہوگیا۔''

''ڈگریاں عقل نہیں سکھاتیں عینی بیٹی! عقل تو زمانہ سکھاتا ہے' تجربات سکھاتے ہیں۔''

''بابا ایک بات بتائیں گے آپ سچ سچ۔'' میں ان کے قریب ہی بیٹھ گئی۔

''کیا حمزہ نے آپ سے کہا ہے کہ وہ زیب سے شادی کرنا چاہتا ہے۔''

''ہاں۔''

بابا نے نگاہیں جھکا لیں۔

''تو پھر آپ کیا سوچ رہے ہیں' چٹ منگنی پٹ بیاہ کریں۔''

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیسے تمہارے والدین سے بات کروں' جبکہ میں تمہارے لئے بات کر چکا ہوں' میں نے حمزہ کو پھر سوچنے کے لئے کہا ہے۔''

''اس کی آپ فکر نہ کریں' میں خود ماما سے کہہ دوں گی کہ وہ زیب کا رشتہ کر دیں حمزہ سے یوں بھی وہ بڑی ہے مجھ سے' اور اب اٹھیں ...... باہر لان میں چلتے ہیں۔ بہت دنوں سے ہم نے لڈو بھی نہیں کھیلی اور......''

''عینی بیٹا تم۔''

بابا کہتے کہتے خاموش ہو گئے۔ اس روز میں کافی دیر وہاں رہی۔ بابا سے گپ لگاتی' اور لطیفے سنا سنا کر ہنساتی رہی۔

''کیا تمہیں دکھ نہیں ہوگا بیٹا ...... ہم اتنے دنوں سے حمزہ کے متعلق باتیں کر رہے تھے' اس کا انتظار کر رہے تھے۔'' جب میں جانے لگی تو بابا نے اچانک پوچھ لیا۔

''میں تو آپ کی خوشی میں خوش ہوں بابا' اور حمزہ کی خوشی آپ کی خوشی ہونی چاہئے' بلکہ ہے۔''

بابا کو تسلی دے کر بلکہ انہیں اکسا کر کہ وہ فوراً پاپا کے پاس آئیں زیب کے لئے۔ میں گھر آئی تو زیب منہ بسورے بیٹھی تھی' اور پاپا نہ جانے کیوں الجھ رہے تھے۔

''آخر اس میں حرج ہی کیا ہے تاجی! اگر یوں ہو جائے تو یوں بھی زیب بڑی ہے۔ ہمیں پہلے اس کے متعلق سوچنا چاہئے۔''

ماما خاموش بیٹھی تھیں۔

''ہاں اس میں حرج ہی کیا ہے؟''

کچھ دیر بعد انہوں نے سر اٹھا کر پاپا کی طرف دیکھا' تو ان کی نظر مجھ پر پڑی۔ عجیب سا

کرب تھا ان کی آنکھوں میں' جس نے پورے وجود کو لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ میرے اندر گرج چمک کے ساتھ برسات ہونے لگی' اور شاید زندگی میں پہلی بار اپنے گھر میں میں نے بڑی شوخی سے چہکتے ہوئے ماما کو مخاطب کیا۔

"ارے ماما' بابا آئیں گے کل یا پرسوں حمزہ بھائی کا رشتہ لے کر زیب کے لئے۔ کتنا مزہ آئے گا' ہیں نا۔" میں نے ان کی آنکھوں میں جھانکا۔

وہ مسکرائیں ..... مبہم سی مسکراہٹ سے پاپا کے چہرے کا تناؤ کم ہو گیا۔ زیب کھل اٹھی' اور ماما کی ممنون نظریں میرے وجود سے لپٹ گئیں' تو میں اپنے کمرے میں چلی آئی۔ بظاہر یہ کوئی مشکل بات نہ تھی۔ میرے دل میں حمزہ کے لئے کوئی ایسا جذبہ پیدا نہیں ہوا تھا' میں تو صرف بابا کی شفقتوں اور محبتوں کی طالب تھی' لیکن پھر بھی بابا جی کہتے تھے۔ تقریباً سال بھر ہمارے درمیان حمزہ موضوع گفتگو رہا تھا' بابا کے ساتھ میں نے بھی حمزہ کا انتظار کیا تھا' اور ایک تصور سا تھا کہ حمزہ آئے گا' اور..... لیکن وہی ہوا تھا' جو ہمیشہ سے میرے ساتھ ہوتا آیا تھا۔ زیب نے حمزہ کو چھین لیا تھا۔ میرے دل کی عجیب سی کیفیت ہو رہی تھی۔ کبھی آنسو امڈ امڈ آتے' اور کبھی سکوت سا طاری ہو جاتا' اور کبھی یوں لگتا جیسے دل بند ہو جائے گا' اور جی چاہتا کاش یہ دل بند ہو جائے' اور کہیں تپتی ریت پہ سویا رہوں۔

ہمیشہ کے لئے' کبھی نہ اٹھنے کے لئے۔

پتا نہیں کتنے دن گزر گئے میں بابا کی طرف بھی نہ گئی۔ زیب کی منگنی اور منگنی کے ساتھ ہی نکاح بھی ہو گیا۔ رخصتی کچھ روز بعد طے پائی تھی۔ نکاح والے دن میں نے بابا کو دیکھا تھا' وہ کچھ تھکے تھکے اور کمزور لگ رہے تھے۔ ماما بے حد مصروف تھیں۔

زیب کے لئے کپڑوں کی خریداری' دوسری شاپنگ' کام کے لئے کپڑے دینا' کبھی ٹیلرز کے پاس' کبھی کہیں' کبھی پاپا ان کے ساتھ ہوتے' کبھی وہ زیب کو ساتھ لے لیتیں' تاکہ اس کی پسند کی شاپنگ کر سکیں۔ انہوں نے مجھے کبھی ساتھ چلنے کو نہیں کہا تھا۔ میں نے خود ہی کچن سنبھال لیا تھا' زبان سے ہمیشہ کی طرح اب بھی کچھ نہیں کہا تھا۔

ہاں آتے جاتے ان کی نظریں میری نظروں سے الجھتیں' کبھی معذرت کرتیں۔

کبھی فخر اور مان کے جذبوں سے لبریز۔ کبھی ممنونیت کا احساس لئے۔

کبھی انجانے درد میں لپٹی۔

اور مجھے ان نظروں سے گھبراہٹ ہوتی۔ میرا دل میرے سینے کے اندر الجھنے لگتا' ضد کرنے

لگتا۔

جھگڑنے لگتا' میرا جی چاہتا کہ ماما کو جھنجھوڑوں' ان سے کہوں کچھ کہیں' کچھ بولیں' مگر ماما چلی جاتیں' اور میں ان کے نقش پا دیکھتی رہ جاتی۔

اس روز میرا دل بہت گھبرا رہا تھا' اندر گھٹن ہو رہی تھی' جی چاہتا تھا کسی مہربان سینے سے لگ کر خوب سارا رو لوں' اور ہلکی پھلکی ہو جاؤں' تب مجھے بابا کا خیال آ گیا' اور میں مہراں کو بتا کر کہ میں کہیں جا رہی ہوں ماما شاپنگ کر کے آئیں تو انہیں بتا دے۔ مہراں کو چند روز قبل ہی پاپا نے ماما کے منع کرنے کے باوجود رکھا تھا' تاکہ ماما کا بوجھ کم ہو سکے۔ انہیں زیب کی شادی کی تیاری بھی کرنا تھی۔ اس روز میں بڑے اہتمام سے تیار ہوئی تاکہ بابا یہ نہ سمجھیں کہ میں ناخوش ہوں۔

بابا مجھے پہلے سے بھی کمزور لگے۔

"ارے بابا کیا آپ بیمار تھے؟"

"شاید بیمار ہی ہوں۔"

"کیا ہوا تھا.....؟"

"کیا زیب نے نہیں بتایا پچھلے دنوں ہلکا سا اٹیک ہو گیا تھا۔"

"نہیں تو..... لیکن بابا یہ بڑی غلط بات ہے۔ اب تو آپ کو ایک دم سے ٹھیک ہو جانا چاہئے تھا' اب تو حمزہ بھی آ گیا ہے' اور آپ کی خواہش کے مطابق اس نے پاکستان میں ہی شادی کر لی ہے۔"

"میری خواہش....."

بابا نے اتنی آہستگی سے کہا' جیسے اپنے آپ سے سرگوشی کی ہو' اور پھر بہت دیر تک یونہی میرے چہرے کی طرف دیکھتے رہے۔

"یہ کیا اس طرح کیوں دیکھ رہے ہیں مجھے۔"

"تم ناراض ہو مجھ سے۔"

ان کی آواز آہستہ تھی' بہت مدھم۔

"جی نہیں' میں کبھی بھی اپنے بابا سے ناراض نہیں ہو سکتی۔"

"تم آئی نہیں نا تو میں نے سمجھا کہ تم مجھ سے خفا ہو گئی ہو' اور اگر آج تم نہ آتیں نا' تو میں خود آ جاتا' میں نے حمزہ سے کہا تھا' وہ مجھے لے جائے تمہاری طرف۔"

"سوری بابا! وہ ماما بہت مصروف ہوتی ہیں۔ انہیں بازار جانا پڑتا ہے نا' تو پھر اس لئے میں کوکنگ وغیرہ کر لیتی تھی۔ ابھی بھی ماما فرنیچر دیکھنے گئی ہوئی تھیں۔"

"ان سب کی ضرورت نہیں تھی' میں نے منع بھی کیا تھا انور صاحب کو' یہ سب نہ کریں۔"

"ان کے اپنے دل کی بھی تو کوئی خوشی ہے نا' اور پھر زیب...... وہ سمجھے گی کہ ماما نے جان بوجھ کر......"

"اچھا......"

"اور یہ بستر چھوڑ دیں' اب اس گھر میں پہلی شادی ہونے والی ہے' کوئی ہنگامہ کریں' کوئی رونق میلہ لگائیں' اور یہ بیماری جو ہے نا اسے تو آج کریں رخصت جناب دولہا کے والد محترم ہیں۔ آپ کو تو بارات کے آگے بھنگڑا ڈالتے ہوئے آنا چاہئے تھا' اور وہ ارسلان بھائی وہ کب آ رہے ہیں؟"

"میں نے اسے فون تو کر دیا تھا' وہ میری اور دانی دو ہفتے پہلے آ جائیں گے' گاؤں سے آپا کو بھی میں نے بلوایا ہے' کرلیں گی تیاری وہی سب...... مجھے تو...... تم خوش ہو نا عینی؟"

ان کی نظریں پھر میرے چہرے پر کچھ کھوجنے لگیں۔

"ہمارے بابا کے بیٹے کی شادی ہے تو بھلا میں خوش کیوں نہیں ہوں گی' بلکہ میں ماسی شہر بانو سے کہتی ہوں وہ ڈھولکی منگوائیں' اور پینو کو بھی بلا لیں' سسرال سے ہم کل سے یہاں ڈھولکی بجائیں گے۔"

"بیٹی مجھے معاف کر دینا۔ میں حمزہ کو اگر مجبور کرتا تو شاید...... لیکن بیٹا جبر اور زبردستی سے ہونے والے رشتے پائیدار نہیں ہوتے۔"

"Leav It بابا...... اس بات کو بھول بھی جائیں کیا آپ خوش نہیں۔"

"ہاں میں خوش نہیں ہوں' شاید میں نے ایسا نہیں چاہا تھا' پتا نہیں حمزہ کو کیوں تم نے اٹریکٹ نہیں کیا۔"

"بابا آپ کو میری قسم آئندہ اس موضوع پر کوئی بات نہیں ہوگی' اور اگر آپ نے ایسی کوئی بات کی تو میں آپ سے ناراض ہو جاؤں گی' اور کبھی نہیں آؤں گی آپ سے ملنے۔"

"جان بابا!"

بابا نے تڑپ کر مجھے دیکھا۔

"ایسا مت کرنا...... ایسا کبھی مت کرنا۔ نہیں تو میرا دم گھٹ جائے گا۔ وعدہ کرو زیب کے

آنے کے بعد بھی تم یونہی آتی رہو گی میرے پاس' اپنے بابا کے پاس۔"

"وعدہ۔"

میں نے ہاتھ آگے بڑھایا۔

"لیکن آپ کو بھی وعدہ کرنا پڑے گا' کہ آج کے بعد آپ اداس نہیں ہوں گے' بالکل بھی ذرا بھی۔"

"وعدہ۔"

بابا مسکرائے' لیکن ان کی آنکھوں سے دو آنسو نکل پڑے۔

"بری بات۔"

میں نے ہاتھ بڑھا کر ان کے آنسو پونچھ دیئے۔

"چیئر اپ۔"

اٹھیں اور چل کر "مسٹر بین" دیکھتے ہیں۔

"مسٹر بین' میرے اور بابا کے پسندیدہ مووی تھی۔ ہم اکثر اسے لگا کر دیکھتے' اور پھر مسٹر بین کی حرکتوں پر خوب ہنستے۔

اور مسٹر بین دیکھتے ہوئے میں اور بابا خوب ہنسے...... پتا نہیں بابا مجھے بہلا رہے تھے' یا سچ مچ ہی انہیں ہنسی آ رہی تھی۔ خود میں تو بابا کی خاطر ہنس رہی تھی' ورنہ میرے دل پر ایک انجانا سا بوجھ تھا۔ مجھے حمزہ سے شادی نہ ہونے کا دکھ نہیں تھا' لیکن شاید مجھے اس بات کا رنج ضرور تھا کہ اب کی بار پھر زیب کے سامنے میری ذات بے وقعت ہو گئی تھی' حتیٰ کہ بابا اور ماما بھی چاہ رہے تھے کہ زیب اور حمزہ کی شادی ہو جائے' یہ دکھ نیا نہیں تھا۔ میں نے بچپن سے اس دکھ کا ذائقہ چکھ رکھا تھا' پھر بھی جو درد دل میں اٹھ رہا تھا' وہ نیا نیا لگتا تھا۔

"ارے بابا آپ یہ اکیلے اکیلے ہنس رہے ہیں۔" حمزہ گاؤن کی ڈوریاں کستے ہوئے اپنے کمرے سے نکلا' اور پھر اچانک ہی اس کی نظر مجھ پر پڑی۔

"اکیلے کہاں......؟" بابا نے خوش دلی سے جواب دیا۔

"یہ میری بیٹی ہے میرے پاس...... اور جب یہ آتی ہے نا تو اپنے ساتھ ہنسی اور خوشی کے پھول بھی لے کر آتی ہے۔"

"اچھا......"

حمزہ نے دلچسپ نظروں سے مجھے دیکھا' اور بابا کے ساتھ والے صوفے پر آ کر بیٹھ گیا۔

"ویسے آپ کو پہلے اس کوچے میں نہیں دیکھا کہاں تھیں آپ۔"

"میں تو یہیں ہوتی ہوں' اسی کوچے میں اکثر' لیکن کچھ لوگوں کی بینائی کمزور ہوتی ہے...... کیوں بابا؟"

"بالکل حمزہ کی بینائی پر تو مجھے بھی شبہ ہے۔"

"بابا......"

حمزہ کچھ نادم سے ہو گئے۔

"ابھی کچھ دیر پہلے تو آپ بات کرنے سے بھی بیزار دکھتے تھے اور اب۔"

"یہ ہماری بیٹی کا کمال ہے۔"

"کیا آپ کوئی ساحرہ ہیں۔"

وہ اب پوری طرح میری طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

"نہیں میرا نام نور العین ہے۔"

"نور العین...... عینی۔"

"ہاں جی۔"

میں نے بغور اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں الجھن تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے اس نے پہلی بار مجھے دیکھا ہو۔

"حیرت ہے آپ ایک بار پہلے بھی مجھ سے مل چکے ہیں' پھر پہچانا کیوں نہیں...... بابا۔"

میں نے بابا کی طرف دیکھا۔

"آپ انہیں بادام کھلایا کریں' ان کی یادداشت کمزور لگتی ہے۔"

بابا اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ رہے تھے کہ میں نے اسے پھر مخاطب کیا۔

"سوری حمزہ بھائی میں اپنے امتحان کی مصروفیت کی وجہ سے آپ سے تفصیلی ملاقات نہ کر سکی' حالانکہ میں اور بابا تو سال بھر سے آپ کے منتظر تھے' بہرحال پہلے تو مبارکباد قبول کیجئے نکاح کی...... اور پھر جو گزر گیا' سو گزر گیا' لیکن اب آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ میں بابا کی بیٹی ہوں' اور شادی پر بابا کی بیٹی بن کر سب نیگ وصول کرلوں گی۔"

"بابا......" میں نے بابا کو مخاطب کیا۔

"انہیں بتا دیجئے گا کہ اب تو سستے چھوٹ گئے ہیں' پھر ایسا نہیں ہوگا۔"

"میرے خیال میں آپ نے جتنا بتا دیا ہے کافی ہے۔ میں اب خیال رکھوں گا کہ آپ کی

حق تلفی نہ ہو' ویسے یعنی بی بی بندہ حاضر ہے پچھلا حساب مع جرمانے کے چکانے کے لئے کہ بابا کی بیٹی کو ناراض کرنا میں افورڈ کر ہی نہیں سکتا۔"

اب وہ بڑے سکون سے بات کر رہا تھا۔

"ویسے کمال ہے' اس روز دیکھنے کے باوجود میں نے آپ کو پہچانا نہیں...... آپ اس روز سے بالکل مختلف لگ رہی ہیں۔"

"نظر نظر کی بات ہے' کبھی کوئی نظر معتبر کر دیتی ہے' اور کبھی کوئی نظر کمتر کر دیتی ہے' اور کبھی معتوب بنا دیتی ہے۔"

"ہائے واہ' آپ کی ایجوکیشن کیا ہے؟"

"بی اے کا ایگزام دیا ہے۔"

"اور باتیں تو آپ ایسے کر رہی ہیں جیسے ڈگریاں گھول کر پی چکی ہوں۔"

"یہ میری بیٹی بہت ساری خوبیوں کی مالک ہے حمزہ بہت گن ہیں اس میں' اور سب سے بڑھ کر اس کا دل بہت خوبصورت ہے۔ نرم' مہربان' اور محبتوں سے لبریز دل۔"

بابا نے پیار سے مجھے دیکھا۔ تب ہی فون کی بیل ہوئی۔ بابا نے ریسیو کیا' اور پھر حمزہ کی طرف دیکھا۔

"تمہارا فون ہے زیب کا ہے شاید......" حمزہ قدرے فاصلے پر جا کر زیب سے باتیں کرنے لگا' اور میں بابا کی طرف متوجہ ہو گئی۔ اس روز بابا کے کہنے پر حمزہ مجھے چھوڑنے گیا' اور راستے میں بھی دو تین بار اس نے حیرت کا اظہار کیا کہ میں اس روز کے مقابلے میں بہت مختلف لگ رہی ہوں' اور یہ کہ اس روز تو میں بہت خاموش طبع اور جھینپو لگ رہی تھی' جبکہ آج اس قدر شوخ و چنچل' شریر' اور پھر زیب نے بھی بتایا تھا کہ آپ بہت کم گو ہیں' اور بات نہیں کر سکتیں کسی اجنبی سے کانفیڈنس بالکل نہیں ہے۔"

"شاید صحیح ہی کہا ہو۔" میں نے آہستگی سے کہا۔

"خیر صحیح تو نہیں کہا' اگر کانفیڈنس نہ ہونے پر یہ حال ہے' تو میں حیران ہوں کہ اگر آپ میں کانفیڈنس ہوتا' تو پھر کیا حال ہوتا' مجھے تو آپ بھگا ہی دیتیں۔"

میں نے اس کی بات پر تبصرہ نہیں کیا تھا۔

"آپ کل آئیں گی۔"

میں اترنے لگی' تو اس نے کہا۔

"پتا نہیں۔"

"پلیز ضرور آیئے گا' بابا آپ کے آنے سے بہت فریش لگنے لگے ہیں' ورنہ کچھ دنوں سے تو وہ بالکل ہی خاموش ہو گئے تھے' شاید میں نے انہیں (Hurt) ہرٹ کیا ہے' لیکن پتا نہیں کیوں ایسا ہو گیا۔ پتا نہیں کیوں اس روز مجھے آپ اس طرح دکھائی کیوں نہیں دیں۔" اس نے آہستگی سے کہا تھا' اور خدا حافظ کہہ کر دروازے سے ہی واپس پلٹ گیا۔ ایک لمحہ کو میں ساکت رہ گئی۔

پھر یکدم مجھے یوں لگا' جیسے کسی نے زخموں پر نرم نرم پھاہے رکھ دیئے ہوں' ایک ٹھنڈک سی پورے وجود میں اترتی گئی' جیسے میں خود اپنی نظروں میں معتبر ہو گئی ہوں' حمزہ زیب کا ہی مقدر تھا' اور اس رشتے سے میرے لئے محترم...... پھر وہ بابا کا بیٹا تھا' سو مجھے بھی بابا کے حوالے سے عزیز تھا۔ میں دوسرے تیسرے دن ضرور بابا کی طرف جاتی تھی۔ وہ گھر پر ہوتا تو اس سے بھی گپ شپ رہتی' اس کی پھوپھو' جسے وہ اور بابا دونوں ہی آپا کہتے تھے' گاؤں سے آ گئی تھیں' جس سے ذرا رونق سی ہو گئی تھی' میں نے شہر بانو سے کہہ کر ڈھولک بھی منگوا لی تھی' اور پھر سب کو جمع کر کے تھوڑی سی رونق لگا لیتی...... آپا شہر بانو سب ہی میرے ساتھ مل کر گاتے کبھی کبھی گلباز خان بھنگڑا ڈالتا۔ چوکیدار اور خانساماں بھی شامل ہو جاتے' خوب سماں بندھتا۔ حمزہ اور بابا ایک طرف صوفوں پر بیٹھے دلچسپی سے دیکھتے رہتے۔ اب بابا پہلے سے کچھ بہتر لگنے لگے تھے۔ ماما بہت معروف تھیں' میں تین چار دن نہ آ سکی تو حمزہ چلا آیا۔

"بابا کی طبیعت رات سے کچھ اپ سیٹ سی ہے آپ کو یاد کر رہے تھے۔"

"کیوں کیا ہوا......؟"

میں پریشان ہو گئی۔

"دراصل ارسلان بھائی کا فون آیا تھا' رات انہوں نے معذرت کی تھی کہ وہ شادی میں شریک نہ ہو سکیں گے۔ شاید بابا نے اس کا اثر لیا ہے۔"

"کتنے ظالم ہیں آپ اور کس قدر سنگدل ہیں آپ لوگ' اتنے محبت کرنے والے' اتنے چاہنے والے باپ کو دکھ دیتے ہیں' اور بہت بدنصیب بھی ہیں کہ ان کی شفقتوں اور محبتوں سے خود کو محروم کر رکھا ہے۔" مجھے یکدم ہی غصہ آ گیا تھا' اور میرے منہ میں جو کچھ آیا بولتی چلی گئی۔

"آپ مجھے کیوں ڈانٹ رہی ہیں۔ میں تو آ گیا ہوں ہمیشہ کے لئے' سب تعلق رشتے توڑ کر اور ان کی خواہش کے مطابق شادی بھی کر رہا ہوں۔" میں خاموش ہوئی تو حمزہ نے جواب دیا۔

"ان کی خواہش کے مطابق......"

میرے لبوں سے بے اختیار نکلا' اور میں نے فوراً ہی زبان روک لی۔

حمزہ نے ایک گہری نظر مجھ پر ڈالی' اور جیسے خود سے سرگوشی کی۔

"کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ہر خواہش پوری نہیں ہو پاتی' پھر آپ چل رہی ہیں میرے ساتھ میں آپ کو لینے آیا ہوں۔"

"آپ نہیں جانتے بابا آپ دونوں کو کتنا مس کرتے تھے۔ کتنا یاد کرتے تھے۔ سارا وقت آپ دونوں کی باتیں...... شاید آپ کو یقین نہ آئے' لیکن میں آپ کو آپ کے بچپن کی ہر بات بتا سکتی ہوں' وہ باتیں بھی' جو آپ بھول چکے ہوں گے' اس لئے کہ بابا نے انہیں اتنی بار دہرایا ہے کہ مجھے یوں لگتا ہے' جیسے آپ اور ارسلان بھائی میری آنکھوں کے سامنے بڑے ہوئے ہیں۔"

"میں یقیناً آپ کا بہت ممنون ہوں کہ آپ نے ہماری عدم موجودگی میں بابا کا اتنا خیال رکھا' ان کی تنہائی اور اکیلے پن کو شیئر کیا۔ ہم واقعی بہت بدنصیب ہیں کہ ان کی محبتوں سے دور رہے ہیں۔"

"بابا بہت اچھے ہیں' خدا ان کو بہت طویل عمر دے۔" میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

تب ہی ماما آ گئیں۔

"ارے حمزہ بیٹے آپ کب آئے۔"

انہوں نے ہاتھ میں پکڑے شاپر ایک طرف میز پر رکھے۔

"بس ابھی آیا ہوں آنٹی۔"

"تو بیٹھو نا بیٹا کھڑے کیوں ہو۔"

"نہیں آنٹی وہ میں تو عینی کو لینے آیا تھا۔ بابا نے بھیجا ہے' وہ ان کے اداس ہو رہے تھے۔"

"ارے حمزہ آپ۔"

"زیب شاید آتے ہی کچن کی طرف چلی گئی تھی' حالانکہ وہ بھی ماما کے ساتھ جیولری لینے گئی تھی۔ دراصل اسے چوڑیوں کا ڈیزائن پسند نہیں آیا تھا' تو ماما نے کہا تھا ساتھ چل کر اپنی پسند کی لے لو۔"

"کیسی ہو زیب؟" حمزہ اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

بلیک کلر کے فراک سوٹ میں وہ بہت کیوٹ لگ رہی تھی۔ چہرہ دھوپ میں شاپنگ کرنے

سے دمک رہا تھا۔ رنگ اس کا یوں بھی بہت فیئر تھا۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں آنے والی خوشی کے تصور سے دمک رہی تھیں۔

"افوہ اس قدر گرمی تھی' آتے ہی پورے دو گلاس پانی پئے ہیں۔" وہ صوفے پر بیٹھ گئی' اور حمزہ کی طرف دیکھا۔

"آپ بیٹھ جائیں نا پلیز...... عینی پیپسی لے آؤ۔"

اس نے حمزہ سے نظر ہٹا کر ذرا کی ذرا مجھے دیکھا۔

ماما نے حمزہ اور زیب کے ملنے پر کوئی پابندی نہیں لگائی تھی' کیونکہ زیب کو پسند نہیں تھا۔

"یہ دقیانوسی باتیں ہیں۔"

اس نے ماما کے یہ کہنے پر کہ اب اسے رخصتی تک حمزہ سے نہیں ملنا چاہئے جواب دیا تھا۔

اور ماما اس کی بات کبھی ٹال نہیں سکتی تھیں' سو زیب کا جب جی چاہتا ملک ہاؤس چلی جاتی۔ حمزہ کو ساتھ لے کر باہر کہیں آؤٹنگ کے لئے چلی جاتی' ہاں حمزہ گھر پر کم ہی آتا تھا۔

"Sorry زیب وہ بابا کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے' اسی لئے تو میں عینی کو لینے آیا تھا۔"

میں نے دیکھا زیب کی پیشانی پر ناگواری سے شکنیں سی پڑ گئیں' لیکن دوسرے ہی لمحے وہ مسکرائی۔

"دو منٹ بیٹھو تو حمزہ میں ذرا سانس تو لے لوں' پھر میں بھی چلتی ہوں بابا کو دیکھنے۔"

حمزہ خاموشی سے بیٹھ گیا' تو وہ اسے جیولری دکھانے لگی۔

"یہ دیکھو حمزہ یہ نیلم کا سیٹ کتنا نازک اور خوبصورت سا ہے...... ہے نا۔"

میں انہیں وہاں ہی بیٹھا چھوڑ کر اپنے کمرے میں تیار ہونے کے لئے آ گئی۔

بابا کا رنگ زرد ہو رہا تھا' اور میں نے محسوس کیا کہ وہ سانس بھی بمشکل لے رہے تھے۔

"حمزہ آپ ڈاکٹر کو بلالیں۔ بابا کی طبیعت مجھے ٹھیک نہیں لگ رہی۔"

"بابا سے میں نے کہا تھا' لیکن یہ منع کر رہے تھے۔"

بابا نے منع کیا۔

"بابا آپ خاموش رہیں حمزہ پلیز! آپ ڈاکٹر کو فون کریں۔"

میں نے بابا کی بات پر توجہ نہ دی۔

زیب ایک طرف خاموش اور کچھ بیزار بیزار سی بیٹھی تھی۔ اس نے بس بابا کو سلام کیا تھا' اور ایک طرف بیٹھ گئی تھی۔ بابا نے بھی اس کی خیریت دریافت کی تھی' اور خاموش ہو گئے تھے۔

"بابا ٹھیک نہیں ہے' جو آپ کر رہے ہیں۔"

"کیا کر رہا ہوں میں۔" انہوں نے مسکرا کر مجھے دیکھا۔

"کیا آپ کو معلوم نہیں آپ کیا کر رہے ہیں۔"

"نہیں تو۔"

انہوں نے معصومیت سے سر ہلا دیا۔

"آپ وعدہ خلافی کر رہے ہیں۔"

"ارے نہیں بالکل بھی وعدہ خلافی نہیں کر رہا۔ دراصل یہ سب تمہیں بلانے کے لئے تھا۔"

وہ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئے۔

"لیٹے رہیں...... آپ کو اٹھنے کی اجازت نہیں۔"

"ہائے داوے یہ ہماری بیٹی کیا ڈاکٹر بن گئی ہے۔" زیب ازحد حیران سی میری اور بابا کی گفتگو سن رہی تھی' اور شاید اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں کسی سے اس طرح بات بھی کر سکتی ہوں۔ حمزہ فون کر کے اندر آیا' تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ارے کہاں......؟" حمزہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"سوری حمزہ مجھے شام کو اپنے دوست کی برتھ ڈے پر جانا ہے۔ اس کے لئے مجھے تیار بھی ہونا تھا' پلیز مجھے ڈراپ کر دو۔"

"لیکن زیب وہ ڈاکٹر آ رہا ہے' کچھ دیر رک جاؤ ڈاکٹر بابا کو چیک کر لے تو چلی جانا۔"

"مگر دیر ہو جائے گی' میں نے پارلر سے ٹائم لیا ہوا ہے' میں تو صرف بابا کی مزاج پرسی کے لئے آ گئی تھی۔"

"بیٹا جاؤ زیب کو چھوڑ آؤ۔"

"بابا میں گلباز کو کہتا ہوں چھوڑ آتا ہے۔"

حمزہ سنجیدہ تھا' شاید اسے زیب کا جانا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

"کوئی بات نہیں بیٹا عینی ہے نا میرے پاس جاؤ۔"

"بابا نے اسے اشارہ کیا تو وہ خاموشی سے باہر نکل گیا۔ حمزہ فوراً ہی زیب کو ڈراپ کر کے واپس آ گیا تھا۔ ابھی ڈاکٹر بابا کو چیک کر رہا تھا' وہ خاموشی سے آ کر کھڑا ہو گیا۔

"ملک صاحب آپ گڑبڑ کر رہے ہیں' آپ کو ہسپتال میں ایڈمٹ کرنا پڑ جائے گا۔"

"ارے نہیں ڈاکٹر یہ غضب نہ کرنا' اُف ہسپتال کے ماحول میں تو میرا دم گھٹ جاتا ہے۔"

"تو پھر احتیاط کریں۔"

"ڈاکٹر بیمار دل کو کتنا سنبھالیں' کبھی نہ کبھی تو دغا دے ہی جاتا ہے اسے۔"

"بابا پھر وہی فضول باتیں' کٹی ہو جائے گی۔"

"سوری۔" بابا نے فوراً کان پکڑ لئے۔

"چلیں معاف کیا۔" میں نے فراخدلی سے کہا۔ ڈاکٹر اپنا بیگ بند کرتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا' اور حمزہ کو اپنے پیچھے باہر آنے کا اشارہ کیا۔

"ڈاکٹر میرے بیٹے کے ساتھ مل کر کوئی سازش مت کرنا' مجھے ہسپتال میں نہیں جانا۔"

ڈاکٹر حامد صرف فیملی ڈاکٹر ہی نہ تھے' بلکہ بابا کے دوست بھی تھے۔

"تمہارا بیٹا میرا بھتیجا بھی ہے...... اور تمہاری بہتری کیلئے اگر ہمیں کوئی سازش بھی کرنی پڑی' تو کر لیں گے۔"

"دیکھا عینی بیٹی آج کل تو دوست بھی دغا دے جاتے ہیں۔" انہوں نے باہر جاتے ڈاکٹر حامد کی طرف اشارہ کیا۔ حمزہ ڈاکٹر کو چھوڑ کر آیا' تو وہ بہت اداس اور خاموش سا تھا۔

"یہ تم کسی اداس الو کی طرح منہ کیوں لٹکائے بیٹھے ہو۔ ڈاکٹر کی بات کا اعتبار مت کرنا' میں تمہاری دلہن اس گھر میں لائے بغیر کہیں نہیں جانے کا۔ عینی بیٹی اپنی ماما سے کہو زیادہ بکھیڑا نہ کریں' اور رخصتی کر دیں زیب بیٹی کی۔"

اب بابا کو کیا پتا تھا کہ ہمارے حالات بہتر ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ سب کچھ ہی تو بنانا تھا' اور ذرا سا بھی کہیں زیب کو فرق لگ جاتا تو ماما دکھی ہوتیں۔

"ارے ہاں بابا ایک خوشخبری۔" میں نے چٹکی بجائی۔

"ارسلان بھائی کا فون آیا تھا۔ حمزہ نے بتایا ہے کہ وہ شادی سے دو دن پہلے پہنچ جائیں گے۔"

"لیکن حمزہ نے مجھے تو نہیں بتایا۔" بابا کے چہرے پر ایک دم خوشی کے رنگ بکھر گئے۔ حمزہ نے از حد حیران ہو کر مجھے دیکھا۔

وہ جب ہم آ رہے تھے تو موبائل پر کال آئی تھی' اور یہاں آتے ہی اور باتیں شروع ہو گئیں۔

"لیکن رات تو ارسلان نے......"

"ہاں وہ کہہ رہے تھے کہ بابا اداس ہو گئے ہیں' اس لئے انہوں نے پروگرام سیٹ کر لیا

ہے۔"

"تھینک گاڈ۔" بابا کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

"میں بہت دکھی ہو گیا تھا جب ارسلان نے بتایا کہ۔"

"اور جناب اسی خوشی میں ہم آپ کو پلاتے ہیں اپنے ہاتھ کی بنی کافی۔"

میں اٹھ کھڑی ہوئی' دراصل حمزہ بہت مضطرب سا ہو گیا تھا' اور بار بار الجھی نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

نانو نے مجھے کافی بنانا سکھایا تھا' ایک بار میں نے بابا کو بتایا تھا' اور تب کبھی کبھی بابا مجھ سے فرمائش کر کے کافی بنواتے تھے۔

"ہاں ضرور...... دیکھنا حمزہ میری بیٹی کے ہاتھ کی بنی کافی میں کیسی خوشبو اور ذائقہ ہے۔"

"چلیں دیکھ لیتے ہیں۔"

میرے کچن میں آتے ہی حمزہ بھی پیچھے آ گیا۔

"یہ آپ نے کیا کیا' ارسلان بھائی صاف صاف کہہ چکے ہیں کہ وہ نہیں آ سکتے۔"

"بابا کو خوش کرنے کے لئے کہا ہے میں نے۔ آپ نے دیکھا نہیں کہ بابا کا رنگ کیسے بدل گیا تھا۔ آنکھوں میں کتنی رونق آ گئی تھی۔"

"ہاں لیکن آپ نے یہ بھی سوچا کہ جب ارسلان بھائی نہیں آئیں گے تو بابا کا دل بند بھی ہو سکتا ہے۔"

"یہ آپ سے کس نے کہا کہ ارسلان بھائی نہیں آئیں گے' وہ آئیں گے۔"

"کیا آپ کو الہام ہوا ہے۔"

"نہیں لیکن بابا کی خوشی اور زندگی کے لئے انہیں آنا ہوگا' اور میں ان سے بات کروں گی...... آپ میری بات کروائیے گا ان سے۔"

"آپ کو یقین ہے کہ وہ آپ کی بات مان لیں گے۔"

"ہاں......"

"آپ سچ مچ ساحرہ ہیں' مجھے یقین ہے کہ آپ انہیں قائل کر لیں گی۔" وہ مسکرایا۔

اور واقعی میں نے ارسلان بھائی کو قائل کر لیا تھا' صرف ایک بات کی تھی میں نے ان سے۔

"اگر آپ نہ آئے ارسلان بھائی تو آپ بابا کے قاتل ہوں گے' اگر آپ کو یہ منظور ہے تو

پھر مت آیئے گا۔"

لیکن اس کے باوجود بابا کی طبیعت ایک دن پھر بگڑ گئی۔ پورے دو دن انہیں آئی سی یو میں رکھا گیا' اور جب انہیں کمرے میں لایا گیا' تو وہ اتنے کمزور اور لاغر لگ رہے تھے کہ میں بے اختیار ان سے لپٹ کر رو دی۔

"یہ کیا کر رہی ہیں آپ۔" حمزہ نے مجھے پیچھے ہٹایا۔

"بابا کی طبیعت اور خراب ہو جائے گی۔"

"سوری۔"

"پگلی۔" بابا کی آواز میں نقاہت تھی۔

"مجھے کچھ نہیں ہوگا انشاء اللہ۔"

"انشاء اللہ۔" میں کتنی دیر تک ان کا ہاتھ تھامے بیٹھی رہی۔

"مجھے آپ پر رشک آ رہا ہے عینی...... آپ بابا سے کتنی قریب ہیں' اور ہم نے خود کو بابا سے کتنا دور کر دیا تھا۔"

"لیکن اب قریب بھی تو آ گئے ہیں۔"

"مگر وقت ہی کتنا رہ گیا ہے۔" حمزہ اداس تھا۔

"اب آپ نے بابا کی طرح فضول باتیں شروع کر دیں۔" میں نے اسے ڈانٹا۔

"پتا نہیں آپ کیا چیز ہیں عینی' جانے کیسے آپ مجھ سے مس ہو گئیں۔"

"ہو جاتا ہے کبھی کبھی ایسا۔"

میں نے شرارت سے اس کی طرف دیکھا' لیکن وہ سنجیدہ رہا۔ بابا گھر جانے کی ضد کر رہے تھے' لیکن ڈاکٹرز نے اجازت نہیں دی تھی۔ ارسلان بھائی کو جو بھی پہلی فلائٹ ملی تھی' وہ بابا کی بیماری کا سنتے ہی اس فلائٹ سے آ گئے تھے' اور بابا بہت خوش تھے۔

"میری اور دانی کچھ روز میں آ جائیں گے بابا۔"

ارسلان بھائی کی آمد بابا کے لئے ٹانک ثابت ہوئی تھی' اور ایک ہفتے بعد ہی ڈاکٹر نے انہیں گھر جانے کی اجازت دے دی تھی۔ زیب صرف دو بار بابا کو دیکھنے آئی تھی' وہ بھی ذرا سی دیر کیلئے۔

"ہسپتال میں ایک مخصوص بو ہوتی ہے دوائیوں کی' میرا دل اس سے خراب ہو جاتا ہے۔"

اس نے حمزہ سے کہا تھا' لیکن حمزہ نے کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا۔ مجھے ہمہ وقت اس کی آنکھوں

میں ایک الجھن سی تیرتی نظر آتی تھی۔ پتا نہیں اس کے ساتھ کیا مسئلہ تھا' اس روز میں بابا کے لئے سوپ بنا کر کچن سے نکلی' تو وہ ٹی وی لاؤنج میں آنکھیں موندے صوفے پر نیم دراز تھا۔

"حمزہ کیا پریشانی ہے آپ کو' بابا تو اب کافی بہتر ہیں۔"

"ہاں۔" اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔

"کوئی پریشانی نہیں۔"

"نہیں' کچھ تو ہے' جو آپ کو ڈسٹرب کر رہا ہے۔"

"آپ نے محسوس کر لیا حیرت ہے۔"

"ظاہر ہے آدمی کے سینے میں دل ہو' اور وہ دیدہ بینا رکھتا ہو تو محسوس کیا جا سکتا ہے۔"

"واقعی مان لیا کہ آپ کے سینے میں دل بھی ہے' اور آپ دیدہ بینا بھی رکھتی ہیں۔ خیر آزما لیں گے آپ کو کسی دن۔"

"آپ سوپ پئیں گے۔ میں نے بابا کے لئے بنایا ہے۔"

"میں مریض تو نہیں ہوں۔"

"لگ تو رہے ہیں' لیکن یہ سوپ جو میں نے بنایا ہے وہ صرف مریضوں کے لئے نہیں ہے۔"

"آپ نے بنایا ہے تو یقیناً اس میں آپ کے ہاتھ کی خوشبو بھی ہو گی' لیکن اس وقت موڈ نہیں ہے۔" اس نے سر پھر صوفے کی پشت پر رکھ کر آنکھیں موند لیں' اور میں بابا کے کمرے میں آ گئی۔ بابا سے تھوڑی دیر گپ شپ لگا کر میں نے ان سے اجازت لے لی۔

"ارے ابھی تو آئی تھیں تم۔"

"بابا جوں جوں شادی میں دن تھوڑے رہ گئے ہیں ماما کی مصروفیت بڑھتی جا رہی ہے۔ انہوں نے کہا تھا جلدی آ جانا۔"

"اچھا پھر جاؤ میری وجہ سے تمہیں بڑا پرابلم ہوتا ہے۔"

"کوئی پرابلم نہیں ہوتا بابا' مجھے آپ کے پاس آ کر جو خوشی ہوتی ہے' آپ کو پتا ہے' لیکن کیا کروں ماما بھی تو اکیلی ہیں اور زیب چند دنوں کی مہمان ہے' اس گھر میں۔"

"بیٹا دعا کیا کرو حمزہ اور زیب خوش رہیں' حمزہ کو اپنے فیصلے پر پچھتانا نہ پڑے۔ پتا نہیں کیوں مجھے لگتا ہے جیسے حمزہ پچھتا رہا ہو۔"

"ارے نہیں بابا آپ وہم نہ کریں۔"

میں بابا کو خدا حافظ کہہ کر باہر آئی' تو زیب کچھ ناراض ناراض سی کھڑی تھی۔ پتا نہیں' کب آئی تھی وہ۔

"اچھے خاصے تو ہیں تمہارے بال اب انہیں مزید کیا سیٹ کروانا ہے۔" حمزہ کے لہجے میں بیزاری تھی۔

"میں ذرا ہیئر سٹائل چینج کرنا چاہتی ہوں۔"

"زیب تم بال بڑھا کیوں نہیں لیتیں عینی کی طرح۔" حمزہ کی نظریں اچانک ہی میری طرف اٹھی تھیں۔ زیب نے بے حد ناگواری سے مجھے دیکھا' اور پھر حمزہ کی طرف متوجہ ہوگئی۔

"مجھے پسند نہیں ہیں۔"

"اچھا تم بتاؤ نا شام کا پروگرام پکا ہے۔"

"سوری زیب بابا کی طبیعت تو تمہیں پتا ہی ہے۔ سو میرے لئے مشکل ہے تمہاری فرینڈز کی پکنک پارٹی اٹینڈ کرنا۔"

"سب کو بہت شوق ہے تم سے ملنے کا۔"

"مل لیں گے چند دنوں بعد۔"

"اوکے۔"

زیب کا موڈ ایک دم خراب ہوگیا۔ ماما پاپا نے ہمیشہ اس کی بات مانی تھی اس لئے وہ اپنی بات کی نفی برداشت ہی نہیں کر پاتی تھی۔

"چلے جائیں آپ حمزہ ارسلان بھائی تو ہیں نا گھر پر' اور پھر میں کوشش کروں گی کہ شام کو چکر لگا لوں۔" میں نے حمزہ سے کہا۔

لیکن حمزہ نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔

"اوکے...... بابا کی تیمار داری سے فرصت مل جائے تو مجھے فون کر لینا۔"

زیب کا رنگ غصے کی شدت سے سرخ ہوگیا' اور وہ تیز تیز چلتی ہوئی ٹی وی لاؤنج سے نکل گئی۔

"آپ نے زیب کو خفا کر دیا حمزہ' بابا کی طبیعت اب تو کافی بہتر ہے آپ چلے جاتے۔"

"پلیز عینی ان کو تو اور کوئی کام ہی نہیں ہے' ہر وقت گھومنا پھرنا' سیر و تفریح نہیں ہے موڈ میرا۔"

"آپ واقعی ڈسٹرب ہیں...... اگر مناسب سمجھیں تو مجھے اپنی الجھن بتایئے...... شاید میں

کچھ مدد کر سکوں۔"

"ہاں شاید۔" حمزہ نے بہت گہری نظروں سے مجھے دیکھا۔

"بتا دوں گا...... اگر نہ نکل سکا اس الجھن سے تو...... پھر تو ظاہر ہے آپ ہی مدد کریں گی' لیکن کیا آپ خضر ہیں۔" وہ مسکرایا۔

"ممکن ہے۔"

"تو ٹھیک ہے یاد رکھئے گا' بھٹک گیا تو آپ کے پاس ہی آؤں گا راستہ پوچھنے' رہنمائی ضرور کیجئے گا۔"

"ضرور۔"

"وعدہ۔"

"میں نے گلباز خان کو بلایا کہ وہ مجھے چھوڑ آئے۔ جب سے حمزہ سے تعارف ہوا تھا' میں آتی وہ گھر ہوتا تو ہمیشہ مجھے خود چھوڑنے آتا تھا' لیکن آج اس نے ایسی کوئی آفر نہیں کی تھی' بلکہ یوں ہی پاؤں پھیلائے آنکھیں موندے نیم دراز رہا۔ اس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ واقعی الجھن میں ہے' لیکن یہ الجھن میری ذات سے متعلق ہوگی' اس وقت مجھے اس کا ہرگز اندازہ نہ تھا' البتہ چند دن بعد جب میں بابا سے ملنے آئی' تو وہ بابا کے کمرے میں تھا' اپنا نام سن کر میں غیر ارادی طور پر رک گئی۔ میں تقریباً چھ دن بعد آئی تھی' البتہ بابا سے ایک دو بار فون پر بات ہوئی تھی۔

"بابا پلیز میں عینی......"

"حمزہ اس سے آگے کچھ مت کہنا۔" یہ بابا کی آواز تھی۔

"شادی بیاہ کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہوتا کہ آج ایک اور کل دوسری۔"

"بابا میں کیا کروں زیب نے مجھے بہت مایوس کیا ہے' وہ عینی سے بہت مختلف ہے۔ کوکنگ سے اسے دلچسپی ہیں' بوڑھے لوگوں کے پاس بیٹھنا اسے بور لگتا ہے' وہ...... بابا پلیز آپ میری بات سمجھیں' وہ میری لائف سٹائل میں فٹ نہیں بیٹھتی۔"

"میں جانتا ہوں' مگر میری جان وہ تمہاری پسند تھی۔"

"مانتا ہوں' لیکن مجھ سے غلطی ہوگئی بابا' تب میں نے عینی کو دیکھا ہی کب تھا۔"

"دیکھا تو تھا۔"

"ہاں بابا! لیکن شاید میری آنکھیں اندھی ہوگئی تھیں' میں پہچان نہیں پایا تھا۔"

"مگر اب یہ ناممکن ہے۔ پندرہ دن تمہاری شادی میں رہ گئے ہیں' اس بے چاری لڑکی کا

کیا قصور ہے' جو تمہاری منکوحہ ہے۔"

"بابا میں نے بہت سمجھایا ہے خود کو...... لیکن میرا دل نہیں مانتا' آپ کو کیا پتا بابا زیب نے مجھے ہر ہر جگہ مایوس کیا ہے' آپ بیمار تھے لیکن اسے پروا تک نہیں تھی' میں زیب کو اپنی زندگی میں شامل نہیں کر سکتا' آپ ایک بار انکل انور سے بات تو کریں' عینی بھی تو ان کی ہی بیٹی ہے' زیب نہ سہی عینی سہی۔"

"یہ ناممکن ہی سمجھو جان بابا...... تم اگر زیب سے شادی نہ بھی کرو' تو بھی عینی اب تمہارے مقدر کے آسمان پر نہیں چمک سکتی' کیا سمجھتے ہو تم...... ایک بیٹی کو طلاق دے دو گے' تو وہ دوسری بیٹی سے تمہارا نکاح کر دیں گے...... ناممکن ہے۔"

"زیب کیلئے اپنے دل کو تھوڑا فراخ کر لو اور اسے اس کی کمزوریوں پر معاف کر دو' شاید تمہارے دل میں اس کے لئے جگہ بن سکے...... یہ سوچو تم نے اسے پہلی نظر میں ہی پسند کیا تھا' عینی مجھے کس قدر عزیز تھی' لیکن تم نے۔" بابا کی آواز میں آنسوؤں کی نمی تھی۔

"بابا آپ چاہیں تو اب بھی۔"

"پاگل مت بنو حمزہ۔"

اب کے بابا کے لہجے میں سرزنش تھی۔

"اور آئندہ ایسی بات مت کرنا' چلو اٹھو اور جا کر ٹیلر سے پتا کرو تمہارا سوٹ کب تک تیار ہو گا۔"

"السلام علیکم۔"

میں نے ذرا سا دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔

"ارے ہماری بیٹی آ گئی۔"

بابا کے لہجے میں ہمیشہ والی مسرت تھی۔

"یہ آپ کبھی کبھی اچانک کہاں سے ٹپک پڑتی ہیں۔" حمزہ مجھے دیکھتے ہی کھڑا ہو گیا تھا۔

"بیل کی آواز بھی نہیں آئی۔"

"اطلاعاً عرض ہے کہ میں بچپن سے ماسی شہر بانو کا کوارٹر استعمال کرتی ہوں ادھر آنے کیلئے۔"

"او کے بابا!" حمزہ مجھ سے نظریں چرا رہا تھا۔

"ارسلان کو بھی ساتھ لے لینا۔"

"جی بہتر۔" وہ بے حد تھکا تھکا' مضمحل اور اداس لگ رہا تھا۔

اس روز میں بابا کے پاس زیادہ دیر نہیں ٹھہری تھی' اور بابا نے بھی مجبور نہیں کیا تھا۔ وہ بہت الجھے الجھے اور اداس تھے۔

"بابا اب شاید میں بہت سارے دن نہ آ سکوں۔" میں نے اچانک فیصلہ کیا تھا کہ مجھے زیب کی رخصتی تک ادھر نہیں آنا چاہئے۔ "اب میں آپ کا استقبال گھر پر کروں گی۔ آپ آئیں گے حمزہ کی بارات کے ساتھ ٹھیک ہے نا بابا۔"

"شاید ٹھیک ہی ہے۔ تم...... بیٹا تم بہت عقلمند ہو۔ دیکھو بیٹا حمزہ کی کسی بات کا برا مت ماننا۔ تمہیں تو پتا ہے وہ بچپن سے ہی ایسا ہے' جب بازار جاتا تھا تو میری پسند کی ہوئی چیز ناپسند کر دیتا تھا' اور ہمیشہ اپنی پسند کی چیز لاتا' لیکن پھر گھر آ کر اس کی رائے بدل جاتی تھی' اور وہ ضد کرتا کہ بابا جو آپ نے شرٹ پسند کی تھی' وہی اچھی تھی' یہ اچھی نہیں تبدیل کر کے وہی لے آتے ہیں' لیکن زندگی میں بعض مقام ایسے آتے ہیں' جہاں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔"

"جی بابا...... آپ پریشان نہ ہوں۔ حمزہ بھی جانتا ہے کہ زندگی کے اہم فیصلے اس کی خریدی ہوئی شرٹ نہیں ہیں کہ انہیں تبدیل کیا جا سکتے' اور آپ نے اداس نہیں ہونا' بالکل سوچنا نہیں' کچھ پریشان نہیں ہونا' اور جب آپ آئیں گے حمزہ کی بارات کے ساتھ نا تو بالکل فٹ ہونا چاہئے' اور حمزہ کا دماغ خود ہی ٹھیک ہو جائے گا ایک دو روز میں۔" لیکن یہ میرا خیال تھا۔ خدا جانے زیب اور اس کے درمیان کیا بات ہوئی تھی کہ حمزہ نے زیب سے کہہ دیا تھا کہ اس کا زیب جیسی لڑکی کے ساتھ گزارا ناممکن ہے۔ تمہارے جیسی خودغرض لڑکیوں کی تو وہاں بھی کمی نہیں تھی۔

زیب نے رو رو کر گھر میں ہنگامہ کھڑا کیا ہوا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ سب میری وجہ سے ہے۔ میں نے حمزہ کو اکسایا ہے' اور حمزہ نے اس کے ساتھ ایسا رویہ اختیار کیا ہے۔ اب جبکہ شادی میں صرف آٹھ دن رہ گئے تھے' اور اسی روز حمزہ کا فون آ گیا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ زیب رو دھو کر اپنے کمرے میں سو رہی تھی' اور ماما غالباً کچن میں تھیں ورنہ میں نے فون کبھی ریسیو نہیں کیا تھا' دوسری طرف حمزہ تھا۔

"کہاں ہیں آپ اتنے دنوں سے۔"

میری آواز پہچانتے ہی اس نے فوراً کہا۔

"بابا اداس ہیں۔"

"بابا کو پتا ہے میری مجبوری۔"

"کیا خبر کوئی اور بھی اداس ہو۔"

"آٹھ دن رہ گئے ہیں اس کی اداسی دور ہو جائے گی۔"

"شاید ایسا نہ ہو عینی' آپ نے وعدہ کیا تھا کہ اگر کبھی میں راستہ بھٹک گیا تو آپ میری رہنمائی ضرور کریں گی۔"

"آپ راستہ بھٹکے نہیں ہیں' صحیح راستے پر جا رہے ہیں۔ ہاں اب بھٹکنا چاہتے ہیں۔ بہتر ہے کہ اپنی سمت تبدیل نہ کریں۔ منزلیں روز روز بدلی نہیں جاتیں۔"

"بعض اوقات ایسا بھی تو ہوتا ہے عینی کہ جلدی میں آدمی اپنی صحیح منزل کا تعین نہیں کر پاتا۔"

"ہاں شاید لیکن بہتری اسی میں ہے حمزہ کہ جس منزل کا تعین ہو چکا ہو' سفر اسی سمت جاری رہے۔" میں نے فون بند کر دیا۔

"کس کا فون تھا۔" ماما کچن سے باہر آ گئیں۔

"حمزہ کا' زیب کا پوچھ رہا تھا۔ میں نے بتا دیا سو رہی ہے۔"

"حمزہ کا تھا۔"

ماما کے پھیکے چہرے پر رنگ سا آ گیا۔

"بہت پیارا بچہ ہے۔ زیب ہی کچھ نازک مزاج ہے' خفا کر دیا ہوگا اسے' میں تو ڈر رہی تھی۔" وہ زیب کے کمرے کی طرف بڑھ گئیں' شاید اسے بتانے کے لئے' اور کچھ ہی دیر بعد میں نے دیکھا وہ فون پر حمزہ سے بات کر رہی تھی' یقیناً حمزہ نے جان لیا ہوگا کہ میں نے اس سے کہا ہے...... اور حمزہ سے بات کرنے کے بعد وہ تیار ہو کر غالباً حمزہ سے ملنے چلی گئی۔

"زیب اب تو چند دن گھر میں ہی رہو۔"

"Promise ماما کل کے بعد کہیں نہیں جاؤں گی۔ گھر پر رہوں گی۔"

"اچھا لیکن جلدی آنا۔" ماما اسے روک نہ سکیں۔

اس روز پتا نہیں کیوں صبح سے ہی دل اداس تھا' شاید زیب کے لئے جس کے جانے میں صرف تین دن رہ گئے تھے۔ حالانکہ میرے اور اس کے درمیان کبھی بہت تو کیا تھوڑی سی بھی دوستی نہیں رہی تھی' پھر بھی شاید اس کی رخصتی کے خیال سے دل اداس ہو رہا تھا۔ ماما کو تو کتنی بار دوپٹے کے پلو سے آنسو پونچھتے دیکھا۔ شام کو ایک دم ہی دل گھبرایا تو میں کمرے سے باہر آ گئی۔ بابا بہت یاد آ رہے تھے۔ پتا نہیں ان کی طبیعت کیسی تھی۔

حمزہ نے بھی پھر فون نہیں کیا تھا' البتہ ارسلان بھائی آئے تھے اور ساری باتیں پاپا سے طے کر گئے تھے' ان سے پتا چلا تھا کہ بابا ٹھیک ہیں...... پھر بھی میں نے سوچا بابا سے بات کروں۔ بے اختیار ہی جی چاہنے لگا تھا۔ میں بھی عجیب ہوں فون تو کر سکتی تھی' ابھی میں ریسیور اٹھانے ہی لگی تھی کہ بیل بج اٹھی' دوسری طرف ماسی شہربانو تھی۔

بابا چلے گئے تھے...... اچانک...... حمزہ کی شادی کا انتظار کئے بغیر۔ اس کی دلہن لائے بغیر۔ مجھے کتنے دن یقین نہ آیا۔ میں تڑپ تڑپ کر روئی...... مجھے کیا پتا تھا کہ بابا یوں اچانک چلے جائیں گے' مجھے پتا ہوتا تو میں کبھی بھی یوں اتنے بہت سارے دن بابا سے دور نہ رہتی۔

"آپ مجھے پاگل کر دیں گی عینی بس کریں اب۔" اس روز بابا کو دنیا سے رخصت ہوئے چھٹا دن تھا' اور میں بابا کے بیڈ روم میں ان کے بیڈ کی پٹی پر سر رکھے روئے چلی جا رہی تھی۔ جانے کب حمزہ اندر آیا تھا۔ میں آنسو پونچھ کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"یہ گھر بابا کے بعد میرے لئے کتنا اجنبی ہو گیا تھا' بھلے اس گھر میں زیب بھی آ جاتی تب بھی یہ اجنبی ہی رہتا۔ یہ گھر تو بابا کی موجودگی سے اپنا اپنا تھا' بابا کو اچانک کیا ہو گیا تھا۔ یقیناً آپ نے ہی کچھ کہا ہوگا۔" میں نے حمزہ کی طرف دیکھا۔

"وہ تو کہتے تھے آپ کو سہرا باندھے دیکھے بغیر کبھی نہیں جائیں گے۔"

"پتا نہیں مجھے خود نہیں پتا اچانک کیا ہو گیا۔ رات کتنی دیر تک وہ مجھ سے اور ارسلان بھائی سے باتیں کرتے رہے تھے' انہوں نے مجھے خوش رہنے کی دعا دی تھی اور......" حمزہ کی آواز بھرا گئی۔

رات اچانک ان کے دل میں درد اٹھا' اور ڈاکٹر کے آنے سے پہلے ہی...... آپ کو پتا ہے عینی میں نے آپ کے بجائے زیب کو اپنا کر بابا کو Hurt (ہرٹ) کیا تھا...... بابا کو آپ سے محبت تھی' اور واقعی آپ اس قابل ہیں کہ آپ کو چاہا جائے' اور میں تلافی کرنا چاہتا تھا' لیکن بابا کہتے تھے اب یہ ممکن نہیں۔"

"صحیح کہتے تھے۔"

"شاید یہی دکھ بابا کو لے گیا۔" وہ رونے لگا۔

"ہاں شاید یہی دکھ۔"

کتنے سارے دن میں سوچتی رہی' لیکن پھر ملک ہاؤس نہیں گئی...... وہاں میرا تھا ہی کیا۔

ارسلان بھائی واپس امریکہ چلے گئے تھے۔ جانے سے پہلے وہ چاہتے تھے کہ سادگی سے

رخصتی ہو جائے' لیکن حمزہ تیار نہیں تھا۔

''اتنی جلدی نہیں ابھی تو بابا کو گئے ایک ماہ بھی نہیں ہوا۔''

''میرا دوبارہ آنا مشکل ہو جائے گا۔''

''کوئی بات نہیں اب کون ہے جس کے دل دکھنے کا خیال ہو گا رہا میں تو......''

لیکن زیب کو حمزہ کی یہ بات پسند نہ آئی تھی اور یہی بات وجہ اختلاف بن گئی۔ زیب چاہتی تھی کہ جلد رخصتی ہو جائے جبکہ حمزہ مسلسل ٹال رہا تھا۔

دراصل وہ شادی کرنا چاہتا ہی نہیں ہے' اور اس کی وجہ میں ہوں۔ وہ میری معصومیت اور خوبصورتی پر مرمٹا ہے یہ زیب کا خیال تھا۔ جس کی کئی بار ماما نے تردید کرنے کی کوشش کی تھی' لیکن زیب اٹھتے بیٹھتے طنز کرتی رہتی۔ میں سخت عذاب میں تھی۔ بابا کا دکھ اور زیب کا رویہ دونوں نے مل جل کر مجھے بیمار کر ڈالا تھا۔ ایسے میں نانو کی آمد میرے لئے خوشگوار جھونکا تھی۔

''نانو پلیز مجھے اپنے ساتھ لے چلیں۔''

''میری جان تمہاری خاطر ہی تو آئی ہوں۔'' اس بار ماما نے ہلکا سا احتجاج کیا۔

''اس کا رزلٹ آ گیا ہے اماں میرا تو خیال تھا کہ یہ یہاں پنجاب یونیورسٹی سے ہی ایم اے کرتی۔''

''وہاں سے ہی کر لے گی۔'' نانو میری حالت دیکھ رہی تھی' اور یوں میں نانو کے ساتھ ایک بار پھر کراچی آ گئی۔

وہاں ہی مجھے پتا چلا کہ حمزہ بھی امریکہ چلا گیا ہے' اور جانے سے پہلے وہ زیب کو آزاد کر گیا ہے۔ میں نے یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا تھا' لیکن میرے ہونٹ جیسے ہنسنا بھول گئے تھے۔ میرے اندر بے شمار درد جمع ہو گئے تھے' بابا کی موت کا دکھ' زیب کی طلاق کا رنج اور حمزہ کے نامراد رہ جانے کا غم' لیکن کچھ بھی تو میرے اختیار میں نہیں تھا۔ میں قدرت کے فیصلوں کے متعلق سوچتی رہتی بابا نے سوچا تھا۔ زیب نے کیا چاہا تھا' اور کس طرح اس نے اپنی چاہت کو اپنا مقدر بنانا چاہا تھا' اور حمزہ نے کیا کیا تھا' لیکن میرے پاس کسی سوال کا جواب نہیں تھا' یہ سب کیوں ہوا تھا؟ کیا تھا اگر حمزہ مجھے ہی پہلے پسند کر لیتا' تو شاید بابا بھی نہ مرتے اور......

نانو ہمیشہ کی طرح چاق و چوبند تھیں۔ بہت سوشل اور گھومنے پھرنے کی شوقین' لیکن میرا کہیں جانے کو جی نہ چاہتا۔

''تاجی نے تمہیں یوں نظر انداز کر کے اچھا نہیں کیا۔ کوئی اولاد کے ساتھ بھی یوں کرتا

ہے۔''

نانو کبھی کہتیں' لیکن میں نے کبھی نانو کی کسی بات پر تبصرہ نہیں کیا تھا۔ پتا نہیں کیوں اب باشعور ہونے کے بعد مجھے یوں لگنے لگا' جیسے ماما بہت مظلوم اور مجبور ہوں۔ کبھی کبھی وہ مجھے بے تحاشا یاد آتیں' پتا نہیں وہ بھی مجھے یاد کرتی تھیں یا نہیں' میں جب سے آئی تھی میری ان سے بات نہیں ہوئی تھی۔ فون آتا تو نانو ہی بات کرتیں' اور مجھے بتا دیتیں کہ ماما پوچھ رہی تھیں مجھے اور بس......

میں گزرتے وقت کے ساتھ سنبھل تو گئی تھی' لیکن بابا کی موت کا دکھ میرے دل سے جاتا نہیں تھا۔ کتنے اچھے تھے بابا...... کتنے محبت کرتے تھے مجھ سے۔

کتنا چاہتے تھے مجھے...... بابا کے ساتھ کبھی کبھی حمزہ بھی تصور میں چلا آتا...... کس قدر الجھا ہوا' اور پریشان نظر آنے لگا تھا۔ بابا کی موت سے پہلے جب آخری بار میری اس سے بات ہوئی تھی' تو کتنا تھکا تھکا اور ٹوٹا ہوا لگ رہا تھا۔

''خدا کرے کہ وہ اپنی زندگی میں خوش ہو۔'' میں نے کئی بار بے آواز دعا کی اس کے لئے۔

یونیورسٹی میں چھٹیاں ہوئیں تو نانو نے کہا کہ میں ایک دو ہفتے کے لئے ماما اور پاپا سے مل آؤں' اگرچہ میرا قطعی کوئی موڈ نہیں تھا' لیکن نانو نے مجبور کیا۔

''چلی جاؤ تمہاری ماما کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں رہتی' دو ہفتے رہ آؤ گی تو اس کی طبیعت بھی بہل جائے گی۔''

''ماما کو کیا ہوا ہے؟''

''بظاہر تو کچھ نہیں ہوا' لیکن تمہارے پاپا بتا رہے تھے کہ کچھ کمزوری ہے۔''

سو نانو کے مجبور کرنے پر میں چلی آئی تھی۔ میں نے دیکھا مجھے دیکھ کر ماما کے چہرے پر سرخی سی پھیل گئی تھی۔ پاپا کا چہرہ بھی کھل اٹھا تھا' البتہ زیب کو کوئی خاص خوشی نہیں ہوئی تھی' اس کی تصدیق تو چند دن میں ہو گئی۔

اس کا رویہ میرے ساتھ بہت خراب تھا' اور اس نے صاف صاف مجھ سے کہہ دیا تھا کہ حمزہ نے میری وجہ سے اس کو طلاق دی ہے۔

''لیکن جب تمہاری طلاق ہوئی تو میں کراچی تھی۔''

''ہاں لیکن جو بیج تم بو گئی تھیں' یہ اسی کا رزلٹ تھا۔''

"تمہیں خوامخواہ غلط فہمی ہے زیب۔"

میں نے اسے سمجھانا چاہا تھا' لیکن وہ کوئی بات بھی سننے کے لئے تیار نہ تھی۔ شاید ماما کی کمزوری کی وجہ بھی زیب کا رویہ تھا۔ بابا اسے کسی بات پر روکتے یا ٹوکتے نہ تھے' شاید وہ بھی یہی سمجھتے تھے کہ قصور میرا ہے۔ میں جلد ہی اس ماحول سے اکتا گئی' اور ایک ہفتے بعد ہی واپس کراچی چلی گئی۔ نانو مجھے اچانک دیکھ کر حیران ہو گئیں۔

"ارے یہ تم بغیر اطلاع کے اکیلی۔"

"آپ کے بغیر دل اداس ہو گیا تھا۔" میں نے بیگ ایک طرف رکھتے ہوئے ان کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

"اور میں اکیلی نہیں آئی پاپا آئے ہیں ساتھ۔"

"اور وہ کہاں رہ گیا۔"

"باہر ٹیکسی والے سے میٹر پر الجھ رہے تھے۔" نانو ایک دم گھبرا کر کھڑی ہو گئیں۔

نانو ایک دم گھبرا کر کھڑی ہو گئیں۔

"یہ کوئی الجھنے کا دور ہے کسی سے' ان ٹیکسی والوں کا کیا پتا...... جو مانگتا ہے دے۔ ارے عبداللہ دیکھو انکل کو۔"

نانو عبداللہ کو پکارتی ہوئی باہر نکل گئیں' اور میں نے سوچا یہ کون ذات شریف ہیں' جو میری عدم موجودگی میں تشریف لائے ہیں۔ تب نانو پاپا اور عبداللہ کے ساتھ اندر آئیں۔ دراز قد دبلا پتلا اور سمارٹ سا عبداللہ حفیظ ماموں کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔ پیشے کے لحاظ سے انجینئر تھا' اور اپنے ہوش میں پہلی بار پاکستان آیا تھا۔

نانو نے اندر آنے پر اس کا مکمل تعارف کروایا۔ میں نے اس سے عبداللہ کو سرسری نظر سے دیکھا تھا' اور اس وقت مجھے یہ قطعی معلوم نہیں تھا کہ یہ شخص آنے والے دنوں میں میرے لئے کتنی اہمیت اختیار کر جائے گا' اور وہ جذبہ جو حمزہ کے لئے میرے دل میں پیدا نہیں ہو سکا تھا' عبداللہ کے لئے پیدا ہو جائے گا۔

عبداللہ سے نانو کو بہت پیار تھا' اور وہ نانو کا پہلا اور سب سے بڑا پوتا تھا' اور ان سے بہت قریب تھا' اور نانو کے بلانے پر کراچی آیا تھا' نانو کی خواہش تھی کہ وہ یہاں ہی رہے پاکستان میں' اور یہاں ہی جاب کر لے' لیکن وہ کچھ متذبذب سا تھا' وہ نانو کے ساتھ بھی رہنا چاہتا تھا اور پاکستان میں بھی سیٹل ہونا اسے مشکل لگ رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ نانو کو منا کر اپنے ساتھ لے

جائے گا' لیکن نانو ایسا کوئی ارادہ نہیں رکھتی تھیں' ایک تو اس کی وجہ میں تھی' دوسرا عمر کا آخری حصہ وہ اپنے وطن کی فضاؤں میں گزارنا چاہتی تھیں' اور عبداللہ کا خیال تھا کہ اس کی وجہ صرف میں ہوں اس لئے شاید دل ہی دل میں اسے مجھ پر غصہ تھا' اس لئے ایک روز وہ میرے کمرے میں چلا آیا' میں اپنے نوٹس تیار کر رہی تھی۔ ایک لمحہ تو حیران ہوئی۔

"آپ خیریت......؟"

"جی خیریت ہی ہے۔"

وہ بڑے سکون سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ جب سے آیا تھا میری اس سے ڈائریکٹ کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ میں اپنی پڑھائی میں مگن تھی' اور وہ زیادہ تر نانو کے پاس رہتا تھا' کچھ دنوں تک میرے پریویس کے پیپرز شروع ہو رہے تھے' سو میں نانو کے پاس بھی کم ہی جاتی تھی۔

"ایک بات تو بتائیں مس نور العین صاحبہ!"

"جی......"

"یہ آپ آخر اپنے والدین کے پاس کیوں نہیں رہیں' کیا جھگڑا ہے آپ کا ان سے؟"

"کیا مطلب......؟" مجھے اس کے سوال پر حیرت ہوئی۔

"مطلب صاف ہے آپ کی وجہ سے نانو یہاں بندھی ہوئی ہیں۔"

"کوئی کسی کی وجہ سے نہیں بندھتا مسٹر کزن میں نے نانو کو نہیں روک رکھا ہے۔ اور میرا اپنے والدین سے کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ اگر نانو جانا چاہیں تو چلی جائیں' میں واپس چلی جاؤں گی۔ اور جب نانو نہیں تھیں یہاں تب اتنے بہت سارے سال میں نے انہی کے پاس گزارے تھے۔"

اس کی آنکھوں میں دلچسپی سی نظر آئی۔

"گویا آپ کو بولنا آتا ہے' ورنہ میرا خیال تھا کہ شاید آپ کو بولنا نہیں آتا۔"

"مجھے بلاضرورت بات کرنا پسند نہیں ہے۔"

"لیکن میں تو مہمان ہوں' آپ کے ملک میں۔"

"نانو ہیں تو آپ کی میزبانی کو۔"

یہ اس سے براہ راست میری پہلی گفتگو تھی' لیکن اس کی بات میرے دل کو چبھی تھی' اور میری انا پر چوٹ پڑی تھی۔ سو میں اس کے جانے کے کچھ دیر بعد ہی نانو کے پاس گئی تھی۔

"نانو آپ اگر عبداللہ کے ساتھ واپس جانا چاہیں تو چلی جائیں...... میرا کوئی مسئلہ نہیں

ہے' میں لاہور مائیگریشن کروالوں گی۔"

"تمہارا تو کوئی مسئلہ نہیں ہے بٹی' تم سے کس نے کہا میں تو اپنی مٹی میں دفن ہونے کے لئے آئی ہوں۔"

"عبداللہ کہہ رہا تھا......لبو۔" مجھے بہت غصہ تھا۔

"ویسے ہی مذاق کر رہا ہے' ورنہ اسے پتا ہے سب۔"

"آپ نے مجھے لبو کہا۔"

میں نانو کے کمرے سے باہر نکلی' تو وہ برآمدے میں کھڑا تھا۔ ایک لمحہ کو میں ٹھٹک گئی' لیکن دوسرے ہی لمحے میں نے کندھے اچکائے۔

"میری مرضی۔"

"تو پھر میں بھی آپ کو کہوں گا۔"

"کیا......"

میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"کیا......؟ ہاں آپ......آپ۔" اس نے سر کھجایا۔

"ابھی مجھے سمجھ نہیں آ رہا پھر سوچ کر بتاؤں گا۔" اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی' اور وہ بہت گہری نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں سر جھٹک کر اپنے کمرے کی طرف چل پڑی' تو اس نے آواز دی۔

"سنیں۔"

"کیا ہے اب۔"

"وہ سمجھ آ گئی ہے کہ کیا کہوں۔ کیوٹ......آپ بہت کیوٹ ہو۔"

مجھے ہنسی آ گئی۔ عجیب آدمی ہے میں سمجھ رہی تھی کہ وہ یوں ہی کوئی فول سا نام دے گا' لیکن یوں گفتگو کا سلسلہ طویل ہوتا گیا' اور پتا ہی نہیں چلا کہ کب کیسے ہم دونوں اپنے دل میں ایک دوسرے کے لئے اچھے جذبے محسوس کرنے لگے۔ ماموں اور ممانی کے بار بار فون آ رہے تھے' وہ عبداللہ کو واپس بلا رہے تھے۔

"ایک بہت اچھی جاب کا ایڈ آیا ہے۔ بہت پرکشش عبداللہ جلدی آ جاؤ" اس روز ان کا فون آیا تو انہوں نے اصرار کیا۔

"جی ڈیڈی میں سوچ رہا ہوں۔"

"تو کیا آپ واپس جا رہے ہو۔"

"ہاں آنے والوں کو ایک دن جانا ہی ہوتا ہے' لیکن اگر تم کہو تو نہ جاؤں۔" اس کی نظریں میرے چہرے پر تھیں۔

"لیکن کیا آپ میرے کہنے پر رک جاؤ گے عبداللہ۔ وہ پرکشش جاب اور......"

"تم کہو تو......کہہ کر تو دیکھو' یہ تو محض ایک جاب ہے جنت میں بھی نہیں جاؤں گا۔"

"مگر عبداللہ!" میں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"میں بھلا تمہیں کیسے روک سکتی ہوں۔"

"پاگل تم مجھے روک چکی ہو۔ تمہیں کیا خبر کہ تم میرے اندر چھید کر کے میرے دل میں پیوست ہوئی جاتی ہو' میں نے نانو کو بتا دیا ہے......وہ خود ہی ڈیڈی اور مما سے بات کر لیں گی۔"

یہ انکشاف بہت خوش کن تھا' اور حیران کر دینے والا تھا۔ عبداللہ سے اچھی خاصی دوستی ہو جانے کے باوجود کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی یہ خیال میرے دل میں نہیں آیا تھا کہ عبداللہ مجھے اس طرح اس انداز میں بھی پسند کر سکتا ہے۔ اس روز میں بہت دیر تک عبداللہ کے متعلق سوچتی رہی' وہ ایک بہت نفیس اور بہت اچھا انسان تھا' اور میرے دل میں بھی نہ جانے کب سے اس کے لئے اس جذبے کی کونپل پھوٹ چکی تھی۔ مجھے اس روز بابا بھی یاد آئے اور حمزہ کا بھی خیال تھا۔ میں نے حمزہ سے محبت نہیں کی تھی' لیکن میں نے اسے سوچا ضرور تھا۔

"بابا کی خواہش کو اپنے دل میں سجایا تھا' لیکن اب یہ عبداللہ جو نہ جانے کن چور راستوں سے دل میں گھس آیا تھا۔

"اور یہ کتنی خوشی کی بات ہے' بٹی کہ ہمارے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے' اور کوئی ظالم سماج ہمارے راستے میں نہیں آئے گا' بس نانو' ڈیڈی اور مما سے بات کریں گی' اور پھر پھوپھو سے ایک روز اس نے کہا تھا۔

اور میں نے سوچا تھا واقعی ہاہے راستے میں تو کوئی رکاوٹ نہیں ہے' لیکن مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں تو بچپن سے ہی محروم رہی ہوں تو اب کیسے ممکن ہے۔ ماما' پاپا اور زیب اچانک ہی کراچی آ گئے تھے۔ پاپا تو دو دن رہ کر چلے گئے' لیکن ماما اور زیب وہاں ہی ٹھہر گئے تھے۔ زیب بالکل ویسی ہی تھی' تنگ مزاج اور مغرور سی اور مجھ سے خفا خفا......وہ ابھی تک حمزہ کی ناراضی کا سبب مجھے سمجھ رہی تھی' حالانکہ اس کا سب سے بڑا سبب وہ خود تھی' وہ خوبصورت تھی اسٹائلش تھی' ایجوکیٹڈ تھی۔

اور حمزہ نے پہلی بار اسے دیکھ کر پسند کیا تھا' لیکن اس نے خود اسے دور کر دیا تھا' اپنی عادت اور مزاج کی وجہ سے۔ حمزہ جس ملک سے آیا تھا' وہاں ہر طرح حسن بکھرا ہوا تھا' جن مشرقی اقدار کو وہ اس میں دیکھنا چاہتا تھا اور جن کا خاکہ بابا نے اس کے ذہن میں بٹھا دیا تھا' وہ زیب میں نہ تھیں' لیکن پھر بھی وہ مجھے مجرم سمجھتی تھی۔ ماما کے ساتھ بھی اس کا رویہ خاصا کھردرا سا تھا' لیکن ماما تھیں کہ وہ صرف اس کی خاطر کراچی آئی تھیں' اور میں سمجھ رہی تھی شاید مجھ سے ملنے۔

''دراصل اماں میں زیب کے لئے آئی ہوں' وہ انور کا خیال ہے کہ اگر بھائی جان عبداللہ کے لئے زیب کا رشتہ لے لیں تو۔''

''کمال کرتی ہو تم بھی تاجی۔''

نانو اور ماما ٹی وی لاؤنج میں تھیں' اور میں کچن میں اپنے لئے چائے بنا رہی تھی' اور ان کی آواز بخوبی مجھ تک آ رہی تھی۔

''اماں اس میں آخر حرج ہی کیا ہے۔ انہیں کہیں نہ کہیں تو عبداللہ کی شادی کرنا ہی ہے نا تو پھر زیب میں کیا برائی ہے۔''

''حیرت ہے تم پر تاجی تمہیں اپنی بیٹی دکھائی نہیں دیتی۔''

''ہو جائے گا اس کا بھی اماں' ابھی تو پڑھ رہی ہے' پھر زیب اس سے بڑی بھی ہے' اور مجھے اس کی فکر بھی ہے۔ انور بھی بہت پریشان رہتے ہیں۔ طلاق کی وجہ سے آپ کو پتا ہے باہر اس کے رشتے کا کتنا پرابلم ہے۔ آنے والے سو سوال کرتے ہیں' کیوں ہوئی طلاق' شادی تیار تھی کوئی تو وجہ ہوگی...... اس لئے مجھے عبداللہ کا خیال آیا تھا' وہ تو اپنا ہے' بھائی جان آپ کی بات نہیں ٹالیں گے' آپ ان سے بات تو کریں نا۔''

''میں بات کر چکی ہوں آصف سے' لیکن عینی کے لئے اور آصف کو کوئی اعتراض نہیں ہے' تم زیب کے لئے کہیں اور کوشش کرو۔''

''اماں کہاں کوشش کروں' اگر حمزہ والا معاملہ نہ ہوتا تو شاید...... اماں آپ بھائی جان سے بات تو کریں زیب میں کیا برائی ہے۔''

''حد ہے تم پر بھی تاجی...... میں کہہ رہی ہوں کہ میں بات کر چکی ہوں آصف سے' اور شاید وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند بھی کرتے ہیں' اور عبداللہ اور مزاج کا لڑکا ہے' وہ اپنے فیصلے خود کرتا ہے۔''

''مگر اماں پلیز! آپ ایک بار پوچھ کر تو دیکھیں عبداللہ سے' اور پھر بھائی جان سے۔'' ماما

کے لہجے میں لجاجت تھی' اور میرے اندر کہرا سا گرنے لگا' اور ایک عجیب سی مایوسی' دکھ' رنج کے سائے میرے وجود میں پھیلتے چلے گئے۔ عبداللہ مجھ سے محبت کرتا تھا' بہت شدت سے' مجھے یقین تھا وہ ماما کا پروپوزل ہرگز قبول نہیں کرے گا' لیکن مجھے ماما کی نظروں سے خوف آتا تھا۔ التجا کرتی معذرت کرتی نظریں۔

ماں مانگتی...... اور میں ان نظروں سے ہار جاتی تھی' پتا نہیں ماما پاپا اور زیب ہمیشہ ہی میرے معاملے میں خود غرض کیوں ہو جاتے تھے' اور اب بھی ماما خود غرض ہو رہی تھیں' اگرچہ نانو نے انہیں بتا بھی دیا تھا کہ میں اور عبداللہ ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں' پھر بھی ان کی نظریں اٹھتے بیٹھتے میرا تعاقب کرتی تھیں' اور پھر وہ میرے سامنے سوالی بن کر آ کھڑی ہوئیں۔ زندگی میں پہلی بار انہوں نے نظروں کے ساتھ ساتھ لفظ بھی استعمال کیے۔ انہوں نے شاید چند دنوں میں اندازہ لگا لیا تھا کہ عبداللہ اپنے دل میں میرے لئے کیا جذبے رکھتا ہے۔

''عبداللہ تمہاری بات نہیں ٹالے گا' یعنی تم اس سے بات کرو کہ وہ زیب سے......''

اور میں حیران نظروں سے انہیں دیکھتی رہ گئی۔ میرا دل جیسے کسی نے دو ٹکڑے کر دیا' میں نے کچھ نہیں کہا۔ بس نظریں جھکا لیں۔ میں جانتی تھی کہ میں ماما کی نظروں سے ہار جاؤں گی اور یہ احساس کتنا اذیت ناک تھا' اس شخص سے دستبردار ہو جانے کا احساس' جسے دل نے سب کچھ مان لیا۔ دل میں اذیت کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ جیسے پورے وجود میں کسی نے اذیتیں اتار دی ہوں۔

ماما اپنی بات کر کے مجھ سے نظریں ملائے بغیر کمرے سے باہر چلی گئی تھیں' اور باہر نانو کی گود میں سر رکھے رو رہی تھیں۔

''عمر بھر کی ریاضتیں رائیگاں جا رہی ہیں پلیز اماں کچھ کریں۔ مجھے انور کی نظروں میں سرخرو کر دیں۔''

کس قدر خوش ہیں سب ماما' پاپا اور زیب یہ سوچنے کے باوجود میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں ماما کو پاپا کی نظروں میں سرخرو کر دوں گی' چاہے جان سے گزر جاؤں ماما کی عمر بھر کی ریاضتیں رائیگاں نہیں جائیں گی۔ میں عبداللہ کو منا لوں گی' کہ وہ زیب سے شادی کر لے' لیکن رگوں کو کاٹتا ہوا یہ درد کس قدر جان لیوا ہے...... روح کھینچتا ہوا' کاش ماما جان سکتیں...... کہ انہیں سرخرو کرنے کیلئے مجھے کتنا بڑا خراج ادا کرنا پڑا۔

❊ ❊ ❊

پتا نہیں کیوں میرا دل ڈوب رہا ہے' اور آنکھیں بھر بھر آ رہی ہیں۔ اگرچہ مجھے تو خوش ہونا چاہئے کہ میں انور کی نظروں میں سرخرو ہو جاؤں گی...... شاید یہ آخری امتحان ہے اور اگر ایسا نہ ہوتا تو...... اگر عینی عبداللہ کو سمجھانے کا وعدہ نہ کرتی تو میری عمر بھر کی ریاضتیں رائیگاں چلی جاتیں' لیکن میں کیا کروں میرا دل لحہ لحہ ڈوب رہا ہے۔ عینی کا چہرہ بار بار میری آنکھوں کے سامنے آ رہا ہے۔ کتنا کرب تھا اس کی آنکھوں میں' کتنے شکوے' کتنی شکایتیں تھیں' لیکن اس نے زبان سے کچھ نہیں کہا' کوئی گلہ نہیں کیا' کوئی شکوہ نہیں کیا۔ ہمیشہ کی طرح آپ پریشان نہ ہوں' ماما میں عبداللہ سے کہوں گی' بلکہ اسے مجبور کروں گی۔

اور پھر وہ چلی گئی۔ اس کا ایک ایک قدم میرے دل پر پڑ رہا تھا۔ مجھے تو خوش ہو جانا چاہئے تھا' یہی تو چاہتی تھی میں اس لئے تو میں نے یہ سفر کیا ہے' اور یہاں تک آئی ہوں۔ انور کتنے پریشان تھے زیب کے لئے' اور میں خود بھی تو کم پریشان نہیں تھی۔ جانے کتنے لوگوں سے کہہ رکھا تھا' لیکن بات کہیں بنتی ہی نہ تھی۔ حالانکہ زیب میں کوئی کمی تو نہ تھی' پڑھی لکھی تھی' خوش شکل تھی' بس وہ جو طلاق کا دھبہ لگ گیا تھا...... اور زیب سمجھتی تھی کہ اس میں میرا قصور ہے یا عینی کا حالانکہ بس' اچانک ہی ایک روز انور کو عبداللہ کا خیال آیا تھا۔

''وہ عبداللہ بھی تو آج کل پاکستان آیا ہوا ہے' تم بات کر کے دیکھو اماں سے۔''

''ہاں بات کروں گی۔''

مجھے انور کی بات پسند آئی تھی' لیکن پھر پتا نہیں کیوں میں اماں سے بات نہیں کر سکی' تب ایک روز انور نے پھر کہا۔

''تاجی تم نے بات کی اماں سے۔''

''نہیں۔''

''تاجی کیوں...... کیوں بات نہیں کی تم نے اماں سے۔''

انور کی آنکھوں میں شکوک تھے' اور مجھے انور کی ان نظروں سے کتنا خوف آتا تھا۔

''یونہی میں سوچ رہی تھی پتا نہیں عبداللہ کس مزاج کا ہے' اس نے ساری عمر غیر ملک میں گزاری ہے۔ اس کا مزاج کیسا ہے اور......''

''اوہ......''

انور کی آنکھوں سے شکوک مٹ گئے۔ ایک ملائم سا جذبہ ان میں ہلکورے لینے لگا۔

''بہت اچھا لڑکا ہے عبداللہ' خود بھی ملا ہوں اس سے' بہت اچھے مزاج کا ہے۔ ایسا کرو

تاجی تم کراچی چلی جاؤ...... عینی سے بھی مل آؤ اور اماں سے بھی بات کر لو...... عبداللہ کو بھی دیکھ لو گی' بلکہ تم اماں سے کہنا کہ ہر صورت وہ بھائی جان اور بھابی کو راضی کر لیں اس کے لئے۔''

اور اب جب کہ ایسا ہو گیا تھا تو دل کیوں چاہ رہا تھا کہ چیخ چیخ کر رو لوں۔ کتنا مشکل اور طویل سفر طے کیا ہے میں نے جیسے' بائیس سال تک میں تنے ہوئے رسوں پر چلتی رہی ہوں' اور ہر لمحے یہ خوف کہ کہیں گر نہ جاؤں...... کہیں...... گرنے سے زیادہ گرنے کے خوف نے مجھے اپنے شکنجے میں جکڑے رکھا۔ یہ سفر جو بیس سال پہلے شروع ہوا تھا' اور تب مجھے ہرگز معلوم نہیں تھا کہ یہ سفر اتنا مشکل ہوگا۔ بال سے زیادہ باریک پل صراط پر سفر کیا ہے میں نے' اور ہر لمحہ گرنے کے خوف نے ادھ موا کر دیا ہے مجھے۔ میرے اعصاب تھک گئے ہیں' میرا وجود نڈھال ہو رہا ہے' اور میرا دل نہ جانے کتنے ٹکڑوں میں بٹ چکا ہے۔ ایسا تو نہیں سوچا تھا میں نے...... چوبیس سال پہلے جب انور سے میری منگنی ہوئی تھی' تب میری عمر ہی کیا تھی۔ پندرہ سولہ سال...... میں کتنا روئی تھی اور اماں سے جھگڑا کیا تھا۔

''کیا میں بہت زیادہ کھانا کھا جاتی ہوں' جو اتنی جلدی کر رہی ہیں۔''

''منگنی کی ہے صرف شادی تو تمہاری پڑھائی کے بعد ہوگی۔'' اماں نے مجھے اطمینان دیا تھا' پھر بھی شروع شروع میں انور مجھے اچھا نہیں لگتا تھا۔ مجھے اس پر بہت غصہ آتا تھا' لیکن پھر ہولے ہولے مجھے وہ اچھا لگنے لگا تھا۔ کبھی کبھی وہ فون پر بات کرتا تو ہفتوں اس کی باتیں دل میں ہلچل مچائے رکھتی تھیں۔ مجھے تو پتا ہی نہیں چلا کہ کب کیسے وہ میرے دل میں اتر آیا۔ اس کا خیال' اس کی محبت میری رگوں میں لہو کے ساتھ دوڑنے لگی' اور آنٹی...... آنٹی عاصمہ تو مجھ سے اتنا پیار کرتی تھیں' کہ میں حیران ہوتی تھی کہ لڑکیاں مجھے سسرال سے ڈراتی کیوں تھیں۔ آنٹی تو اماں سے بھی زیادہ پیار کرنے والی تھیں' مگر پھر اچانک ہی آنٹی بیمار ہو گئیں' انور بہت پریشان تھا۔

''تاجی شاید ہم جلد ہی بچھڑ جائیں۔ عمر بھر ساتھ چلنے کا سوچا تھا' لیکن یہ سفر ادھورا ہی رہ جائے گا۔'' ایک روز اس نے فون کیا۔

''لیکن کیوں انور کیا ہو گیا ہے؟'' میں بے چین ہو گئی۔

''ہم ہمیشہ ساتھ چلیں گے عمر بھر' میں اماں سے کیا گیا وعدہ نبھا نہ پاؤں گا' مجھ سے کہیں ناانصافی ہو جائے گی۔''

میں انور کی بات سمجھ نہیں پا رہی تھی' تب اس نے وضاحت کی تھی۔

''تاجی تمہیں پتا ہے اماں کو کینسر ہو گیا ہے' اور زیب بہت چھوٹی ہے۔ اماں کا خیال ہے کہ

وہ میری شادی جلدی کر دیں۔ تم گھر آ جاؤ گی تو زیب کو سنبھال لو گی۔ لیکن تاجی تم اتنی معصوم اور اتنی چھوٹی سی ہو کہ میں تم پر کوئی بوجھ نہیں ڈالنا چاہتا۔ اس لئے میں نے سوچا ہے کہ میں شادی نہیں کروں گا' اور خود زیب کا خیال رکھوں گا۔ یہ میری ذمہ داری ہے اسے مجھے ہی سنبھالنا ہے۔''

وہ بہت افسردہ تھا خود میرا دل جیسے کٹنے لگا۔ انور کے بغیر زندگی کا سفر طے کرنا میں نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔

''نہیں انور ہم دونوں مل کر اس ذمہ داری کو سنبھالیں گے۔''

''بہت مشکل سفر ہے تم تھک جاؤ گی تاجی۔'' انور نے مجھے بہت سمجھایا تھا' لیکن میں نے سوچا تھا بھلا یہ کیسے مشکل ہے' ایک ننھی منی بچی کو سنبھالنا اور بچے تو مجھے یوں بھی اچھے لگتے تھے۔ عبداللہ...... مانی' ثناء سب سے ہی مجھے بے حد پیار تھا' بلکہ میری جان انکی رہتی تھی بچوں میں...... پھر بھلا زیب کو میں کیوں نہیں سنبھال سکتی' سو میں نے انور سے کہا میں ہر امتحان میں پوری اترو گی' تم دیکھنا تو' لیکن خدا کے لئے ایسا مت سوچو' اور تب آنٹی نے اماں سے میری رخصتی کی بات کی تھی۔ بھائی جان نے بہت مخالفت کی' اماں بھی متردد تھیں' لیکن پھر میرا رجحان دیکھا اور ابا کی بھی مرضی تھی۔ سو میں پڑھائی نامکمل چھوڑ کر رخصت ہو کے انور کے ہاں آ گئی۔ آنٹی کا تو بس نہیں چلتا تھا کہ میرے پاؤں تلے ستارے بچھا دیں۔ تین ماہ میں انہوں نے مجھے اتنی محبت دی کہ شاید ہی کسی ساس نے کسی بہو کو دی ہو۔

زیب کا خیال رکھنا' ماں بن کر پالنا اسے۔'' وہ اکثر کہا کرتی تھیں۔

''بہت بدنصیب ہے یہ پیدا ہوئی تو باپ کی محبت سے محروم ہو گئی۔ کتنا انتظار کیا تھا میں نے اس کا' کتنی دعائیں کی تھیں اس کے لئے' اور جب یہ آئی تو مجھے اس کا انتظار نہ تھا اور نہ ہی اس کی خواہش تھی۔ میں نے کتنی ہی بار آنٹی سے وعدہ کیا تھا' کہ میں زیب کا خیال رکھوں گی' بہت زیادہ اور اس وعدے کو نبھانے میں...... میں نے اپنا آپ تھکا ڈالا ہے' اپنی بیٹی کو اپنی محبتوں سے محروم کیے رکھا' لگتا ہے جیسے کانٹوں پر پا پیادہ سفر کیا ہے میں نے' بائیس برسوں پر محیط یہ امتحان...... جب عینی دنیا میں آئی تو زیب تین سال کی تھی...... انور کو کچھ خاص خوشی نہ ہوئی۔

''ابھی زیب بہت چھوٹی تھی' ابھی کچھ مدت اور اگر بچے نہ ہوتے تو اچھا تھا۔''

اس روز جب ڈاکٹر نے مجھے ماں بننے کی نوید دی تھی' تو میں نے بے حد خوش ہو کر انور کو بتایا تھا۔ لیکن انور کی بات سن کر میرا دل مرجھا گیا تھا' اور میری خوشی اندر ہی کہیں دم توڑ گئی تھی' اور پھر عینی کی آمد تک میں اپنے آپ میں شرمندہ ہی رہی اور عینی کی پیدائش کے بعد کتنی ہی بار ایسا

ہوا' جب انور نے مجھے احساس دلایا کہ عینی کی وجہ سے زیب نظر انداز ہو رہی ہے' حالانکہ ایسا تو بالکل بھی نہیں تھا۔ میں نے کبھی بھی زیب کو نظر انداز نہیں کیا تھا' مگر اس روز عینی بری طرح رو رہی تھی۔ شاید اس کے پیٹ میں درد تھا' میں نے اسے گود میں اٹھایا ہی تھا کہ زیب میری گود میں آنے کے لئے مچلنے لگی' اور حلق پھاڑ پھاڑ کر رونے لگی۔ تب ہی انور آ گئے۔

''تاجی میں نے تمہیں کہا تھا کہ تم اس امتحان میں پوری نہیں اتر سکو گی۔''

وہ زیب کو اٹھانے کے لئے جھکی' لیکن وہ تو میری ہی گود میں آنا چاہتی تھی۔ میں نے عینی کو بیڈ پر لٹا دیا' اور زیب کو گود میں اٹھا کر بہلانے لگی۔ عینی رو رہی تھی' شاید اسے کوئی تکلیف تھی۔ میرا دل کٹ رہا تھا' مگر مجھے تو اس امتحان میں کامیاب ہونا تھا۔ عینی خود ہی روتے روتے تھک کر چپ ہو گئی' اور سو گئی...... اور ایسے کتنے ہی کڑے امتحان میری زندگی میں آئے' ہر بار میرے دل میں جیسے زخم سا ہو جاتا تھا۔ شروع شروع میں دل بہت تڑپتا...... کئی بار میں چھپ چھپ کر روئی' جب عینی کے لئے کھلونے نہ خرید سکی۔ جب کوئی اچھا فراک زیب کے لئے لیتی اور اتنے پیسے نہ بچتے کہ عینی کے لئے بھی ویسا ہی فراک لے سکوں' پھر ہولے ہولے میں نے دل کو سمجھا لیا...... وہ اندر سے کتنا بھی تڑپتا بظاہر میں کچھ ظاہر نہ کرتی تھی' کبھی کبھی انور کو خود عینی پر ترس آ جاتا تھا' یا پیار تو میں منع کر دیتی...... ایک بار جب وہ عینی کے لئے گڑیا لائے' تو میں نے زیب کے ضد کرنے پر اسے دے دی تو انور نے منع بھی کیا تھا' اور رات کو دیر تک مجھ سے بحث بھی کی تھی۔

''وہ بھی بچی ہے...... تم بھی حد سے گزر جاتی ہو۔''

''کوئی بات نہیں بہل جائے گی۔''

میں نے بات ختم کر دی تھی' لیکن رات دیر تک مجھے نیند نہ آئی تھی اور عینی کے خاموش نامعلوم آنسو میرے دل پر گرتے رہے تھے' لیکن مجھ پر تو دھن سوار تھی۔ اس امتحان میں سرخرو ہونے کی' اور اس دھن میں عینی کو میں نے خود سے دور کر دیا تھا۔ عینی میرے قریب نہیں آتی تھی' دور دور سے مجھے دیکھتی تھی۔ زیب کو زیادہ لاڈ پیار نے ضدی اور کچھ خودسر سا بنا دیا تھا۔ انور اس کی کوئی بات نہیں ٹالتے تھے' میں عینی کے لئے کوئی چیز لاتی اور وہ اسے پسند آ جاتی تو وہ مزے سے لے لیتی۔ عینی خاموش رہتی تھی۔ پھر اماں آئیں تو انہوں نے مجھے ڈانٹا کہ میں نے عینی کی شخصیت مسخ کر دی ہے۔ وہ اسے ساتھ لے جانا چاہتی تھیں۔ میں نے روکا نہیں۔ سوچا شاید اس طرح اس کی شخصیت میں جو کمی رہ گئی ہے پوری ہو جائے۔ میں نے ہر روز اسے یاد کیا' لیکن واپس نہیں بلایا' پھر اماں چلی گئیں تو وہ آ گئی۔ عینی میں کچھ تبدیلی ضرور آئی تھی' لیکن گھر میں وہ خاموش ہی رہتی البتہ شہر بانو نے مجھے

بتایا کہ وہ ملک صاحب کے ہاں خوب چہکتی ہے۔ تب ہی تو میں نے کبھی اسے وہاں جانے سے نہیں روکا۔ جب وہ ملک صاحب کے ہاں سے آتی تو اس کے چہرے پر ایک چمک ہوتی تھی۔ وہ بچپن سے ہی ادھر جا رہی تھی پھر جب ہم اپنے فلیٹ میں منتقل ہوئے تو زیب نے کتنی فرمائشیں کیں اپنا کمرہ اپنی مرضی سے سیٹ کیا۔ اس کے کمرے کے لئے فرنیچر، پردے کوئی بھی چیز خریدتے ہوئے مجھے عینی کا خیال بار بار آتا مگر ہر بار میں اس کا خیال ذہن سے جھٹک دیتی۔ نہیں پہلے زیب کا کمرہ اس کی مرضی کے مطابق سیٹ ہو جائے تو پھر عینی کا کمرہ بھی سیٹ کرلوں گی...... میں نے ہمیشہ ہی عینی کی حق تلفی کی لیکن پتا نہیں کیوں مجھے ہمیشہ یہ یقین ہوتا تھا کہ عینی میرا مان رکھ لے گی۔ وہ مجھے انور کی نظروں میں نامعتبر نہیں ہونے دے گی۔ جب ملک مختار پہلی بار ہمارے گھر آئے تھے اپنے بیٹے کے ساتھ اور انہوں نے عین کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا کہ عینی کو انہوں نے بیٹی بنا رکھا ہے لیکن اب وہ باضابطہ طور پر اپنی بیٹی بنانا چاہتے ہیں ہمیشہ کے لئے گھر لے جانا چاہتے ہیں اسی لئے وہ آئے ہیں۔ ان کا بیٹا مجھے بہت اچھا لگا تھا میرے اندر جیسے یکدم پھول کھل اٹھے تھے۔ چراغاں ہو گیا تھا لیکن پھر پہلے ہی روز زیب نے حمزہ کو اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ زیب بچپن سے ہی بہت خودغرض تھی۔ وہ ہم سے کبھی بھی اتنی محبت نہ کر سکی جتنی ہم نے اس سے کی تھی اور عینی سے تو اس کی کبھی بنی ہی نہ تھی۔ اس نے عینی کو قبول ہی نہیں کیا تھا۔ موقع ملتے ہی وہ اس کی چٹکی کاٹ لیتی۔ گرا دیتی یا تھپڑ مارتی۔ میں عینی کی آمد سے اتنا سہم گئی تھی کہ میں نے ذہنی طور پر اسے تیار ہی نہیں کیا تھا کہ اس کی منی سی بہن یا بھائی آنے والا ہے۔

میں تو دعائیں مانگتی رہی تھی کہ وہ دنیا میں نہ آئے انور کی ناراضی کا خوف میرے اندر کنڈلی مار کر بیٹھ گیا تھا۔ اس لئے تو عینی کے بعد اور کوئی دنیا میں نہ آ سکا۔ حالانکہ ایک بار جب عینی کافی بڑی ہو گئی تھی کوئی دس گیارہ سال کی تو انور نے دبے لفظوں میں بیٹے کی خواہش کی تھی۔ کتنی قربانیاں دی تھیں میں نے، کتنی خواہشوں کو مارا تھا لیکن پھر بھی ہاتھ کیا آیا تھا جب زیب حمزہ سے شادی کی خواہش ظاہر کی اور بتایا کہ حمزہ بھی اس سے شادی کا خواہش مند ہے تو میں نے انور سے کہا۔

''ملک صاحب نے عینی کے لئے بات کی ہے اور عینی بھی ملک صاحب سے بہت مانوس ہے بچپن سے ہی اس کا ادھر آنا جانا ہے۔'' تب انور نے حیرت سے مجھے دیکھا تھا۔

''تاجی تم کبھی زیب اور عینی کے مسئلے میں خودغرضی کا ثبوت دو گی مجھے پتا نہ تھا...... زیب بڑی ہے اور اصولاً بھی زیب کی شادی پہلے ہونی چاہئے لیکن تم......'' پھر اس کا لہجہ بدل گیا۔

''تم زیب کی ماں نہیں ہو عینی کی ماں ہو آج پتا چل گیا اس مقام پر آ کر تم انصاف نہیں کر سکی

ہو تاجی......'' اور میرے اندر برسات ہونے لگی تھی۔ عمر بھر کی ریاضتوں کو لمحہ بھر میں محض ایک جملہ کہہ کر انور نے رائیگاں کر دیا تھا کیا کچھ نہیں کیا تھا میں نے زیب کے لئے حتیٰ کہ اپنی محبت و شفقت کو بھی محدود کر دیا تھا اور اب انور مجھ سے کس امتحان کا متقاضی تھا خدایا کتنے امتحان ابھی اور باقی ہیں۔

''میرے اندر ہر وقت برسات رہنے لگی۔ حمزہ اور زیب کا نکاح ہو گیا۔ عینی نے کچھ نہ کہا۔ انور نے ممنونیت کا اظہار کیا لیکن میرے دل پر جیسے منوں بوجھ آ گرا تھا۔ میں عینی سے نظر نہ ملا پاتی تھی۔ اس کی سوال کرتی نظریں مجھے اندر تک ہلا دیتی تھیں۔ کسی سوال کا جواب نہ تھا میرے پاس۔ میں نے تو ساری زندگی عینی کی حق تلفی کی ہے اور اب پھر محض انور کی نظروں میں سرخرو ہونے کے لئے ایک بار پھر اس سے اس کی خوشی چھیننے آ گئی ہوں۔ کیسی ماں ہوں میں میں نے کبھی ایک بار بھی اس کے متعلق ماں بن کر نہیں سوچا۔ ہمیشہ عہد نبھانے اور نہ نبھا سکنے کے خوف میں مبتلا زیب کے گرد پروانوں کی طرح چکر لگاتی رہی ہوں...... کتنا صحیح کہا تھا انور نے۔

''یہ بہت مشکل امتحان ہے تاجی تم نہ چل سکو گی۔'' اور میں اس چلنے میں ہانپ ہانپ گئی ہوں۔ کتنے ہی ایسے مقام آئے جب عینی کو میری ضرورت تھی لیکن میں زیب کے پاس تھی۔ جب زیب اور عینی کے سکول میں ایک ہی روز پرائز ڈسٹری بیوشن فنکشن ہوا تھا اور میں نے عینی سے وعدہ کیا تھا کہ اس کے سکول آؤں گی اسے پرائز ملنا تھا لیکن پھر زیب کے ضد کرنے پر اس کے ساتھ چلی گئی تھی اور وہاں ہال میں بیٹھے ہوئے سارا وقت میرا دھیان عینی کی طرف رہا تھا۔ اس نے میرا انتظار کیا ہو گا۔ پرائز لیتے وقت بھی والدین کے ہجوم میں اس کی نظروں نے مجھے کھوجا ہو گا اور پھر جب ایک بار عینی کو خسرہ ہو گیا تھا اور انہی دنوں زیب کو بھی فلو ہو گیا تھا اور ہلکا ٹمپریچر بھی...... تب زیب آٹھ سال کی اور عینی پانچ سال کی تھی اور جب میں زیب کی ضد پر اس کو پاس لٹائے کہانی سناتی تو عینی اپنے بیڈ پر بیٹھے ہوئے کتنی حسرت سے دیکھتی تھی مجھے۔ میرا دل کٹ جاتا تھا اور میں رخ موڑ لیتی اور میرا کتنا جی چاہتا تھا کہ عینی کو بھی اسی اچھے سکول میں داخل کراؤں جہاں زیب ہے لیکن یہ ممکن نہیں تھا اور میں نے تو ایک بار بھی انور سے اس خواہش کا اظہار نہیں کیا تھا لیکن جب انور نے کہا تو میں نے منع کر دیا کہ مجھے پتا تھا کہ ہم اتنے اخراجات کے متحمل نہیں ہو سکتے اور کہاں کہاں کس کس جگہ میں نے اپنے دل کو نہیں مارا...... پھر بھی کیا ملا...... انور نے بارہا اعتراف کرنے کے باوجود کہ میں نے جو عہد کیا تھا وہ نبھایا ہے ایک بار پھر کہہ دیا تھا کہ زیب کی جگہ اگر عینی ہوتی تو میں ضرور عبداللہ کی بات کرتی لیکن یہ زیب ہے جس سے میرا کوئی رشتہ نہیں تو یہ تھا ان ساری ریاضتوں کا صلہ...... ایک بار پھر میرا دل لہولہو ہو

گیا' اور ایک بار پھر میں نے اس امتحان میں کامیاب ہونے کے لئے اپنی ممتا کا گلا گھونٹ دیا ہے۔ کیا میں نے عینی کے چہرے کی چمک نہیں دیکھی۔

کیا عبداللہ کی آنکھوں میں عینی کے لئے وہ جذبے نہیں دیکھے جو انمٹ اور انمول ہوتے ہیں۔ عینی کے چہرے پر کھلتے گلاب رنگ

آنکھوں میں دمکتے موتی۔

کیا یہ سب مجھے دکھائی نہیں دیئے۔ کیسی ماں ہوں میں۔

میں نے اس کے چہرے کے گلاب چرا لئے ہیں' اور آنکھوں کے موتی چھین لئے ہیں' بھلا کس لئے۔ کون جانتا ہے جبر کے رشتے کتنی دیر چلیں گے' اور پھر وہی آبلہ پائی......

میں نے زندگی بھر عینی کو کچھ نہیں دیا' مگر اب...... ہاں اب میں عینی سے کچھ نہیں چھینوں گی......اس کی خوشی' اس کی مسرتیں اسی کا حصہ ہیں۔

میں نے سوچا ہے' اور میرا ڈوبا ڈوبا دل اپنے آپ تیرنے لگا ہے اور شادی کے بعد پہلی بار میں نے خود کو ہلکا پھلکا محسوس کیا ہے۔

میں نے فیصلہ کرلیا ہے۔ عینی اور عبداللہ کی شادی کا۔ بھلے انور کچھ بھی سوچے۔

میں بہت آہستہ سے اٹھی ہوں اور ہولے ہولے چلتی ہوئی اماں کے پاس آ کر بیٹھ گئی ہوں۔

''اماں بھائی جان کو فون کر دیں' مجھے عینی کے لئے عبداللہ کا رشتہ منظور ہے۔''

اماں حیرت سے مجھے دیکھ رہی ہیں' لیکن میں ہنس رہی ہوں۔

''ہاں اماں۔''

''میں نے تنے ہوئے رسوں پر چلنے کے خوف سے خود کو آزاد کرا لیا ہے' اور بائیس برسوں سے چھپا کر رکھی ہوئی ممتا اُمڈ آنے کو بے تاب ہے۔''

اماں نے بے اختیار مجھے گلے سے لگا لیا' اور میں ان کے سینے پر سر رکھے ہولے ہولے کہہ رہی ہوں۔

''اماں عینی کو بلائیں' میں اسے گلے لگا کر بہت پیار کرنا چاہتی ہوں' اتنا پیار جو اس بائیس برسوں کی تشنگی کو ختم کر دے۔ اماں کے آنسو میرے بالوں میں گر رہے ہیں' اور میرے آنسو میرے رخساروں کو بھگوتے جا رہے ہیں۔

❋❋❋

مسافتیں بے نشان ٹھہریں

یہ کہانی ملائکہ محب اللہ خان کی ہے۔ ملائکہ میری کون ہے' اور میں اس کی کہانی کیوں لکھ رہی ہوں' تو شاید اس کا جواب میرے پاس نہیں ہے۔ وہ میری کون تھی؟ اس کے اور میرے بیچ کیا رشتہ تھا؟ محب و محبوب کا' ہمدرد کا' دوست کا یا جانے کیا' میں آج تک جان نہیں پایا ہوں۔ شاید مجھے اس سے محبت ہو گئی تھی' یا پھر شاید مجھے اس سے ہمدردی تھی۔ مجھے اس پر ترس آتا تھا۔ میں محض اسے تباہ ہونے سے بچانا چاہتا تھا۔ ایک خوبصورت' ذہین اور بے ضرر ایجوکیٹڈ لڑکی کو' بہر حال جو کچھ بھی تھا' اتنے برس بیت جانے کے بعد بھی میں اسے نہیں بھولا۔ بھول ہی نہیں پایا ہوں۔ شاید اس کی کہانی کا قرض مجھے اتارنا ہے' یا شاید میں اسے اس لئے نہیں بھلا پایا' کہ وہ کچھ انوکھی سی تھی۔ اس کے اندر محبت کو پانے کی بڑی حب تھی' لیکن اس کے اندر کے الجھاؤ اور نفسیاتی گرہیں اتنی شدید تھیں' کہ وہ محبت پانے کو لپکتی تو لیکن...... ایک بار اس نے کہا تھا۔

''ڈاکٹر حبیب احسن! تم میری کہانی لکھو۔''

''اچھا لکھوں گا۔'' میں ہنس دیا۔ ''لکھوں گا' لیکن کیا' ایک پاگل سی لڑکی ہے جو......''

''تم وعدہ کرو میری کہانی لکھو گے۔''

وہ مچل اٹھی' اور جب وہ ضد پر اتر آتی تھی' تو کسی کی نہیں سنتی تھی۔ مجھے وعدہ کرتے ہی بنی۔ میں کوئی بڑا رائٹر نہیں ہوں' لیکن کبھی کبھار کچھ نہ کچھ لکھتا ہوں۔ کچھ اندر سے باہر آنے کو بے تاب ہو' جب کوئی چیز اندر چبھ رہی ہو' اور میں اسے کہہ نہ پاؤں' تو میں قلم اٹھا لیتا ہوں' تو شاید اسی وعدے کا بوجھ مجھے ملائکہ محب اللہ کو بھولنے نہیں دیتا۔ ان بیتے سات سالوں میں' میں اسے کبھی بھول ہی نہیں پایا' اور ایسا ہے کہ میں نے ان بیتے سالوں میں کچھ لکھا بھی نہیں ہے۔

آج قلم اٹھایا ہے تو جی چاہا کہ ملائکہ کی کہانی لکھوں۔

ملائکہ ایک ایسی لڑکی تھی‘ جسے خود اپنی صلاحیتوں کا ادراک نہیں تھا‘ یا اگر ادراک تھا بھی پھر بھی اسے خود پر اعتماد نہیں تھا‘ اس لئے وہ ساری زندگی دوسروں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنتی رہی۔ اس نے وہی کیا‘ جو دوسروں نے چاہا‘ بلکہ دوسرے بھی کون اس کی ماں اور اس کا ماموں۔ اگر وہ اپنی زندگی کے فیصلے خود کرتی تو شاید کہانی مختلف ہوتی۔ شاید اس کے ساتھ وہ سب کچھ نہ ہوتا‘ جو ہوا‘ پتا نہیں اس سب کے لئے وہ قصور وار تھی‘ یا دوسرے یا پھر اگر وہ خود قصور وار تھی‘ تو کتنے فیصد۔ میں نے جب اسے پہلی بار دیکھا تھا‘ تو اس نے بلیو جینز پر گھٹنوں سے اونچا کرتا پہن رکھا تھا‘ جس کے گلے پر کڑھائی تھی۔ چھوٹے چھوٹے بلیو اور وائٹ پھول‘ اور وہ رو رہی تھی۔ میں نے اس کی آنکھوں سے بہتے آنسوؤں کو دیکھا‘ جو اس کے رخساروں کو بھگو رہے تھے‘ تو میں ٹھٹک کر رک گیا۔ میں اپنے کلینک سے نکل کر پارکنگ کی طرف جا رہا تھا‘ اور وہ پارکنگ میں ہی ایک سائیڈ پر اپنی گاڑی سے ٹیک لگائے کھڑی رو رہی تھی۔

”یہ کون ہے؟ اور یہ اس طرح کیوں رو رہی ہے؟ آخر اس کے ساتھ کیا ہوا ہے؟“ میں نے غیر ارادی طور پر قدم اس کی سمت بڑھا دیئے۔

”یہ لڑکی......“ مجھے لگا‘ جیسے میں نے اسے پہلے بھی کہیں دیکھا ہو لیکن کہاں...... میں نے ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ یکایک میرے ذہن میں روشنی سی کوندی۔

”ارے یہ تو......“ میں چونکا۔ ”یہ تو ملائکہ محب اللہ خان ہے۔ شوبز کی دنیا کا ایک جانا پہچانا نام‘ سکرین کا چمکتا ستارہ‘ ماڈلنگ سے سٹارٹ کر کے سکرین پر تہلکہ مچانے والی ملائکہ محب اللہ۔“

اور پھر تقریباً چھ سات سال پہلے ہی عین عروج کے دور میں شوبز کو خیرباد کہہ دینے والی۔ اب نہ تو وہ کسی ٹی وی ڈرامے میں نظر آتی تھی‘ اور نہ ہی کسی ایڈ میں۔ چند سال پہلے کی بات تھی۔ وہ ٹی وی سکرین پر چھائی ہوئی تھی۔ اس کی اداکاری کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ رسالے اور اخبارات اس کے انٹرویو چھاپتے تھے‘ اس کی اداکاری پر تبصرہ کرتے‘ گو میں نے اسے زیادہ نہیں دیکھا‘ کیونکہ میں تو دو سال قبل ہی پاکستان آیا تھا‘ اور ان دو سالوں میں کہیں کسی ڈرامے میں دکھائی نہیں دی تھی۔ لیکن چند سال پہلے پاکستانی ڈرامے غیر ممالک میں بھی بہت شوق سے دیکھے جاتے تھے۔ میں نے بھی ایک دوست کے ہاں اس کا ڈرامہ دیکھا تھا۔ میرے اس دوست نے پاکستان سے پی ٹی وی کے مشہور ڈراموں کی کیسٹیں منگوائی تھیں۔

ایک بار میں نے ٹی وی پر اس کا انٹرویو بھی دیکھا تھا‘ اور حیران ہو کر اس کی باتیں سنتے

ہوئے از حد متاثر ہوا تھا۔ وہ بہت پڑھی لکھی تھی‘ کم از کم میں اس وقت تک نہیں سمجھتا تھا کہ کوئی پاکستانی اداکارہ اتنی پڑھی لکھی ہو سکتی ہے۔ اس نے اے لیول سینٹ جوزف سے کیا تھا‘ اور پھر گریجویشن لاہور سے کرنے کے بعد ایم ایس سی کیمسٹری اس نے جامعہ کراچی سے کیا تھا۔ اس کے علاوہ کئی ڈپلومے اور کورسز بھی‘ جو اب مجھے یاد نہیں تھے‘ برٹش لہجے میں انگریزی بولتی‘ اس اداکارہ کے انٹرویو کو میں نے بہت دلچسپی سے دیکھا تھا۔ تب ہی تو میں نے اتنے سالوں بعد بھی اسے پہچان لیا تھا‘ وہ بلاشبہ وہی تھی‘ لیکن وہ کیوں رو رہی تھی‘ یہ جاننے کے لئے ہی میں اس کی طرف بڑھا۔ اگر میں امریکہ میں یوں کسی لڑکی کو روتے دیکھتا‘ تو شاید اس کی طرف نہ بڑھتا کہ وہ اپنی ذاتیات میں مداخلت پر خفا بھی ہو سکتی تھی‘ اور عین ممکن ہے وہ مجھ پر کیس بھی کر دیتی‘ لیکن یہ پاکستان تھا‘ وہ مجھے رونے کا سبب نہ بھی بتاتی‘ لیکن وہ کم از کم میرے ساتھ ایسا کوئی سلوک نہ کرتی‘ اسی یقین نے مجھے اس کی طرف بڑھنے کا حوصلہ دیا تھا‘ پھر یکایک وہ مڑی اور میں نے اسے کھڑکی میں جھکتے دیکھا۔ گاڑی میں کوئی اور بھی تھا شاید‘ کیا مجھے لوٹ جانا چاہئے۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ مجھے اس کی آواز سنائی دی‘ وہ چلا رہی تھی۔

”تم گھٹیا عورت! تم مجھے کبھی خوش نہ ہونے دینا۔ تم خودغرض‘ لالچی اور......“

میں اب اس سے اتنے فاصلے پر تھا‘ کہ اس کی آواز مجھے صاف سنائی دے رہی تھی۔ میں حیران کھڑا تھا۔ ٹی وی پر برٹش لہجے میں انگریزی بولتی وہ لڑکی‘ نرمی سے ٹھہر ٹھہر کر بات کرتی‘ جس لڑکی کا امیج میرے ذہن میں بنا ہوا تھا‘ میں اس کے چلانے سے بری طرح مجروح ہوا تھا۔

”ملکی! میں کہہ رہی ہوں آرام سے گاڑی میں بیٹھو اور تماشا مت بناؤ۔“

اندر بیٹھی خاتون نے کہا تھا۔ وہ مجھے نظر نہیں آ رہی تھی‘ لیکن میں اسے سن رہا تھا۔

”میں...... میں تماشا بناتی ہوں یا تم۔“ اب وہ پہلے سے زیادہ زور سے چیخی تھی۔

”تم بناتی ہو میرا تماشا‘ ہر جگہ‘ ہر مقام پر۔“

”بےوقوف مت بنو ملکی! ماں ہوں میں تمہاری اور مجھے تمہاری بہتری چاہئے۔“

”اب پتا نہیں تمہیں میری بہتری چاہئے یا......“ وہ استہزائیہ انداز میں ہنسی تھی۔

”ملکی!“ عورت نے کھڑکی میں سے ہاتھ باہر نکال کر اس کے بالوں کو مٹھی میں بھر کر جھٹکا دیا‘ تو میں بے اختیار ایک قدم آگے بڑھا۔ اس نے اپنے بال اس خاتون کی مٹھی سے آزاد کیے اور پلٹ کر مجھے دیکھا۔

”کیا میں آپ کی کچھ مدد کر سکتا ہوں۔“

"چل اوئے' راہ لگ اپنی۔" گاڑی والی خاتون کا لہجہ ایسا تھا کہ میں کھسیا گیا۔

"وہ سامنے میرا کلینک ہے' میں پارکنگ کی طرف جا رہا تھا کہ آپ کو روتے دیکھا تو...... میں ڈاکٹر ہوں' ڈاکٹر حبیب احسن سائیکاٹرسٹ۔" میں نے وضاحت کی۔

وہ اب میری طرف مڑ چکی تھی۔ اس کے رخسار بھیگے ہوئے تھے' اور آنکھوں سے وحشت برس رہی تھی۔ مجھے لگا جیسے وہ بہت اَپ سیٹ ہو' تب ہی تو وہ اتنا چیخ چیخ کر بول رہی تھی' حالانکہ مجھے اب بھی اس کے لہجے کی نرمی اور شائستگی یاد ہے۔ اس کا تلفظ بھی بہت اچھا تھا۔

"اٹس او کے۔"

اس نے آہستگی سے کہا' اور تیزی سے گاڑی کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی۔ میں نے اندر بیٹھی خاتون کو دیکھا۔ تیز گلابی رنگ کے کپڑوں میں ملبوس' گہرا میک اپ کیے وہ شکل سے کوئی نائیکہ لگ رہی تھی۔ تو کیا ملائکہ محب اللہ کا تعلق اسی علاقے سے ہے۔ ایک لمحہ کو مجھے خیال آیا' مگر دوسرے ہی لمحے مجھے یاد آ گیا کہ کسی میگزین میں' میں نے پڑھا تھا کہ وہ کسی اچھی فیملی سے ہے' اور اس کے والد کسی جاگیردار فیملی کے ہیں۔

ان دنوں جب اس نے شوبز کو خیرباد کہا تھا' تب اس کے متعلق میگزینز میں' اخباروں میں' فلمی پرچوں میں بہت کچھ چھپتا رہا تھا۔ ایسا ہی ایک پرچہ میرے ہاتھ بھی لگ گیا تھا' جس میں اس کے شوبز چھوڑنے کے متعلق مختلف قیاس آرائیاں کی گئی تھیں کہ اسے کسی سے عشق ہو گیا تھا' اور وہ شوبز چھوڑ گئی۔ ایک خیال یہ بھی تھا کہ اس کی شادی اپنے جاگیردار باپ کے خاندان میں ہو گئی ہے' جس کی وجہ سے اس نے اداکاری چھوڑ دی ہے۔ وہ گاڑی پارکنگ سے نکال کر لے گئی تھی' اور میں ابھی تک وہیں کھڑا تھا۔

"تھینک گاڈ" میں نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا کہ اس نے کچھ نہیں کہا تھا' ورنہ...... شکر ہے کہ یہ پاکستان تھا۔

❋❋❋

میں ایک ڈاکٹر ہوں' ایم بی بی ایس ڈاکٹر نہیں بلکہ سائیکاٹرسٹ۔ وہاں واشنگٹن سٹی میں نا صرف میری بہت اچھی جاب تھی' بلکہ میں نے سب کچھ ایک بنا بنایا سیٹ اَپ چھوڑ کر یہاں آنے کو ترجیح دی' کیوں...... ٹھہریئے پہلے میں آپ کو اپنے متعلق بتاتا ہوں۔

میرا نام حبیب احسن ہے' ڈاکٹر حبیب احسن۔ ہم دو بھائی ہیں۔ میرے بابا آرمی میں تھے' اور ڈیپوٹیشن پر کچھ عرصہ سعودی عرب میں کام کرنے کے بعد انہوں نے ریٹائرمنٹ لے لی تھی' اور

ان کی ریٹائرمنٹ کے بعد میرے بھائی نے انہیں امریکہ بلوا لیا۔ گو وہ وہاں جانا نہیں چاہتے تھے' ان کا ارادہ اپنی زمینوں کو آباد کرنے کا تھا' لیکن اسد بھائی کے سامنے مجبور ہو گئے۔ اسد بھائی کو امریکہ میں سیٹل ہوئے سات آٹھ سال ہو گئے تھے۔ اس دوران وہ صرف ایک بار پاکستان آئے تھے۔ ان کی بیوی امریکن تھی' جس نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ بابا نے چاہا تھا کہ وہ پاکستان سیٹل ہو جائیں' اور اسلام آباد میں گھر لے لیں' لیکن اسد اور ان کی وائف کو یہاں رہنا پسند نہ تھا' اور امی اب ان کے بغیر نہیں رہ سکتی تھیں۔ سو بابا اور امی امریکہ چلے گئے۔ میں نے ایف ایس سی کے بعد نیا نیا میڈیکل کالج میں ایڈمیشن لیا تھا کہ اسد بھائی نے میرے پیپر بھی بھیج دیئے اور میں امریکہ چلا گیا۔

اسد اور ان کی بیوی عائشہ ٹیکساس میں رہتے تھے۔ ان کا گھر بہت خوبصورت تھا' اور عائشہ بہت اچھی لڑکی تھی۔ مجھے وہاں جا کر پہلے گریجویشن کرنا پڑا۔

اور گریجویشن کے بعد میرا ٹیسٹ لیا گیا' اور مجھے مشورہ ملا کہ مجھے ایم بی بی ایس کے بجائے سائیکالوجی پڑھنا چاہئے اور نفسیاتی امراض کا معالج بننا چاہئے۔ سو میں نے اپنے پروفیسرز کی رائے کا احترام کیا۔ میرا پورا خاندان وہاں تھا' سو مجھے وہاں سیٹ ہونے میں مشکل پیش نہیں آئی تھی۔ وہاں میں ایک کامیاب ڈاکٹر تھا۔ میرے پاس آنے کے لئے تین تین ماہ پہلے ٹائم لینا پڑتا تھا۔

پھر بھی میں یہاں آ گیا' سب کچھ چھوڑ کر' صرف اس لئے یہ بابا کی خواہش تھی۔ حالانکہ وہاں کیا نہیں تھا میرے پاس۔ اپنا ذاتی گھر' جاب' پیسہ اور پھر سب سے بڑھ کر جائمہ حارث۔ جائمہ حارث میری کون تھی' میں شاید اس کی وضاحت نہ کر سکوں۔ بس وہ جائمہ تھی۔ مسلمان باپ کی کرسچن بیٹی۔ اس میں مسلمانوں والی کوئی بات نہ تھی' اس کا باپ بہت پہلے جب وہ چھوٹی سی تھی' اس کے ماں کو چھوڑ گیا تھا۔ بہت سارے دوسرے ایشیائی مردوں کی طرح۔ اس کی ماں اب اپنے ایک بوائے فرینڈ کے ساتھ رہتی تھی' اور جائمہ حارث ایک الگ اپارٹمنٹ میں۔ ممکن ہے مجھ سے ملنے سے پہلے اس کے ساتھ بھی کوئی اس کا اپارٹمنٹ شیئر کرتا ہو' لیکن جب میری اس سے ملاقات ہوئی تھی' میں نے اسے اکیلا ہی رہتے دیکھا تھا۔ وہ کرسمس پر اپنی ماں کے پاس جاتی تھی' ورنہ اکیلی رہتی تھی۔

وہ اپنے نام کے ساتھ حارث لکھتی تھی' لیکن وہ کبھی کبھار چرچ بھی چلی جاتی' اور کرسمس کی تیاریاں ہفتوں پہلے شروع کر دیتی تھی۔ میرے اور اس کے درمیان مذہب کبھی زیر بحث نہیں آیا

تھا۔ میں نے کبھی اس سے نہیں کہا تھا کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں' اور نہ ہی اس نے' لیکن ہمیں ایک دوسرے سے کچھ کہنے کی ضرورت نہ تھی۔ ہم دونوں اپنی اپنی جگہ جانتے تھے کہ ہم ایک دوسرے کے لئے بنے ہیں۔ میں جب پاکستان گیا تھا' تو میں نے سوچا تھا کہ میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد واپس آ جاؤں گا' تو میں جو وہیں ہی ٹک گیا تھا' تو صرف جائمہ حارث کے لئے۔

وہ ایسی ہی تھی' اتنی دلکش' اتنی پیاری کہ میں گھنٹوں اسے تکتا رہتا تھا۔ اس میں ایک خاص دلربائی تھی۔ ایک سپردگی' ایک وفاداری' میں اس کا اسیر تھا۔ عاشی بھابی کی طرح وہ بھی میکسیکن تھی' اور میرے مشاہدے کے مطابق میکسیکن ......لڑکیوں میں بہت وفا ہوتی ہے۔ وہ ٹوٹ کر محبت کرتی ہیں۔

میں واشنگٹن میں تھا' بابا اور اماں کبھی میرے پاس رہتے تھے' اور کبھی اسد بھائی کے پاس۔

میں نے جائمہ سے یہ کبھی نہیں کہا تھا' کہ میں اس سے شادی کروں گا' لیکن میرے ذہن میں تھا کہ سیٹل ہونے اور اچھا سا گھر لینے کے بعد میں جائمہ سے شادی کے لئے کہوں گا۔ میں اسے جُو کہہ کر بلاتا تھا' جُو فارسی میں ندی کو کہتے ہیں' وہ بھی کسی ندی کی ہی طرح تھی۔ سبک روندی کی طرح......تو گھر بنانے اور سجانے کے بعد میں نے سوچا تھا کہ اب مجھے کہنا چاہئے کہ میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں' لیکن اس سے پہلے میں بابا اور اماں سے بات کرنا چاہتا تھا' لیکن بابا کو اچانک ہارٹ کی تکلیف ہوئی اور انہیں ہسپتال لے جانا پڑا۔ ڈاکٹر نے بائی پاس تجویز کیا' اور بابا گھر آ گئے۔

اس روز میں ان کے کمرے میں بیٹھا تھا کہ اچانک انہوں نے کہا۔

''بیبو! میری ایک بات مانے گا پتر!''

اس طرح ''بیبو'' کہہ کر انہوں نے شاید کبھی بہت بچپن میں مجھے پکارا تھا۔ ان کے لہجے میں پتا نہیں کیا تھا کہ میں تڑپ اٹھا۔

''بابا! آپ حکم کریں۔''

''بیٹا! تم کسی پاکستانی لڑکی سے شادی کرنا۔''

ایک لمحے کو مجھے لگا' جیسے میرا دل ساکت ہو گیا ہو۔ کیا بابا جان! جان گئے تھے کہ میں جائمہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے اپنے دل کی دھڑکن سنائی نہیں دے رہی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا' جیسے میں یکا یک تہی داماں ہو گیا ہوں۔ شاید بابا نے میرے چہرے کا بدلتا رنگ دیکھا تھا' کہ ان کے چہرے پر مایوسی پھیل گئی۔ انہوں نے نظریں میرے چہرے سے ہٹا لیں۔

''میں تمہیں مجبور نہیں کرتا۔ اگر تم نہیں چاہتے تو......بس درخواست کی تھی تم سے۔''

''بابا!'' میں نے تڑپ کر انہیں دیکھا۔

یہ میرا باپ تھا' جس نے زندگی میں میری کوئی خواہش رد نہیں کی تھی۔

جس نے باپ کی شفقت کے ساتھ دوستوں کا سا اعتماد بھی دیا تھا۔ اس نے آج تک کچھ طلب نہیں کیا تھا' بلکہ دیا ہی تھا۔ اگر اس نے ایسی خواہش کا اظہار کیا تھا' تو اس کا کوئی سبب ضرور ہوگا' ورنہ عاشی بھابی سے انہیں کوئی شکایت نہ تھی۔ عاشی بھابی' جنہوں نے اسد بھائی کی خاطر اسلام قبول کیا' جو اماں اور بابا کا بہت خیال رکھتی تھیں' جن دنوں وہ اسد کے گھر ہوتے وہ خصوصات جینز ٹراؤزر اور شرٹ پہنتیں' سر پر اسکارف باندھے رکھتیں۔ وہ ہر جمعہ کو مسجد میں نماز کے لیے بھی جاتی تھیں۔ میرے دونوں بھتیجے بھی ان کے ساتھ مسجد جاتے' گھر میں ایک قاری انہیں قرآن پڑھانے آتا تھا' ہاں وہ اردو نہیں جانتے تھے۔ اپنی ماں کی طرح امریکن لہجے میں انگریزی بولتے۔ خود کو مسلمان اور پاکستانی بتاتے کہ شاید یہ بابا نے ہی انہیں سکھایا تھا۔ عاشی بھابی ایک مثالی بہو اور بیوی تھیں۔ بابا جب صبح نماز کے لئے اٹھتے تو وہ انہیں بیڈ ٹی بنا کر کمرے میں دے جاتیں۔ میں نے جب گریجویشن کیا' تو انہوں نے مجھے گاڑی گفٹ کی۔

میں سمجھتا تھا' وہ پاکستانی بہوؤں کے مقابلے میں بہت اچھی ہیں' جو ساس نندوں کے خلاف سازشیں کرتی رہتی ہیں' اور ان کا وجود برداشت نہیں کر سکتیں۔

بابا اور اماں بھی ان کی بہت تعریف کرتے تھے' لیکن پھر بھی کہیں کوئی کمی تھی کہ بابا نے ایسا کہا تھا مجھ سے' لیکن مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

''بابا!'' میں نے ان کے ہاتھ تھام لئے۔

''درخواست نہیں بابا! حکم کریں۔ آپ کی ہر بات میرے لئے حکم کا درجہ رکھتی ہے۔''

یکا یک ان کا چہرہ چمک اٹھا۔

''اللہ تمہیں خوش رکھے بیبو! میں تیری پھوپھو کو لکھتا ہوں تیرے لئے لڑکی تلاش کرے۔''

بابا خوش تھے' اماں بھی' لیکن میرے اندر تو سناٹے اتر آئے تھے۔ میں جُو سے بھاگنے لگا' کترانے لگا۔ وہ حیران تھی۔

''کیا ہو گیا ہے تمہیں حوبیب!''

ایک دن اس نے مجھے میرے کلینک میں پکڑ لیا۔ میں نے نظریں چرا لیں۔ حالانکہ جب وہ مجھے ہونٹ گول کر کے حوبیب کہتی تھی' تو مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔

"کچھ نہیں' بس مصروف تھا۔"

"صرف مصروف تھے' یا کچھ اور بات تھی؟" وہ تو میرے اندر اتر جاتی تھی۔

"یہ بابا نے کیا مانگ لیا تھا مجھ سے' میری زندگی' میرے دل کی ویرانی۔"

میں وہاں رہ کر جُو کا سامنا نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے اپنے آپ سے خوف آتا تھا کہ کہیں میں اپنے وعدے سے پھر نہ جاؤں' کہیں کسی کمزور لمحے میں ایسا کچھ کر بیٹھوں کہ پھر بابا سے نظر نہ ملا پاؤں۔ سو میں نے پاکستان آنے کا فیصلہ کر لیا۔ بابا بہت خوش ہوئے تھے۔

"تم جاؤ' ہم بھی جلد آ جائیں گے۔" بابا کا بائی پاس ہونا تھا۔

اماں نے صرف اتنا کہا۔

"میرا دل تو دولخت ہو جائے گا نا احسن صاحب! آدھا یہاں' آدھا وہاں۔ یہاں رہے تو حبیب کا خیال' وہاں ہوئے تو اسد کی تڑپ۔"

"ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں تو تم ہی بھرتی تھیں' حالانکہ جتنا سکھ عاشی نے تمہیں دیا' اتنا......"

بابا' اماں سے کہہ رہے تھے' لیکن میں سوچ رہا تھا' اور جو میرا دل سخت ہو گیا ہے۔ وہ بابا نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"پاکستان ہمارا پیارا ملک ہے' ہمارا اپنا۔ وہاں کا کچھ بھی اجنبی نہیں ہے حبیب! تم وہاں کچھ نہ بھی کرو تب بھی اتنی جائیداد اور زمین ہے میری وہاں کہ گھر بیٹھے ساری زندگی کھاتے رہو' صرف اسلام آباد کے بنگلوں کا ہی کرایہ کافی ہے۔"

وہ سمجھ رہے تھے کہ میں اس لئے افسردہ ہوں کہ مجھے اپنے مستقبل کا خوف ہے۔ میں نے عمر کے اٹھارہ سال پاکستان میں گزارے تھے۔ مجھے بھی بابا کی طرح پاکستان سے بہت محبت تھی۔ اگر کوئی پاکستان کے متعلق غلط بات بھی کرتا تھا' تو میرا جی چاہتا تھا کہ اس کا منہ نوچ لوں۔ برائی کہاں نہیں ہے' اور یہ برائیاں پیدا کون کرتا ہے؟ میں جو وہاں ٹھہرا ہوا تھا' تو صرف اس لئے کہ جُو نے مجھے ان دیکھی زنجیروں میں باندھ رکھا تھا' اور اب جب میں نے یہ زنجیریں توڑ دی تھیں' تو پیچھے مڑ کر نہ دیکھا۔ اسے اپنے جانے کا بتایا تک نہیں' لیکن پتا نہیں اسے کیسے پتا چل گیا تھا۔

جب میں بورڈنگ کے لئے جا رہا تھا' تو میں نے لاؤنج کے شیشے کے پیچھے سے اسے دیکھا۔ وہ متوحش نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی' پھر جیسے اس نے مجھے دیکھ لیا۔ وہ ہاتھ ہلا رہی تھی' وہ رو رہی تھی۔ میں نے اس کے ہونٹوں کو ہلتے ہوئے دیکھا۔ شاید وہ کچھ کہہ بھی رہی تھی۔

میں تیزی سے آگے بڑھ گیا' اور پھر کتنے ہی دن خود کو سمجھاتا رہا۔ میں نے کب اس سے کہا تھا کہ میں اس سے شادی کروں گا' ہمیشہ اس کے ساتھ رہوں گا' ہم تو بس دوست تھے۔

"اگر صرف دوست تھے تو پھر اسے بتائے بغیر کیوں بھاگ آئے؟"

کوئی میرے اندر سے ہی مجھے کچوکے لگاتا' لیکن بہرحال میں نے خود کو سنبھال لیا۔ بابا اور اماں بھی بابا کے بائی پاس کے بعد آ گئے تھے۔

میں نے کلینک بنا لیا تھا۔ گو میں کوئی خاص کامیاب نہیں تھا۔ دراصل تب ہمارے ملک میں نفسیاتی عوارض کا علاج کرانے کا کوئی خاص رجحان نہ تھا۔ ایلوپیتھک علاج سے ناکام ہو کر خود بخود ہی یہ فرض کر لیا جاتا تھا کہ جادو ہے یا جنات کا اثر ہو گیا ہے۔ گو اب بھی حالات کچھ زیادہ تبدیل نہیں ہوئے' تاہم پہلے سے بہتر ہیں' اور وہاں تو مریضوں کا تانتا لگا رہتا تھا' جیسے ہر ایک کو نفسیاتی پرابلم تھا۔

اپنے ہی گھر میں محرم رشتوں سے خوفزدہ بچیاں' تنہائی کا شکار بوڑھے' شوہر کا تشدد برداشت کرنے والی بیویاں' شادی کر کے گھر بسانے اور مائیں کہلانے کی خواہش مند عورتیں۔ غرض اس ترقی یافتہ ملک میں نفسیاتی مریضوں کی کمی نہ تھی' لیکن یہاں میں سارا دن تقریباً فارغ بیٹھا رہتا تھا' تب میرے دوست ڈاکٹر مظہر حسین نے مجھے مشورہ دیا کہ میں فونٹین ہاؤس کو رضاکارانہ طور پر جوائن کر لوں' نہیں تو میری صلاحیتوں کو زنگ لگ جائے گا' میں بہت جلد اکتا جاؤں گا۔ مجھے مظہر کا مشورہ پسند آیا تھا۔ وہ خود بھی نفسیاتی عوارض کا معالج تھا' اور گلبرگ میں اس کا کلینک تھا' اور وہ خاصا معروف بھی تھا۔ اس کے توسط سے ہی کچھ مریض میرے پاس آئے تھے' جن میں دو ابھی میرے زیر علاج تھے۔ ایک مسز ملک' کسی مل اونر کی بیوی۔ اس کا مسئلہ یہ تھا کہ اس کے پاس کرنے کو کوئی کام نہ تھا۔ بچے جوان تھے اور شوہر کسی اور لڑکی میں دلچسپی لے رہا تھا۔

دوسرا ایک گورنمنٹ آفیسر' جو بیوی اور ماں کے درمیان گھن چکر بنا ہوا تھا۔ ماں کے پاس جاتا تو وہ بیوی کے خلاف بولتی اور بیوی ماں کے خلاف سٹنگ کے دوران مجھے عاشی بھابی کا خیال آیا' اور پھر جُو کا' لیکن مجھے تو بابا سے کیا وعدہ نبھانا تھا۔ فاؤنٹین ہاؤس جوائن کرنے سے مجھے ایک مصروفیت مل گئی تھی۔

میں فونٹین ہاؤس جانے کے لئے ہی اپنے کلینک سے نکلا تھا' جب میں نے ملائکہ کو روتے دیکھا تھا۔ ملائکہ جا چکی تھی' اور میں وہیں کھڑا تھا۔ میں سر جھٹک کر اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

میں جب یہاں سے گیا تھا' تب کے اور اب کے پاکستان میں بہت فرق آ چکا تھا' لیکن صرف

اتنا فرق کہ جیسے کوئی معصوم سیدھا سادا دیہاتی بچہ شہر میں آ کر ویسا ہی ہو جائے۔ بڑے بڑے پلازے اور مارکیٹیں بن گئی تھیں۔ گاڑیوں کی بہتات تھی' آبادی بڑھ گئی تھی۔ لڑکیاں نوکریاں کر رہی تھیں اور خاصی پُر اعتماد ہو گئی تھیں۔ کئی گھروں میں ڈش لگ گئی تھی۔ بہت کچھ بدلنے کے بعد بھی بہت کچھ ویسا ہی تھا' لیکن اب سات سال بعد تو اور بھی سب کچھ بدل گیا ہے۔ اتنا کچھ کہ کبھی کبھی میں حیران رہ جاتا ہوں۔

تقریباً ہر گھر میں کیبل موجود ہے' سڑک پر چھابہ لگا کر پکوڑے بیچنے والے سے لے کر سبزی بیچنے والا بھی کیبل سے لطف اندوز ہو رہا ہے۔ بھلے وہ بچوں کو اچھا لباس یا تعلیم نہ دے سکے' لیکن کیبل کی تفریح ضرور مہیا کر رہا ہے۔ میں جب بھی لبرٹی یا کسی بھی مارکیٹ کی طرف جا نکلتا ہوں' تو مجھے پتا چلتا کہ میں کس ملک میں ہوں۔ لڑکیاں جینز اور ٹی شرٹ پہنے دوپٹوں سے بے نیاز نظر آتی ہیں۔

شادی بیاہ کی تقاریب میں لڑکیاں ماتھے پر بندیا لگاتی ہیں۔ مجھے یاد ہے ایک بار میری کزن نے اپنے سکول کی کسی پارٹی میں شرکت کے لئے ماتھے پر بندیا لگائی۔ آنٹی نے دیکھا تو ڈانٹ دیا۔

"فوراً اتار دو اسے' تم ہندو نہیں ہو" اور ابھی کل کی بات ہے۔ میں اسلام آباد گیا تو ایک دوست سے سنا کہ اب پاکستان میں بار ہاؤسز اور کیسینو بنائے جا رہے ہیں۔ ملک کے ہر بڑے شہر میں۔

"کیا ہم میں اور دوسروں میں کوئی فرق نہیں رہا؟" میں نے بے اختیار اس حکمران کو خراج تحسین پیش کیا جس نے بہت پہلے ملک میں شراب بیچنے پر پابندی عائد کی تھی۔ معاف کیجئے گا یہ میں کن باتوں میں الجھ گیا ہوں۔ میں آپ کو ملائکہ کے متعلق بتا رہا تھا کہ پہلی بار میں نے ملائکہ کو کب دیکھا تھا' اور کیسے انوکھے انداز میں آج جب میں اس کی کہانی لکھ رہا ہوں' تو وہ منظر میری آنکھوں کے سامنے آ رہا ہے۔ گاڑی سے ٹیک لگائے روتی ہوئی اور پھر کھڑکی سے سر اندر کیے چیختی ہوئی ملائکہ محبّ اللہ خان کو اس وقت بھی میں کئی روز تک سوچتا رہا تھا۔ مجھے حیرت ہوتی' وہ یوں سر عام کھڑی کیوں رو رہی تھی' اور وہ عورت' جو خود کو اس کی ماں کہہ رہی تھی' وہ ہرگز اس کی ماں نہیں لگتی تھی۔ اتنی نفیس اور ایجوکیٹڈ عورت کی ماں اتنی جاہل اور بدتمیز......

بہت سارے دن میں اس کے متعلق سوچتا رہا۔ رات کو جب میں بستر پر لیٹتا تو جائمہ کے ساتھ وہ بھی میرے تصور میں آ جاتی۔ آخر کیا تھا اس میں۔ ماضی کی ایک اداکارہ اور جُو تو جو تھی۔

میں اسے چاہتے ہوئے بھی بھلا نہیں پا رہا تھا۔ آخر کیا کمی تھی جُو میں' لیکن بابا...... بابا' عاشی بھابی کی بہت تعریف کرتے تھے۔ اس کے باوجود انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ میں پاکستانی لڑکی سے شادی کروں۔ شاید وہ چاہتے ہوں کہ میرا رشتہ پاکستان سے جڑا رہے۔ شاید ایسی ہی کسی آس پر انہوں نے پاکستان میں اپنی پراپرٹی فروخت نہیں کی تھی۔ بابا خوش تھے' اور شاید اماں بھی' اور میں ان کی خوشی میں خوش تھا' اور خود کو بہلاتا رہتا کہ میں نے بالکل صحیح فیصلہ کیا ہے۔ میرا ایک مصری دوست عبدالماجد اکثر کہا کرتا تھا' کہ پاکستانی مرد بہت خوش قسمت ہوتے ہیں' اس لئے کہ پاکستانی عورت دنیا کی ساری عورتوں کے مقابلے میں اچھی بیوی ہوتی ہے۔ ہاں شاید میں بھی خوش قسمت تھا۔

اماں نے میرے لئے لڑکی پسند کر لی تھی۔ میری پھوپھو کی نند کی بیٹی مریم سب ہی اس کی تعریف کرتے تھے' مگر میں نے کبھی دلچسپی نہیں لی تھی۔

"ٹھیک ہے اماں! آپ کو جو پسند ہو۔"

رشتہ کرنے سے پہلے اماں نے مجھے بتایا' تو میں نے کہہ دیا' لیکن پھر یوں ہوا کہ فوری طور پر اِدھر سے ہاں نہ ہو سکی' کیونکہ اس کے والد اور بھائی ملک سے باہر تھے۔ طے یہ ہوا تھا کہ وہ آ جائیں تو مجھ سے ملنے کے بعد فیصلہ کریں گے۔

بابا میری شادی جلد از جلد کرنا چاہتے تھے۔ شاید وہ جُو کے آنے والے ٹیلی فونوں سے خوفزدہ تھے' جبکہ اماں کی نظر میں مریم کے بعد کوئی لڑکی جچتی ہی نہ تھی۔ اب جبکہ مریم کے والد ابھی تک نہ آ سکے تھے اور پھوپھو سے پتا چلا تھا کہ ان کے اپنے خاندان میں بھی لڑکے ہیں۔ اماں نے اِدھر سے بددل ہو کر لڑکی کی تلاش کی مہم پھر شروع کر دی تھی' لیکن ابھی تک کوئی نظر میں نہیں جچی تھی۔ مجھے بھی کوئی ایسی جلدی نہ تھی۔ میں نے خود کو کلینک اور فونٹین ہاؤس میں مصروف کر لیا تھا۔ کچھ پرانے دوست بھی مل گئے تھے۔ سو وقت اچھی طرح گزر رہا تھا۔ گو کبھی کبھی جُو کی یاد اتنی شدت سے آتی کہ جی چاہتا بابا سے درخواست کروں کہ مجھے اپنے وعدے کی زنجیروں سے آزاد کر دیں' لیکن پھر خود کو سنبھال لیتا' اور اب اس ملائکہ محبّ اللہ خان نے اچانک زندگی میں داخل ہو کر کئی دن تک مجھے ڈسٹرب رکھا' اور جب میں اسے تقریباً بھول چکا تھا کہ ایک دن وہ میرے کلینک میں آ گئی۔ ایک لحہ کو تو میں اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ سیدھی میرے آفس میں آئی تھی۔

"آپ ؟"

"آپ نے پہچان لیا؟"

"جی...... آپ...... وہ......"

"ہاں' میں وہی ہوں' جو اس روز رو رہی تھی۔"

اس نے میری بات کاٹ دی۔ میں خاموش ہی رہا۔

میری سمجھ میں نہ آیا کہ میں اب کیا کہوں۔

"میں معذرت خواہ ہوں کہ اس روز آپ سے......"

"کوئی بات نہیں۔" اب کے میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "میری غلطی تھی' مجھے اس طرح آپ کے پرسنل معاملات میں دخل نہیں دینا چاہئے تھا۔"

"جب کوئی میری طرح حرکت کرے' سرِ راہ کھڑے ہو کر رونے کی تو...... غلطی تو میری ہے نا۔"

اس نے ذرا کی ذرا نظریں اٹھائیں۔ اس کی آنکھوں کا رنگ کیسا تھا' شاید براؤن' شاید گرے' نہیں بلکہ براؤن ہی تھا' اور ان میں عجب سا سنہرا پن تھا۔ اس نے کوئی میک اپ نہیں کیا ہوا تھا' یا پھر اگر تھا بھی تو اتنا لائٹ کہ محسوس ہی نہ ہوتا تھا۔ اس کی پلکیں بغیر مسکارے کے ہی بے حد خوبصورت تھیں۔ اس کے ہونٹوں کے گلابی پن کو کسی لپ سٹک کی حاجت نہ تھی۔ وہ آج سفید لباس میں تھی۔ سفید شلوار قمیص اور بڑا سا دوپٹہ۔ سادگی میں بھی عجب پرکاری تھی۔

"دراصل میں......" ایک معمولی سے وقفے کے بعد اس نے پھر میری طرف دیکھا۔

"آپ جانتے ہیں' میں کون ہوں؟"

"میرا خیال ہے آپ ملائکہ ہیں' ملائکہ محب اللہ۔" میں نے کسی قدر جھجکتے ہوئے کہا۔

"آپ اتنی بے یقینی سے کیوں کہہ رہے ہیں کہ میں ملائکہ ہوں۔ کیا چھ سات سال اتنا زیادہ عرصہ ہوتا ہے کہ لوگ مجھے بھول جائیں۔ مجھے ملائکہ محب اللہ خان کو جس کی وجہ سے ٹی وی ڈرامہ کامیاب ہوتا تھا۔"

اس کے لہجے میں یکدم تیزی آ گئی تھی۔ میں نے کسی قدر ندامت سے کہا۔

"ایسا نہیں ہے مس ملائکہ' لوگ آپ کو ہرگز نہ بھولے ہوں گے۔ مجھے بھی دیکھئے کہ میں نے صرف ایک یا دو ڈراموں میں دیکھا' پھر بھی پہچان لیا۔ ایکچوئلی! میں ملک سے باہر رہا ہوں۔ ابھی تھوڑا عرصہ ہوا مجھے وطن آئے۔"

"اوہ اچھا' تو آپ کہاں رہے ہیں؟" اس کے ماتھے کے بل ختم ہوئے۔

"امریکہ میں۔"

"اور یہاں کیوں آ گئے؟"

"بس وطن کی محبت کھینچ لائی۔" میں مسکرایا۔ "آپ بتائیے' آپ نے کیسے زحمت کی؟"

"ایک تو آپ سے معذرت کرنا تھی۔ دوسرے آپ نے بتایا تھا کہ آپ سائیکاٹرسٹ ہیں۔ میں اپنے علاج کے لئے آئی ہوں۔ ڈاکٹر حبیب! کیا آپ مجھے ٹائم دے سکیں گے؟"

"وائے ناٹ۔" میں نے سوچا۔ میرا اندازہ ٹھیک تھا کہ یہ لڑکی نفسیاتی مریض ہے۔

"لیکن آپ جانتی ہیں کہ اس میں سب سے اہم چیز پیشنٹ کا تعاون ہے۔ آپ کو اپنے مسئلے کے علاوہ اپنے متعلق سب کچھ بتانا ہوگا' ایمانداری کے ساتھ' اس طرح ٹریٹمنٹ میں آسانی رہتی ہے۔"

"ہاں' میں یہ سب سوچ کر ہی یہاں آئی ہوں۔ دو سال پہلے میں علاج کے سلسلے میں ایک ڈاکٹر کے پاس گئی تھی' لیکن پھر علاج ادھورا ہی چھوڑ دیا۔"

"جی بتائیے' کیا مسئلہ ہے آپ کو؟" میں نے پیشہ ورانہ انداز میں پوچھا۔

"کبھی میرا دل چاہتا ہے ڈاکٹر حبیب! کہ میں ساری دنیا کو توڑ پھوڑ کر تباہ کر دوں' کبھی میرا جی چاہتا ہے کہ میں قتل کر دوں' خاص طور پر اپنی پھوپھی کو اور کبھی میرا دل چاہتا ہے' میں سمندر میں چھلانگ لگا دوں' خودکشی کر لوں' زندگی ختم کر لوں اپنی۔"

اس کے چہرے پر کرب پھیل گیا' اور آنکھوں کی جھیلیں نم ہو گئیں۔ میں نے اس کے درد کو اپنے دل میں اُترتا محسوس کیا۔

"آخر آپ کے دل میں اس طرح کا خیال کیوں آتا ہے؟ آپ کو کیا شکایت ہے دنیا سے؟"

"مجھے دنیا سے کیا شکایت ہے؟" وہ عجیب طرح سے ہنسی۔ "ایک نہیں' ڈاکٹر حبیب! مجھے دنیا سے بہت سی شکایتیں ہیں۔"

"مثلاً؟" میں نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔

"اس دنیا نے میری قدر نہیں کی' میرے ٹیلنٹ کی۔ دیکھو کتنی جلدی بھلا دیا ہے سب نے مجھے۔ ابھی پچھلے دنوں ٹی وی کی سلور جوبلی منائی گئی' اور مجھے کسی نے نہیں بلایا' یاد تک نہیں کیا۔ حالانکہ ایرے غیرے سب مدعو تھے۔"

"ہو سکتا ہے مس ملائکہ! ان کے پاس آپ کا ایڈریس نہ ہو' لیکن میرا خیال ہے جب بھی

ٹی وی ڈرامے کا ذکر ہوتا ہے' آپ کا نام ضرور آتا ہے۔ لوگ آپ کا ذکر کرتے ہیں۔"

میں نے اس کی تردید کی تو ایک لمحہ کو وہ خاموش ہو گئی' لیکن کچھ دیر بعد سر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔

"ڈاکٹر حبیب! آپ نہیں جانتے' آپ بالکل نہیں جانتے۔ یہاں کے لوگوں کو' ان کی سیاست کو۔ یہ جو ٹچے ہیں پروڈیوسروں کے یہ سب......"

پھر وہ منہ ہی منہ میں کچھ بدبدا کر چپ ہو گئی۔

"چلئے۔" میں بہت ہلکے پھلکے انداز میں باتیں کر رہا تھا۔

"دنیا کا تو قصور ہے کہ انہوں نے آپ جیسی باصلاحیت فنکارہ کو بھلا دیا' لیکن یہ اپنی "پھوپھی" کو کیوں قتل کرنا چاہتی ہیں آپ؟"

"پھوپھی ......" اس نے دونوں مٹھیاں بھینچیں۔ اس کے چہرے کا رنگ سرخ ہو گیا۔ اس پھوپھی نے مجھے میری ماں سے چھین لیا تھا۔ اس وقت جب میں صرف تین سال کی تھی یاد ہو کی۔ میرے باپ نے میری ماں کو طلاق دے دی تھی۔ ماں کے بعد اسی پھوپھی نے مجھے پالا' پڑھایا اور وہ کہتی تھی کہ وہ مجھے اپنی بہو بنائے گی' لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ بھلا کیا کمی تھی مجھ میں ڈاکٹر حبیب! کیا کوئی کمی ہے؟"

وہ یکدم کھڑی ہو گئی اور پورے کمرے میں کیٹ واک کرتی ہوئی پھر اپنی جگہ پر بیٹھ گئی۔

"لیکن اس نے مجھے رد کر دیا ڈاکٹر حبیب! یونو' اس نے مجھے ...... ملائکہ کو رد کر دیا' اور پھر میں اپنی ماں کے پاس چلی گئی' لیکن پھوپھی نے مجھے روکا نہیں' ایک بار بھی نہیں۔ عرفان نے مجھے رد کر دیا تھا' تو کیا پھوپھی اپنے خاندان کے کسی بھی لڑکے سے میری شادی نہیں کر سکتی تھی' لیکن اس نے ایسا نہیں کیا ڈاکٹر حبیب! اس نے اور یہ پھوپھی بہت ظالم ہے۔ میری ماں سے مجھے چھیننے والی' ماما سے محروم کرنے والی۔ میں اسے قتل کرنا چاہتی ہوں' سچ سچ حبیب۔"

اس نے ڈاکٹر کا سابقہ خود ہی ہٹا دیا۔ اب آنسو سرمئی جھیلوں کے کناروں سے باہر نکل آئے تھے۔

"اور میں ......" اس نے مٹھیاں بھینچیں' کھولیں اور کہنیاں ٹیبل پر سے ٹکاتے ہوئے آگے جھکی۔ میں اس کے بالکل مقابل ٹیبل کے دوسری طرف بیٹھا تھا۔ میں نے یکدم نگاہیں جھکا لیں۔ "میں سوچتی ہوں کہ میں مر جاؤں۔ میں بھلا اب جی کر کیا کروں گی۔ مجھے گھن آتی ہے اپنے آپ سے' اپنے وجود سے' جانتے ہو حبیب کیوں؟" میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"اس لئے کہ اس کمینے ممتاز نے مجھے اپنی حویلی میں بند کر دیا تھا' پورا ایک ماہ بند رکھا۔"

میں چونکا۔ یہ کیا کہہ رہی تھی وہ۔

"وہ میرے باپ کے خاندان کا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ وہ مجھے میرے باپ سے ملوا سکتا ہے' اس لئے میں اس سے ملنے اس کی حویلی میں گئی تھی' اور اس نے مجھے اپنے گھر میں بند کر دیا۔ وہ کہتا تھا' اس کے خاندان کی لڑکیاں یوں گلیوں میں' ٹی وی سٹیشنوں پر اور سٹوڈیوز میں لور لور نہیں پھرتیں اور یہ صحافی گدھے انہوں نے لکھا میں نے ممتاز ملک سے شادی کر لی ہے' اور اب ممتاز ملک نے مجھ پر ٹی وی پر کام کرنے کی پابندی لگا دی ہے۔ یہ صحافیوں کی قوم کہانیاں گھڑنے میں ماہر ہوتی ہے۔ میں جینا نہیں چاہتی حبیب! مرنا چاہتی ہوں' مرنا چاہتی ہوں۔"

وہ یکدم زور زور سے چیخ چیخ کر رونے لگی۔ میں گھبرا کر میز کے پیچھے سے نکل آیا۔

"ریلیکس مس ملائکہ پلیز......"

لیکن وہ چیخنے لگی۔ اس نے میرے گریبان کو پکڑ کر کھینچا۔

"تم ڈاکٹر ہو' مجھے کچھ ایسا دے دو کہ میں سکون پا لوں' ابدی سکون۔"

میں نے اس کے دونوں ہاتھ بے اختیار پکڑ کر اپنا گریبان چھڑایا۔

"دیکھئے مس ملائکہ! یہ زندگی اتنی ارزاں نہیں ہے کہ اسے معمولی باتوں پر ضائع کر دیا جائے۔ کبھی کبھی زندگی انسان سے یوں ہی کھیل کھیلتی ہے۔"

میں ہولے ہولے بول رہا تھا' اس کے بالکل قریب کھڑا' وہ پوری آنکھیں کھولے مجھے سن رہی تھی۔ اس کے لباس سے بڑی مسحور کن خوشبو اٹھ رہی تھی۔ اس کی قربت سے میں پگھلنے لگا' تو یکدم اس کے ہاتھ چھوڑ کر پیچھے ہٹ گیا۔

"بیٹھئے مس ملائکہ! آپ کا مسئلہ کوئی اتنا سنگین نہیں ہے۔ آپ کو زندہ رہنے کی خواہش نہیں ہے۔ میرے پاس ایسے مریض بھی آتے رہے ہیں' جنہوں نے ایک نہیں کئی بار خودکشی کی کوشش کی' لیکن بفضل خدا اب ٹھیک ٹھاک خوش و خرم زندگی گزار رہے ہیں۔ آپ بھی بہت جلد اس صورت حال سے نکل آئیں گی۔"

"اچھا......" اس کی آنکھوں میں حیرت تھی' اور اس کے چہرے پر فطری معصومیت تھی۔ میں نے اپنے دل میں اس کے لئے بے حد ہمدردی محسوس کی۔

"آپ ایک ذہین اور خوبصورت لڑکی ہیں' اور زندگی یقیناً اپنے ہاتھوں میں آپ کے لئے پھول لئے منتظر ہے۔ ہو سکتا ہے آنے والے دنوں میں ایک بار پھر ٹی وی کی سکرین پر آپ کا

راج ہو۔"

اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ بھیگے بھیگے رخساروں اور بھیگی پلکوں کے ساتھ مسکراتی ہوئی وہ بہت اچھی لگی۔ وہ بلاشبہ بہت خوبصورت تھی۔ میں نے دل ہی دل میں اسے سراہا' اور پھر مس فاطمہ کو بلا کر اس کی فائل بنانے کو کہا۔

شیڈول بھی طے ہو گیا کہ اس ماہ میری اس کے ساتھ چار سٹنگز ہوں گی۔ ہر ہفتے اسے کلینک آنا ہو گا' پھر اگلے ماہ ہم یہ سٹنگز ایک ماہ میں دو کریں گے' اور پھر ہر ماہ ایک' لیکن حالات کے مطابق اس میں کمی بیشی بھی ہو سکتی ہے۔

"او کے......" وہ خدا حافظ کہہ کر چلی گئی' اور کمرہ کتنی ہی دیر اس کی خوشبو سے مہکتا رہا۔

ایک بار پھر میں اسے سوچ رہا تھا۔ اس نے جو کچھ بتایا تھا' اس میں کتنا سچ تھا' اور کتنا جھوٹ میں نہیں جانتا تھا' لیکن مجھے اس پر ترس آ رہا تھا۔ ایک اچھے خاندان کی پڑھی لکھی لڑکی ضائع ہو رہی تھی۔ میں نے بہت خلوص سے اس کے متعلق نوٹس بنائے' اور کافی دیر مطالعہ کرتا رہا۔ بہت کچھ تشنہ تھا' اور آئندہ ہونے والی ملاقاتوں میں شاید میں اسے اس خود ترسی سے نکال لیتا' اور شاید وہ کچھ مزید بھی اپنے متعلق بتاتی' لیکن آئندہ کی تین چار سٹنگز میں اس نے مزید کچھ نہیں بتایا تھا۔

البتہ اس کے بیانات میں کچھ تضاد آ گیا تھا۔

ایک روز اس نے بتایا کہ وہ جب اپنی ماں سے ملی' تو ماں نے اس سے کہا۔ وہ پھوپھی کا گھر چھوڑ کر اس کے پاس آ جائے' اور پھوپھی اس بات پر ناراض ہو گئی۔ کبھی تو وہ پھوپھی کو برا بھلا کہنے لگتی کہ اس کی اس حالت کی وہ ذمہ دار ہے' اور کبھی کہتی...... نہیں' اس کا قصور نہیں ہے۔

ایک روز اس نے کہا۔ وہ ممتاز ملک سے محبت کرنے لگی تھی' اس لئے اس کے پیچھے گئی تھی اس کی حویلی میں' لیکن وہ حویلی کی پابندیوں میں رہ نہیں سکتی تھی' اس لئے واپس چلی آئی۔

اس کے بیانات بدلتے رہتے تھے۔ میں اسے ٹوکے بغیر خاموشی سے سنتا رہتا تھا۔ ایک روز میں نے اس سے پوچھا کہ اس کی پھوپھی اب کہاں ہے' تو اس نے بتایا کہ وہ اپنے بیٹے کے پاس کینیڈا چلی گئی ہے۔ اس روز وہ بہت روئی۔

"کیا تھا اگر وہ مجھے بھی ساتھ لے جاتی' لیکن وہ مجھے ساتھ لے کر نہیں گئی۔ وہ مجھے یہیں چھوڑ گئی' رُلنے اور دھکے کھانے کیلئے۔"

اسے میرے کلینک میں آتے ہوئے دو ماہ ہو گئے تھے' لیکن میں ابھی تک اس کو سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ ایک روز وہ ایک بات کہتی تو دوسرے روز خود ہی اسے رد کر دیتی تھی۔ میں نے محسوس کیا

تھا کہ وہ سب کچھ سچ نہیں کہہ رہی ہے' کہیں کچھ جھوٹ بھی ہے' یا سب ہی جھوٹ ہے۔

ایک روز کلینک میں آئی تو بہت بجی سنوری تھی۔ بلیو کلر کی ساڑھی باندھے سچ مچ دمک رہی تھی۔ اس روز کے شیڈول میں اس کی سٹنگ نہ تھی۔ میں تقریباً فارغ ہی تھا۔

"تم فارغ ہو حبیب!" وہ بہت جلد آپ سے تم پر آ گئی تھی۔

"تقریباً۔"

"تو چلو کہیں لنچ کرتے ہیں' کسی اچھی جگہ پر۔ آج بڑے دنوں بعد میرا جی چاہا ہے کہ میں زندگی کو انجوائے کروں' دیر تک ڈرائیو کروں' اچھا سا لنچ کروں' گانے سنوں' زندگی بہت خوبصورت ہے نا حبیب! اور موت بہت بھیانک۔" اس نے جھرجھری لی۔

میں اس کے ساتھ یوں باہر جاتے ہوئے جھجکا۔ وہ ایک معروف اداکارہ تھی اور سکینڈل بنتے دیر ہی کتنی لگتی ہے' لیکن وہ اداکارہ ہونے کے ساتھ ساتھ میری مریضہ بھی تھی۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں جو چمک اور ہونٹوں پر جس طرح زندگی مسکا رہی تھی' میں اس سے نظریں نہیں چرا سکتا تھا۔ اس کے اندر اگر جینے کی' زندہ رہنے کی اُمنگ جاگی تھی' تو میں اسے دوبارہ موت کی طرف نہیں دھکیل سکتا تھا۔ سو میں خاموشی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

اس کی گاڑی ہم نے پارکنگ میں ہی چھوڑ دی تھی' اور وہ میرے ساتھ میری گاڑی میں تھی۔ اس روز وہ بہت خوش تھی۔ اس روز اس نے بہت باتیں کیں' اور میں حیرت سے اسے سنتا رہا۔ وہ بہت خوبصورت باتیں کر رہی تھی۔ اس کا لہجہ بھی ویسا ہی تھا' دھیما' ٹھہرا ٹھہرا سا' جیسا کہ میں نے ایک بار ٹی وی پر سنا تھا۔ اسے باتیں کرنے اور مخاطب کو اسیر کرنے کا ہنر آتا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں اعتراف کیا۔

"میں آج بہت خوش ہوں حبیب! اس طرح تمہارے ساتھ یہاں لنچ کرنا' یہ سب بہت اچھا لگ رہا ہے مجھے۔"

اس نے کتنی ہی بار دہرایا۔

اس رات جب میں بستر پر لیٹا' تو میری آنکھوں کے سامنے کئی بار اس کا سراپا لہرایا۔ "کون کہہ سکتا ہے یہ اتنی معصوم اور سادہ دل لڑکی شوبز سے تعلق رکھتی ہے۔ آج وہ کتنی خوش ہو گئی تھی۔ میرے ایک بار اس کے ساتھ چلے جانے سے اسے اگر خوشی مل گئی ہے تو میرا کیا گیا ہے۔"

لیکن یہ صرف ایک بار کی بات نہ تھی' اب وہ اکثر اپائنٹمنٹ کے بغیر بھی آ جاتی تھی۔ میں مصروف ہوتا تو ہیلو ہائے کر کے چلی جاتی۔ فارغ ہوتا تو ہم باتیں کرتے رہتے۔ میں اسے اپنے امریکہ

میں قیام کے دوران پیش آنے والے چھوٹے چھوٹے واقعات سناتا' اپنے مریضوں کے متعلق بتاتا۔

وہ بھی یوں ہی باتیں کرتی رہتی' اپنی سہیلیوں کی' اپنے چھوٹے بھائی کی' ماں کی' پھوپھی کی اور اپنے پھوپھی زاد سوتیلے باپ کا بھی ذکر کیا تھا' لیکن اس کے علاوہ اپنی ذات کے متعلق وہ زیادہ نہیں کھلتی تھی۔ ممتاز ملک کے متعلق اس نے دوبارہ بات نہیں کی تھی' اور نہ ہی اپنے سگے باپ کا ذکر کیا تھا۔ مجھے خبر بھی نہیں ہوئی تھی' اور وہ مریض کی حد سے نکل کر دوستی کے درجے تک پہنچ گئی تھی۔

''تم میرے بہت اچھے دوست ہو۔''

جب وہ معصومیت سے اپنی آنکھیں پٹپٹا کر کہتی' تو میں سوچتا کہ کتنی عجیب بات ہے' پاکستانی لڑکیاں بھی اب لڑکوں کو دوست بنانے لگی ہیں۔ دراصل میرے ذہن میں تو وہی تیرہ چودہ سال پہلے کا پاکستان تھا۔

ایک روز وہ مجھے اپنے گھر لے گئی۔ دراصل اس روز بھی میں اس کے بے حد اصرار پر لنچ کے لئے اس کے ساتھ جا رہا تھا' لیکن مجھے مظہر سے کام تھا' ایک مریض کی ضروری فائل اسے پہنچانی تھی' جو مجھے ڈاکٹر مظہر نے دی تھی۔ کئی بار ایسا ہوتا تھا کہ وہ اپنے مریضوں سے متعلق مجھ سے ڈسکس کر لیتا تھا۔ سو ہم پہلے گلبرگ کی طرف چلے گئے۔ مظہر کا کلینک گلبرگ میں تھا۔

''یہاں قریب ہی میرا گھر ہے۔'' اس نے بتایا۔

''تو کیا خیال ہے آج لنچ باہر کرنے کے بجائے تمہارے گھر نہ کیا جائے۔''

وہ ایک لمحہ کو خاموش ہوئی' اور پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔ چھ سات منٹ بعد ہم اس کے گھر کے سامنے تھے۔

گھر اچھا تھا' لیکن گھر کے اندر بے ترتیبی سی تھی۔ ڈرائنگ روم میں کشن نیچے کارپٹ پر پڑے تھے۔ صوفوں کے کور میلے ہو رہے تھے۔ ڈیکوریشن پیسز پر مٹی کی تہیں جمی ہوئی تھیں۔

ٹی وی لاؤنج میں ایک دس گیارہ سال کا بچہ ویڈیو گیم لگائے بیٹھا تھا۔ اس نے ہمیں بس ایک دفعہ نظر اٹھا کر دیکھا تھا' اور پھر گیم میں مصروف ہو گیا تھا۔ بچہ بے حد خوبصورت تھا۔ میرا جی چاہا کہ میں رک کر اس سے بات کروں' لیکن ملائکہ تیزی سے ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گئی' تو میں بھی اس کے پیچھے اندر آ گیا۔

''تم بیٹھو حبیب! میں اماں کو بتاتی ہوں۔ وہ اوپر ہوں گی بیڈ روم میں۔ فلم دیکھ رہی ہوں

گی وی سی آر پر...... بہت شوق ہے انہیں فلمیں دیکھنے کا۔''

میں نے اس اثنا میں پورے ڈرائنگ روم کا جائزہ لے لیا تھا۔ کارپٹ پر بھی جگہ جگہ داغ لگے ہوئے تھے۔ چائے کے یا کسی اور چیز کے' میں نے اندازہ لگایا کہ ملائکہ کو گھر سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اب جب کہ اسے شوبز کو چھوڑے بھی سات سال ہو چکے ہیں کم از کم اس کے گھر...... میں اتنی بے ترتیبی کی توقع نہیں کر رہا تھا۔

میں ابھی ڈرائنگ روم کا جائزہ لے ہی رہا تھا' کہ وہ اپنی ماں کے ساتھ آ گئی۔ آج بھی اس روز کی طرح وہ بھڑکیلے رنگوں کے کپڑے پہنے ہوئے تھی۔ ہونٹوں پر تیز سرخ رنگ کی لپ سٹک تھی۔ اس روز کی طرح آج بھی میں نے سوچا تھا کہ وہ عورت ماں نہیں لگتی' پھر بھی میں احتراماً کھڑا ہو گیا۔

''اماں! یہ ڈاکٹر حبیب ہیں۔ میں نے آپ سے ذکر کیا تھا نا۔''

''اچھا...... اچھا......'' اس نے ایک اچٹتی سی نظر مجھ پر ڈالی۔

''تم نے اتنا بوکھلایا کہ میں سمجھی رفیق صاحب آئے ہیں۔''

''بیٹھئے ڈاکٹر صاحب!''

اب وہ مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں بیٹھ گیا۔ ملائکہ لاؤنج میں جا کر ملازم لڑکے کو آوازیں دینے لگی' جب کہ اس کی اماں مجھے بغور دیکھ رہی تھی۔

''اچھا کاروبار چلتا ہے؟''

''جی......'' مجھے اس کے سوال پر حیرت ہوئی۔

''میرا مطلب ہے کچھ مریض وغیرہ آتے رہتے ہیں؟''

''ابھی تو سٹارٹ کیا ہے' زیادہ پیشنٹ نہیں ہیں۔'' اس کے چہرے پر مایوسی کے رنگ بہت واضح تھے۔ تب ہی ملازم لڑکا کوک لے آیا۔ اب ملائکہ بھی اپنی اماں کے ساتھ آ کر بیٹھ گئی تھی۔ دونوں میں زمین آسمان کا تضاد تھا۔ گفتگو' لب و لہجہ' سب مختلف...... انداز و اطوار' کیا یہ عورت سچ مچ اس کی ماں ہے۔ اگر ہے تو مجھے اس کی ماں کیوں نہیں لگ رہی' بلکہ وہ تو سرے سے مجھے ماں ہی نہیں لگتی۔'' لیکن وہ ملائکہ کی ہی نہیں اس بے حد خوبصورت بچے کی بھی ماں تھی۔ جب ملائکہ نے بتایا کہ شیری بھائی ہے اس کا' تو مجھے بے حد حیرت ہوئی۔ ملائکہ کی اور شیری کی عمر میں کم از کم اکیس بائیس سال کا تو فرق ضرور ہو گا۔ وہ دس گیارہ سال کا تھا۔ جب کہ ملائکہ نے مجھے اپنی عمر بتیس سال بتائی تھی۔

"دراصل......" وہ میری حیرت پا گئی۔

"اماں کو جب ابا نے طلاق دے دی تھی، تو کئی سال اماں، ماموں کے گھر رہیں، لیکن کوئی بارہ سال پہلے ماموں نے اماں کی شادی کر دی تو شادی کے سال بھر بعد شیری پیدا ہوا۔"

"اور تمہارے سوتیلے والد......؟" میں نے پوچھا۔

"دو تین سال پہلے اماں نے ان سے علیحدگی لے لی۔ دراصل جب پھوپھی کے گھر سے میں اماں کے پاس آ گئی تو میرے سوتیلے والد نے اماں سے کہا کہ وہ مجھے واپس بھجوا دیں، تو بس اسی بات پر اماں کا جھگڑا ہو گیا۔ اب میں، شیری اور اماں ہیں بس......"

کھانا ہوٹل سے منگوایا گیا۔ غالباً مٹن کڑاہی اور قورمہ...... ساتھ میں کھیر تھی۔

مجھے کچھ خاص مزہ نہ آیا۔ اس کی اماں کی باتیں مسلسل میرے اعصاب کو تھکا رہی تھیں۔

تھوڑی تھوڑی دیر بعد دونوں میں تلخ کلامی ہو جاتی تھی۔ اس کے انداز گفتگو میں شائستگی مفقود تھی۔ اس سے تو اچھا تھا کہ میں کسی ہوٹل میں ہی لنچ لے لیتا۔ اگرچہ ہر بار دعوت ملائکہ ہی دیتی تھی، لیکن بل میں ہی دیا کرتا تھا۔

"شکر ہے آج کچھ ڈھنگ کا کھانا کھایا۔"

میں لاؤنج میں کھڑا شیری سے باتیں کرتے ہوئے ملائکہ کا انتظار کر رہا تھا۔ حسب معمول اس نے اپنی گاڑی میرے کلینک کے باہر پارکنگ میں چھوڑ دی تھی، اور میری گاڑی میں یہاں تک آئی تھی۔

یہ اس کی اماں کی آواز تھی۔

"آہستہ بولو نا، حبیب سن لے گا۔"

"سن لے، خود تو روز ہوٹلوں میں عیش کرتی ہو، اور ہم یہاں قاسو کی پکائی سڑی ہوئی ماش کی دال اور آلو گوشت کا شوربہ کھا کھا کر......"

شیری زور زور سے ہنسنے لگا۔ ہنستے ہوئے وہ اور پیارا لگ رہا تھا۔

"اماں جھوٹ بولتی ہے۔ کل رات آپا سو گئی تھی، تو انکل رفیق کے ساتھ اماں ہوٹل سے کھانا کھا کر آئی تھی۔" اس نے رازدارانہ انداز میں سرگوشی کی، تو میں نے ہولے سے اس کے گال پر چٹکی بھری۔

"اور تم اپنی اماں کے راز کھول رہے ہو۔"

"یہ تو آپ کو بتایا ہے، آپ آپا کو نہ بتانا۔ ورنہ دونوں میں لڑائی ہو جائے گی۔"

"اچھا نہیں بتاؤں گا۔" میں نے وعدہ کیا تو وہ مسکرایا۔ واپس اپنی جگہ پر بیٹھ کر پھر سے ویڈیو گیم آن کرنے لگا۔

اس روز ملائکہ کو اس کی گاڑی کے پاس ڈراپ کرتے ہوئے میں نے سوچ لیا کہ آئندہ کبھی ملائکہ کے گھر نہیں جاؤں گا، لیکن چار دن بعد ہی مجھے اس کے گھر جانا پڑا۔ اس روز میں کلینک پہنچا ہی تھا، کہ مجھے اس کا فون آیا۔

"حبیب! میں سلیپنگ پلز کھانے والی ہوں۔"

"لیکن کیوں، کیا ہوا بھئی؟" میں نے گھبراہٹ کے باوجود لہجے کو خوشگوار رکھا۔

"بس مجھے اور نہیں جینا۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے حبیب۔" اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

"تم میرے اچھے دوست ہو حبیب! تمہارے خلاف میرا اس دنیا میں اور کوئی نہیں۔ اس لئے تمہیں خدا حافظ کہنے کیلئے فون کیا ہے۔ خدا حافظ حبیب! تم بہت اچھے ہو، مجھے یاد رکھنا۔"

"سنو ملائکہ!" لیکن اس نے فون بند کر دیا۔ میں نے تین چار بار اس کا نمبر ملایا، لیکن شاید اس نے ریسیور کریڈل سے ہٹا دیا تھا۔ دوسرے ہی لمحے میں اپنے کلینک سے نکلا، اور میری گاڑی آندھی طوفان کی طرح اس کے گھر کی طرف جا رہی تھی۔

ملازم لڑکے نے گیٹ کھولا، تو میں سیدھا گاڑی اندر لے گیا۔ پھر تقریباً بھاگتا ہوا ٹی وی لاؤنج میں داخل ہوا۔ ملازم لڑکا میرے پیچھے تھا۔

"ملائکہ کہاں ہے؟"

"اوپر اپنے کمرے میں ہوں گی۔"

سیڑھیاں لاؤنج سے ہی اوپر جا رہی تھیں۔ میں بھاگتا ہوا سیڑھیاں چڑھتا چلا گیا، اور پھر ایک لمحہ رک کر میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ایک بیڈ روم کا دروازہ نیم وا تھا۔ میں سیدھا اس کی طرف بڑھا۔ میرا اندازہ صحیح تھا۔ وہ ہی ملائکہ کا بیڈ روم تھا۔ آسمانی رنگ کی نائٹی پہنے وہ بیڈ پر بیٹھی تھی۔ پانی کا گلاس اس کے ہاتھ میں تھا، اور ہتھیلی پر ڈھیر ساری گولیاں۔

"ملائکہ! یہ کیا کر رہی ہو؟" میں نے ہاتھ مار کر گولیاں گرا دیں۔

"تم، حبیب تم......"

"ہاں میں......"

میں نے اپنا چڑھا ہوا سانس درست کیا، اور اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

"یہ کیا حماقت ہے؟"

"یہ حماقت نہیں حبیب! یہ کام جو میں آج کرنے والی ہوں' مجھے بہت پہلے کر لینا چاہئے تھا۔"

"پاگل ہو تم......"

"میں پاگل نہیں ہوں' بتاؤ کیا ہے میرے لئے اس دنیا میں۔ کیا ملا ہے مجھے اور میں کس کے لئے جیوں۔ کوئی تو جواز ہو میرے پاس جینے کا' کوئی آسرا...... کوئی محبت کی آس...... کچھ تو......"

سرمئی جھیلوں کے کنارے پانیوں میں ڈوب گئے' اور میرا دل جیسے اِن پانیوں میں ڈوب گیا۔

"تم مجھے اپنا دوست کہتی ہو ملائکہ' اور میرے ہوتے ہوئے تم یہ بھی کہہ رہی ہو کہ تمہارا کوئی نہیں...... کیا میں کچھ نہیں۔" وہ کچھ دیر میری طرف دیکھتی رہی' پھر اس نے نظریں جھکا لیں۔

"حبیب تم......" اس نے نچلے ہونٹ کا دایاں کونا دانتوں تلے دبا لیا' اور میرا دل چاہا کہ میں...... میں......

اس روز میں بہت دیر تک اس کے پاس بیٹھا رہا' اور جب اٹھا تو اس سے وعدہ لے چکا تھا کہ وہ آئندہ ایسا نہیں کرے گی۔ پھر اس کے بعد بھی دو تین بار اس کے گھر گیا۔

ایک بار جب شیریں سیڑھیوں سے گر گیا تھا' اور اس کی گاڑی ورکشاپ میں تھی' اور اس نے مجھے فون کیا تھا' اور دوبارہ جب وہ دو تین ہفتے تک سٹنگ میں نہیں آئی تو میں اس کی خیریت معلوم کرنے گیا تھا' اور جتنی بار بھی میں اس کے گھر گیا' اس کی ماں کو یونہی چمکیلے اور بھڑکیلے لباس میں دیکھا۔ میں نے یہ بھی اندازہ لگایا تھا' کہ باوجود تلخ کلامی کے' ملائکہ اپنی ماں کی بات بہت مانتی تھی' لیکن اس کے زیرِ اثر تھی' اور غالباً یہ جو اس کی شخصیت میں الجھاؤ تھا' اس کی وجہ اس کی ماں کا رویہ ہی تھا۔

وہ اپنی ماں سے اختلاف بھی کرتی تھی' لیکن پھر اس کی بات آخر میں مان بھی لیتی تھی۔ ماں سے بات کرتے ہوئے اس کا لب ولہجہ یکدم بدل جاتا تھا' وہ اس سے اسی لہجے میں گفتگو کرتی تھی' جس میں اس کی ماں کرتی تھی۔

"اگر یہ اپنی ماں سے الگ ہو جائے' تو شاید اس کی شخصیت کی گرہیں کھل جائیں۔ کہیں کسی اور ماحول میں' لیکن کیسے......؟ کون اسے اس ماحول سے باہر نکالے۔ اگر ملائکہ کی شادی ہو جائے کسی اچھے شخص سے' جو اسے محبت دے' جو اس کے ساتھ مخلص ہو' وہ جو اس کے اندر محبت کی

طلب ہے' تشنگی ہے' وہ ختم ہو جائے تو یہ ایک نارمل زندگی گزار لے۔" کبھی کبھی وہ مجھے بے حد اپنی سی لگتی تھی' خاص طور پر جب وہ اپنی ماں سے تیز لہجے میں بولتی تھی تب...... لیکن وہ شخص کون ہو سکتا ہے؟"

میرے دل کی زمین پر اچانک ہی یہ خیال اُگ آیا تھا۔ ایک لمحہ کے لئے تو اپنے اس خیال پر میں خود بھی حیرت زدہ رہ گیا تھا۔ کیا میں ملائکہ سے شادی کر لوں؟ کیا میں اس سے محبت کرنے لگا ہوں؟ اور وہ جو' جو میرے دل میں دھرنا مارے بیٹھی ہے۔ نہیں' مجھے ملائکہ سے محبت نہیں ہمدردی ہے۔ میں اسے' اتنی پیاری لڑکی کو ضائع ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ ان دنوں وہ پھر غائب رہنے لگی تھی۔ وہ دو ہفتے کلینک آتی' نہ فون پر ملتی۔ اپنے شیڈول کے مطابق سٹنگ کے لئے بھی نہ آتی' تو میں جھنجھلا جاتا۔

"کہاں گم ہو ملائکہ؟"

"کہیں نہیں......" وہ گول مول سا جواب دیتی۔

"آج ڈنر یا لنچ کے لئے چلو۔"

"آج موڈ نہیں۔"

دو تین بار گھر گیا تو عجیب حلیے میں بیٹھی تھی۔ گندے میلے کپڑے' بکھرے الجھے بال۔

"یہ کیا بوریت ہے ملائکہ۔"

وہ بس ہنس دیتی۔ عجیب طرح کی ہنسی۔

"شاید وہ ایک بار پھر مایوس ہو رہی ہے۔" میں نے سوچا۔ "کہیں......" میں گھبرا گیا۔ "کہیں وہ پھر خودکشی کی طرف مائل نہ ہو جائے۔" کتنی مشکلوں سے تو میں اسے زندگی کی طرف لایا تھا۔ تو...... کیا میں......

❋ ❋ ❋

ان دنوں گھر میں ایک بار پھر اماں اور بابا کے درمیان میری شادی موضوع گفتگو بنی تھی۔ اماں نے کوئی لڑکی دیکھی تھی۔ "اچھی تو ہے' لیکن مریم جیسی نہیں۔" اماں کا اصرار تھا کہ جہاں اتنا انتظار کیا ہے تھوڑا اور کر لیں۔ "آپا کہہ رہی تھیں کہ بھائی صاحب اگلے دو ماہ تک آنے والے ہیں۔"

"اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اپنے بھانجے کا پروپوزل قبول کر لیں۔ بیگم! یہ انتظار چھوڑو اور بس۔"

"اچھا میں حبیب سے پوچھ لوں' پھر بات چلاتی ہوں۔" اور جب اماں نے مجھ سے پوچھا' تو میرے لبوں پر ملائکہ کا نام آتے آتے رہ گیا۔

"نہیں' اماں سے بات کرنے سے پہلے ملائکہ سے بات کرلوں۔"

میں نے بالآخر اس سے شادی کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ اس روز فونٹین ہاؤس گیا' تو مجھے راجہ نواز مل گیا۔ بچپن سے لے کر میٹرک تک ہم نے ایک ہی سکول میں پڑھا تھا۔ وہ آج کل کسی اخبار سے منسلک تھا' اور سروے کے سلسلے میں فونٹین ہاؤس آیا ہوا تھا۔

"چند دن پہلے مظہر نے مجھے تیرا بتایا تھا' روز سوچتا ہی رہا تیری طرف آنے کو۔" وہ بڑی گرم جوشی سے ملا۔

سروے سے فارغ ہو کر ہم ایک کافی ہاؤس میں آ بیٹھے۔

"کیسے ہو یار! اکیلے آئے ہو یا کوئی میم لائے ہو؟"

وہ ہمیشہ کی طرح بے تکلف تھا' لگتا ہی نہیں تھا بیچ میں اتنے ماہ و سال بیت گئے ہیں۔ حالانکہ اسے پہچاننے میں مجھ کچھ دیر لگی تھی۔

"اکیلا ہوں......" میں مسکرایا۔

"تم سناؤ......"

"میں تو دو عدد چیاؤں پیاؤں کا والد محترم بن چکا ہوں' تیسرے کی آمد ہے۔"

اس نے زوردار قہقہہ لگایا۔

"یعنی تم ابھی تک اپنی اس "نفری" بڑھانے والی تھیوری پر یقین رکھتے ہو۔"

وہ فیملی پلاننگ کے خلاف لمبی لمبی تقریریں کرتا تھا۔

"بھئی میرا تو خیال ہے مسلمانوں کو نفری بڑھانی چاہیے۔ بے چارے یوں ہی ہر طرف مارے جا رہے ہیں۔"

"نہیں......" وہ ہنس دیا۔

"تمہاری بھابی نے وارننگ دے دی ہے کہ یہ آخری ہوگا۔ ویسے یار تمہیں شادی کر لینا چاہیے۔"

"سوچ رہا ہوں۔"

"کوئی پسند کرلی ہے۔"

"بس یہی سمجھ لو۔"

"کیسی ہے' میری جان...... کہاں ملی؟"

نواز بچوں کی طرح آنکھیں مٹکا رہا تھا۔

"اب الف سے یے تک بک دے بس۔"

اس نے میری پیٹھ پر دھموکا جڑا۔ وہی پرانا انداز اور بالکل پہلے کی طرح' میں نے اسے سب کچھ بتا دیا۔ وہ بچپن سے ہی میرا راز دار دوست تھا۔ یعنی تمہارا مطلب ہے کہ ملائکہ...... ملائکہ محب اللہ خان...... ماضی کی اداکارہ۔

"ہاں یار! وہ بڑی مظلوم لڑکی ہے' بتایا تو ہے میں نے تمہیں۔"

"بکواس......" اس نے میز پر زور سے ہاتھ مارا۔

"بالکل بکواس...... جو کچھ تم نے بتایا ہے ستر فیصد جھوٹ ہے اس میں...... ممتاز ملک ملائکہ محب اللہ کا دوسرا شوہر تھا' اور وہ بچہ شہریار' ملائکہ کا بیٹا ہے جسے وہ بھائی ظاہر کرتی ہے۔ پہلی شادی اس نے شوبز کی دنیا میں آنے سے پہلے کی تھی اپنے ماموں زاد سے' اور یہ بچہ پہلی شادی سے ہے۔"

میں ساکت بیٹھا تھا۔

"تم یہ کیسے جانتے ہو؟" میری آواز دھیمی تھی۔

"میں تو اور بھی بہت کچھ جانتا ہوں' اور رہی کیسے کی بات تو بیٹا صحافی ہوں۔ تمہیں اس ڈرامہ باز لڑکی سے شادی نہیں کرنا چاہیے۔ تمہارے بابا تمہیں گوریوں سے اس لئے بچا کر نہیں لائے کہ تم کالیوں کے جال میں پھنس جاؤ۔ ملائکہ کی ماں ایک لالچی عورت ہے۔ وہ تو تمہیں بیچ کر کھا جائے گی' اور خود ملائکہ اتنی مظلوم نہیں جتنا ظاہر کرتی ہے۔ اپنی پھوپھی کا گھر اس نے ماں کے کہنے پر چھوڑا ہے' کیونکہ پھوپھی بھی اس کی ماڈلنگ کے خلاف تھی۔"

میں نے راجہ نواز کی ساری باتیں دھیان سے سنیں' لیکن مجھے اس میں ملائکہ کا کوئی قصور نظر نہیں آیا۔ میں اب بھی سوچ رہا تھا کہ مجھے شادی تو کرنا ہی ہے' پھر ملائکہ سے ہی کیوں نہ کرلوں۔ جہاں تک شیری کی بات ہے' وہ ایک پیارا لڑکا ہے' مجھے تو یوں بھی اچھا لگتا ہے۔ اگرچہ مجھے نواز کی بات پر یقین نہیں آیا تھا' یہ صحافی تو یوں بھی پروں کا ڈار بناتے ہیں۔ پھر بھی اگر ایسا تھا بھی تو کیا فرق پڑتا تھا۔

رہی بابا اور اماں کی بات' تو بھلا انہیں کیوں اعتراض ہوگا۔ بابا ہی تو چاہتے تھے نا کہ میں کسی پاکستانی لڑکی سے شادی کروں' اب وہ لڑکی مریم ہو یا ملائکہ' اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔

راجہ نوازش نے اپنی طرف سے ہر طریقے سے مجھے ملائکہ کے ساتھ شادی کے ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کی' بلکہ مجھے یہ تک کہا۔

"کمال ہے یار! تم اتنے بے وقوف ہو گئے مجھے اندازہ نہ تھا۔ آج کل بلکہ پندرہ دن پہلے تک تو اس کا رفیق ہمدانی سے بہت زبردست افیئر چل رہا تھا۔ رفیق ہمدانی' ایک بڑا بزنس مین ہے' دبئی میں اس کا بہت بڑا کاروبار ہے' ایک ماہنامے نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ دونوں نے خفیہ شادی کر لی ہے شاید۔ خود رفیق ہمدانی نے ایک صحافی کو بتایا ہے کہ وہ دونوں عنقریب شادی کرنے والے ہیں' تم کس دنیا میں رہتے ہو میرے یار!"

اس کی باتوں نے مجھے بوکھلا دیا' تاہم میں نے اسے ڈپٹ دیا۔

"یہ تم صحافی یونہی بے پر کی اڑاتے ہو۔ پچھلے ماہ سے میرا مسلسل اس سے رابطہ ہے۔ تقریباً روز ہی بات چیت ہوتی ہے' اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو وہ ضرور مجھ سے ذکر کرتی' اور پھر اسے خواب آور گولیاں کھانے کی بھی ضرورت نہ تھی۔"

"خیر تم آج جا کر اس سے پوچھنا۔"

راجہ نوازش نے بات ختم کر دی تھی۔

لیکن میں سوچ رہا تھا کہ میں آج اسے پرپوز کر دوں تو زیادہ بہتر ہے۔ اور اس سے بات کر کے پھر بابا سے بات کر لوں۔ سو اس ارادے سے میں وہاں سے سیدھا گلبرگ چلا گیا۔

شہریار ٹی وی لاؤنج میں تھا' لیکن خلاف معمول ٹی وی دیکھنے یا ویڈیو گیم کھیلنے کے بجائے وہ صوفے پر دونوں پاؤں رکھے یوں بیٹھا تھا کہ اپنے گھٹنوں کے گرد دونوں بازو لپیٹے ہوئے تھے' اور تھوڑی گھٹنوں پر رکھی تھی۔

"ہیلو....."

میں بے تکلفی سے ٹی وی لاؤنج میں چلا آیا تھا۔

"کیا ہو رہا ہے پارٹنر؟"

میں نے اس کے بال بکھیرے' اس نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں' اور پلکیں بھیگی بھیگی سی تھیں۔ شاید وہ میرے آنے سے پہلے رویا تھا۔

"کیا بات ہے؟ کیا مما سے ڈانٹ پڑ گئی؟"

میں نے خوش گوار انداز میں پوچھا' لیکن اس نے میری بات کا جواب نہ دیا' اور سر جھکا لیا۔ تب ہی اوپر سے چیختی ہوئی آواز آئی۔ ملائکہ کی آواز۔

"شیری کی خبر گیری کرتی ہو' تو کون سا احسان کرتی ہو مجھ پر' تم ہی چاہتی تھیں کہ میں تمہارے بھتیجے سے شادی کر لوں...... اور پھر تم نے ہی طلاق بھی دلوائی تھی' اور تم نے ہی کہا تھا کہ میں کسی کو نہ بتاؤں کہ شہریار میرا بیٹا ہے۔ ورنہ ٹی وی والے مجھے چانس نہیں دیں گے۔ میں نے کبھی یہ نہیں چاہا تھا کہ میں شہریار کا رشتہ لوگوں سے چھپاؤں۔ وہ میرا بیٹا تھا' لیکن تم نے اسے مجھ سے چھین لیا۔"

میں ساکت کھڑا تھا۔ راجہ نوازش کی ایک بات سچ ثابت ہو گئی تھی کہ شہریار ملائکہ کا بیٹا ہے' میں نے ذرا سا رخ موڑ کر اسے دیکھا۔ اس نے اب اپنا سر تقریباً گھٹنوں میں دے لیا تھا' اور ہولے ہولے رو رہا تھا۔

"تو میں ہی اب کہہ رہی ہوں کہ دے آؤ اسے اس کے باپ کو...... میں نہیں سنبھال سکتی اسے۔" یہ اس کی ماں کی آواز تھی۔

"کیا سنبھالتی ہیں۔ کھانا کھلاتی ہیں' نہلاتی دھلاتی ہیں' کیا کرتی ہیں۔ نوکر ہے اس کے کام لئے...... اخراجات میں دیتی ہوں۔"

ملائکہ کی آواز پہلے سے زیادہ بلند تھی۔

"تم کیا اخراجات دو گی' کیا ہے تمہارے پاس۔ کیا سمجھتی ہو کہ ممتاز ملک سے لیا ہوا روپیہ اب تک چل رہا ہے۔ وہ تو گیا یوں' بینک میں تمہارا اکاؤنٹ خالی ہو چکا ہے۔ ملائکہ بی بی! اسی لئے تو کہتی تھی کہ اس رفیق ہمدانی کو پھنسا لے جال میں' اونچی اسامی ہے' ذرا عمر کا زیادہ ہے' تو تجھے عمر سے کیا لینا۔ پر تو تو نکمی ہے اڑ گیا نا پنچھی' تو تو اس ٹٹ پونجیے ڈاکٹر پر مر رہی تھی۔ بھاگ بھاگ کر اس کے کلینک جاتی تھی۔ وہ بے چارہ یہاں گھنٹوں تمہارے انتظار میں سڑتا رہتا تھا' اور تم وہاں....."

"میں اس پر مرتی نہیں تھی۔ علاج کروا رہی تھی اس سے...... اور یہ تمہارا رفیق ہمدانی صرف وقت گزار رہا تھا۔ شادی وادی نہیں کرنی تھی اس نے۔ مجھ سے صاف کہہ دیا تھا کہ جوان بچوں کے ہوتے ہوئے وہ شادی نہیں کر سکتا۔"

"کم بخت مجھ سے تو کہتا تھا کہ ملکی سے شادی کروں گا۔ تیرے اس ڈاکٹر کا کاروبار چلا کچھ؟"

اس کی آواز کی تلخی کم ہوئی تھی۔ وہ غالباً اوپر سیڑھیوں کے قریب ہی لاؤنج میں بیٹھی تھی کہ آواز صاف آ رہی تھی۔ مجھے ہنسی آ گئی' لیکن میں یونہی اس صوفے کی بیک پر ہاتھ رکھے کھڑا تھا'

جس پر شہریار بیٹھا ہوا تھا۔

"اماں! تیری سمجھ میں کوئی بات نہیں آتی۔ کاروبار چلے یا نہ چلے' وہ تیرے رفیق ہمدانی سے کم نہیں ہے۔ کروڑوں کی جائیداد ہے اس کی۔"

"تو شادی کرلے گا تجھ سے؟"

اس کی آواز میں اشتیاق تھا' جب کہ ملائکہ کے لہجے میں بے زاری تھی۔

"پتا نہیں۔"

"دیکھ ملکی! میں تیرے ہی فائدے کو کہتی ہوں کسی طرح شادی پر راضی کرلے اس کو۔ ہائے کیا کیا خواب نہیں دیکھے تھے میں نے کہ تو فلمی دنیا پر راج کرے گی' کروڑوں میں کھیلے گی۔ پر ہائے قسمت...... ہائے صادق تیرا کچھ نہ رہے تو نے میری شہزادی کو برباد کردیا۔" اب آواز میں رقت تھی۔

"مت نام لے اماں اس کا...... میرا خیال ہے حبیب بھی مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے' اور اسے شیری سے بھی لگاؤ ہے۔"

"ہائے ہائے شیری کا مت بتانا اسے کہ وہ تمہارا بیٹا ہے۔ میں سینے سے لگا کر رکھوں گی۔ جگر کا ٹکڑا ہے میرا۔ وہ تو بس یوں ہی غصے میں بک جاتی ہوں۔ جانو! بس تم ہر مہینے اس کا خرچ دے دیا کرنا مجھے' اتنا امیر ہے تیرا ڈاکٹر تو بیس پچیس ہزار مہینہ کیا مشکل ہوگا۔"

"تو فکر نہ کر زیادہ ہی دے دیا کروں گی۔"

اب دونوں نارمل انداز میں باتیں کر رہی تھیں۔ آواز بھی اتنی بلند نہ رہی تھی۔ اسی لئے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا' شاید وہ مستقبل کے خواب دیکھ رہی تھیں۔ میں نے ایک نظر شہریار کی طرف دیکھا۔ اس نے سر بدستور گھٹنوں میں دے رکھا تھا' لیکن اب وہ ہچکیوں سے رو رہا تھا۔

میں کچھ دیر تاسف اور ہمدردی سے اسے دیکھتا رہا۔ اس سارے معاملے میں اس بچے کا کیا قصور ہے۔ دس گیارہ سال کا یہ بچہ شاید آج ہونے والے انکشاف سے ٹوٹ رہا تھا' بکھر رہا تھا۔ میرا دل چاہا اسے سینے سے لگا کر پیار کروں تسلی دوں' لیکن میں اس کے لئے کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ میں خاموشی سے ٹی وی لاؤنج سے باہر نکلا۔ گیٹ پر دودھ کے پیکٹ' ڈبل روٹی اور انڈے شاپر میں لئے ملازم لڑکا ملا۔ شاید گیٹ اسی لئے کھلا تھا۔

"ارے صاحب! آپ کب آئے؟"

"بس ابھی آیا ہوں۔"

"بی بی صاحب تو گھر پر نہیں ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔"

شاید اسے یہی ہدایت ملی ہوئی ہوگی۔ بے اختیار مسکراہٹ کو روکتے ہوئے میں گیٹ سے باہر نکل آیا۔

اس کے بعد میں ملائکہ سے کبھی نہیں ملا۔ میں نے وہاں شیری کے پاس کھڑے کھڑے ہی فیصلہ کرلیا تھا' کہ مجھے ملائکہ سے شادی نہیں کرنی۔

راجہ نوازش صحیح کہتا ہے کہ بابا مجھے اس لئے گوریوں سے بچا کر نہیں لائے کہ میں کالیوں کے جال میں پھنس جاؤں۔ ملائکہ ایسی لڑکی نہیں ہے' جیسی لڑکی بابا میرے لئے چاہتے تھے' تاہم میرے دل میں ایک ملال سا تھا۔ میں اس لڑکی کے حالات پر افسردہ تھا' اور ممکن ہے اگر میں ملائکہ سے پھر ملتا تو میں پگھل جاتا' بہرحال میرے دل میں اس کے لئے ایک نرم گوشہ ضرور تھا' مگر ہوا یوں کہ دوسرے روز ہی مجھے ایک سیمینار میں شرکت کیلئے کراچی جانا پڑ گیا۔

ڈاکٹر مظہر نے مجھے اس کے لئے کئی دن پہلے سے کہہ رکھا تھا' اور پھر وہاں کراچی میں ہی دواؤں کی ایک کمپنی کی طرف سے میں اور ڈاکٹر مظہر ایک کانفرنس میں شرکت کرنے کیلئے ہالینڈ چلے گئے۔

❊ ❊ ❊

ہالینڈ میں تو ہفتے بھر کا قیام تھا لیکن واپسی پر ڈاکٹر مظہر نے انگلینڈ کا پروگرام بنا لیا' جہاں ان کے بھائی بھابی رہتے تھے۔ "چلو یار کچھ دن انگلینڈ کی بھی سیر کرلیں۔" اس طرح یہ ٹور تقریباً مہینے بھر کا ہوگیا' جب واپس آیا تو اماں خوشی خوشی میری بر کی تیاریوں میں مصروف تھیں۔ مریم کے گھر والوں نے ہاں کردی تھی۔

مریم واقعی ایسی لڑکی تھی' جس کی رفاقت پر فخر کیا جاسکتا تھا۔ وہ ہر لحاظ سے اچھی تھی۔ بابا اور اماں کا بیٹیوں کی طرح خیال رکھتی۔ بابا اور اماں خوش تھے' تو میں بھی مطمئن تھا۔ ہاں کبھی کبھی جائزہ حارث کا خیال آتا' تو دل میں کسک سی اٹھتی اور ساتھ ہی پتا نہیں کیوں ملائکہ محب اللہ کا تصور بھی چلا آتا۔ پتا نہیں وہ کہاں ہوگی۔ وہ اور اس کا بیٹا شیری' جسے وہ اپنا بھائی کہتی تھی وہ...... میں نے ملائکہ سے محبت نہیں کی تھی' مجھے شاید اس سے ہمدردی تھی' یا پھر پتا نہیں کیا۔ محبت تو میں نے جائزہ حارث سے کی تھی' لیکن عجیب بات ہے مریم سے شادی کے بعد میں نے جز کو اتنا نہیں سوچا جتنا ملائکہ کو۔

یہ نہیں کہ میں اپنی زندگی سے مطمئن نہیں تھا یا مجھے کسی طرح کا کوئی پچھتاوا تھا۔ لیکن پھر بھی کبھی کبھی ملائکہ محب اللہ بے تحاشا یاد آتی۔ وہ انوکھی سی لڑکی' جس کی زندگی کے نہ جانے کتنے رخ تھے' بہت مہذب اور شائستہ' جاہل اور منہ پھٹ' ظالم' مظلوم' بے بس اور نفسیاتی مریض۔ وہ جو کچھ بھی تھی بہرحال میں اسے بھولا نہیں تھا۔

سات سال گزرنے کے بعد بھی نہیں۔ اب جب کہ میرے دو پیارے پیارے بچے ہیں۔ مریم جیسی بیوی ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ مریم نے زندگی کا ہر سکھ دیا ہے مجھے۔ اگر میری شادی جو یا ملائکہ سے ہوتی تو میں اتنا پرسکون اور مطمئن نہ ہوتا۔

❁ ❁ ❁

مریم سے شادی کے بعد میں کراچی شفٹ ہو گیا تھا' اور اس کی وجہ یہ تھی کہ یہاں بابا کی کافی جائیداد تھی' اور وہ ایک ہاؤسنگ سکیم شروع کرنا چاہتے تھے۔ یوں بھی بابا کے ساتھ ان کی سروس کے دوران بیشتر وقت کراچی میں ہی گزرا تھا۔ کراچی آنے کے بعد کچھ عرصہ تک راجہ نوازش اور ڈاکٹر مظہر سے رابطہ رہا' لیکن پھر ٹوٹ گیا۔

ان سات سالوں میں دو بار میں چند ماہ کے لئے اسد بھائی کے پاس امریکہ بھی گیا۔ جو نے ایک انڈین سے شادی کر لی تھی' لیکن دونوں میں جھگڑا رہتا تھا۔ جو سے میری ملاقات اتفاقیہ ہوئی تھی۔ وہ سٹور سے وائن خرید رہی تھی۔ اپنے متعلق بتاتے ہوئے اس نے کچھ ایسی شاکی نظروں سے مجھے دیکھا تھا کہ پاکستان آ کر بھی میں کتنے دن ڈسٹرب رہا۔ خیر! میں تو ملائکہ کا ذکر کر رہا تھا کہ ان سات سالوں میں مجھے ملائکہ کے متعلق بالکل کچھ پتا نہیں چلا۔ لوگوں نے واقعی اسے بھلا دیا تھا۔ کہیں کسی اخبار میں میری نظر سے اس کا نام نہیں گزرا تھا۔ شاید اگلے چند سالوں میں' میں بھی اسے بھول جاتا کہ مجھے اچانک ایک روز طارق روڈ کراچی کی ایک شاپ سے باہر آتا راجہ نوازش مل گیا۔ میرا دھیان اپنے بیٹے ایمل کی طرف تھا کہ برسوں پہلے کی طرح اس نے پیچھے سے میری پیٹھ پر دھموکا جڑا۔

"اُے کیسے ہو؟"

"او یار.....!"

میں تڑپ کر مڑا تو وہ بازو پھیلائے کھڑا تھا۔ اور کچھ ہی دیر بعد ہم ایک ہوٹل میں ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے ایک دوسرے کو بیتے سالوں کی روداد سنا رہے تھے۔ اس نے بتایا کہ ڈاکٹر مظہر اپنے بھائی کے پاس انگلینڈ چلے گئے ہیں' اور وہ خود دو تین سال سے کینیڈا میں سیٹل

ہے۔

"مگر یار! تم تو ملک سے باہر جانے کے خلاف تھے۔" مجھے حیرت ہوئی۔

"بس یار! کیا بتاؤں' خواہشیں' آرزوئیں بھگائے پھرتی ہیں۔ طلب بڑھتی جاتی ہے سو......؟"

ایمل اسی ہوٹل میں بنے بچوں کے حصے کی طرف چلا گیا تھا۔ جہاں جھولے وغیرہ اور بچوں کی دلچسپی کی دوسری چیزیں تھیں۔

"کراچی میں کب تک قیام ہے؟"

"بس دو تین روز مزید..... پھر کچھ دن گاؤں رہ کر واپس کینیڈا..... دراصل بچے اور بیگم تو وہیں ہیں۔ میں دادا کی وفات پر آیا تھا۔ خیر تم سناؤ بھابی کیسی ہیں؟ اور کیسی گزر رہی ہے؟"

"بہت اچھی۔" میں نے بے حد آسودہ لہجے میں بتایا' تو وہ مسکرا دیا۔

"ملائکہ تو یاد نہیں آتی؟"

"یادوں کا کیا ہے یار....." میں بھی مسکرا دیا۔

"سچ بتا کیا تو اس سے محبت کرنے لگا تھا؟"

"پتا نہیں..... لیکن شاید میں اس کی مدد کرنا چاہتا تھا یا مجھے اس سے ہمدردی ہو گئی تھی۔ اسے تم محبت نہیں کہہ سکتے۔"

"ہاں' ترس تو مجھے بھی اس پر بہت آیا تھا' جب میں نے اسے مینٹل ہاسپٹل میں دیکھا تھا۔"

"مینٹل ہاسپٹل؟" مجھے شاک سا لگا۔

"ہاں ان دنوں وہ مکمل طور پر دیوانگی کا شکار تھا۔ بعد میں اس کی حالت کچھ بہتر ہو گئی تھی۔ آج کل وہ فونٹین ہاؤس میں ہے۔ ڈاکٹر مظہر جب یہاں سے گئے تھے' دو سال قبل تو تب وہاں اس کی پھوپھی نے اسے ایڈمٹ کروایا تھا' اور وہ ابھی تک وہیں ہے۔ چند دن ہوئے میں نے ایک فلمی ہفت روزے میں پڑھا تھا۔"

"اور شیری......؟" بے اختیار میرے لبوں سے نکلا۔

"میرا مطلب ہے اس کا بیٹا۔"

"وہ پہلے تو اپنے باپ کے پاس تھا' لیکن پھر ملائکہ کی پھوپھی اسے لے گئی تھی' اور آج کل وہ کینیڈا میں ہے۔ ملائکہ کی پھوپھی کے پاس' میرے بیٹے کے ساتھ پڑھتا ہے۔ دو تین بار شیری

ملاقات ہوئی ہے اس سے۔ وہ بہت مطمئن اور خوش ہے۔

میں نے ایک اطمینان بھری سانس لی۔ پتا نہیں کیوں مجھے اس سے انس ہو گئی تھی۔

کبھی کبھی زندگی بعض لوگوں کے ساتھ بہت برا سلوک کرتی ہے۔ حالانکہ وہ اس کے مستحق نہیں ہوتے' جیسے ملائکہ محب اللہ کے ساتھ زندگی نے کیا۔ حالانکہ وہ اس کی مستحق نہ تھی۔

میں نے اپنے دل میں اس کے لئے گہرے درد کو پھیلتے ہوئے محسوس کیا۔

اس روز جب میں اپنے بستر پر لیٹا تو غیر ارادی طور پر میں نے اس کے متعلق شروع سے آخر تک ہر بات سوچ ڈالی۔ میں نے سوچا کہ میں ملائکہ کی کہانی لکھوں' جیسا کہ شروع میں آپ کو میں نے بتایا ہے کہ میں کبھی کبھی کہانیاں لکھتا ہوں' بلکہ لکھتا تھا۔ کسی بھی نفسیاتی پرابلم پر...... زیادہ تر میری کہانیوں کا مرکزی کردار کوئی سچا واقعہ ہی ہوتا تھا۔ کچھ دن پہلے ہی مجھے میرے میگزین کے ایڈیٹر ملے تھے' اور وہ گلہ کر رہے تھے کہ میں نے تو بالکل ہی لکھنا چھوڑ دیا ہے' اور میں نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ میں لکھوں گا۔ ایک روز مریم نے بھی کہا تھا کہ مجھے لکھنا چاہئے۔ میں لکھنے کے ہنر سے آشنا ہوں۔ میں نے ملائکہ سے کہا تھا کہ میں اس کی کہانی لکھوں گا تو...... میں نے قلم اٹھا لیا' لیکن مجھے سمجھ میں نہیں آیا کہ میں کیا لکھوں۔ میں نے کلینک آفس سے ملائکہ کی فائل نکلوا لی تھی۔ اس کی کیس ہسٹری میرے سامنے تھی' لیکن چار ماہ کی سٹنگ میں اس نے اپنے متعلق زیادہ نہیں بتایا تھا۔ میں تو اس کے متعلق اتنا بھی نہیں جانتا تھا' جتنا راجہ نوازش اور ڈاکٹر مظہر جانتے تھے۔

میرے پاس تو لکھنے کے لئے کچھ بھی نہ تھا۔ بس چند ادھوری باتیں' ادھوری معلومات۔

اگلے روز نوازش میرے گھر آیا تو میں نے کہا۔

''راجہ! میں ملائکہ سے ملنے جاؤں گا' تم چلو گے میرے ساتھ؟''

راجہ نے ایک گہری نظر مجھ پر ڈالی' اندر تک اترتی ہوئی۔

''تم اب بھی اس سے محبت کرتے ہو۔''

اس نے پوچھا نہیں تھا۔ پورے یقین سے کہا تھا۔ میں خاموش ہی رہا۔

''ہاں' وہ ایسی تھی کہ اس سے محبت ہو جاتی تھی خود بخود ہی۔ ایک بار میں نے بھی ایسا ہی محسوس کیا تھا' لیکن پھر میں نے خود کو سنبھال لیا۔ ان دنوں میں نے اس کا ایک انٹرویو لیا تھا۔ اپنے اخبار کے لئے' اور میری اس سے دوستی ہو گئی تھی' پھر میں کئی بار اس سے ملا تھا۔''

میں نے اس کی بات پر تبصرہ کئے بغیر اپنا سوال دہرایا۔

''چلوں گا۔'' اس نے سانس کھینچی۔ ''اور پھر وہیں سے گاؤں چلا جاؤں گا۔''

''اوکے' تو میں لاہور کے لئے سیٹ بک کروا لیتا ہوں۔'' راجہ نوازش نے سر ہلا دیا' لیکن ہم جتنی دیر ساتھ رہے' وہ کھوجتی نظروں سے مجھے دیکھتا رہا۔ صحافی تھا نا' اندر تک اتر جانے والی نظر رکھنے والا' لیکن وہ میرے اندر ملائکہ کے لئے کوئی ایسا جذبہ نہ پا سکا' جسے وہ محبت کا نام دے سکتا۔ اور وہ پاتا بھی کیسے خود مجھے نہیں معلوم کہ میں نے ملائکہ سے محبت کی تھی یا نہیں۔

آج جب میں اس کی کہانی لکھ رہا ہوں' تب بھی میں نہیں جانتا کہ مجھے اس سے محبت تھی یا محض ہمدردی۔ پہلی ملاقات سے لے کر آج تک میں یہی سمجھتا رہا ہوں کہ میری پہلی محبت جائمہ حارث تھی' لیکن پتا نہیں کیوں ان بیتے سات سالوں میں جتنا میں نے جو کو سوچا' اتنا ہی ملائکہ کو بھی سوچا۔

❋ ❋ ❋

ڈاکٹر لطیف ابھی تک فاؤنڈیشن ہاؤس میں تھے۔ بہت دیر ان کے آفس میں بیٹھ کر باتیں ہوتی رہیں' اور وہ اس بات پر افسوس کرتے رہے کہ ڈاکٹر مظہر جیسے رضا کارانہ طور پر کام کرنے والے ڈاکٹر اب میسر نہیں ہیں۔ میں نے وعدہ کیا کہ میں مہینے میں دو بار کراچی سے آیا کروں گا۔ جس پر وہ بے انتہا خوش ہوئے' اور میں شرمندہ۔ ہم کتنا کچھ اپنے لئے کرتے ہیں' اور دوسروں کے لئے کچھ کرنے کو ہمارے پاس وقت نہیں ہوتا' اور اب جو میں نے یہاں مہینے میں دو بار آنے کا کہا تو کیا صرف جذبہ خدمت سے مغلوب ہو کر یا...... یا پھر ملائکہ......

''نہیں۔'' میں نے اپنے آپ کو سرزنش کی۔ بھلا ملائکہ کے لئے کیوں...... اور پھر ہم ڈاکٹر لطیف کے ساتھ ہی راؤنڈ کے لیے گئے' اور وہ مجھے نظر آ گئی۔ وہ جسے دیکھنے کے لئے میں کراچی سے آیا تھا۔ وہ کچھ عورتوں کے ساتھ بیٹھی تھی' اور وہ سب کاغذ کے پھول بنا رہی تھیں۔ ہمیں دیکھ کر وہ اٹھ کر ہمارے پاس چلی آئی' جب کہ باقی خواتین بدستور اپنے کام میں مصروف رہیں۔

''ڈاکٹر صاحب!'' وہ ڈاکٹر لطیف سے مخاطب تھی۔

''یہ دیکھیں اس موٹی نے مجھے تھپڑ مارا ہے' اور میرے بال بھی کھینچے ہیں۔''

میں بہت دھیان سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ ہونٹ بسور بسور کر بالکل پہلے کے سے انداز میں ڈاکٹر لطیف سے شکایت کر رہی تھی۔ میں تب بھی اس کے بچوں جیسے اس انداز پر ہنستا تھا' آج بھی میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

''کیا وہ میری ماں لگتی ہے جو اس نے مجھے مارا۔'' میں نے اس سے کہا تو سب ہنسنے لگیں۔ میں نے غلط تو نہیں کہا نا ڈاکٹر صاحب! وہ میری ماما تو نہیں ہے۔ مارتی تو صرف ماں ہے نا۔''

وہ ڈاکٹر لطیف کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں پاگلوں والی مخصوص چمک تھی' وہ اس وقت بہت قابل رحم لگ رہی تھی۔ میرے دل کو جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا۔

''جن دنوں یہ مکمل طور پر حواس کھو چکی تھی' تو اس کی ماں اسے بہت مارا کرتی تھی۔''

راجہ نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

وہ ڈاکٹر لطیف سے شکایت لگا کر واپس جا چکی تھی' اور بڑی مطمئن سی اپنی جگہ پر جا کر پھول بنانے لگی تھی۔

''کیا وہ اس کی سگی ماں تھی؟'' میں نے راجہ سے پوچھا۔

''ہاں......''

''لیکن وہ اس کی ماں نہیں لگتی تھی۔ عجیب جاہل سی عورت تھی۔ جب وہ......''

''لیکن وہ اس کی سگی ماں ہی تھی۔'' راجہ نے میری بات کاٹ دی۔

''میں نے اس کے متعلق پوری تحقیق کی ہے' کیونکہ میرے ایڈیٹر نے کہا تھا کہ میں اس کے متعلق کہانی لکھوں۔''

راجہ اخبار میں کالم لکھنے کے علاوہ ایک میگزین سے بھی منسلک تھا' جس میں مشہور شخصیات کے حالات زندگی چھپا کرتے تھے' اور میگزین کا یہ شعبہ راجہ کے پاس تھا۔ کہانی کے انداز میں لکھا گیا سب سچ ہی ہوتا تھا' ممکن ہے تھوڑی بہت رنگ آمیزی بھی ہو' لیکن راجہ کہتا تھا کہ سب سچ ہے اور ایک کہانی وہ مہینوں کی تحقیق کے بعد لکھتا تھا۔

''تو تم نے وہ کہانی لکھی؟'' میں نے متجسس پوچھا۔

''ہاں...... لیکن مکمل نہیں کر سکا۔ بس ایک دو صفحات رہتے تھے کہ مجھے کینیڈا جانے کا چانس مل گیا۔''

''تو وہ کہانی؟''

''پڑی ہے میرے کاغذات میں' واپس جا کر تمہیں بھیج دوں گا' مجھے معلوم ہے کہ تم اس کے متعلق سب کچھ جاننا چاہتے ہو' حالانکہ اس کا کوئی فائدہ نہیں۔'' وہ مسکرایا۔

''تم غلط سمجھ رہے ہو راجہ' وہ میری پیشنٹ تھی' اس نے مجھے سب سچ نہیں بتایا تھا اس لئے فطری تجسس ہے۔''

''تم کہتے ہو تو مان لیتا ہوں۔''

راجہ نے اب کے اپنی مسکراہٹ چھپائی۔ میں جز بز ہو کر ڈاکٹر لطیف کی طرف دیکھنے لگا۔ جو اس دوران اپنے پیشنٹ کے ساتھ باتوں میں مصروف ہو گئے تھے۔

''چلئے......'' مجھے اپنی طرف متوجہ دیکھ کر انہوں نے کہا۔

"آپ کو ایک مریض سے ملواتا ہوں' جس کی کیس ہسٹری مجھے آپ سے ڈسکس کرنا ہے۔ خاص طور پر آپ کی توجہ چاہیے' اس کے لئے۔"

ہم چلتے چلتے ان کے پاس سے گزرے۔ کچھ عورتیں بیٹھی رہیں۔ ایک دو نے سر اٹھا کر ہمیں دیکھا اور وہ پھر کھڑی ہوگئی تھی' اور اب ڈاکٹر لطیف کے بجائے راجہ نوازش کو دیکھ رہی تھی۔

"تم کون ہو؟"

"یہ ایک صحافی ہے' اخبار میں لکھتا ہے۔"

"اچھا......" وہ پھول وہیں پھینک کر تیر کی طرح اس کی طرف لپکی۔

"سنو تم اخبار میں لکھنا کہ میں پاگل نہیں ہوں' بالکل ٹھیک ہوں۔ انہوں نے مجھے یوں ہی یہاں بند کر رکھا ہے۔" اس نے راجہ نوازش کی آستین مٹھی میں جکڑ لی تھی۔

"اچھا...... اچھا لکھوں گا۔"

"لیکن کیا لکھوں تمہارا نام کیا ہے؟ کس نے بند کیا ہے تمہیں؟"

"میرا نام چھ نمبر ہے۔" اس نے روانی میں کہا' اور پھر راجہ کی آستین چھوڑ دی۔ "لیکن یہ دو نمبر ہے' میرا نام۔" وہ پُرسوچ نظروں سے ڈاکٹر لطیف کو دیکھنے لگی۔ میں اسے بہت قریب سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی رنگت سانولی سی ہو رہی تھی' بال روکھے اور مرجھائے ہوئے تھے۔ آنکھوں کے گرد لکیریں پڑ گئی تھیں۔ دانت پیلے ہو رہے تھے۔

"ملائکہ......" بے اختیار میرے لبوں سے نکلا۔

"ملائکہ......" وہ ایک دم خوش ہوگئی' لیکن پھر فوراً ہی اس کی آنکھوں میں الجھن نظر آنے لگی۔

"لیکن تمہیں میرا نام کیسے پتا ہے؟" اس کی آنکھوں کے اور چہرے کے اثرات بدل رہے تھے۔ ڈاکٹر لطیف نے ہولے سے اس کا کندھا تھپکا۔

"میں نے بتایا ہے اسے۔"

ڈاکٹر لطیف ہمیں لے کر آگے بڑھ گئے۔ میرا جی چاہا' میں مڑ کر اسے دیکھوں۔

وہ شاید مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں پہچان کے سائے ابھرتے اور ڈوبتے دیکھے ہیں۔ کیا یہ اچھی علامت نہیں؟"

"ہاں' لیکن فی الحال ذہن پر زور ڈالنا نقصان دہ بھی ہو سکتا ہے۔"

ڈاکٹر لطیف نے کہا' اور میں خاموش ہوگیا کہ بہرحال وہ بہتر جانتے تھے کہ اس کے ٹھیک

ہونے کا پراسس کن مراحل میں ہے۔ میں یہاں کیوں آیا تھا' میں اس سے کیوں ملنا چاہتا تھا' میرا اس سے کیا رشتہ تھا۔ سات سال پہلے وہ میرے پاس مریضہ کی حیثیت سے آئی تھی اور سات سال بعد میں یہاں کیوں دوڑا چلا آیا تھا۔ اس ہوش و حواس سے بیگانہ لڑکی سے ملنے' میں سوچتا رہا۔

راجہ نوازش گاہے گاہے مجھ پر ایک گہری نظر ڈال لیتا تھا' لیکن اس نے کہا کچھ نہیں۔ ہاں جب وہ مجھ سے رخصت ہو کر گاؤں کی طرف جا رہا تھا' اور میں ایئرپورٹ کی طرف' تو اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"کہیں ملائکہ کے ساتھ ہمدردی میں اتنا آگے نہ بڑھ جانا کہ تمہارا خاندان اس سے متاثر ہو۔" پتا نہیں وہ کیا سمجھ رہا تھا۔

"ایسا کچھ نہیں ہے راجہ! اگر ایسا ہوتا تو سات سال پہلے مجھے اس سے ہمدردی کرنے سے کون روک سکتا تھا۔"

"اور اگر میں سات سال پہلے اس سے شادی کر لیتا' تو پھر شاید...... شاید وہ اس حالت تک نہ پہنچتی۔" ایک پچھتاوے کا احساس میرے اندر دور تک پھیلتا ہوا مجھے بے طرح افسردہ کر گیا اور یہ احساس کئی دن تک مجھ پر حاوی رہا۔ حتیٰ کہ مریم نے بھی محسوس کیا۔

"کیا بات ہے حبیب! آپ کچھ پریشان لگ رہے ہیں۔"

"نہیں تو۔" میں نے حیرت سے مریم کو دیکھا۔ "میں پریشان تو نہیں ہوں بالکل بھی۔"

"پھر کیا بات ہے؟" مریم کی سوالیہ نظریں میری طرف اٹھی ہوئی تھیں۔

"آپ بہت خاموش اور افسردہ سے ہیں۔ جب سے لاہور سے آئے ہیں' بلکہ ابھی کل رونی سے کہہ رہا تھا کہ پاپا شاید بیمار ہیں' شور نہ کرو۔ اسے آپ کیا کہیں گے؟"

"اوہ گاڈ!" میں نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ "کیا راجہ صحیح کہہ رہا تھا کہ میں ملائکہ کی ہمدردی میں اپنی لائف خراب نہ کر دوں۔"

"بتایئے نا حبیب! ہم سب آپ کے ہیں' اپنی پریشانی ہمارے ساتھ شیئر کریں۔"

"ایسا کچھ بھی نہیں جان!" میں نے خود کو سنبھالا۔

"لاہور میں دراصل میں ڈاکٹر لطیف سے وعدہ کر بیٹھا ہوں کہ مہینے میں ایک یا دو چکر فونٹین ہاؤس کے رضاکارانہ طور پر لگایا کروں گا' تو بس اسی کے متعلق سوچ رہا تھا کہ کیسے نبھا پاؤں گا وعدہ۔"

مریم کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھل اٹھی۔

"اگر یہ احساس ہمارے خیال سے ہے تو بابا اور اماں جان دو ہفتے تک واپس آ رہے ہیں' اور اگر پیسے کے زیاں کا خیال ہے تو حبیب! یہ مال و دولت تو سب یہیں رہ جائے گا' اور پھر ہمارے پاس اتنا ہے کہ ہم ہر ماہ نو دس ہزار کرائے کے لئے خرچ کر سکتے ہیں۔ فی الحال صبح کی فلائٹ سے جا کر شام کو آ جایا کریں۔ بابا وغیرہ کے آنے کے بعد رکنا پڑے تو رک بھی جائیں۔"

"نہیں' خیر پیسے کا تو مسئلہ نہیں۔" میں شرمندہ سا ہو گیا۔

"میں نے خود ڈاکٹر کو آفر کی تھی۔ بہرحال بابا اور اماں جان آ رہے ہیں' تو پھر کوئی پریشانی نہیں۔" میں مسکرا دیا۔

"مریم! تم بہت اچھی ہو اور میں بہت خوش قسمت ہوں۔"

"یہ بات میں بھی کہہ سکتی ہوں۔"

وہ کسی شاخ نازک کی طرح لچکتی ہوئی باہر چلی گئی۔ بلاشبہ وہ ملائکہ اور جائمہ سے زیادہ خوبصورت تھی۔ اس کے دل میں پیسے اور دولت کی ہوس نہیں تھی۔ وہ یونہی کھلے دل سے خرچ کرتی تھی۔ ملازموں کے دکھ سکھ میں شریک رہتی اور ملائکہ کو دولت کا لالچ تھا۔ وہ مختلف حیلوں بہانوں سے پیسہ مجھ سے خرچ کروایا کرتی تھی۔ اس نے سوائے پہلی بار کے ایک بار بھی فیس ادا نہیں کی تھی' اور پیسے کی حرص تو جو میں بہت تھی' پھر بھی پتا نہیں دل...... اور دل کی شرارتیں بھی عجیب ہوتی ہیں۔

"مریم کے پاس پیسے کی کمی نہیں ہے' اس لئے اسے ہوس نہیں ہے پیسے کی' اور وہ دونوں...... انہیں ضرورت تھی پیسے کی' اس لئے ان کے دل میں حرص تھی' لالچ تھا۔" میں خود بخود موازنہ کرتا رہتا تھا' اور انہیں اس الزام سے بری کر دیتا تھا۔ یہ محبت بھی عجیب ہوتی ہے۔ محبوب کے غلط کو صحیح کہنا اس کی ریت ہے۔

مریم مطمئن ہو گئی تھی' میں اس روز بچوں کو ساحل سمندر پر لے گیا' اور واپسی پر کھانا باہر ہی کھا کر گھر آیا تو ذہن بہت ہلکا پھلکا سا تھا۔ میں نے ڈاکٹر لطیف کو فون کر کے ہر ماہ کی چھ اور ستائیس تاریخ بتا دی تھی' اور سوچتا رہا تھا کہ ملائکہ کے کیس کی فائل بھی ساتھ لے جاؤں گا۔ اس طرح پرانی اور نئی کیس ہسٹری اکٹھی کر کے اس کے ذہن کی گتھیاں سلجھانے میں مدد ملے گی۔ بابا جان اور اماں جان امریکہ سے آ گئے تھے' اور میرے لاہور جانے میں ابھی کچھ دن تھے کہ کینیڈا سے راجہ نے ملائکہ کی کہانی بھیج دی۔

راجہ نے اپنے مخصوص انداز میں حقیقت کو کہانی کا روپ دیا تھا۔

"یہ سب سچ ہے حبیب!"

اس نے لکھا تھا۔

وہ سب سچ میں نے پڑھا۔ میں نے ملائکہ سے وعدہ کیا تھا کہ میں اس کی کہانی لکھوں گا' لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں اس کی کہانی کہاں سے شروع کروں' وہاں سے' جہاں پہلی بار وہ مجھے ملی تھی' یا پھر وہاں سے' جب اس نے ملک محب اللہ خان کے گھر آنکھیں کھولی تھیں' لیکن پھر اس کے بعد کیا لکھوں گا۔ اس نے تو مجھے اپنے ماضی کے متعلق کچھ زیادہ نہیں بتایا تھا' لیکن اب راجہ نوازش کی لکھی ہوئی کہانی میرے سامنے تھی۔ میں جب کلینک سے اٹھا تو ساری کہانی پڑھ چکا تھا' اور یہ ساری کی ساری کہانی اسی طرح آپ کے سامنے ہے' میں نے اس میں کچھ ردوبدل نہیں کیا' بلکہ ساری کی ساری کہانی آپ کے سامنے رکھ دی ہے۔

ملائکہ سے زندگی میں غلطیاں سرزد ہوئیں' لیکن پھر بھی یہ سب پڑھنے کے بعد میں نے اس کے لئے اپنے دل میں نفرت محسوس نہیں کی' بلکہ وہ جو میرے دل میں ایک نرم گوشہ تھا اس کے لئے' اس کا گداز پہلے سے بڑھ گیا تھا۔ شاید اس لئے کہ میں اس سب کے لئے اسے قصوروار نہیں سمجھتا یا شاید اس لئے کہ راجہ نوازش صحیح کہتا ہے کہ ملائکہ سے محبت کرتا ہوں اور محبوب کا غلط بھی صحیح لگتا ہے۔ یقیناً آپ کو میری طرح تجسس ہو رہا ہو گا' اس لئے میں آپ کو زیادہ دیر امتحان میں نہیں ڈالتا۔ آپ ملائکہ کی کہانی پڑھئے جسے راجہ نوازش نے لکھا ہے۔ شاید آپ کو بھی میری طرح اس سے ہمدردی ہی محسوس ہو یا پھر......

❊ ❊ ❊

ملک محب اللہ خان نے بہت خوشگوار موڈ کے ساتھ بیڈروم میں قدم رکھا' تو تیز خوشبو نے اس کا استقبال کیا۔ انہوں نے برا سا منہ بنایا۔

ان کے بار بار منع کرنے کے باوجود پتہ نہیں کیوں سلطانہ ایسی ہی تیز خوشبوئیں استعمال کرتی تھیں' حواس کو پراگندہ کرنے والی۔

دروازے کے پاس ہی کھڑے کھڑے انہوں نے دائیں طرف نگاہ کی۔ سلطانہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی تھی' جھلملاتے ہوئے آتشیں گلابی سوٹ میں۔ اسے ایسے ہی بھڑکیلے اور چیختے چلاتے رنگ پسند تھے۔ اسی رنگ کی لپ سٹک میں ہونٹ رنگے اب وہ مسکارا لگا رہی تھی۔

آتشیں گلابی رنگ کے سوٹ پر سنہرے ستاروں سے بنے جھلملاتے پھول انہیں زہر لگے۔

"یہ...... یہ کیا ہے سلطانہ بیگم! یہ کیا ڈریس پہنا ہے آپ نے؟"

سلطانہ نے مڑ کر ایک نظر ان پر ڈالی۔

"اس لباس میں کیا خرابی ہے خان!"

"جس ڈنر میں ہم جا رہے ہیں' وہاں ایسا ڈریس نہیں چل سکتا۔ کوئی سوبر سا ڈریس پہنیں' بلکہ چکن کا وہ گرے سوٹ پہن لیں' جو آپا لے کر آئی تھیں اور منہ ہاتھ دھو کر ذرا لائٹ سا میک اپ کر لیں۔"

"لو وہ بھی کوئی فنکشنوں میں پہننے والا جوڑا ہے' اتنا سادا اور آپ کو بڑا پتا ہے۔" وہ تھوڑا سا ہنسی۔

"ایسے کپڑے تو فنکشنوں میں ہی اچھے لگتے ہیں۔ "بتیوں" میں تو خوب چمکتے ہیں اور میری اماں نے جو یہ سلمہ ستارے والے جوڑے دیئے ہیں' یہ ضائع تو نہیں کرنے' پورے دو ہزار کا یہ سوٹ لیا تھا "رنگ محل" سے اماں نے۔"

ملک محب اللہ ہونٹ بھینچے اسے دیکھتے رہے۔ ایک دم ہی ان پر تھکن طاری ہو گئی تھی۔

جانے وہ کیسا منحوس لمحہ تھا' جب انہوں نے سلطانہ عرف شانی بیگم کو گاتے سنا تھا۔ وہ کوئی مشہور سنگر نہ تھی' بلکہ اس روز سے پہلے تک وہ اس کا نام تک نہ جانتے تھے۔ یہ فیشن شو ان کا ایک دوست منعقد کروا رہا تھا' اور اس کے بے حد اصرار پر وہ چلے آئے تھے' ورنہ انہیں ایسے فنکشنوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ کسی اشتہاری کمپنی کی طرف سے اس فیشن شو میں شریک ہوئی تھی' اور اسی اشتہاری کمپنی کا مہیا کردہ سفید ڈریس پہنے گا رہی تھی۔

میک اپ مین کا مہارت سے کیا گیا میک اپ' سفید بہت سی کلیوں والا کرتا' لمبا سا دوپٹہ اور پنجابی گانے کے بول براہ راست ان کے دل پر اثر کر رہے تھے' آواز میں سوز تھا۔ وہ یک ٹک اسے دیکھے جا رہے تھے۔ سٹیج کی تیز روشنیوں میں وہ کوئی اپسرا لگ رہی تھی۔ کوئی آسمانی مخلوق گلابی رنگت' بڑی بڑی غزالی آنکھیں۔ وہ تو جیسے ان آنکھوں کے سحر میں جکڑ گئے تھے۔

پاس بیٹھے دوست نے انہیں ادھر متوجہ دیکھ کر بتایا تھا۔

"یہ سلطان ہے۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے ہی گانا شروع کیا ہے۔ ابھی سٹیج پر ہی ایک دو بار پرفارمنس دی ہے۔ امید ہے جلد ہی ٹی وی اور ریڈیو تک رسائی بھی ہو جائے گی۔" یکا یک ان کا دل چاہا' وہ اس لڑکی کو اپنا لیں۔ ساری دنیا کی نظروں سے بچا کر اپنے پاس چھپا لیں' ساری میلی اور گندی نظروں سے۔ انہوں نے پیچھے مڑ کر ناگواری سے ان نوجوانوں کو دیکھا تھا' جو سیٹیاں بجا

رہے تھے۔ ان کا برسوں سے خالی دل کسی کی رفاقت کی تمنا کرنے لگا تھا' اور وہیں بیٹھے بیٹھے انہوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اس لڑکی کو دنیا کی نظروں سے بچا کر گھر اور چار دیواری کا تحفظ دیں گے۔

"یار زمان شاہ! اگر میں کہوں میں اس لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں تو کیا یہ ممکن ہے؟"

شاہ زمان چونکا۔

"اگر یہ مذاق ہے تو خیر ہے' لیکن اگر تم سنجیدہ ہو تو عرض ہے کہ یہ لڑکی تمہارے سٹینڈرڈ کی نہیں ہے۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے شاہ زمان۔"

"بہت فرق پڑتا ہے۔ میری دادی کہتی ہے کہ بیٹی چاہے کہیں بھی دے دو' بہو دیکھ بھال کر اچھے خاندان کی لاؤ کہ اس نے پوری نسل کو پروان چڑھانا ہوتا ہے۔"

تب تو وہ شاہ زمان کی بات سمجھے نہیں تھے' لیکن اب انہیں لگتا تھا کہ شاہ زمان نے بالکل صحیح کہا تھا۔

انہوں نے ایک نظر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی سلطانہ کو دیکھا۔

"اور اس کے لئے...... میں نے کسی کی بات نہ مانی۔"

"زمان! اس لڑکی کا پتا کراؤ' مجھے ہر قیمت پر اس سے ہی شادی کرنا ہے۔"

"اس کا باپ ایک دفتر میں چپڑاسی ہے۔" شاہ زمان نے انہیں بتایا۔

"اور بھائی کسی سٹوڈیو میں ملازم ہے' اور ان کا کوئی فیملی بیک گراؤنڈ نہیں ہے۔ دو بہن بھائی ہیں' بہت غربت ہے۔"

"غربت کوئی جرم تو نہیں زمان۔"

"غربت جرم نہیں ہے' لیکن میرے بھائی! وہ لوگ کسی بھی لحاظ سے تمہارے ہم پلہ نہیں ہیں۔ اس لڑکی کی ماں کسی زمانے میں گڑوی بجایا کرتی تھی۔ سمجھتے ہو نا گڑوی بجانے والی عورتوں کو۔"

"تو......؟" ملک محب اللہ خان نے بھنویں اچکائیں۔

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اس کا باپ محنت کر کے روٹی کماتا ہے' باعزت طریقے سے۔"

"لیکن ذات کا بھانڈ ہے۔" شاہ زمان چڑ گیا تھا۔

لیکن ملک محب اللہ' جنہوں نے اپنی ساری زندگی ایجوکیشن یورپ میں مکمل کی تھی' انہیں اس سے بھی کوئی فرق نہیں پڑا تھا اور انہوں نے اپنے عزیز از جان دوست شاہ زمان کی کوئی بھی نصیحت سننے سے انکار کر دیا تھا۔ حتیٰ کہ آپا کی خاموشی بھی انہیں فیصلہ بدلنے پر مجبور نہ کر سکی تھی۔ آپا' جنہوں نے ماں باپ کے بعد ہر طرح سے ہی ان کا خیال رکھا تھا۔

''غربت کوئی جرم نہیں ہے محب! لیکن......''

وہ جو ان کے منہ سے شادی کی بات سن کر بے حد خوش ہو گئی تھیں کہ وہ کسی طرح شادی کے لئے راضی تو ہوئے' سلطانہ کے متعلق تفصیل جان کر خاموش سی ہو گئی تھیں۔

''لیکن ویکن کچھ نہیں آپا! میرے دل نے پہلی نظر میں یہ اسے پسند کر لیا ہے' ورنہ آپ جانتی ہیں' میرا شادی وغیرہ کا کوئی ارادہ نہیں تھا' جو خاندانی طور طریقے وہ نہ جانتی ہوگی' وہ آپ اس کو سکھا لیجئے گا۔'' ان کا انداز حتمی تھا۔

لیکن اس ایک سال دس دن میں وہ کچھ بھی نہ سیکھ پائی تھی۔ حالانکہ آپا اپنے گھر کے کام چھوڑ کر دن میں کئی گھنٹے اس کے ساتھ گزارتی تھیں۔ وہ بالکل ان پڑھ تھی۔

اس کے بات کرنے کا انداز بالکل گنواروں جیسا تھا' لباس کے معاملے میں اس کا ذوق بے حد خراب تھا۔ صرف چند دن بعد ہی محب اللہ کو احساس ہو گیا تھا کہ ان سے زندگی کی سب سے بڑی غلطی سرزد ہو چکی ہے۔ صرف دور سے شکل وصورت دیکھ کر انہوں نے اپنی زندگی کا اتنا اہم فیصلہ کر لیا تھا۔

کس قدر حماقت ہوئی تھی ان سے...... لیکن شاید دل کی شرارتیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔

شاہ زمان نے اس شادی کے لئے اس کے بھائی صادق کو پورا ایک لاکھ روپیہ دیا تھا' جس پر وہ خاصا ناخوش سا تھا۔

''شانو کے کیریئر کا ابھی آغاز ہوا تھا شاہ جی! یہ شادی نہ ہوتی تو اس نے ایسے لاکھوں کمانے تھے۔ ہمارا تو جی مستقبل تباہ کر رہے ہیں آپ۔''

''جانتا ہوں کتنے کمانے تھے' زیادہ بک بک نہ کرو' شکر نہیں کرتا کہ بہن کا گھر بس رہا ہے۔''

سلطانہ کے باپ نے بات پکی کر دی تھی۔ سادگی سے نکاح ہوا تھا۔ ولیمے کی تقریب میں بھی مختصر سے لوگ تھے۔ صرف چند فیملی فرینڈز۔ محب اللہ کے بہنوئی نہیں چاہتے تھے کہ اخباروں میں آئے کہ ملک محب اللہ خان نے ایک سٹیج گلوکارہ سے شادی کر لی ہے۔ شادی پر اور ولیمے پر

اسے پارلر سے تیار کروایا گیا تھا' اور وہ حقیقتاً خوبصورت لگ رہی تھی' لیکن خوبصورتی صرف ظاہری ہی تو نہیں ہوتی۔ خوبصورتی صرف قد وقامت اور چہرے کے خدوخال کا نام تو نہیں ہے۔ خوبصورتی تو بات چیت' اٹھنے بیٹھنے کے طریقے' گفتگو ہر شے سے مکمل ہوتی ہے اور محب اللہ خان شدت سے سوچنے لگے تھے کہ سلطانہ بیگم کا حسن ادھورا ہے' نامکمل ہے۔ کتنی ہی بار باتوں باتوں میں انہوں نے اسے سمجھایا تھا کہ وہ آپا کی باتوں کو دھیان سے سن کر سمجھنے کی کوشش کرے۔

چیختے چلاتے رنگ کے کپڑے' شوخ میک اپ ان کی سوسائٹی میں سوٹ نہیں کرتا۔ محبت تو ابتدائی چند دنوں کے بعد ہی گہنا گئی تھی۔ اب تو بس رشتہ نبھانے والی بات تھی۔ وہ پچھتانا نہیں چاہتے تھے' لیکن پچھتاوے ان کے اندر بیٹھے ڈنک مارتے رہتے تھے' پھر بھی حتیٰ الامکان وہ خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتے تھے۔

آخری نظر آئینے پر ڈال کر سلطانہ ان کے قریب آئی۔ ''تم کو تیار نہیں ہونا محب اللہ۔''

''آپ کہہ کر تو اس نے شاید ایک آدھ بار ہی بلایا تھا۔ تنہائی میں تو خیر تھی' لیکن سب کے سامنے جب وہ محب اللہ کو تم اور تو کہہ کر بلاتی تو برا لگتا تھا۔ ایک بار آپا نے ٹوکا تو کھی کھی کر کے ہنس پڑی۔

''لو محب اللہ میرا شوہر ہے یا باپ' جو آپ کہہ کر بلاؤں۔''

''میری بھرجائی نے ایک بار صادق بھائی کو آپ کہہ کر بلایا تھا' تو میرے ابا نے فوراً ٹوک دیا کہ تیرا اباپ نہیں ہے' خاوند ہے تیرا۔'' آپا چپ ہو گئی تھیں اور وہ شرمندہ۔

''نہیں' میرا موڈ نہیں رہا جانے کو۔'' وہ کرسی سے اٹھ کر بیڈ پر بیٹھ گئے' اور جھک کر جوتے اتارنے لگے۔

''نہ تو میں ویسے ہی اتنی تیار ہوئی ہوں۔'' اس کا موڈ خراب ہو گیا تھا۔

''اب ذرا گھما شالاؤ...... باہر سے کھانا کھلاؤ اور پھر مجھے بھائی صادق کی طرف لے جاؤ۔ اتنے دن ہو گئے ادھر گئے ہوئے۔''

''ابھی دو دن پہلے تو صادق ادھر آیا تھا۔''

''لو میں تو نہیں گئی نا۔''

''میں بہت تھکا ہوا ہوں سلطانہ اور میرے سر میں بھی درد ہے' پلیز۔''

ان کا لہجہ بدستور نرم تھا۔ اس ایک سال دس دن میں کبھی انہوں نے سلطانہ سے اونچی آواز میں بات نہ کی تھی۔ حالانکہ انہیں اس کی بہت سی سرگرمیوں پر اعتراض تھا' جس میں صادق

کا وقت بے وقت ان کے گھر آنا بھی انہیں برا لگتا تھا۔

وہ انتہائی لالچی آدمی تھا۔ جب بھی آتا سلطانہ سے کسی نہ کسی بہانے کچھ مانگ لیتا اور ڈھیٹ اس قدر تھا کہ ملک محب اللہ کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہوئے بھی اسے جھجک نہ ہوئی تھی' اور اس کے جانے کے بعد سلطانہ انہیں جتانا نہ بھولتی کہ صرف ان کے ساتھ اس کی شادی کر دینے سے اس کے گھر والوں کا کتنا نقصان ہوا تھا۔

''شمورانی نے میرے ساتھ ہی گانا شروع کیا تھا۔ ایسی بھدی آواز میں کہ میرے سامنے پانی بھرتی نظر آتی تھیں' لیکن اب ان کی گڈی چڑھ گئی ہے' لاکھوں کما رہی ہیں۔'' لہٰذا صادق اپنی کسی ضرورت کے لئے ان سے کچھ مانگتا ہے تو یہ اس کا حق ہے۔

وہ تاسف سے اسے دیکھتے۔

کیسی ناشکری عورت تھی وہ۔ شکر ادا نہیں کرتی تھی کہ ایک گھر اور چار دیواری کا تحفظ مل گیا تھا۔

''اچھا تو پھر میں ہی چلی جاتی ہوں ڈرائیور کے ساتھ۔ اب اتنی تیار شیار ہوئی ہوں تو اماں ابا اور بھائی صادق سے مل لوں گی۔''

انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ اس سے کوئی بحث نہیں کرنا چاہتے تھے۔

''اچھا تو پھر تین چار ہزار روپیہ بھی دے دیں خرچے کے لئے' کچھ میرے پاس ہیں' بڑی اچھی فلم لگی ہوئی ہے'' تاج محل'' میں' سب دیکھنے جائیں گے اور کچھ کھائیں پئیں گے۔''

''آپ سارا سارا دن وی سی آر پر فلمیں دیکھ دیکھ کر نہیں تھکتیں۔'' محب اللہ خان کے لہجے میں بیزاری تھی۔

''نہ تو فلمیں نہ دیکھوں تو اور کیا کروں۔ گانے پر تو تم نے پابندی لگا دی ہے۔ تھیٹر پر جانا بھی بند کر دیا۔''

''گھر میں کرنے کو ڈھیروں کام ہوتے ہیں سلطانہ۔'' انہوں نے آہستگی سے کہا' جسے اس نے سنی ان سنی کر دیا۔

''اچھا' پیسے تو دو نا بھائی صادق بتا رہا تھا بڑی اچھی فلم ہے'' مولا جٹ ان لندن۔'' محب اللہ نے خاموشی سے پانچ ہزار نکال کر اسے دے دیئے اور والٹ ٹیبل پر رکھتے ہوئے ٹانگیں بیڈ پر رکھ لیں۔

''پلیز جاتے ہوئے کچن میں چائے کے لئے کہہ دیجئے گا۔''

اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے پیسے گن کر پرس میں رکھے۔ پلنگ کے نیچے سے سرخ رنگ کی بیل والی جوتی نکالی اور کھٹ کھٹ کرتی ہوئی باہر چلی گئی۔ محب اللہ خان کے سر میں یکا یک ہی درد ہونے لگا تھا۔ آنکھیں موند کر تکیے پر سر رکھ دیا۔ کیسے گزرے گی اتنی لمبی زندگی اور کیونکر...... سلطانہ بیگم کی ہر ادا ہی نرالی تھی' اور وہ کچھ سمجھنے کو تیار ہی نہ تھی۔ آپا بیگم بھی کوشش کر کر کے ہار گئی تھیں۔

محب کو باورچی کے ہاتھ کا پکا پسند نہیں۔ کہتا ہے ساری زندگی دوسروں کے ہاتھ کا پکا کھایا ہے۔ گھر کے کھانوں کو ترسا ہوا ہے تو میں آ جاتی تھی ہفتے بعد' کچھ نہ کچھ بنا کر رکھ جاتی تھی۔ اب تم آ گئی ہو تو اپنے ہاتھ سے کچھ نہ کچھ بنا دیا کرو۔''

''میں......'' سلطانہ بیگم نے آنکھیں پھاڑ کر انہیں دیکھا تھا۔

''ہاں' تم دلہن......''

''لیکن مجھے بھی پکانا نہیں آتا۔''

اب وہ ایسے بھی دولت مند خاندان کی نہ تھی کہ گھر میں باورچی ہوں۔

آپا کو غصہ آ گیا تھا' لیکن وہ ضبط کر گئیں۔

''کیا گھر میں کبھی کچھ نہیں پکا؟''

''نہیں۔'' اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''بس کبھی کبھار عید' بقر عید یا کسی تہوار پر ہی گھر میں کچھ پکتا تھا' ورنہ تو بازار سے ہی آتا تھا کھانا۔ اماں کہتی تھیں دس روپے کے چنے یا حلیم منگواؤ تو پورا گھر پیٹ بھر کے کھا لیتا ہے۔ گھر میں ایک تو گھی لون مرچوں کا اتنا خرچ' ایک ہانڈی پر بیس پچیس روپے تو اٹھ جاتے ہیں' اوپر سے پکانے کی مصیبت الگ۔''

آپا بیگم تاسف سے اسے دیکھنے لگیں۔

''بس صبح چائے ہی بنتی تھی گھر میں' کبھی پایوں کے ساتھ پی لی اور کبھی بہت عیش ہوئے تو حلوہ پوری آ گیا ناشتے میں۔''

''خیر جو طور طریقے تمہارے میکے میں تھے' یہاں تو نہیں چل سکتے۔ محب کو کم مرچوں والے کھانے پسند ہیں۔ عمر کا زیادہ حصہ اس نے یورپ میں گزارا ہے۔ اس کی پسند کے دو چار کھانے میں تمہیں سکھا دیتی ہوں۔''

سلطانہ بیگم نے نخوت سے کندھے اچکائے۔

"باورچی ہے تو اس کو بتا دیں' پکا دیا کرے گا۔"

جہاں آپا بیگم یہ ٹکا سا جواب سن کر ششدر رہ گئی تھیں' وہیں محب اللہ خان بھی شرمندہ ہو گئے تھے۔

"واہ محب اللہ خان! عمر کے بتیس سال اس لڑکی کے انتظار میں ضائع کر دیے تم نے۔ یہ تھی تمہاری آئیڈیل۔"

ان کے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ بکھر گئی۔

کہاں کہاں سے انہوں نے خود کو بچایا تھا۔ سوزی تو ان کے پیچھے ہی پڑ گئی تھی۔ جانے کہاں سے اس کو پتا چل گیا تھا کہ وہ ایک امیر زادے ہیں اور پاکستان میں بہت بڑی پراپرٹی ہے۔

بے چاری مغربی عورت' چار دیواری اور تحفظ کو ترسی ہوئی' پیسے کی ہوس سے لبالب بھری۔ آپا نے جب خدشہ ظاہر کیا تھا کہ کہیں وہ وہیں کسی گوری میں تو دل نہیں اٹکا بیٹھے تو وہ دل کھول کر ہنسے تھے۔

"توبہ کریں آپا اتنا بے وقوف نہیں ہے آپ کا محب! زندگی کے ساتھی کے لئے میری بڑی مختلف سی چوائس ہے۔"

"اور یہ تھی میری مختلف چوائس ....؟"

انہوں نے آنکھیں کھول کر سامنے دیوار پر لگی بڑی سی تصویر کو دیکھا' جس میں دلہن بنی ہوئی وہ ان کے ساتھ کھڑی تھی۔ قیامت کی حد تک حسین' لیکن اس کی آنکھوں کی بے باکی تصویر میں بھی واضح تھی' اور یہ بے باکی انہیں کیوں دکھائی نہ دی تھی۔ یہ دل' یہ ضدی بچہ اس نے مہلت ہی کب دی تھی انہیں اسے دیکھنے اور پرکھنے کی۔

ایک سرد آہ بھر کر وہ اٹھ بیٹھے۔ ملازم اس دوران چائے رکھ گیا تھا۔ چائے پی کر وہ کمپیوٹر کے سامنے جا بیٹھے۔ بارہ بجے تک سلطانہ واپس نہیں آئی تھی۔ یقیناً نو سے بارہ کا شو دیکھ کر وہ حسب معمول ایک بجے تک واپس آئے گی۔ نائٹ بلب جلا کر وہ سونے کے لئے لیٹ گئے' اور جانے کب انہیں نیند آ گئی۔ انہیں خبر نہیں ہوئی تھی کہ سلطانہ کب آئی تھی۔

تین چار راتوں کی مسلسل ٹینشن کے بعد آج انہیں نیند آئی تھی' اور یہ غالباً خواب آور دوا لینے کا اثر تھا کہ صبح وہ اٹھے تو فریش سے تھے۔ سلطانہ گہری نیند سو رہی تھی' اور سوتے میں وہ انہیں انتہائی معصوم اور بے ضرر سی لگی۔ بے باک آنکھیں خوابیدہ تھیں۔ لانبی پلکیں رخساروں پر سایہ

فگن۔ لمحہ بھر وہ اسے دیکھتے رہے' اور اگر یہ وہ سارے طور طریقے سیکھ لے' جو میرے لئے پسندیدہ ہوں تو زندگی کا یہ سفر اتنا مشکل نہ لگے۔ پڑھائی اور بات چیت کے آداب سکھانے کے لئے کوئی اچھی ٹیوٹر رکھ لوں' جو اسے اٹھنے بیٹھنے' اوڑھنے پہننے کا سلیقہ بھی سکھائے تو ممکن ہے' بلکہ یقیناً کچھ نہ کچھ بہتر ہو جائے گا۔

اس خیال نے انہیں بڑی تقویت دی۔ چنانچہ ناشتہ کر کے وہ سیدھے آپا کی طرف ہی چلے آئے کہ آپا سے بہتر کوئی اور ان کا درد اور مشکل نہیں سمجھ سکتا تھا۔ آپا نے ان کی تائید کی۔

"ٹھیک ہے' میں دیکھتی ہوں۔"

لیکن یہ سب کچھ اتنا آسان نہ تھا۔ ایک کے بجائے دو دو ٹیوٹر لگا گئیں۔ ایک پڑھنا لکھنا سکھانے کے لئے اور دوسری ایک ماہر بیوٹیشن تھی' لیکن سب بے فائدہ جا رہا تھا۔ اس نے الف سے آگے پڑھ کر نہ دیا تھا۔

وہ کوئی پندرہ سولہ سالہ لڑکی تو تھی نہیں' دیکھنے میں چوبیس پچیس کی لگتی تھی' لیکن آپا کا خیال تھا کہ اس کی عمر تیس سے کم نہیں' بلکہ زیادہ ہی ہو گی۔ سو بوڑھے طوطے بھلا کیا سیکھتے۔ وہ بیوٹیشن سے جو سیکھتی' بالکل ویسا ہی کر کے دکھا بھی دیتی' لیکن جب تیار ہوتی تو وہی چیختا چلاتا میک اپ' گہرے رنگوں کے کپڑے' ہاں ساڑھی باندھنا اس نے سیکھ لیا تھا' مگر انتخاب وہی سرخ' جامنی اور گلابی ہی تھا۔ یہ رنگ اس پر اتنے برے نہیں لگتے تھے' لیکن ساتھ ہی گہرا میک اپ انہیں برا بنا دیتا تھا۔ ان ہی دنوں گھر میں اجنبی لوگوں کی آمد شروع ہو گئی۔ عجیب وغریب حلیوں کے مرد اور عورتیں۔

"کون ہیں یہ لوگ؟" انہوں نے پوچھا۔

"ہمارے رشتہ دار ہیں۔" سلطانہ کا جواب تھا۔

"یہاں کیا کرنے آتے ہیں؟"

"ملنے آتے ہیں۔ ایک تو تم نے گانے پر پابندی لگا دی ہے۔ میرے اندر کا فنکار مار دیا ہے۔ بس دل کی تسلی کے لئے ذرا ہلہ گلہ کر لیتے ہیں۔ صادق تو کہتا ہے کہ مجھے گانا شروع کر دینا چاہئے۔ بہت شہرت ملے گی۔"

"فضول مت بولا کریں آپ۔ ایک بات جب پہلے طے ہو گئی تھی تو......" انہیں غصہ آ گیا۔

"تو اس میں حرج ہی کیا ہے۔ صادق نے بھی کہا تھا کہ ابھی بات مان لو بعد میں منوا لینا۔"

''ہائے' میں گانا نہیں چھوڑ سکتی خان۔''

اس نے لاڈ سے اپنا سر ان کے سینے پر رکھ دیا۔ وہ ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹ گئے۔ چہرے پر ناگوار شکنیں تھیں' اور ضبط کی کوشش میں چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

''وہ ہے نا نذیر علی وہ کہہ رہا تھا میرے گلے میں تو سُر خود بولتے ہیں۔ میرے ماے کا پتر ہے۔ ہم نے ایک گانا اکٹھے گایا تھا سٹیج پر' بڑی واہ واہ ہوئی تھی۔ دیکھا تھا کل تم نے نذیر علی کو۔ وہ اونچا لمبا سا مونچھوں والا۔''

''اگر یہاں میرے ساتھ رہنا ہے سلطانہ! تو یاد رکھیں کہ یہ گانا وانا سب بھول جائیں' اور مجھے ان لوگوں کی یہاں آمد بھی پسند نہیں ہے۔''

وہ انتہائی سختی سے کہہ کر کمرے سے باہر نکل گئے۔

''ہوں۔'' ان کے جانے کے بعد اس نے کندھے اچکائے۔

صادق نے اچھی طرح سمجھا دیا تھا اسے۔

''تیرے پاؤں جم گئے ہیں شانو! یہ خان ساتھ نبھانے والا لگتا ہے۔ بس اب تو اپنی کرائی منوا' تیری اور نذیر علی کی جوڑی بڑی مقبول ہوگی۔ پیسہ ہی پیسہ...... بارش ہو جائے گی پیسے کی۔''

''لیکن خان کے پاس تو خود بھی بڑا پیسہ ہے۔''

''جھلی ہے تو نری۔ وہ پیسہ تیرے پاس تھوڑا ہے۔ مانگ مانگ کر لینا پڑتا ہے تجھے' پھر اپنا کمائے گی تو اس میں بھائی کا بھی خیال کر لینا۔ یہ پروڈیوسر اتنا کم دیتے ہیں کہ ایک وقت کی روٹی بھی مشکل سے پوری ہوتی ہے۔ تیرے بیاہ سے بڑا نقصان ہوا۔ دو چار پیسے جو تو کماتی تھی وہ بھی گئے۔''

''لو پچھلے ہفتے تو دس ہزار دیئے تھے۔''

''وہ تو اماں کی بیماری میں لگ گئے۔''

وہ اور پیسے نکال دیتی اور وہ روز یونہی بہانے بنا بنا کر اس سے رقم لیتا رہتا تھا۔ روپے پیسے کا تو کوئی مسئلہ نہ تھا' وہ جتنے مانگتی محب اللہ خان خاموشی سے اس کے حوالے کر دیتے۔ تکلیف دہ بات تو نذیر علی اور سلطانہ کی بے تکلفی تھی۔ نذیر علی ہر تیسرے چوتھے دن چلا آتا تھا۔ شروع شروع میں تو صادق یا کوئی اور عورت یا مرد ساتھ ہوتا' بعد میں اکیلے ہی آنے لگا۔ پرانے ملازم محب اللہ کو رپورٹ ضرور دیتے تھے کہ ان کی عدم موجودگی میں کون کون آیا؟

کئی بار وہ آفس سے آئے تو ڈرائنگ روم میں وہ موجود ہوتا۔ سلطانہ اور اس کے قہقہے

روم تک سنائی دیتے تھے۔ کئی بار انہوں نے اپنی گاڑی میں سلطانہ اور نذیر علی اور صادق کو کسی ہوٹل میں جاتے دیکھا۔ آفس سے اچانک کسی کام سے اٹھنے پر انہوں نے ایک بار سگنل پر ایک ہوٹل کے باہر اپنی گاڑی دیکھی۔ یہ سب ان کے لئے انتہائی تکلیف دہ تھا۔ ایک دن تکلیف حد سے بڑھی تو وہ آپا کے سامنے رو پڑے۔

''مجھے لگتا ہے آپا! میرے دماغ کی رگیں پھٹ جائیں گی۔''

''جب جوتی تکلیف دینے لگے تو اسے بدل لینا چاہئے۔'' آپا نے ان کا سر سینے سے لگایا۔

''اور......'' وہ کچھ کہتے کہتے جھجکیں۔ ''مانا ہمارے خاندان میں طلاق معیوب سمجھی جاتی ہے' لیکن خاندان کو بدنامی سے بچانے کے لئے ضروری ہے کہ تم سلطانہ کو فارغ کر دو۔ کل تمہارے بھائی صاحب بھی بتا رہے تھے کہ کل کسی دوست کے ساتھ ہوٹل گئے کھانا کھانے' تو وہاں وہ کسی شخص کے ساتھ بیٹھی تھی' اور اس کے قہقہوں کی آوازیں اتنی بلند تھیں کہ لوگ مڑ مڑ کر دیکھ رہے تھے۔ تمہارے بھائی صاحب تو دروازے سے ہی پلٹ آئے کہ کہیں پکار لیا تو خوامخواہ بدنامی ہو گی۔''

اور وہ اندر تک عرق ندامت سے بھیگ گئے۔

''بھائی......'' انہوں نے اس کی پیشانی چومی۔ ''کبھی کبھی اپنے ہی جسم کے حصے کو کاٹنا پڑتا ہے۔ باقی جسم کو محفوظ رکھنے کے لئے۔''

اور جب وہ آپا کے گھر سے نکلے تو فیصلہ کر چکے تھے' اور اس فیصلے نے انہیں بہت پُرسکون کر دیا تھا۔ انہیں لگ رہا تھا' جیسے ڈیڑھ سال بعد ان کے دل پر دھرا بوجھ کم ہوا ہو۔ گھر آئے تو خلاف توقع ڈرائنگ روم خالی تھا اور سلطانہ بیڈ روم میں لیٹی ہوئی تھی۔

''خیریت......'' ان کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ ابھری۔ ''آج تمہارے ماے کا پتر نہیں آیا؟''

سلطانہ نے خوابناک آنکھوں سے انہیں دیکھا۔

''آج میری طبیعت ٹھیک نہیں۔''

آواز میں نقاہت شامل ہوگئی جبکہ چہرہ چمک رہا تھا۔

''خدانخواستہ' نصیب دشمناں کیا مرض لاحق ہو گیا۔''

''خان! آپ بھی بس۔'' وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ چہرے پر شرم کے آثار نظر آنے۔'' وہ صبح سے

چکر آ رہے تھے' نذیر آیا تو میں اس کے ساتھ ڈاکٹر کی طرف چلی گئی۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ میں ماں بننے والی ہوں۔''

''کیا ۔۔۔؟'' ان کا دل دھک سے رہ گیا۔

''لو جی' تمہیں تو سمجھ ہی نہیں آئی' باپ بننے والے ہو تم۔''

سمجھ تو وہ گئے تھے' لیکن یہ کیا ہو گیا تھا۔ اس وقت جب وہ اسے علیحدہ کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔

''نہیں۔'' انہوں نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔

''سچی تم نذیر سے پوچھ لو بے شک۔''

''شٹ اپ۔'' انہوں نے ایک ناگواری نظر اس پر ڈالی۔

یہ نذیر اس کی زندگی کے ہر معاملے میں داخل ہو رہا تھا۔ کیا اسے زیب دیتا تھا کہ وہ نذیر کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس جائے۔

یکدم ان کے سر میں درد کی شدید لہر اٹھی' وہ دونوں ہاتھوں میں سر تھامے ہوئے بیڈ کے کونے پر ٹک گئے۔

''لو' تم تو خوش ہونے کے بجائے الٹا غم زدہ ہو کے بیٹھ گئے ہو۔ خان! یہ تو خوشی کی خبر ہے کہ تم باپ بننے والے ہو۔ میری اماں کو اتنی فکر تھی کہ سال گزر گیا' کوئی خبر ہی نہیں۔ خدا نہ کرے تو ... وہ اس روز میں نے وی سی آر پر فلم لگائی ہوئی تھی نا تو اس میں تو ہیرو کو جب پتا چلا ہے کہ وہ باپ بننے والا ہے تو وہ خوشی سے پاگل ہو جاتا ہے اور......''

''خدا کے لئے سلطانہ بیگم اس وقت کچھ دیر کو خاموش ہو جایئے۔ نہ آپ ہیروئن اور نہ میں ہیرو۔''

وہ جو فیصلہ کر کے آپا کے گھر سے اٹھے تھے' وہ فیصلہ تو جیسے بیچ منجدھار میں پھنسی کشتی کی طرح ڈولنے لگا تھا۔ قدرت یوں ہی انسانوں پر اثر انداز ہوتی ہے۔

وہ اٹھے اور مرے مرے قدموں سے چلتے ہوئے باہر لاؤنج تک آئے' اور پھر اپنی سٹڈی میں چلے گئے۔

''آپا ...'' کچھ دیر بعد ہی وہ آپا کو فون کر رہے تھے۔

''آپا! اب میں کیا کروں؟''

وہ روہانسے ہو رہے تھے۔ کچھ دیر پہلے جس بوجھ سے وہ خود کو آزاد سمجھ رہے تھے' وہ دگنا ہو

گیا تھا۔

''محب ...... میری جان ...... کچھ بھی مت کرو' حوصلہ کرو۔ اللہ اپنی حکمتیں خود جانتا ہے۔ میرے باپ کے گلشن میں مدت بعد بہار آنے والی ہے۔ اس گھڑی کے لئے تو میں نے بہت دعائیں کی تھیں محب۔''

خوشی سے ان کی آواز کانپ رہی تھی۔ وہ اتنی دور سے بھی ان کے چہرے پر کھلتے رنگوں اور آنکھوں میں دمکتی خوشی کو دیکھ رہے تھے۔

''مگر آپا ......'' ان کی سسکی نکل گئی۔ ''اس عورت کے ساتھ کیسے' کیسے آپا۔''

''محب میں آ رہی ہوں ابھی۔''

انہوں نے فون بند کر دیا۔ جانتی تھیں کہ اس وقت محب اللہ کو ان کے سہارے کی بہت ضرورت ہے۔ وہ جوان کے گھر سے اٹھتے ہوئے ان کے چہرے پر سکون کے رنگ بکھرے تھے' وہ جو فیصلہ کر کے بہت مطمئن تھے' یکایک یہ کیا ہو گیا تھا۔ انہیں اپنی حالت اس وقت کسی ایسے مسافر کی سی لگ رہی تھی' جو منزل پر پہنچ کر بھی نامراد رہا ہو۔ وہ لاؤنج میں بیٹھ گئے۔

کچھ دیر بعد آپا مٹھائی کی ٹوکریوں سے لدی پھندی آ گئیں۔

''آپا......'' انہیں دیکھ کر وہ بکھر گئے۔

آپا نے ان کا ہاتھ تھام کر' ان کا سر سینے سے لگا کر انہیں تسلی دی تھی۔

''کیا تم یہ برداشت کر سکو گے کہ تمہارا بچہ اس چھوٹے سے گھر میں' اس ماحول میں جنم لے' پلے بڑھے۔'' اور وہ جو آپا کے آنے سے پہلے سوچ رہے تھے کہ بچہ ہو جائے تو پھر تو طلاق دی جا سکتی ہے' ایک دم ڈھے سے گئے۔ ایک کلکاریاں مارتا بچہ تصور میں آیا' اور پھر سلطانہ بیگم کا گھر۔ سٹیل کی بڑی سی پلیٹ میں زمین پر بیٹھ کر لڑ لڑ کر کھانا کھاتے سلطانہ کے بھتیجے بھتیجیاں۔

''اوہ نو......'' انہوں نے خود ہی نفی میں سر ہلایا۔

''کبھی کبھی زندگی میں سمجھوتے کرنے پڑتے ہیں بھائی۔'' آپا بیگم نے نرمی سے کہا۔

''اور اب یہ جانے آپا کے سمجھانے کا اثر تھا' یا پھر خود ہی باپ بننے کی انوکھی خوشی' کسی کلی کی طرح دل کے اندر کھل اٹھی تھی کہ وہ سلطانہ کا بہت خیال رکھنے لگے۔ اس کی ناگوار باتوں کو بھی برداشت کرتے رہے۔ خود اسے ساتھ لے کر ایک بڑے ہسپتال میں اس کا نام درج کروایا۔ باقاعدگی سے چیک اپ کے لئے لے کر جاتے۔ اس کی خوراک کا خیال رکھتے۔ سلطانہ تو ان دنوں ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔ صادق نے سمجھایا تھا۔ ''اب اس گھر میں تمہارے قدم مضبوط ہو

گئے ہیں' جو چاہو حاصل کرلو' بچہ ہو جائے تو سب سے پہلے گھر اپنے نام کرواتا۔ کچھ جائیداد اور بینک بیلنس بھی نکلوا لو۔''

''لیکن صادق بھائی! گھر میرا اور میرے بچوں کا ہی ہوگا۔''

''جھلی ہو تم' ان بڑے لوگوں کا کیا پتا۔ کب دل بھر جائے۔''

اور سلطانہ کی سمجھ میں بات آ گئی تھی۔

گو اب بھی صادق کبھی کبھی نذیر علی اور ایک دو بندوں کے ساتھ آ جاتا۔ محفلیں جمتیں' گیت گائے جاتے اور ہلہ گلہ ہوتا' محب اللہ خان بہت جز بز ہوتے۔ جب انہیں پتا چلتا کہ ان کی عدم موجودگی میں گھر میں جمگھٹا رہا' لیکن جب سلطانہ آنکھوں میں آنسو بھر کے کہتی۔

''کیا کروں باہر بھی نہیں جا سکتی۔ اس حالت میں بیٹھے بیٹھے دل گھبراتا ہے۔ صادق اور نذیر علی آ جاتے ہیں تو دل بہل جاتا ہے۔''

وہ خاموش ہو جاتے کہ بچہ ہو جائے تو شاید خود ہی سلطانہ سنبھل جائے' لیکن ان کے سارے خواب' خواب ہی رہے۔ سلطانہ ایک بچی کی ماں بن گئی۔ بچی بے انتہا خوبصورت تھی۔ محب اللہ خان اور سلطانہ دونوں کا حسن چرا لائی تھی۔

آپا نے بہت شوق سے اس کا نام ملائکہ رکھا تھا۔ ملائکہ کے لئے آیا رکھ لی گئی۔ سلطانہ کو اس کی ذرا پروا نہیں تھی۔ وہ بچی کی طرف سے بالکل بے نیاز تھی۔ چند ماہ بعد ہی وہ بچی کو آپا کی گود میں ڈال کر خود پہلے جیسی سرگرمیوں میں مصروف ہوگئی تھی' بلکہ اب وہ کچھ زیادہ ہی کھل گئی تھی۔ صادق نے اسے یقین دلایا تھا کہ اب وہ بچی کی ماں بن کر زیادہ مضبوط ہوگئی ہے۔ وہ کلفٹن کا ایک فلیٹ اپنے نام کروانے میں کامیاب ہوگئی تھی۔

محب اللہ بیٹی کی پیدائش پر واقعی اتنے خوش تھے کہ جب اس نے گفٹ کی فرمائش کی اور کلفٹن والے فلیٹ کو اپنے نام کرنے کو کہا تو انہوں نے اس کی بات مان لی۔ بہرحال اب وہ ان کی بیٹی کی ماں تھی' اب کوئی خطرہ نہیں تھا۔

یہ صادق کا خیال تھا' تب ہی وہ تو آزادانہ نذیر علی کے ساتھ گھومتی' بلکہ ایک دو بار محب اللہ خان کی لاعلمی میں سٹیج پر جا کر نذیر کے ساتھ گانا بھی گایا۔ محب اللہ خان کی کاروباری مصروفیات کچھ ایسی تھیں کہ انہیں سلطانہ کی اس سرگرمی کا پتا ہی نہ چل سکا۔

ادھر ملائکہ اکثر بیمار رہنے لگی تھی۔ اس کا پیٹ خراب رہتا۔ دودھ ہضم نہ ہوتا۔ آپا بیگم جب بھی آتیں تشویش کا اظہار کرتیں۔ محب ڈاکٹروں کے پاس لے جاتے' لیکن دو چار دن بعد پھر

وہی حال ہو جاتا' جو بچی بے انتہا خوبصورت اور صحت مند تھی' اب سوکھ کر کانٹا ہوگئی تھی' ہر وقت ریں ریں کرتی رہتی۔ آپا کا جی چاہتا تو گود میں اٹھا کر گندا فیڈر منہ میں دے دیتی' ورنہ وہ کاٹ میں پڑی روتی رہتی' اور سلطانہ تو محب اللہ کے جانے کے بعد ہی گھر سے نکل جاتی۔ آپا بیگم نے دو تین بار اسے سمجھایا کہ وہ خود بچی کا خیال رکھا کرے۔

''آیا کس بات کی تنخواہ لیتی ہے۔''

اس کے جواب نے آپا کو حیران کیا تھا' کہ یہ کیسی ماں ہے' لیکن وہ محب اللہ سے کچھ نہ کہہ سکیں۔ البتہ آیا کو خوب ڈانٹ پلائی۔ ان دنوں سلطانہ پر فلموں پر کام کرنے کا بھوت سوار ہوگیا تھا۔ صادق اور نذیر نے اسے یقین دلایا تھا کہ وہ اتنی خوبصورت ہے کہ تمام چوٹی کی ہیروئنوں کو پیچھے چھوڑ جائے گی۔ سو وہ نذیر کے ساتھ سٹوڈیوز کے چکر کاٹتی رہتی' یا پھر صادق کے ساتھ۔

ان ہی دنوں محب اللہ خان کو کاروبار کے سلسلے میں فرانس جانا پڑا' اور ان کا قیام وہاں تقریباً تین ماہ رہا۔ واپس آئے تو سلطانہ کے متعلق جو خبریں انہیں ملیں' اس نے انہیں حواس باختہ کر دیا۔ اس اثنا میں اسے کسی فلم میں معمولی سا کردار مل گیا تھا' اور وہ ہواؤں میں اڑ رہی تھی' اور محب اللہ خان کی ہر تنبیہ سے بے نیاز ہو کر دھڑلے سے نہ صرف سٹیج پر گانا گا رہی تھی' بلکہ ریڈیو پر ایک آدھ چانس بھی مل چکا تھا۔ محب اللہ خان حیرت سے شاہ زمان کی گفتگو سن رہے تھے' جو سب کچھ بتاتے ہوئے بے حد شرمندہ سا ہو رہا تھا۔

''اسی لئے میں نے تمہیں منع کیا تھا محب! تمہیں اسے روکنا چاہئے تھا۔''

''لیکن میں تو ملک سے باہر تھا' اور پھر جب یہاں تھا تب بھی پتا نہیں چلا۔ میں تو سمجھ رہا تھا کہ بیٹی کی پیدائش کے بعد وہ بدل گئی ہے۔''

وہ آفس سے اٹھے تو قدموں میں جان ہی نہ تھی۔ اپنے آپ کو گھسیٹتے ہوئے گھر پہنچے۔ سلطانہ ان کی بے وقت آمد پر حیران ہوئی۔

''تم اس وقت۔''

دو دن سے وہ گھر پر ہی تھی۔ جب سے محب اللہ واپس آئے تھے' اور آج صادق نے اس سے کہا تھا کہ وہ گیارہ بجے آ جائے۔ ایک بڑے فلم پروڈیوسر سے ملنے جانا ہے۔

''اس کی فلم ہٹ ہوگئی تو سمجھو کہ بس......'' محب اللہ نے ایک چبھتی ہوئی نظر اس پر ڈالی۔

''کہیں جا رہی تھیں آپ؟''

''ہاں' وہ بھائی صادق نے بلایا تھا۔ ابا کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

انہوں نے ایک گہری نظر اس پر ڈالی۔ گہرے میک اپ اور ہاتھوں' کانوں میں فل جیولری کے ساتھ وہ باپ کی مزاج پرسی کو جا رہی تھی۔

"بیٹھ جائیے' آپ کے والد تو غالباً اس وقت اپنی جاب پر ہوں گے۔"

"جی......" وہ کچھ ٹپٹائی اور بھاری پلو سنبھالتے ہوئے بیٹھ گئی۔

"سلطانہ بیگم! آپ کو یاد ہوگا کہ ملائکہ کی پیدائش سے پہلے میں نے آپ کو کیا سمجھایا تھا۔"

"تو میں نے کیا تمہاری عزت کو بٹہ لگایا ہے۔"

"تو کوئی کسر بھی نہیں چھوڑی آپ نے۔ میں نے گانے سے منع کیا تھا۔"

"تو کیا ہے' بڑے بڑے گھرانوں کے لوگ گا رہے ہیں۔" وہ چمک کر بولی۔

صادق نے ہمیشہ کہا تھا کہ بہادر بن کر' نڈر ہو کر بات کرنا' جب بھی محب اللہ نے ایسی کوئی بات کی۔ ظاہر ہے ایک دن پتا تو چلے گا ہی۔

"لیکن میں نے آپ کو سختی سے منع کیا تھا۔" محب اللہ خان ضبط کی انتہاؤں پر تھے۔ "اور آپ نے' کسی فلم میں بھی......"

"کیا ہوا......تم یونہی ناراض ہو رہے ہو۔ ارے دیکھنا ایک دن جب میں ہیروئن بن جاؤں گی تو تم بھی فخر کرو گے کہ تم سلطانہ عرف شانی کے شوہر ہو۔"

"شٹ اپ۔" ان کا ضبط جواب دے گیا۔ "تم اپنا فخر اپنے پاس رکھو' اور آج کے بعد جی بھر کر گاؤ' ناچو' فلموں میں کام کرو۔ جو مرضی کرو' میں نے تمہیں طلاق دی۔" لمحہ بھر کو سلطانہ ہکا بکا ہوئی۔ دوسرے ہی لمحے ہنس پڑی۔

"تمہارا کیا خیال ہے کہ تم طلاق دو گے تو مجھ سے کوئی شادی نہیں کرے گا۔"

"میرا کوئی خیال نہیں ہے سلطانہ بیگم! آپ میرے گھر کو خالی کر دیں' اور جو لینا چاہیں لے جائیں۔ قانونی اور کاغذی کارروائی قانون اور شریعت کے مطابق ہوتی رہے گی۔"

سلطانہ نے سب کچھ سنا اور صادق کو فون کرنے لگی۔ محب اللہ خان نے ایک نظر اس پر ڈالی' اور پھر نڈھال قدموں سے چلتے ہوئے اپنی سٹڈی میں چلے گئے' اور وہاں فون پر آپا کو صورت حال سے مطلع کیا۔ وہ بیڈ روم میں جانا نہیں چاہتے تھے تاکہ سلطانہ اپنا سامان وہاں سے اٹھالے۔

کچھ ہی دیر بعد آپا اور ان کے شوہر آ گئے۔ فون پر ظاہر ہے تفصیلات نہیں بتائی جا سکتی تھیں۔ سلطانہ بیڈ روم میں تھی' وہ سیدھی سٹڈی میں چلی گئیں۔

"تم نے ٹھیک کیا ہے محب اور بالکل صحیح وقت پر فیصلہ کیا ہے۔ اپنے خاندان کی عزت سرِ بازار اچھلتے دیکھنا آسان نہیں ہے اور بچی...... بچی کا کیا ہوگا؟"

"ہاں بچی!" انہیں اچانک ملائکہ کا خیال آیا۔

"اس سلسلے میں بات نہیں ہوئی' لیکن اگر سلطانہ اسے لے جانا چاہے گی تو میں روک نہ پاؤں گا۔"

"ہماری بچی رل جائے گی محب۔" آپا ملول تھیں۔

"ایسے لوگوں سے جو اتنے لالچی اور گھٹیا ہوں' کوئی ڈیل کی جا سکتی ہے۔"

بھائی صاحب نے مشورہ دیا' لیکن کسی ڈیل کی نوبت ہی نہ آئی۔ جب سلطانہ' صادق کے آنے کے بعد تین چار کپڑوں سے بھرے صندوق' سوزوکی میں رکھوا چکی۔ لاکر میں رکھے زیوروں سے بیگ بھر کر درازوں وغیرہ میں جتنی نقدی موجود تھی' وہ سب بھی نکال لی۔ صادق نے جاتے جاتے محب اللہ کا قیمتی پن بھی اٹھا لیا۔ صادق کو بیگ دے کر وہ سٹڈی کی طرف بڑھی اور دروازے کو پاؤں سے کھولا۔

"سنو محب اللہ خان! جا رہی ہوں تمہارے گھر سے اور خوش ہوں بہت کہ تم جیسے تنگ نظر شخص سے جان چھوٹ گئی۔ چاہو تو ابھی تین طلاقیں دے دو۔ تم کیا سمجھتے تھے کہ میں روؤں' پیٹوں گی' تمہارے پاؤں پڑوں گی کہ اور دو طلاقیں مت دو۔ میرے پچھلے مر نہیں گئے تھے ہاں۔"

محب اللہ ہونٹ بھینچے کھڑے تھے' آپا آگے بڑھیں۔

"سلطانہ! ابھی بھی وقت ہے سوچ لو۔ ایسے ہی سانچے میں ڈھل جاؤ' جیسے محب چاہتا ہے۔"

"ہوں۔" وہ طنز سے ہنسی۔

"سانچے میں ڈھل جاؤ۔" تب ہی آیا ریں ریں کرتی بچی کو گود میں لیے نرسری سے باہر آئی۔

"بیگم صاحبہ جی! بے بی آج دودھ بھی نہیں پی رہی' جتنا دودھ پیتی ہے ساتھ ہی قے کر دیتی ہے۔"

کالی سوکھی سڑی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے' میلے کپڑے۔ ایک لمحہ کے لئے سلطانہ نے اس کی طرف دیکھا۔ تب ہی صادق نے پیچھے سے آ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"چلو شانو!"

"یہ...... یہ بچی......"

"جہیز میں نہیں لائی تھیں تم۔ جس کی ہے، سنبھال لے گا۔"

"لیکن......" سلطانہ نے کچھ کہنا چاہا۔

"چپ کرو، یہ مرگھلی مرتی ہوئی بچی لے کر کیا کرو گی۔ کون سنبھالے گا، نری مصیبت۔ تمہارا کیریئر نہیں بننے والا شانی اس کے ہوتے۔ اوّل تو یہ بچے گی نہیں، بچ گئی تو یہاں رہ کر زیادہ فائدہ پہنچا سکتی ہے تمہیں۔"

"سنو......" آپا کے میاں نے اسے آواز دی۔

"بچی ہمارے پاس رہے گی، لیکن تمہارا اس پر کوئی دعویٰ نہیں ہو گا اور تمہیں لکھ کر دینا ہو گا۔"

"لکھ دیں گے میاں جی! لیکن ایسے ہی نہیں پہلے طلاق کی کارروائی مکمل ہو جائے پھر بات ہو گی۔"

صادق، سلطانہ کو وہیں چھوڑ کر دو قدم پیچھے مڑا۔ اس کی آنکھوں میں یکدم چمک سی پیدا ہوئی۔

محب اللہ واپس سٹڈی کی طرف مڑ گئے تو آپا نے آپا کی گود سے بچی کو لے لیا۔

"یہ کیسے......" محب اللہ نے کچھ کہنا چاہا تو آپا نے اسے تسلی دی۔

"پہلے کون سا اسے سلطانہ کی گود میسر تھی، جواب کچھ فرق پڑے گا۔ میں پالوں گی اسے۔ بس تم اس کی طرف سے بے فکر ہو جاؤ اور پہلے تو کسی ڈاکٹر کو بلاؤ گھر پر، یا ہسپتال چلو۔ بچی کی حالت ٹھیک نہیں لگ رہی مجھے۔ سلطانہ تو تھی ہی ایسی، تم نے بھی بچی کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا۔ غضب خدا کا کیسی پھول سی بچی تھی، اور کیا حالت ہو گئی۔"

محب نے سسکیاں لیتی بچی کی طرف دیکھا، اور ان کے دل کو جیسے کچھ ہوا۔ وہ یکدم اٹھ کھڑے ہوئے۔

"آپ آئیے بچی کو لے کر۔ میں گاڑی نکالتا ہوں۔" ڈاکٹرز اسے دیکھ کر حیران رہ گئے۔

"آپ نے اب تک بچی کا چیک اپ کیوں نہیں کروایا۔ یہ ڈی ہائیڈریشن کا شکار ہے۔ جسم سے پانی تقریباً ختم ہو چکا ہے، حیرت ہے یہ اب تک زندہ کیسے ہے۔" ملک محب اللہ پشیمان سے ہو گئے۔

"اللہ سے دعا کریں، ہم اپنی سی کوشش کرتے ہیں۔" اور پھر اللہ نے دعائیں سن لیں۔ بچی زندگی کی طرف لوٹ آئی تھی، لیکن ایک اور مسئلہ اس کے سر پر لگی ہوئی چوٹ تھی۔ اس چوٹ نے

دماغ کو بھی متاثر کیا تھا۔ آپا نے استفسار پر بتایا کہ چند ہفتے قبل وہ کاٹ سے گر گئی تھی۔ وہ صحت یاب تو ہو گئی تھی، لیکن اس کے منہ سے رال ٹپکتی رہتی تھی۔ اسی وجہ سے ڈاکٹرز اس کی دماغی صحت کے متعلق متذبذب تھے۔

آپا کی محنت اور دعائیں رنگ لائی تھیں۔ چند ہی ماہ میں اس کی رنگت لوٹ آئی تھی، اور وہ اتنی صحت مند اور پیاری ہو گئی تھی کہ دیکھنے والے کو بے اختیار اس پر پیار آتا، لیکن تین سال کی عمر تک اس نے بولنا شروع نہیں کیا تھا۔ محب اللہ خان اسے باہر بھی لے گئے۔ ڈاکٹروں نے انہیں اطمینان دلایا کہ وہ بولنے لگے گی۔ ہاں ہو سکتا ہے کچھ تاخیر سے بولے، یا ممکن ہے وہ ذہنی طور پر کچھ کمزور ہو، لیکن ابنارملٹی والی کوئی بات نہیں ہے۔ جب محب اللہ ملائکہ کو واپس لے کر آئے تو آپا نے ایک دن انہیں گھیر لیا۔

"ایسا کب تک چلے گا محب؟"

"کیسا آپا؟"

"یہی کہ کب تک تنہا اور اکیلے زندگی گزارو گے۔ شادی کر لو۔"

"کی تو تھی۔" وہ افسردہ سے تھے۔

"ضروری تو نہیں کہ ہر لڑکی سلطانہ جیسی ہو، پھر اپنے غلط فیصلے کی سزا کب تک خود کو دو گے، کب تک تنہا رہو گے۔"

"ملائکہ ہے نا آپا تنہا کب ہوں۔" وہ مسکرائے۔

"لیکن ملائکہ کو تم مجھے دے چکے ہو۔"

"آپ ہی کی ہے۔ آپ نہ ہوتیں تو شاید زندہ بھی نہ رہتی۔"

"خیر زندگی دینے اور لینے والی ذات تو اللہ کی ہے۔" آپا نے محب اللہ کی طرف بغور دیکھا۔ ان تین سالوں میں جیسے ان کے چہرے اور آنکھوں کی چمک ماند پڑ گئی تھی۔

"محب! خلاف فطرت زندگی گزارنا تو رب کو بھی پسند نہیں ہے۔ ایک بار تم نے خود فیصلہ کیا تھا، ایک بار مجھ پر اعتماد کر کے دیکھو۔"

"میری سب سے بڑی نند کی بیٹی ہے مائرہ۔ بہت اچھی، سلیقے والی ہے، سمجھ دار ہے، پڑھی لکھی ہے۔ اگر تم مان جاؤ تو میں تمہارے بھائی صاحب سے بات کروں۔"

"ٹھیک ہے آپا!" ان کے سامنے تو وہ ہمیشہ بے بس ہو جاتے تھے۔

آپا کے لئے تو ان کی رضامندی ہی بہت تھی۔ وہ دوسرے دن ہی نند کے گھر جا پہنچیں۔

مائرہ سے بات کی' وہ بہت صاف گو لڑکی تھی۔

''ماں! مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ آپ کے بھائی یقیناً بہت اچھے انسان ہیں' اور ان کی ہمراہی باعثِ فخر ہے میرے لئے۔ سلطانہ ان کی زندگی سے جا چکی' اس کا ذکر میرے لئے اہم نہیں' لیکن ملائکہ موجود ہے وہ معصوم بچی ہے لیکن ایک بات کی میں وضاحت کر دوں کہ شاید میں اس سے محبت نہ کر سکوں۔ میں اس کا خیال بھی رکھوں گی۔ میرا رویہ اس کے ساتھ روایتی قسم کی سوتیلی ماؤں والا تو ہرگز نہیں ہو سکتا' لیکن میں نہیں سمجھتی کہ میں اس سے انصاف کر پاؤں گی۔''

''ملائکہ میری بیٹی ہے مائرہ! اور اسے میرے پاس ہی رہنا ہے۔''

''آپا بہت مطمئن ہو گئی تھیں' چند ہی دنوں میں معاملات طے پا گئے۔

مائرہ ایک اچھی اور محبت کرنے والی بیوی ثابت ہوئی تھی۔ ہر لحاظ سے مائرہ ان کے معیار پر پوری اتری تھی۔ وہ آپا کے شکر گزار تھے' لیکن پتا نہیں کیوں سلطانہ والے واقعہ کے بعد ان کا دل نہیں لگا تھا یہاں۔ سو وہ آہستہ آہستہ کینیڈا کے لئے کوشش کر رہے تھے اور شادی کے صرف چھ ماہ بعد انہیں کینیڈا کی مائیگریشن مل گئی' تو انہوں نے کینیڈا کے لئے رختِ سفر باندھ لیا۔ آپا افسردہ تھیں۔

''اپنے وطن میں کیا برائی ہے محب؟''

''بس آپا دل اچاٹ ہو گیا ہے یہاں سے۔''

جانے سے دو دن پہلے وہ آپا کے پاس آئے تھے۔ ملائکہ کے لئے ڈھیروں تحائف اور کھلونے لے کر۔

تب ہی پھولے پھولے گلابی فراک میں ملائکہ بھاگتی ہوئی آئی' تو انہوں نے دونوں بازو پھیلائے۔ وہ ان کے بازوؤں میں سما گئی۔

''بابا......'' اس نے ننھے ننھے ہاتھوں سے ان کا چہرہ اپنی طرف موڑ کر شاپرز کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ سب تمہارے ہیں میری جان پھر کہو بابا۔'' آج پہلی بار اس کی زبان سے بابا نکلا تھا۔

''آپا......'' وہ خوشی سے بولے۔ ''آپا آج صدقہ خیرات کر دیجئے گا' بہت سارا' میری بیٹی نے پہلا لفظ بولا ہے۔''

''ہاں' آج صبح اس نے اماں بھی کہا۔ یہ ساری کوشش عرفی کی ہے۔ وہی سارا دن اس

کے ساتھ لگا رہتا ہے۔''

''میں آپ کا اور بھائی صاحب کا ہمیشہ ممنون رہوں گا۔ آپ نے جو کچھ میری بیٹی کے لئے کیا ہے' میں وہ احسان کبھی......''

''فضول بات مت کرو محب!'' آپا نے انہیں ڈانٹ دیا۔

''تمہاری بیٹی میرا اپنا ہی خون ہے۔''

انہوں نے محبت سے ملائکہ کو دیکھا' جو محب اللہ کی گود میں بیٹھی' اب ان کے کالر سے کھیل رہی تھی۔ آپا کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

''پتا نہیں کب' کب پھر دیکھ پائے گی اپنے باپ کو۔''

''آپا میں رابطہ رکھوں گا' آتا رہوں گا۔ فون پر تو بات ہوتی ہی رہے گی۔''

انہوں نے آپا کی نم آنکھیں دیکھتے ہوئے تسلی دی' لیکن وقت اور حالات انسان کے تابع نہیں ہوتے۔ محب اللہ کینیڈا گئے تو ایسے کہ دس سال تک واپس نہ آئے۔ البتہ بہن سے فون پر رابطہ رہا۔ بیٹی سے بھی بات چیت ہوتی رہی۔ ان دس سالوں میں وہ دو بیٹوں اور ایک بیٹی کے باپ بن چکے تھے۔

دس سال بعد وہ بہنوئی کی وفات پر آئے تو ملائکہ کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ تیرہ چودہ سال کی ملائکہ نہ صرف یہ کہ بے حد حسین ہو چکی تھی' بلکہ ذہین بھی بہت تھی۔ وہ بچی' جس کے متعلق ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ شاید وہ اپنے ہم عمر بچوں کے مقابلے میں ذہنی طور پر کچھ کمزور ہو گی' وہ پڑھائی میں سب سے آگے تھی۔ غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی بہت شوق سے حصہ لیتی تھی۔ ڈھیروں کپ اور ٹرافیاں اور کتابیں جب اس نے محب اللہ خان کو دکھائیں تو اللہ کی اس مہربانی پر محب اللہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''محب! میں چاہتی ہوں ملائکہ کو تم مجھے میرے عرفان کے لئے دے دو۔''

''آپا! یہ آپ ہی کی ہے' اس کے متعلق ہر فیصلہ آپ کو ہی کرنا ہے۔''

محب اللہ خان ایک ماہ بعد جب واپس جا رہے تھے' وہ ننھے بچوں کی طرح رو رہی تھی۔

''آپ پھر کب آئیں گے؟''

''بہت جلد گڑیا۔''

لیکن وہ اپنا وعدہ نبھا نہ سکے۔ وقت تیزی سے گزرتا گیا' اور مزید دس سال بیت گئے۔ ملائکہ نے گو ماسٹرز کر لیا تھا' لیکن وہ چھوٹی سی چھوٹی بات بھی آپا سے پوچھتی تھی۔

"پھوپھو! میں یہ ریڈ کپڑے پہن لوں۔ یہ سکارف اوڑھ لوں' یہ کتاب خرید لوں۔"

وہ خود سے فیصلہ نہ کر پاتی تھی۔ کئی بار آپا نے سمجھایا۔

"چندا! اپنے اندر اعتماد پیدا کرو' خود فیصلہ کرو کہ تمہیں کون سی کتاب خریدنی ہے؟ کون سے رنگ کے کپڑے پہننے ہیں' کیا کرنا ہے۔"

لیکن وہ فیصلہ ہی نہ کر پاتی' اور پھوپھو کی طرف بھاگتی پوچھنے کیلئے۔

بچپن میں عرفان اس کا خوب مذاق اڑاتا تھا۔

"امی! پانی پی لوں' واش روم چلی جاؤں۔"

"یہ سکول نہیں ہے' گھر ہے بی بی! یہاں تم بغیر پوچھے پانی پینے اور واش روم جا سکتی ہو۔"

لیکن اس پر عرفان کی باتوں کا اثر نہیں ہوتا تھا۔ وہ یونہی ذرا ذرا سی باتوں کے لئے آپا کی طرف دیکھتی تھی۔ ان دنوں وہ فرسٹ ایئر میں پڑھتی تھی' جب ایک دن آپا کو کسی کام سے باہر جانا پڑا تو سکول سے آ کر وہ رات تک بھوکی بیٹھی رہی۔ آپا آئیں تو حیران رہ گئیں۔

"ملائکہ بیٹا! ملازمہ سے کہا تھا۔ وہ کھانا لگا دیتی۔ اب تک بھوکی بیٹھی ہو۔"

"آپ جو نہیں تھیں تو......"

وہ رو پڑی تھی' اور تب آپا نے سنجیدگی سے سوچا تھا کہ ملائکہ میں جو اعتماد کی کمی ہے' اس کے لئے انہیں سنجیدگی سے کچھ کرنا چاہئے۔ انہوں نے بچپن میں اس کو بالکل ہتھیلی کا چھالا بنائے رکھا تھا۔ اگرچہ وہ بالکل نارمل تھی۔ وہ اپنی کلاس کی ذہین لڑکیوں میں شمار ہوتی تھی' لیکن اگر کوئی خلاف مرضی بات ہو جاتی' تو یوں پاؤں مار مار کر چیخ چیخ کر روتی کہ رنگ سرخ ہو جاتا' سانس بند ہونے لگتا' اور ایسے میں رال بہنے لگتی۔ انہوں نے جب ڈاکٹروں سے بات کی تو انہوں نے یہی کہا کہ اسے ضد نہ دلائیں' اور کوشش کریں کہ اس کی ہر بات مان لی جائے۔ یوں شاید انہوں نے اس کا خیال حد سے زیادہ رکھا تھا۔

ہر وقت اس کے ساتھ ہی رہتی تھیں' لیکن انہیں ہمیشہ ساتھ نہیں رہنا تھا۔ اسے اپنی ایک الگ زندگی شروع کرنا تھا' ایک گھر چلانا تھا' بچے پالنے تھے۔ انہوں نے عرفان اور محب اللہ سے مشورہ کر کے تھرڈ ایئر میں اسے لاہور کے کالج میں داخل کروا دیا۔ سب کا خیال تھا کہ ہوسٹل میں رہ کر اس کے اندر اعتماد پیدا ہوگا۔

"آپ مجھے لاہور کیوں بھیج رہی ہیں؟" وہ سخت گھبرائی ہوئی تھی۔

"وہاں کا معیارِ تعلیم بہت اچھا ہے۔ کنیئرڈ میں تمہارا ایڈمیشن ہوا ہے۔"

"لیکن میں وہاں اکیلی...... نہیں پھوپھو! میں یہیں پڑھ لوں گی۔ یہاں بھی تو سب اچھا ہے۔"

"ہاں' لیکن میں چاہتی ہوں میری بیٹی بہت اچھے کالج میں پڑھے۔"

"اچھا۔" وہ ان کی بات مان بھی لیتی تھی' قائل بھی ہو جاتی تھی' پھر بھی اس نے کہا تھا۔

"لیکن مجھے وہاں ڈر لگے گا پھوپھو۔"

"وہاں اور لڑکیاں بھی ہوں گی' اور پھر میں اور عرفی تم سے ملنے آتے رہیں گے۔"

یوں اسے لاہور بھیج دیا گیا۔ شروع شروع میں تو وہ بہت گھبرائی۔ تقریباً روز کلاس سے باہر نکل کر پی سی او سے فون کرتی۔ ہفتے بھر بعد آپا اس سے ملنے آتیں تو وہ ان کے گلے لگ کر خوب روتی۔ وہ سیاہ شلوار پر سرخ ڈاٹس والی سیاہ شرٹ پہنے ہوئے تھی۔ ملگجے کپڑوں میں ملبوس وہ ان کے گلے میں بانہیں ڈالے خوش خوش بیٹھی تھی۔

"ملائکہ! آپ نے کتنے دن سے کپڑے چینج نہیں کئے۔"

"جب سے کراچی سے آئی ہوں۔" اس نے لاپرواہی سے بتایا۔

"اب آپ بتائیں نا کون سے پہنوں؟"

تو انہوں نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

"ملائکہ! تم بچی نہیں ہو اب' یہ اتنے دن سے تم کالج بھی ان ہی کپڑوں میں جا رہی ہو۔"

"نہیں' کالج میں تو دوسرے پہن کر جاتی ہوں۔ یہ تو ہاسٹل میں آ کر پہنتی ہوں۔"

ایک لمحے کو تو ان کا جی چاہا کہ وہ اسے ساتھ واپس کراچی لے جائیں' معصومیت سے اپنی طرف تکتی ملائکہ پر انہیں بے طرح پیار آ رہا تھا' لیکن دوسرے ہی لمحہ انہوں نے دل پر جبر کر لیا کہ اس کا یہاں رہنا ہی بہتر تھا' اور شاید ان کا فیصلہ صحیح تھا۔ کچھ ہی عرصہ میں اس کے فونز میں کمی آ گئی۔ اب وہ فون کر کے چھوٹی چھوٹی باتیں ان سے نہ پوچھتی تھی' اس لئے گریجویشن کے بعد آپا نے اسے واپس بلوا لیا۔

"اب ماسٹرز یہاں سے کر لو۔"

"مگر میری فرینڈ تو لاہور میں ہی ایڈمیشن لے گی۔" وہ کچھ پریشان سی ہوئی تھی۔

"اس نے کہا تھا کہ لاہور میں...... میرا مطلب ہے پنجاب یونیورسٹی میں ایڈمیشن لیں گے۔"

"اس کے کہنے سے کیا ہوتا ہے ملائکہ! تمہیں اب یہیں پڑھنا ہے۔"

"اچھا۔" اس نے پھوپھو کی بات پر زیادہ حجت نہیں کی تھی' لیکن وہ کئی دن اپ سیٹ سی رہی۔

دراصل اپنی روم میٹ مونا سے اس کی بہت دوستی ہوگئی تھی' اور مونا نے گویا پھوپھو کی جگہ سنبھال لی تھی۔ فیصل آباد سے آنے والی مونا اپنے بہن بھائیوں میں سب سے بڑی تھی' اور فطرتاً بہت خیال رکھنے والی تھی۔

اس نے کچھ دن تو خاموشی سے ملائکہ کو دیکھا۔ وہ نہ تو اپنے بیڈ کی چادر درست کرتی تھی' نہ کمبل تہہ کر کے رکھتی۔ تین تین چار چار دن تک میلے کپڑے پہنے رکھتی۔ اپنا کپ دھونا بھی اسے عذاب لگتا تھا۔ اکثر یاد ہی نہ رہتا تھا کہ کپ اور پلیٹ دھو کر رکھنا ہے' لیکن پھر اس سے ملائکہ کی یہ لاپروائی برداشت نہ ہوئی۔ وہ ہولے ہولے اسے ٹوکنے لگی۔

"ملائکہ! یہ اپنا تولیہ سٹینڈ پر ڈال دو' کتابیں بیڈ سے ہٹا کر میز پر رکھ دو' یار! کپڑے چینج کر لو۔ یہ کیا چھ دن سے تم اسی جامنی شلوار پر تین شرٹ بدل چکی ہو۔"

ملائکہ خاموشی سے اثبات میں سر ہلا کر اس کی بات مان لیتی تھی۔ اس بات نے مونا کو متاثر کیا۔

"والدین کی اکلوتی بیٹی ہے' کام کی عادت نہیں ہے۔" اور پھر اس کی بے تحاشا خوبصورتی اور معصومیت' کئی کام اس نے خود ہی اپنے ذمہ لے لیے تھے۔ غیر ارادی طور پر وہ اس کا خیال رکھنے لگی تھی۔ جلد ہی دونوں میں بہت گہری دوستی ہوگئی تھی۔ اس نے مونا کو بتایا تھا' کہ وہ اپنی پھوپھو کے پاس رہتی ہے' اور اس کے بابا' آنٹی یعنی سوتیلی والدہ اور سوتیلے بہن بھائی باہر رہتے ہیں۔

"اور تمہاری مما...... کیا ان کی ڈیتھ ہوگئی تھی۔"

"ہاں شاید میرے بہت بچپن میں ایک بار پھوپھو نے بتایا تھا' کہ میں سال سوا سال کی تھی' جب وہ مجھے اپنے ساتھ گھر لائی تھیں۔"

اس کی ماں کیسی تھی' کون تھی؟ اور اسے کیا ہوا تھا؟ اس نے کبھی پوچھا ہی نہیں تھا۔ نہ ہی پھوپھو نے اس کا ذکر کیا تھا' لیکن مونا نے پوچھا تھا۔ "کیا تمہاری مما بھی تمہاری ہی طرح خوبصورت تھیں۔" اور اس نے مونا سے کہا تھا کہ وہ پھوپھو سے پوچھ کر بتائے گی اور جب چھٹیوں میں وہ کراچی گئی' اور اس نے پھوپھو سے یہ بات پوچھی تو پھوپھو کچھ دیر کے لئے خاموش ہوگئی تھیں' پھر آہستگی سے کہا تھا۔

"نہیں' میری جان! وہ تمہاری جیسی خوبصورت نہ تھی' لیکن ایک عام نظر رکھنے والے بندے کی نظر میں شاید وہ خوبصورت ہی ہو' تم سے بھی زیادہ' مگر مجھے وہ ہمیشہ بہت بدصورت دکھی۔"

وہ حیران سی انہیں دیکھ رہی تھی' اور ان کے بات کے معنی اخذ کرنے کی کوشش کر رہی تھی' اور پھر ناکام ہو کر انہیں دیکھنے لگی۔

"پھوپھو! مما کیا میری پیدائش پر فوت ہوگئی تھیں۔"

"نہیں تو۔" پھوپھو نے چونک کر اسے دیکھا۔

"تم سے کس نے کہا کہ وہ فوت ہوگئی ہیں۔"

"تو کیا آنٹی میری مما نہیں۔" اس نے خوش ہو کر پوچھا۔

"نہیں......" پھوپھو سنجیدہ تھیں۔

"ملکی! اب تم اتنی بڑی ہو چکی ہو کہ ہر بات سمجھ سکتی ہو' کیلکولیٹ کر سکتی ہو۔ تمہاری مما نے تمہارے پپا سے طلاق لے لی تھی' اور تمہیں چھوڑ گئی تھی۔" وہ منہ کھولے حیرت سے انہیں دیکھنے لگی۔

"مگر کیوں......؟" کچھ دیر بعد اس نے پوچھا۔

"دراصل تمہارے پپا اور مما کے مزاج اور ماحول میں زمین آسمان کا فرق تھا' سو نبھ نہ سکی۔" انہوں نے بات ختم کر دی۔

"اچھا' لیکن اب وہ کہاں ہیں؟"

"معلوم نہیں' ایک بار عرفی کے ابا جان نے بتایا تھا کہ انہوں نے لاہور میں دیکھا تھا اسے' شاید وہ لوگ یہاں سے لاہور چلے گئے تھے' لیکن جب تک وہ یہاں رہے' تب بھی وہ کبھی تمہیں دیکھنے یا ملنے نہیں آئی۔ حالانکہ تمہارے پپا نے کہا تھا مجھ سے کہ اگر کبھی سلطانہ' ملائکہ سے ملنے آئے تو اسے ملنے دینا کہ یہ اس کا حق ہے۔"

"تم ملنا چاہتی ہو اس سے؟" کچھ توقف کے بعد پھوپھو نے پوچھا۔

"آپ کا کیا خیال ہے' مجھے ان سے ملنا چاہئے؟"

"وہ تمہاری ماں ہے' تم ملنا چاہو تو میں تمہیں روکوں گی نہیں' لیکن اسے تمہارا خیال ہوتا تو کبھی تو وہ رابطہ کرتی' کبھی تو پوچھتی تمہارا۔ اتنے برس گزر گئے پتا نہیں کہاں ہے؟ کس جگہ ہے؟ اب کہاں ڈھونڈو گی اسے؟"

"ہاں' آپ صحیح کہتی ہیں۔ انہیں ملنا ہوتا یا میرا خیال ہوتا تو کبھی تو ملنے آتیں۔"
ملائکہ کو پھوپھو کی بات صحیح لگی تھی' اور وہ سچ ہی تو کہہ رہی تھیں کہ کہاں ڈھونڈے گی وہ انہیں' اور پھر پھوپھو نے ماں سے کم پیار تو نہیں دیا تھا اسے' بلکہ زیادہ ہی۔

"میری ماں تو آپ ہیں۔"

اس نے ان کے گلے میں بانہیں ڈال دیں' اور ان کا چہرہ چمک اٹھا۔

***

دو سال تک مونا اس کی نگراں بنی رہی' اور اب مونا سے الگ ہو کر وہ اپ سیٹ ہو گئی تھی' لیکن پھوپھو چاہتی تھیں کہ وہ ان کی نظروں کے سامنے ہی رہے۔ یہ دو سال بھی محض اس کی بہتری کی خاطر انہوں نے اسے دور بھیجا تھا' ورنہ ہر لمحہ اس کی فکر رہتی تھی۔

کچھ دن تک تو وہ مونا کو مس کرتی رہی' لیکن ہولے ہولے وہ پھر پھوپھو کے زیرِ اثر ہو گئی۔

"پھوپھو یہ ڈریس پہن لوں' اس کے ساتھ یہ جوتی کیسی لگے گی۔" وہ پھر سے ان سے مشورے کرنے لگی تھی۔ تاہم لاہور کی رہائش سے اتنا فرق ضرور پڑا تھا' کہ کئی کام وہ خود کرنے لگی تھی۔ اس کی بات چیت میں اعتماد بڑھ گیا تھا' اور وہ پھوپھو کی عدم موجودگی میں بھی خود کو محفوظ ہی محسوس کرتی تھی' اور ان سے پوچھے بغیر بھی کام کر لیتی تھی۔

انہی دنوں عرفان کو محب اللہ خان نے کینیڈا بلوا لیا۔ وہ یہاں اپنی جانب سے مطمئن نہ تھا' اور چاہتا تھا کہ شادی سے پہلے ایک پُرامید مستقبل اس کے سامنے ہو۔ محب اللہ خان سے بات ہوئی' تو انہوں نے اسے وہاں بلوا لیا۔

عرفان چلا گیا اور پھوپھو کی تمام تر توجہ کا مرکز صرف وہی رہ گئی۔ اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھنا' اس کی پسند ناپسند کے مطابق کھانے پکوانا' اس کی شاپنگ کرنا' سب انہوں نے اپنے ذمے لے لیا تھا۔ حالانکہ عرفان نے جاتے جاتے کہا تھا۔

"ملکی بیگم! اب کچھ میری اماں کی بھی خدمت کر لو۔ بہت خدمت کروالی ہے ان سے۔"

"ہاں تو وہ میری بھی تو اماں ہیں نا۔"

وہ ان کے گلے میں بانہیں ڈال کر بیٹھ گئی تھی' اور پھوپھو نہال ہو گئیں۔

ان دنوں جب وہ ماسٹرز کرنے کے بعد بور ہو رہی تھی' پھوپھو نے اسے مشورہ دیا کہ وہ "کوکنگ" کی کلاسز اٹینڈ کرلے' ڈرائیونگ سیکھ لے' میک اپ کا کورس کر لے۔"

"ہاں یہ صحیح ہے۔"

اسے پھوپھو کا مشورہ پسند آیا تھا' اور اس نے فوراً ہی ایک انسٹیٹیوٹ میں ایڈمیشن لے لیا' جہاں یہ سارے کورس تھے۔ وہاں اس کی دوستی عفیرا سے ہو گئی تھی۔ عفیرا کی مما ایک بوتیک چلاتی تھیں۔ والد کی وفات ہو چکی تھی۔ کبھی کبھار وہ فیشن شو بھی منعقد کرواتی تھی۔ عفیرا نے اسے بتایا تھا' کہ آج کل وہ کسی گارمنٹ فیکٹری کی طرف سے فیشن شو کی تیاری کر رہی ہیں۔ عفیرا نے اسے اس فیشن شو میں حصہ لینے پر اکسایا۔

"یار! میں نے مما سے تمہاری اتنی تعریف کی ہے کہ وہ تو بن دیکھے ہی تم پر عاشق ہو گئی ہیں۔"

"مگر میں نے پہلے تو کبھی کسی فیشن شو میں شرکت نہیں۔"

"تو اب کر لو نا یار! میں بھی حصہ لے رہی ہوں۔ سچ بہت مزا آتا ہے۔ میں نے پہلے بھی حصہ لیا ہے۔"

"اچھا' میں پھوپھو سے پوچھوں گی۔"

"جلدی پوچھ کر آنا پلیز۔"

وہ تھوڑی سی بھلکڑ تھی' اس لئے اسے یاد ہی نہیں رہا پھوپھو سے پوچھنا اور اگلے روز انہیں اچانک فیصل آباد جانا پڑ گیا' جہاں ان کی چھوٹی نند رہتی تھیں۔

"عرفی کی پھوپھو کی طبیعت بہت خراب ہے ملائکہ! اور مجھے فیصل آباد جانا ہے۔ تم ذرا اپنے دو چار جوڑے رکھ لو بیگ میں' یہاں تنہا کیسے رہو گی۔"

وہ اٹھی' وارڈ روب کھولے کچھ دیر کھڑی رہی' اور پھر اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کون سے کپڑے اور کیا کیا بیگ میں رکھے۔

"میرا جانا کیا ضروری ہے؟" وہ واپس بیڈ پر لیٹ کر میگزین دیکھنے لگی۔

پھوپھو آئیں تو انہیں حیرت ہوئی۔

"تم تیار نہیں ہوئیں بٹیا۔"

"پھوپھو! اگر میں گھر پر ہی رہوں تو۔"

"ہاں ہاں بے شک رہ لو۔"

وہ تو اس کے خیال سے ہی کہہ رہی تھیں کہ اکیلے میں گھبرائے گی۔ ایسی ہی تو تھی وہ۔

"رقیہ ہے نا' ملازم سب پرانے ہیں۔ میں رقیہ سے کہہ دیتی ہوں' وہ تمہارے کمرے میں

ہی سوئے گی۔ دو دن کی تو بات ہے۔"

"ٹھیک ہے پھوپھو! آپ بے فکر ہو کر جائیں۔" اور پھوپھو کے جانے کے بعد عفیرا آدھمکی۔

"تم نے پوچھا؟"

"نہیں۔"

"تو اب پوچھ لو۔"

"مگر وہ تو فیصل آباد چلی گئی ہیں۔ دو دن تک آئیں گی۔"

"مگر ماما نے تو آج فائنل کرنا ہے۔ میں تو تمہیں لینے آئی تھی' اور یوں بھی تمہاری پھوپھو تو ہر بات مانتی ہیں تمہاری' منع نہیں کریں گی۔"

اور وہ عفیرا کے ساتھ اس کی ماما کے پاس چلی آئی۔ انہوں نے اسے پسند کیا۔ پھوپھو کو فیصل آباد میں زیادہ دن لگ گئے' کیونکہ ان کی نند کا انتقال ہو گیا تھا۔ وہ عفیرا کے ساتھ انسٹیٹیوٹ سے اس کی ماما کے بوتیک میں چلی جاتی تھی۔ اسے مزا آ رہا تھا اس ریہرسل میں۔ پھوپھو سے فون پر بات ہو جاتی تھی۔ وہ تقریباً روز ہی اس سے فون کر کے خیریت پوچھتی تھیں' اور اسے پریشان نہ پا کر بہت اطمینان محسوس کرتی تھیں۔ انہوں نے عرفان کو بھی بتایا تھا کہ وہ ملائکہ کو کراچی ہی چھوڑ آئی ہیں۔"

"ارے مام وہ بونگی لڑکی! کہیں مارے خوف کے اس کا انتقال ہی نہ ہو جائے' اور کہیں وہ اتنے دنوں سے بھوکی ہی نہ بیٹھی ہو۔"

"مذاق نہیں عفی! ملکی بہت سمجھ دار ہے' اور اب وہ ننھی بچی نہیں ہے۔ ماسٹرز کر چکی ہے۔"

"چلیں' آپ کہتی ہیں تو مان لیتا ہوں۔ بعد میں Experience (تجربہ) بھی ہو جائے گا۔" وہ خوش دلی سے بولا تھا۔

گو وہ ملائکہ کی طرف سے مطمئن تھیں' پھر بھی وہ دسویں کے بعد سب کے روکنے کے باوجود واپس آ گئیں۔ ملائکہ بہت مطمئن اور خوش تھی' اس نے ان کے آتے ہی اپنی فیشن شو میں شرکت کے متعلق انہیں بتایا تو وہ ایک لمحہ کو چپ ہو گئیں' دو دن بعد اس فیشن شو کا انعقاد ہونا تھا۔ اب وہ کیا کہتیں' اور یوں بھی اپنی زندگی میں پہلی بار اس نے اپنی مرضی سے کوئی فیصلہ کیا تھا' وہ اسے بددل نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ سو انہوں نے "ٹھیک ہے" کہہ کر بات ختم کر دی۔

"آپ چلیں گی نا میرے ساتھ' میں دو گیسٹ لے جا سکتی ہوں۔"

"ہاں......"

وہ اس وقت بہت تھکی ہوئی تھیں۔ اس لئے مختصر بات کر کے اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ اتنے دن کی تھکن رنگ لائی تھی' اور انہیں ٹمپریچر ہو گیا تھا۔ اس لئے وہ ملائکہ کے ساتھ اس کے شو میں شرکت کیلئے نہ جا سکی تھیں۔ ملائکہ تو بہت پُرجوش ہو رہی تھی۔ اسے پھوپھو کے نہ جانے کا بہت افسوس تھا۔ شو بہت کامیاب رہا تھا' اور بقول عفیرا کے وہ تو پورے شو پر چھا گئی تھی۔ خوبصورتی' چہرے کی فطری معصومیت اور پھر ڈائیلاگ' ڈلیوری سب ہی کمال کی تھی۔ ڈائیلاگ تو ایک دو ہی تھے۔ چہرے کے ایکسپریشن کمال کے تھے۔

عفیرا کی مام ہر سال نئے انداز میں ہی فیشن شو منعقد کرواتی تھیں۔ اس بار پس پردہ میوزک کے ساتھ کہیں کہیں آدھ ڈائیلاگ بھی انہوں نے شامل کر لیا تھا۔ جس نے شو کو منفرد بنا دیا تھا۔ وہ عفیرا کے ساتھ مسرور سی کھڑی تھی۔ کچھ دیر پہلے اس کی مما اس کی بے انتہا تعریف کر کے گئی تھیں۔ میکسی نما ڈریس میں وہ اپسرا ہی لگ رہی تھی۔ یہ سب کچھ اس کے لئے بہت نیا اور خوش کن تھا۔ وہ سب کی توجہ کا مرکز تھی۔ آتے جاتے لوگ رک کر اسے دیکھتے' اور مسکراتے تھے' کئی نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں نے اس کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلائے تھے' جواباً اس نے بھی ہاتھ ہلا دیا۔

"میرا خیال ہے اب میں جاؤں۔" اس نے عفیرا سے اجازت چاہی۔

"پلیز تھوڑا رکو نا۔ مما کو آ جانے دو۔ وہ دراصل فوراً ہی فنکاروں کو ان کی پے منٹ کر دیتی ہیں۔ یہ ان کا اصول ہے۔"

"پھوپھو پریشان ہوں گی۔"

"اچھا' تم رکو میں مما کو دیکھتی ہوں۔"

عفیرا چلی گئی تو اچانک ہی وہ دونوں اس کے پاس آ کھڑے ہوئے تھے۔ ایک مرد اور ایک عورت' عورت نے گہرا میک اپ اور بھڑکیلا لباس پہن رکھا تھا۔ گہرا جامنی رنگ' لیکن اس کی بے حد سفید رنگت پر یہ رنگ برا نہیں لگ رہا تھا۔

"ہم تمہیں بہت دیر سے ڈھونڈ رہے تھے' تم...... تمہارا نام ملائکہ ہے' ملائکہ محب اللہ خان۔"

اس شخص نے پوچھا۔

"یہ تمہارا اصلی نام ہے۔"

"ہاں......" اس نے حیرت سے دونوں کو دیکھا۔

عفیرا کے ماما نے اس کا تعارف اسٹیج پر اسی نام سے کروایا تھا۔

"تمہارا باپ کیا کرتا ہے؟"

عورت بہت دلچسپی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ خوبصورت تھی' لیکن اس کا لہجہ گنوار تھا۔

"پپا تو باہر ہوتے ہیں کینیڈا۔"

"اور تم......" وہ بہت بے تابی سے سوال کر رہی تھی۔

"میں پھوپھو کے ساتھ رہتی ہوں۔"

"تمہارے باپ نے تمہیں یہاں کیوں چھوڑ دیا' بہن کے پاس؟"

"دیکھئے' آپ یہ سب مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہیں؟" ملائکہ نے ناگواری سے اسے دیکھا۔

"میری والدہ نہیں ہیں...... میری پھوپھو نے مجھے پالا ہے۔"

"تیرے باپ نے شادی کر لی ہوگی دوسری' ہے نا۔" وہ ہنسی اور مرد کی طرف دیکھا۔

"یہ اپنی ملکی ہی ہے' صادق تو صحیح کہہ رہا تھا۔"

"تمہاری والدہ کا نام کیا تھا؟"

مرد کی نظریں اس پر تھیں۔

"سلطانہ......" بے اختیار ہی اس کے لبوں سے نکلا۔ پہلی بار پھوپھو کے لبوں سے یہ نام سنا تھا اور جانے ذہن کے کس کونے میں محفوظ رہ گیا تھا۔

"ہائے میری بچی! میں ہوں تیری بدنصیب ماں۔" عورت نے ایک دم بڑھ کر اسے گلے لگا لیا۔" اور یہ تیرا ماموں ہے۔"

عورت سے الگ ہو کر وہ حیران سی اسے دیکھنے لگی۔ یہ عورت اس کی ماں تھی' لیکن اس کے دل میں کوئی جذبہ نہیں ابھرا تھا۔ یہ عورت اسے چھوڑ گئی تھی' اس وقت جب وہ بالکل ننھی سی تھی۔ حالانکہ اس وقت اسے ماں کی گود اور محبت کی ضرورت تھی' لیکن وہ کیوں چھوڑ گئی تھی اسے' پھوپھو نے کوئی تفصیل نہیں بتائی تھی۔

"آپ مجھے چھوڑ کر چلی گئی تھیں اور اب اتنے سارے سالوں کے بعد......"

"وہ تو تیرے ماموں......"

"شانی......" مرد نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"میں بتاتا ہوں اسے ساری بات۔"

"بیٹا! تمہاری ماں کو تمہاری پھوپھو نے بسنے نہیں دیا کیونکہ تمہارے باپ نے اپنی پسند سے شادی کی تھی' اور بالآخر اس نے تمہاری ماں کو گھر سے نکال دیا۔ طلاق دلوائی اور تمہیں چھین لیا۔"

"نہیں۔" اس نے بے یقینی سے انہیں دیکھا۔

"آپ نے پھر کبھی مجھ سے ملنے کی کوشش نہیں کی۔"

"نہیں' ہم کئی بار آئے' لیکن چوکیدار نے ہمیں اندر نہیں گھسنے دیا۔ کیسا کیسا تڑپتی تھی یہ تمہارے لئے' راتوں کو جاگ کر روتی اور تجھے پکارتی تھی۔ ارے میں نے تو تیرے باپ کے قدموں پر گر کر اس سے کہا کہ بس تم سے ملنے کی اجازت دیدے' لیکن اس نے دھتکار دیا۔"

"نہیں' بھلا بابا اور پھوپھو اتنے ظالم ہو سکتے ہیں۔" پھوپھو تو اتنی نرم دل ہیں۔" وہ متذبذب سی کھڑی انہیں دیکھ رہی تھی' تب ہی عفیرا آ گئی۔ اس کے ساتھ ایک نوجوان تھا۔

"یار! مما تو بہت مصروف ہیں' تم چلی جاؤ' تمہارا ڈرائیور انتظار کر رہا ہے۔ کل آؤں گی میں تمہاری طرف پھر انسٹیٹیوٹ میں دو دن بعد ملاقات ہوگی' اور ہاں ان سے ملو سلیمان واسطی صاحب ہیں' تم سے ملنا چاہ رہے تھے۔ ایک بہت بڑی ایڈورٹائزنگ کمپنی کے مالک ہیں۔"

"مس! میں آپ سے یہ پوچھنا چاہ رہا تھا کہ آپ کو ماڈلنگ سے کوئی دلچسپی ہے۔"

"جی نہیں۔" اس نے حیرت بھری معصومیت سے اس کی طرف دیکھا۔

"اوہ......" وہ مسکرایا۔

"دراصل آپ کی پرفارمنس بہت زبردست تھی' اور آپ کی فیس بیوٹی کے تو کیا ہی کہنے۔ میں چاہ رہا تھا کہ آپ کو ماڈلنگ کی آفر کروں۔ ہماری کمپنی کے ایڈ بہت مقبول ہوتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا ٹی وی فیری لان اشتہار۔ فیری لان کا اشتہار تو اسے بہت پسند تھا۔ ململ سے ڈریس میں فضا میں تیرتی ہوئی سی وہ لڑکی۔"

"ہاں ہاں' بہت خوبصورت ہے۔" اس کی آنکھوں میں اشتیاق اتر آیا۔

"تو پھر آپ کل مجھ سے میرے آفس میں ملئے۔" اس نے وزیٹنگ کارڈ نکال کر اس کی طرف بڑھایا' تو اس نے جھجکتے ہوئے کارڈ پکڑ لیا۔

"تو میں امید رکھوں کہ میرے اگلے ایڈ کی ماڈل آپ ہوں گی۔"

"نہیں...... وہ...... پتا نہیں' پھوپھو اجازت دیں گی' یا نہیں۔ وہ تو انہوں نے شاید میرا اس فیشن شو میں بھی شرکت کرنا پسند نہیں کیا۔"

"ارے گولی مارو پھوپھو کو۔" سلطانہ نے کہا۔

"ایسا گولڈن چانس ہے، میں ہوں اس کی ماں۔" اس نے سینے پر ہاتھ رکھا۔

"اور میں اسے اجازت دے رہی ہوں۔" سلیمان واسطی کی آنکھوں میں حیرت اتر آئی۔

"آپ...... آپ غالباً شانی ہیں، سٹیج اداکارہ؟"

"فلموں میں بھی کام کیا ہے میں نے۔"

"ہاں، شاید میرا اتنا علم نہیں ہے۔"

"بہرحال مس ملائکہ! میں آپ کا انتظار کروں گا۔" وہ واپس مڑ گیا۔ عفیرا بھی اسے چھوڑ کر جا چکی تھی۔ ایک بار پھر وہ ان دونوں کے ساتھ تنہا کھڑی تھی۔

"دیکھ چندا! یہ چانس مس نہ کرنا۔" عورت نے اسے گلے لگایا۔ "تیری پھوپھو نے آئیں بائیں شائیں کی تو کہہ دینا کہ تم اپنی مرضی کی مالک ہو، اور یہ ہوٹل ہے نا سٹیشن کے پاس علی بابا ہوٹل، وہاں ٹھہرے ہوئے ہیں ہم، دیکھ کل ملنے ضرور آنا۔ ہائے میں تو تیرے لئے جلی ہوئی تھی۔"

وہ خاموشی سے پارکنگ کی طرف بڑھ گئی تھی۔ ذہن الجھا ہوا تھا۔ یہ عورت اس کی ماں تھی، لیکن ماں نہیں لگتی تھی اور بابا کے ساتھ اس کا تو کوئی جوڑ تھا ہی نہیں، پھر بابا نے اس سے شادی کر لی تھی۔ پھوپھو صحیح تو کہتی ہیں کہ مزاج نہیں ملا۔ بابا تو بہت سوبر ہیں۔

وہ بہت تھکی ہوئی تھی، اس لئے پھوپھو سے زیادہ بات کئے بغیر سو گئی، لیکن صبح ناشتے پر اس نے ساری تفصیل پھوپھو کو بتا دی۔

"سلطانہ ملی تھی تمہیں؟"

"ہاں۔" اس کا اطمینان قابلِ دید تھا۔ وہ چھوٹے چھوٹے لقمے توڑ توڑ کر منہ میں ڈال رہی تھی۔

"وہ کہہ رہی تھیں کہ آپ نے انہیں طلاق دلوائی ہے، اور مجھے چھین لیا ان سے۔"

"ایسا نہیں ہے بیٹا!" انہوں نے بمشکل ضبط کیا۔

"وہ جھوٹ بول رہی ہے۔ تمہارے بابا نے اسے اجازت دے دی تھی کہ وہ تمہیں لے جائے، اور طلاق بھی میں نے نہیں دلوائی تھی۔ میں بھلا کیوں بھائی کا گھر اجاڑتی۔" ان کا رنگ سرخ ہو رہا تھا، اور آنکھوں میں نمی تھی۔

"خیر میں نے ان کی باتوں پر یقین نہیں کیا تھا، بلکہ مجھے تو حیرت ہوئی کہ بابا نے ان سے شادی کیوں کر لی تھی۔ بابا کے اور ان کے سٹیٹس میں بہت فرق لگ رہا تھا مجھے۔"

"ہاں، قسمت......" انہوں نے ملائکہ کی پوری بات سن کر اطمینان بھری سانس لی۔

اس روز وہ بہت خوش تھی، اس لئے دن بھر چہکتی رہی۔ ٹی وی دیکھتی رہی۔ شام کو عفیرا شو کی مووی لے کر آئی تو پھوپھو کے ساتھ بیٹھ کر اسے دیکھا، اور بہت خوش ہوئی۔

"اچھی لگ رہی ہوں نا۔" اس نے پھوپھو سے تصدیق چاہی۔

"ہاں، بہت خوبصورت لگ رہی ہو۔"

"ہاں سب نے ہی میری بہت تعریف کی اور وہ......" اسے اچانک یاد آیا۔

"ایک شخص نے مجھے ماڈلنگ کی بھی آفر کی۔"

"نہیں بیٹا!" ان کے لبوں سے بے اختیار نکلا۔ "ہماری فیملی کی لڑکیاں ماڈلنگ وغیرہ نہیں کرتیں۔ میں نے تمہیں شو میں شرکت کرنے پر کچھ نہیں کہا کہ چلو ایک بار شوق پورا کر لیا ہے، اب کہنے کا فائدہ بھی نہیں تھا، لیکن ماڈلنگ ہرگز نہیں، تم منع کر دو۔"

فضا میں تیرتی ہوئی وہ حسین ماڈل۔

دل میں گدگدی سی ہوئی۔ "کیا ہی اچھا ہوتا کہ میں بھی......"

"اس میں کیا حرج ہے پھوپھو! وہ کہہ رہے تھے واسطی صاحب کہ اچھے خاندانوں کی لڑکیاں بھی اس فیلڈ میں آ رہی ہیں۔"

"آتی ہوں گی، لیکن ہمارے خاندان کی نہیں۔ تمہارے بابا بہت ناراض ہوں گے، اور عرفی بھی پسند نہیں کرے گا۔"

"اچھا۔" وہ مایوس ہوگئی۔ وہ پھوپھو کی خواہش جانتی تھی کہ پھوپھو اسے اپنی بہو بنانا چاہتی ہیں۔ گو عرفان نے اس حیثیت سے کبھی کوئی بات نہیں کی تھی۔ وہ زیادہ تر اپنی پڑھائی اور پھر جاب میں مصروف ہو گیا تھا۔

کھانے کی ٹیبل پر، ناشتے پر، ٹی وی لاؤنج میں گفتگو ہوتی رہتی تھی، لیکن عرفان نے کبھی کوئی چھچھوری بات نہیں کی تھی، اور نہ ہی کبھی کوئی ڈائیلاگ بولے تھے، لیکن پھر بھی وہ اس کے لئے اپنے دل میں ایک خاص جذبہ محسوس کرتی تھی۔ پھوپھو سے تو کئی بار بچپن میں وہ ضد بھی کر لیتی تھی، لیکن عرفان کی بات مان لیتی تھی۔

"عرفان بھی پسند نہیں کرے گا، پھوپھو ٹھیک کہتی ہیں۔" اس نے خود کو مطمئن کر لیا، اور ناول لے کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اسے کہانیاں اور ناول پڑھنا بہت پسند تھا۔ پھوپھو خاصی ڈسٹرب تھیں۔ انہوں نے فوراً محب اللہ سے بات کی، تو انہوں نے پوری بات سنی۔

"اگر وہ یہاں گھر پر آ گئی ملنے تو؟"

"تو ملنے دیجئے گا' وہ بہرحال اس کی ماں ہے۔"

"اور اگر ملائکہ نے اس کے ساتھ جانے کی بات کی تو؟"

"ملائکہ ایسی نا سمجھ نہیں ہے۔ آپ کو اپنی تربیت اور محبت پر یقین نہیں ہے کیا۔" انہوں نے انہیں تسلی دی۔

"لیکن ماں ہے وہ اس کی' جنم دیا ہے اس نے اسے۔ ماں کی محبت کی ہوک تو ہوتی ہے نا محبت! اور پھر سلطانہ پر مجھے اعتبار نہیں ہے' وہ کہیں بچی کو ورغلا نہ لے۔"

"لیکن آپا! ہم اس کے حق کو چیلنج تو نہیں کر سکتے نا۔" لیکن ان کے تسلی دینے کے باوجود وہ سارا دن مضطرب سی رہیں' اور مسلسل دعا مانگتی رہیں کہ سلطانہ پھر دوبارہ ملائکہ سے ملنے کی کوشش نہ کرے' لیکن سلطانہ نے تو پتا نہیں شام تک کا وقت کیسے گزارا تھا۔

"سونے کی چڑیا ہے تیری بیٹی شانو! اب ہاتھ سے نہ نکلنے دینا۔ تو تو ہیروئن نہیں بن سکی' پر یہ بن جائے گی۔" صادق نے اسے سمجھایا تھا۔

"میرے ہاتھ میں کب ہے۔"

"لے لے نا ہاتھ میں' بیٹی ہے تیری اور پھر بڑی بھولی بھالی سی ہے۔ دیکھا تھا کیسی شاندار گاڑی میں بیٹھ کر آئی تھی۔ میں نے کہا تھا نہ تجھ سے کہ تیری بیٹی بچ گئی تو یہاں رہ کر زیادہ فائدہ پہنچا سکتی ہے تجھے۔ تو نے دیکھا تھا' سنا تھا۔ میڈم نے اس کا تعارف کرواتے ہوئے بتایا تھا کہ کتنی پڑھی لکھی ہے۔ آج کل انڈسٹری میں بھی پڑھی لکھی ہیروئنوں کی مانگ ہے۔"

"ہاں......" سلطانہ کو صادق کی بات سمجھ میں آ گئی تھی۔ خود سلطانہ ان دنوں خاصی تنگی میں گزارا کر رہی تھی۔ محب اللہ سے طلاق لے کر کچھ دن تو خوب عیش کیے۔ نذیر سے شادی کر لی۔ سٹیج پر گانے بھی گائے' جو کامیاب بھی ہوئے۔ عام طبقے نے پسند کیے' لیکن ان ہی دنوں تھائی رائیڈ کا آپریشن کروانا پڑا۔ تھائی رائڈ کی تکلیف کافی عرصہ سے تھی۔ اب آپریشن ناگزیر تھا' اور آپریشن نے اس کی آواز کو بہت متاثر کیا تھا۔ بڑی بھدی آواز ہو گئی تھی۔ گو ڈاکٹر نے کہا تھا' کہ کچھ عرصہ بعد آواز ٹھیک ہو جائے گی' لیکن ایسا نہ ہو سکا تھا۔ عین اس وقت جب اس کی اور نذیر کی جوڑی سٹیج پر دوگانوں میں مقبول ہو رہی تھی' یہ مسئلہ ہو گیا تھا۔

تب نذیر اور صادق کے مشورے پر اس نے فلموں میں ہیروئن بننے کے خواب دیکھنے شروع کر دیے۔ دو تین فلموں میں ایکسٹرا کا کردار بھی ملا' لیکن وہ ہیروئن نہ بن سکی تھی' اور محض سٹیج

کی تیسرے درجے کی اداکارہ بن کر رہ گئی تھی۔ نذیر بھی اِدھر اُدھر منہ مارتا رہتا تھا' جس مقصد کے لئے اس نے سلطانہ سے شادی کی تھی' وہ مقصد پورا نہیں ہوا تھا' تو سلطانہ کا عشق بھی ہوا ہو گیا تھا' اور سلطانہ صادق کے ساتھ مختلف سٹوڈیوز کے دھکے کھاتی رہتی تھی۔ جتنے روز سٹیج پر کوئی ڈرامہ چلتا رہتا تھا' نذیر کا موڈ بھی صحیح رہتا تھا۔ ان کے درمیان جھگڑے کی بڑی وجہ صادق تھا۔ نذیر کہتا تھا کہ تم جو کماتی ہو' وہ صادق کو کھلا دیتی ہو' جبکہ تمہاری کمائی پر پہلا حق میرا ہے۔"

"اور تم بھی تو اپنی کمائی باہر اڑا آتے ہو۔" سلطانہ بھی دوبدو جواب دیتی۔

"تمہاری وجہ سے میری زندگی خراب ہوئی ہے۔ اچھی بھلی محل میں رہتی تھی' گاڑیوں میں گھومتی تھی' ہزاروں خرچ کرتی تھی۔"

"میری وجہ سے نہیں' صادق کے لالچ کی وجہ سے۔"

وہ بھی سب کچھ کھول کر رکھ دیتا تھا۔ زندگی بس یوں ہی گزر رہی تھی۔ گلشن والا فلیٹ فروخت کر کے صادق نے چند دن میں رقم برابر کر دی تھی۔ نذیر سے شادی تو بعد میں ہوئی تھی۔ وہ سلطانہ کو لے کر لاہور آ گیا تھا' کہ یہاں اکیلی رہ کر کیا کرے گی' پھر سارے سٹوڈیو تو لاہور میں ہیں۔ یہاں رہ کر ہیروئن نہیں بن سکے گی۔

تین چار دن قبل وہ اپنے تھیٹر کے ساتھ کراچی آئی تھی' جس میں نائیکہ کا کردار ملا تھا۔ اس گھٹیا سے تیسرے درجے کے ہوٹل میں وہ ٹھہری ہوئی تھی۔ صادق بھی اسی تھیٹر میں کوئی معمولی کام کر رہا تھا' جبکہ نذیر لاہور میں ہی تھا۔ دو چار روز میں وہ کسی میلے میں جانے والا تھا۔

"دیکھ سب کچھ صادق کے حوالے نہ کر دینا۔" جاتے جاتے اس نے تاکید کی تھی۔

اور یہاں قسمت کی دیوی کیسے مہربان ہو گئی تھی اس پر' جس ملائکہ کے متعلق اس کا خیال تھا کہ وہ مر کھپ چکی ہو گی' وہ کتنی خوبصورت ہو گئی تھی۔

"کیسی شہزادی کی طرح لگ رہی تھی' ہے نا صادق۔"

"ہاں ہاں۔" وہ سوچ میں ڈوبا ہوا تھا کہ کیسے اسے قابو میں کرے۔

"جانتی ہے' یہ ماڈل لڑکیاں ایک ایڈ کے کتنے پیسے لیتی ہیں' لاکھوں روپے' ایک عام سی ماڈل بھی پچاس ہزار سے کم تو کیا لیتی ہو گی۔"

"ہائے میں مر گئی۔" اس نے سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔

"بس کر لے کسی طرح ہاتھ میں اپنی چڑیا کو۔ تیری بیٹی ہے' وہ کون ہوتی ہے اس پر قبضہ کر کے بیٹھنے والی' اور پھر......" وہ دل ہی دل میں مسکرایا۔

"اکلوتی بیٹی ہے' ساری جائیداد کی مالک......عیش ہو جائیں گے شانی۔"

"ارے کیا پتا' اب تک کتنی اولادیں اور پیدا کر چکا ہوگا۔ زیادہ لمبے خواب نہ دیکھ تو۔"

"پھر بھی کچھ تو اس کو ملے گا نا۔"

❋❋❋

وہ دونوں سیدھے ہوٹل سے سلیمان واسطی کے پاس گئے تھے' لیکن ملائکہ وہاں نہیں آئی تھی۔

"اب......" دونوں نے اس کی طرف دیکھا۔

"چل اس کی پھوپھو کے گھر چلتے ہیں' اس سے ملنے۔"

"وہ ملنے دے گی۔"

"روک کے تو دیکھے' بیٹی ہے تیری۔" صادق نے حوصلہ دیا۔

"لیکن وہ جو اشٹام پر لکھ کر دیا تھا۔" سلطانہ ڈر رہی تھی۔

"تو چل۔" اور جب وہ دونوں "قصر عرفان" میں پہنچے تو ان کے خدشے بے بنیاد ہی نکلے۔

"میں اپنی بیٹی سے ملنے آئی ہوں۔" کسی قدر گھبرائے لہجے میں سلطانہ نے آیا سے کہا' تو وہ خاموشی سے ڈرائنگ روم سے نکل گئیں۔

ملائکہ سو رہی تھی' انہوں نے اسے جگایا۔

"تمہاری امی آئی ہیں ملنے۔"

"کیوں......؟" اس نے مندی مندی آنکھوں سے انہیں دیکھا۔

"پتا نہیں......" پھوپھو بے حد سنجیدہ تھیں۔

"تو مل لوں؟"

"ہاں......" انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"بابا اور عرفان ناراض تو نہیں ہوں گے؟" آنکھوں میں بچپنا اور معصومیت لئے انہیں دیکھ رہی تھی۔

"تمہارے بابا تو شاید کچھ نہ کہیں' ہاں عرفان کا نہیں پتا مجھے' کیا کہے گا۔"

"تو نہ ملوں؟" وہ سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھنے لگی۔

"اب آئی ہے تو مل لو۔ ماں ہے تمہاری۔"

بادل نخواستہ انہیں کہنا پڑا۔ اسے ڈرائنگ روم میں بھیج کر وہ اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

وہ اس عورت کا سایہ تک اس پر پڑنے نہیں دینا چاہتی تھیں' لیکن بہرحال وہ اس کے ماں ہونے کے حق کو چیلنج نہیں کر سکتی تھیں۔ سلطانہ بڑی بے تابی سے اس سے ملی۔

"میں رات بھر سو نہیں سکی۔" دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ لئے وہ والہانہ انداز میں اسے دیکھ رہی تھی۔ صادق نے تعریفی انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ اس وقت وہ غضب کی اداکاری کر رہی تھی۔ کبھی اس کے ہاتھ چومتی' کبھی پیشانی' کبھی آنکھوں میں آنسو بھر لاتی۔

"ایسی اداکاری کسی فلم میں کرتی' تو آج ہیروئن ہوتی۔" صادق نے دل ہی دل میں سوچا۔ ملائکہ متاثر لگ رہی تھی۔

"اچھا پلیز اب مت روئیں۔ آپ کی غلطی تھی نہ چھوڑ کر جاتیں مجھے۔"

"بتایا تو تھا تیری اس پھاپھا کٹنی پھوپھی نے چھین لیا تجھے۔ پھر میں نے بھی سینے پر پتھر رکھ لیا کہ تیرے ماے کے گھر میں تو بس دو وقت کی سوکھی روٹی ہی تھی۔ یہاں تو عیش سے پلتی' تیرا حق تھا نا یہاں کی ہر چیز پر۔"

وہ کوئی گھنٹہ بھر بیٹھی تھی۔ رات کو اسے تھیٹر میں جانا تھا۔

"دیکھ جتنے دن میں یہاں ہوں مجھے ملنے آیا کرنا۔ میں اپنی پیاس بجھا لوں گی۔ ہائے برسوں کی تشنگی ہے ملائکہ۔"

"اچھا......" اس نے سر ہلا دیا۔

"ضرور آنا' میں روز تو ادھر نہیں آؤں گی۔ کیا پتا کسی روز تیری پھوپھی چونڈے سے پکڑ کر باہر نکال دیں' اور ہاں......"

جاتے جاتے صادق نے کہا۔

"پھوپھو نے اجازت نہیں دی ماڈلنگ کی۔"

"ارے کیسے اجازت نہیں دے گی۔" سلطانہ چمک کر بولی۔

"تو بالغ ہے' اپنی مرضی کی مالک ہے۔ ایسا گولڈن چانس پھر نہیں ملے گا تجھے لکی۔ میری بات مان لے' واسطی صاحب سے مل لے۔ ابھی تو فوٹو سیشن ہوگا' پھر کیا پتا تو سلیکٹ بھی ہو گی یا نہیں۔"

"میرے ساتھ آنا کل میں خود لے چلوں گی۔"

وہ کچھ بولی نہیں۔ ناخن دانتوں سے کترتے ہوئے وہ چپ چاپ انہیں دیکھتی رہی۔

"آپ کیسے آئے؟ گاڑی ہے آپ کے پاس۔"

"ارے میرے پاس گاڑی کہاں سے آتی۔" سلطانہ کے لہجے کی تلخی اس سے چھپی نہ رہ سکی۔

"میں ڈرائیور سے کہتی ہوں وہ چھوڑ آتا ہے آپ کو۔"

"رہنے دے تیری پھوپھی کو برا لگے گا۔"

"نہیں لگے گا اماں! آپ بے فکر رہیں۔"

اور اس روز وہ دیر تک سلطانہ کے متعلق سوچتی رہی۔ یہ عورت اس کی ماں تھی' اگر بابا میں اور اس میں علیحدگی نہ ہوتی تو آج یہ عورت بھی ان کے ساتھ رہتی ہوتی کینیڈا میں یا یہاں بابا کے اس بڑے سارے گھر میں۔ اسے سلطانہ پر بہت ترس آیا۔ جو اولاد کے ساتھ ساتھ ہر آسائش سے محروم تھی۔ اس کے جسم پر موجود لباس پر گو موتی اور ستارے جڑے تھے' لیکن وہ انتہائی کم قیمت تھا۔ ایسا لباس تو رقیہ بی کو بھی پسند نہ آتا۔ پھوپھی نے اماں کے متعلق اس سے کوئی بات نہ کی تھی۔ اگلے روز انسٹیٹیوٹ میں اس نے عفیرا سے پوچھا۔

"عفی! اگر تمہارے پاس بہت پیسہ ہو' اور تم آسائش کی زندگی گزار رہی ہو' جب کہ تمہاری ماں تم سے الگ کہیں اور تنگ دستی کی زندگی گزار رہی ہو تو......"

"میں اس کی ہر ممکن مدد کروں گی۔" عفیرا نے بلا جھجک کہا۔ "تم نہیں جانتیں کیا ماں کے کتنے حقوق ہوتے ہیں۔ ہم تو ساری زندگی اس کی خدمت کرتے رہیں تو اس کا حق ادا نہیں کر سکتے۔"

"دراصل......" اس نے عفیرا کو ساری بات بتا دی۔

"تو تمہیں اپنی امی کی مدد کرنا چاہیے ملائکہ! بلکہ ہاں......" اسے یاد آیا۔

"یہ مما نے دیا تھا' چیک ہے بیس ہزار کا۔"

اس نے پرس سے لفافہ نکالا۔

"یہ کس بات کا......؟"

"بھئی' اس فیشن شو میں شرکت کا معاوضہ۔"

"اچھا۔"

اسے حیرت ہوئی اس نے تو یونہی عفیرا کی دوست کی حیثیت سے اس میں شرکت کی تھی' اور اسے بالکل بھی نہیں پتا تھا کہ اس طرح اتنی رقم ملے گی۔

"تم بہت بھولی ہو ملائکہ! بڑے فنکاروں کو تو مما اس سے زیادہ معاوضہ ادا کرتی ہیں۔ کوئی مفت میں تھوڑا ہی شرکت کرتے ہیں یہ لوگ۔"

"تو پھر یہ بیس ہزار میں انہیں دے دیتی ہوں۔"

"ضرور......"

عفیرا نے تائید کی۔

یوں تو بابا اس کے اکاؤنٹ میں ہر ماہ کچھ نہ کچھ بھیجتے رہتے تھے' لیکن اسے کبھی ضرورت ہی نہیں پڑی تھی رقم نکلوانے کی۔ پھوپھو اس کی ہر ضرورت پوری کر دیتی تھیں۔ فی الحال یہ دے دیتی ہوں۔ میں اکاؤنٹ سے بھی کچھ نکال کر دے دوں گی۔" انسٹیٹیوٹ سے وہ سیدھی علی بابا ہوٹل آئی تھی۔

"اور کسی سے ملنا ہے بی بی!"

ڈرائیور نے پوچھا' تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ صادق اسے ہال میں ہی بیٹھا چائے پیتا نظر آ گیا تھا۔

"ہاں ہاں تیری اماں اوپر ہے کمرے میں' تیرے غم میں پڑی ہے۔ رات سے کچھ کھایا ہی نہیں۔"

وہ اس کے ساتھ سیڑھیاں چڑھ کر اس کمرے تک آئی' جہاں سلطانہ ابھی تک سو رہی تھی۔ رات بارہ بجے شو کے بعد جو تھک کر لیٹی تھی' تو ابھی تک خواب خرگوش کے مزے لے رہی تھی۔

"شانی اٹھ کر دیکھ کون آیا ہے؟"

صادق نے کندھوں سے پکڑ کر اسے جھنجھوڑ ڈالا۔

اور پھر ایک ملاقات کئی ملاقاتوں کا پیش خیمہ بن گئی تھی۔ وہ تقریباً روز ہی ان سے ملنے چلی آتی۔ اس بیس ہزار کے علاوہ بھی اس نے بہت بڑی رقم ماں کو دی تھی' اور اس کے بے حد اصرار پر وہ اس کے ساتھ سلیمان واسطی سے بھی نہ صرف ملی تھی' بلکہ فوٹو سیشن کے بعد ماڈلنگ کرنے کی ہامی بھی بھر لی تھی۔ ڈرائیور نے اس کے ہر روز ہوٹل جانے کے متعلق پھوپھو کو بتا دیا' تو اس نے صاف کہہ دیا کہ وہ اپنی اماں سے ملنے جاتی ہے۔

"وہ یہاں پر بھی تو تم سے مل سکتی ہے ملائکہ!" پھپھو ششدر رہ گئی تھیں۔

"ہاں' لیکن وہ روز روز یہاں نہیں آ سکتیں۔" اس نے بے نیازی سے کہا' تو وہ حیران سی اسے دیکھتی رہ گئیں۔ یہ چند ہی دنوں میں اس میں کیسی تبدیلی آئی تھی۔ صادق اور سلطانہ نے اس

کی ٹھیک ٹھاک برین واشنگ کر دی تھی۔ ان کے تھیٹر کے لوگ واپس لاہور چلے گئے تھے' لیکن وہ وہیں ہی رک گئے تھے۔ ادھر نذیر کے فون پر فون آ رہے تھے۔

''کیا کوئی خزانہ مل گیا ہے۔ واپس آ جا اب۔ مجھے میلے میں جانا ہے' تو بھی ساتھ چلنا۔''

''تو چلا جا' میں نہیں جانے کی۔''

صادق کی بھی نوکری کا مسئلہ تھا' بالآخر وہ جانے کیلئے تیار ہو گئے۔

''میں بھی چلوں آپ کے ساتھ؟'' ملائکہ نے پوچھا۔ ان دنوں وہ پھوپھی سے بہت کبیدہ خاطر ہو رہی تھی۔

''ارے نہیں چندا!'' صادق نے فوراً کہا۔ ''تو بس یہیں رہ' ہم اتنے ظالم نہیں ہیں۔ تری پھوپھی نے ماں بن کر پالا ہے تجھے۔ شانی کا کیا ہے پہلے بھی تو تیرے بغیر ہی رہتی تھی' بس تو ہم سے ربطہ رکھنا۔''

''اچھا......'' ملائکہ کو اس سے وہ بہت عظیم لگے۔

''تو نے صادق ایسا کیوں کیا؟'' اس کے جانے کے بعد اس نے پوچھا۔

''اس کے یہاں رہنے میں فائدہ ہے خلے! ابھی کیا ہے وہ ذرا اس کا اشتہار آنے دے۔ واسطی صاحب کو بڑا یقین ہے کہ وہ راتوں رات مشہور ہو جائے گی۔''

''پھر کیا ہم اسے لے چلیں گے؟'' سلطانہ نے اشتیاق سے پوچھا۔

''کہاں رکھے گی اس دو کمرے کی کھولی میں۔ یہیں رہنے دے اسے۔'' صادق کے ذہن میں جانے کیا تھا' وہ ہمیشہ دور کی کوڑی لاتا تھا۔ سلطانہ اس کی معترف تھی۔ لہٰذا چپ ہو گئی۔

❋ ❋ ❋

ملائکہ اس کے جانے سے اداس تھی۔ اسے پھوپھو ایک دم بری لگنے لگی تھیں۔ اسے اماں کی بتائی ہوئی ہر ہر بات پر یقین تھا کہ غربت کی وجہ سے اس کی ماں پر بہت ظلم ہوا' اور اس ظلم میں پھوپھو کا ہاتھ تھا' ورنہ بابا تو ایسے نہ تھے۔ اس کے کورس مکمل ہو چکے تھے۔ ڈرائیونگ لائسنس بھی مل گیا تھا۔

اس نے بابا کو بتایا تو انہوں نے پھوپھو سے کہا' کہ وہ اسے گاڑی لے دیں۔ سلطانہ لاہور جا چکی تھی۔ ملائکہ زیادہ تر گھر پر ہی رہنے لگی تھی۔ اشتہار کی شوٹنگ سلطانہ کی موجودگی میں ہی ہو چکی تھی۔ چنانچہ پھوپھو مطمئن ہو گئی تھیں' اور چاہتی تھیں کہ جلد از جلد اس کی شادی کر کے اسے عرفان کے ساتھ کینیڈا بھیج دیں۔ انہیں سلطانہ کے ساتھ اس کا میل جول ہرگز پسند نہ آیا تھا' اور اس سلسلے میں انہوں نے کئی بار عرفان سے بات بھی کی تھی۔

''بس امی جان! صرف چند ماہ کی بات ہے۔ آپ بس شادی کی تیاری کریں۔'' انہوں نے شوروم سے اس کی پسند کی گاڑی نکلوائی تھی' اور ملائکہ ان دنوں گاڑی پا کر بہت خوش تھی۔ اکثر ان سے پوچھ کر چلی جاتی۔ کبھی کبھار سلیمان واسطی کی طرف چلی جاتی۔ وہاں اسے بہت اچھا لگتا تھا' ہر شخص اس کی تعریف کرتا تھا۔ اس کی طرف متوجہ ہو جاتا تھا۔

پھر اس کا اشتہار آن ایئر ہو گیا۔

یہ وہ تھی۔ کتنی ہی دیر تک وہ حیران سی خود کو دیکھتی رہی۔ عجیب سی خوشی اور سنسنی اس کے وجود میں دوڑتی رہی۔ سلیمان واسطی نے سچ کہا تھا' اس نے ایک ہی رات میں شہرت حاصل کر لی تھی۔

کئی لوگوں نے اس کے ساتھ کانٹیکٹ کرنے کی کوشش کی' وہ اپنی اشتہاری فلم کے لئے اسے لینا چاہتے تھے' لیکن سلیمان واسطی نے ان سے کہہ دیا تھا' کہ وہ صرف اس کی کمپنی کے لئے کام کرے گی۔ وہ اس روز سیدھا اس کے گھر چلا آیا۔ نیا کنٹریکٹ سائن کروانے اور پچھلے

اشتہار کی رقم کا چیک دینے۔

وہ چیک ہاتھ میں لئے حیران سی بیٹھی تھی۔ جب پھوپھو ڈرائنگ روم میں داخل ہوئیں' نوکرانی نے بتایا تھا کے بی بی سے ملنے کوئی صاحب آئے ہیں' اور انہوں نے سوچا کہیں کم بخت صادق نہ ہو۔ اس لئے جلدی جلدی نماز ختم کر کے چلی آئیں۔

''یہ میری پھوپھو ہیں۔'' ملائکہ نے تعارف کروایا۔

''تشریف رکھئے' کیسے آنا ہوا۔''

انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے بیٹھنے کے لئے کہا۔

''بیگم صاحبہ! ملائکہ نے میرے ایک اشتہار میں کام کیا ہے۔ میں ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی کا مالک ہوں' اور میں انہیں اپنی ایک اور اشتہاری فلم کے لئے بک کرنا چاہتا ہوں۔''

وہ ہکا بکا سی اسے دیکھ رہی تھیں۔

''کیا مطلب...... ملائکہ! یہ صاحب کیا کہہ رہے ہیں؟''

''ملائکہ نے نظریں جھکا لیں۔

''دیکھئے صاحب!'' انہوں نے بمشکل اپنے غصے پر قابو پا کر دھیمے لہجے میں کہا۔

''ہم خاندانی لوگ ہیں اور ہمارے ہاں لڑکیاں ایسے شعبوں میں نہیں جاتیں' اور نہ ہی اسے پسند کیا جاتا ہے۔ اگر اس نے نادانی میں بغیر اجازت ایسا کام کیا ہے' تو آئندہ کے لئے میں معذرت خواہ ہوں۔''

سلیمان واسطی تو خود حیران تھا' وہ عورت' جو خود کو ملائکہ کی ماں کہتی تھی۔ ایک اس کا لب و لہجہ اور انداز گفتگو اور کہاں یہ خاتون۔

''لیکن آج کل تو بہت اچھے گھرانوں کی بچیاں......'' اس نے کہنا چاہا تو پھوپھو نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔

''پلیز آپ جا سکتے ہیں۔''

''مگر پھوپھو۔''

''تم چپ رہو ملائکہ۔'' انہوں نے زندگی میں پہلی بار اسے گھر کا۔'' تم اتنی خود مختار کیسے ہو گئیں کہ تم نے اتنا بڑا قدم اٹھا لیا۔ جانتی ہو کیا عزت ہوتی ہے معاشرے میں ان ماڈل لڑکیوں کی۔ تمہارے بابا سنیں گے تو کیا کہیں گے' اور آج کے بعد تم اکیلی باہر نہیں جاؤ گی۔ جاؤ اپنے کمرے میں۔''

وہ خاموشی سے اٹھ آئی' لیکن اس کے اندر ضد سر اٹھا رہی تھی۔ ایک اتنی بڑی رقم کا چیک تھا اس کے ہاتھ میں' پھر گلیمر کی اپنی کشش تھی۔ شاید یہ ضد دم توڑ دیتی' اگر سلطانہ اور صادق کے فون نہ آتے۔ انہوں نے نہ صرف یہ کہ اسے بہت بہت مبارکباد دی تھی' بلکہ اسے اکسایا تھا کہ وہ مزید کام کرے' اور ایک دن یقیناً صف اول کی ماڈلز میں اس کا شمار ہوگا۔

''مگر پھوپھو بہت ناراض ہیں اماں۔''

''لعنت بھیجو اس پر۔ تم کوئی اس کی غلام ہو۔ فوراً نیا کنٹریکٹ سائن کر لو' بلکہ ابھی فون کر دو واسطی کو کہیں کسی اور کو نہ لے لے' لیکن دیکھو پیسوں کا معاملہ پہلے طے کرنا ہوگا۔ اس نے پہلے بھی ٹرخا دیا ہے تمہیں۔ صادق آ جائے گا بس تو فون کر دینا' جان! واسطی کے ساتھ معاملات وہ خود طے کر لے گا۔''

مگر کئی دن تک اس کی ہمت نہ پڑی۔ پھوپھو نے اس سے بات چیت تقریباً بند کر رکھی تھی۔ اس روز لاؤنج میں وہ فون سن رہی تھی' اور ٹی وی پر اس کا اشتہار چل رہا تھا۔ غصے سے فون پٹخ کر انہوں نے ٹی وی کا سوئچ آف کیا اور باہر چلی گئیں۔ کتنا دل چاہتا تھا اس کا کہ وہ اس کا اشتہار دیکھیں' اس کی پرفارمنس کی تعریف کریں' لیکن ان کا غصہ تو کم ہونے میں نہیں آ رہا تھا' خود اس کو اپنا اشتہار اتنا اچھا لگتا تھا کہ اس کا جی چاہتا تھا' کہ ٹی وی پر ہی چلتا رہے' اور وہ دیکھتی رہے۔ صادق اور سلطانہ ہر روز اسے فون کرتے' لیکن اس وقت جب پھوپھو سونے کے لئے اپنے کمرے میں جا چکی ہوتیں۔ وہ عموماً عشاء کی نماز اپنے کمرے میں ہی پڑھتی تھیں' اور یہ بات اس نے ہی سلطانہ کو بتائی تھی۔

''ایسا کر ملکی میں اور صادق آ جاتے ہیں' تو آ جا ہمارے پاس پھر دیکھ لیں گے۔ بڑی آئی پھوپھی کیسے اجازت نہیں دیتی وہ تجھے۔ ارے یہ تیری زندگی ہے اس پر تیرا اپنا حق ہے' نہ کہ اس کا۔ وہ نہیں چاہتی کہ تو پیسوں میں کھیلے' شہرت حاصل کر لے۔''

وہ اس کے کانوں میں زہر انڈیلتی رہتی' اور اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ کیا کرے۔ پھر پورے چھ دن بعد پھوپھو نے ایک صبح ناشتے کی میز پر اس سے کہا۔

''آج تیار ہو جانا جیولر کی طرف جانا ہے' اور کچھ شاپنگ کرنا ہے' تمہارے ویڈنگ ڈریس بھی لینا ہے تم دیکھ لینا۔ کون سا کلر لینا چاہتی ہو' عرفان اور تمہارے بابا آ رہے ہیں اگلے ہفتے' اور تمہاری شادی ہے۔''

وہ حیرت سے منہ کھولے پھوپھو کو دیکھتی رہ گئی۔ اس کی شادی ہو رہی تھی' اسے خبر بھی

نہیں۔ بالا ہی بالا پھوپھو نے یہ کیا سازش کر لی تھی۔ عرفان کو تو تین چار ماہ تک آنا تھا' پھر...... ایک لمحہ کو اس کا دل عجب طرح سے دھڑکا...... عرفان...... عرفان نے کبھی اس سے کوئی ایسی بات نہ کی تھی' جس میں استحقاق ہو' لیکن جاتے سے وہ اس کا دیکھنا' وہ کئی دن تک ڈسٹرب رہی تھی۔

عرفان بہت نرم مزاج کا تھا۔

''اور وہ یقیناً مجھے اجازت دے دے گا۔ اس نے خوش دلی سے سوچا۔'' اتنا پیسہ ملے گا' اتنی شہرت' اتنا گلیمر۔''

اس نے آنکھیں موند کر خود کو شہرت کی بلندیوں پر دیکھا' اور پھر خاموشی سے اٹھ کر تیار ہونے چل دی۔ اس نے بہت شوق سے اپنے لئے ویڈنگ ڈریس پسند کیا تھا۔ جیولری میچنگ کی خریدی گئی تھی۔ پھوپھو بار بار کھوجتی نظروں سے اسے دیکھتی تھیں' اور پھر جیسے ان کے چہرے پر اطمینان سا پھیل جاتا' مگر اس رات جب اس نے سلطانہ کو بتایا کہ اس کی شادی ہو رہی ہے تو وہ حیران رہ گئی۔

''یہ اچانک کس کو تاڑ لیا تیری پھوپھی نے۔''

''عرفان سے' بابا بھی آ رہے ہیں۔ عرفان پھوپھو کا بیٹا ہے نا۔ آپ آنا ضرور میری شادی میں' میں پھوپھو اور بابا سے اجازت لے لوں گی' وہ منع نہیں کریں گے۔''

''لو تیری چڑیا تو گئی مٹھی سے پھر۔''

صادق نے قہقہہ لگایا۔ وہ اس وقت سلطانہ کے گھر میں ہی تھا۔

''ہماری تو قسمت ہی کھوٹی ہے شانی۔''

''تو کچھ کر صادقے!'' سلطانہ بھی پریشان ہو گئی۔

''اچھا چل صبح کراچی چلتے ہیں۔''

''اور وہ نذیر......؟''

''کہہ دینا اس سے ایک پرائیویٹ پروگرام ہے اس میں جانا ہے۔''

صادق کے پاس ہمیشہ ہی جواب تیار رہتے تھے' اور پھر صبح ہی وہ کراچی پہنچ گئے تھے۔ ان کی قسمت اچھی تھی کہ جب وہ اس سے ملنے ''قصر عرفان'' گئے تو وہ گھر پر اکیلی تھی۔ پھوپھو' رقیہ اور ڈرائیور کے ساتھ شاپنگ کے لئے نکلی ہوئی تھیں۔

''اے میں کہتی ہوں آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر پھوپھی سے' زر خرید نہیں ہے اس کی' کہہ دے کہ تجھے اپنی مرضی سے اپنی زندگی جینا ہے۔ غلامی نہیں کرنا اس کے بیٹے کی۔

تیرے لئے لاکھ رشتے ہیں۔''

وہ کوئی دو گھنٹے بیٹھی اس کو سمجھاتی رہی۔ ملائکہ خاموش بیٹھی اس کی باتیں سنتی رہی۔ کبھی کبھی صادق بھی بول اٹھتا تھا۔ ان کے جانے کے کچھ ہی دیر بعد پھوپھو آ گئیں۔ چوکیدار سے سلطانہ کی آمد کا سن کر وہ بوکھلائی ہوئی سی لاؤنج میں آئیں۔

''کون آیا تھا ملائکہ؟''

''اماں اور ماما آئے تھے۔ وہ بے حد پُرسکون سی بیٹھی ناخنوں کو تراش رہی تھی۔

''کیوں آئے تھے؟'' ان کا اضطراب چھپائے نہ چھپتا تھا۔

''ملنے آئے تھے مجھ سے۔''

''پھوپھو! ماڈلنگ کرنا اور ٹاپ کی ماڈل بننا میری شدید خواہش ہے۔ مجھے ماڈل بننا ہے' اور میں نے آج سلیمان واسطی کو فون پر بتا دیا ہے کہ میں ان کا کنٹریکٹ سائن کر رہی ہوں۔ آپ عرفان کو بھی بتا دیں' بعد میں اسے کوئی مسئلہ نہ ہو۔''

پھوپھو حیران سی اسے دیکھ رہی تھیں۔

''ملائکہ! تو ہوش میں ہے نا۔ یہ پٹی تجھے کس نے پڑھائی ہے۔ میں جانتی ہوں۔ وہ تیری دشمن ہے' دوست نہیں ہے۔''

''وہ میری ماں ہے پھوپھو اور ماں کبھی بیٹی کی دشمن نہیں ہو سکتی۔''

وہ بڑے اعتماد سے بول رہی تھی۔ یہ ملائکہ تھی جو ہر چھوٹی بڑی بات ان سے پوچھتی تھی' اور وہ کہتی تھیں۔'' ملائکہ اب بڑی ہو جاؤ۔'' اور آج وہ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑی تھی۔ وہ خاموشی سے باہر چلی گئیں۔ ان کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا تھا۔ اس ننھی سی جان کو انہوں نے پالا پوسا تھا' اس کے لئے خواب دیکھے تھے' اسے اپنے لاڈلے بیٹے کی دلہن بنانے کے۔

کیا اماں کے دودھ کا اثر ان کی تربیت پر غالب آ گیا تھا۔

''اماں صحیح کہتی تھیں۔'' ملائکہ نے انہیں خاموشی سے جاتے دیکھ کر سوچا۔

''مجھے شروع میں ہی پھوپھو سے بے دھڑک بات کرنا چاہئے تھی۔ میرے اندر ٹیلنٹ ہے تو میں کیوں نہ اسے آزماؤں۔ ٹھیک ہے میں کل ہی واسطی صاحب سے مل کر معاملہ طے کر لیتی ہوں۔ اماں اور صادق ماما کو ساتھ لے لوں گی۔ وہ بڑی مطمئن ہو گئی تھی' اور سلطانہ کو ہوٹل میں فون کر کے اسے ساری بات بتا دی تھی۔

''شاباش بیٹی! ڈرنا نہیں ہم ہیں نا ادھر۔ تیرے لئے ہی آئے ہیں' اتنا خرچ کر کے'

صادق بے چارے نے کرایہ کسی سے ادھار لیا۔"

"ٹھیک ہے میں آؤں گی تو پیسے بھی لیتی آؤں گی۔"

❋ ❋ ❋

رات ہی کو عرفان کا فون آ گیا' وہ بہت سنجیدہ تھا۔

"پھوپھو اپنے کمرے میں ہیں' میں بلاتی ہوں۔"

"مجھے تم سے بات کرنا ہے ملکی! یہ امی جان کیا کہہ رہی ہیں؟"

"ہاں میں ماڈل گرل بننا چاہتی ہوں' مجھے شوق ہے۔'

"تم نے شوق پورا کر تو لیا ملکی؟" عرفان نے سمجھایا۔

"دیکھو ہمارا ماحول' ہمارا پس منظر اس کی اجازت نہیں دیتا' اور نہ ہی میں پسند کرتا ہوں کہ میری بیوی۔"

"لیکن مجھے پسند ہے۔" پتا نہیں اس میں اتنی جرأت کہاں سے آ گئی تھی۔

"دیکھو ملائکہ! ماڈلنگ یا میں' تمہیں دونوں میں سے کسی ایک کو چننا ہوگا۔" ایک لمحہ کو اس کا دل ڈوب سا گیا' لیکن دوسرے ہی لمحے سلطانہ کے الفاظ اس کے کانوں میں گونجنے لگے۔

"تیرے قدموں پر سینکڑوں عرفان جیسے لڑکے سر رکھیں گے ملکی! تو ایک بار شوبز کی دنیا میں قدم رکھ' تو تو ملکہ ہے میری جان' شہزادی ہے۔"

"میں ماڈلنگ نہیں چھوڑ سکتی۔"

دوسری طرف کچھ دیر خاموشی رہی' پھر عرفان کی آواز سنائی دی۔

"او کے میری طرف سے تم آزاد ہو۔"

اس کا دل جیسے نیچے گہرائیوں میں ڈوبتا جا رہا تھا۔ وہ کتنی دیر ریسیور ہاتھ میں تھامے ساکت کھڑی رہی۔ شاید دونوں طرف یقین ٹوٹا تھا۔ عرفان کو یقین تھا کہ وہ اسے نہیں چھوڑ سکتی' اور اسے یقین تھا کہ عرفان اس کی ضد مان لے گا۔ ابھی دو تین دن پہلے اس نے اپنا ویڈنگ ڈریس پسند کیا تھا۔ اور...... کچھ دیر وہ اپنے بیڈ پر بیٹھی روتی رہی۔ اس وقت صرف سلطانہ تھی' جو اسے تسلی دے سکتی تھی۔ اس کے ٹوٹے دل پر مرہم رکھ سکتی تھی۔ سو کچھ دیر بعد وہ آنسو پونچھ کر اٹھی اور اسے فون کرنے لگی۔

"تم نے بالکل صحیح کیا۔" سلطانہ نے اسے شاباش دیتے ہوئے کہا۔

"صبح واسطی کے دفتر جانا۔ صادق اور میں بھی آ جائیں گے۔"

صبح ناشتے کے بعد وہ تیار ہو کر باہر نکلی تو پھوپھو کچن کے پاس کھڑی رقیہ کو کچھ ہدایات دے رہی تھیں۔

"میں کام سے جا رہی ہوں۔"

انہوں نے بس مڑ کر ایک نظر اسے دیکھا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اسے شاید منع کریں' لیکن انہوں نے کچھ نہیں کہا تھا۔ ایک گمبھیر سنجیدگی ان کے چہرے پر پھیلی ہوئی تھی' اور اس کے بعد بھی انہوں نے کبھی اسے کہیں آنے جانے سے نہ روکا' وہ کیا کرتی ہے' کہاں جاتی ہے؟ انہیں جیسے اس سے کوئی سروکار نہ رہا تھا۔

جس روز اس کی شوٹنگ تھی' وہ خاصی دیر سے آئی تھی' لیکن پھوپھو نے اس سے کوئی باز پرس نہیں کی تھی۔ سلطانہ اور صادق مستقل کراچی میں ہی رہ رہے تھے' اور تقریباً ہر روز ہی ملائکہ سے ان کی ملاقات ہوتی تھی۔ ملائکہ کے پہلے ہی ایڈ نے اسے خاصا مشہور کر دیا تھا۔ چند ایک ٹی وی پروڈیوسر سروں نے بھی اس سے رابطہ کیا تھا' اور وہ چاہتے تھے کہ وہ ان کی سیریز میں کام کرے' اور سلطانہ چاہتی تھی کہ وہ پھوپھو کا گھر چھوڑ کر اس کے ساتھ لاہور چلے' لیکن صادق ایسا نہیں چاہتا تھا' وہ کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ کچھ ایسا منصوبہ' جس میں زیادہ سے زیادہ مال ہاتھ لگ سکے' لیکن ابھی وہ کوئی لائحہ عمل نہیں طے کر پایا تھا کہ ملائکہ کو ایک فلم میں کام کی آفر مل گئی' اور وہ بھی ایک بڑے فلم ساز آفتاب علی کی طرف سے۔ سلطانہ اور صادق تو خوشی سے پاگل ہو گئے۔

"ملکی! اس چانس کو مس نہیں کرنا' فوراً ہمارے ساتھ لاہور چلو۔ تم نہیں جانتیں آفتاب علی کا نام' کامیاب فلم کی ضمانت ہے۔"

"لیکن ملائکہ متذبذب تھی۔ پتا نہیں پھوپھو لاہور جانے دیں گی یا نہیں؟ کیا ہوگا جو روک لیں۔ گو اس کا دل خود بہت چاہ رہا تھا۔

اس روز آفتاب علی' سلیمان واسطی کے سٹوڈیو میں اچانک ہی آئے تھے' جب وہ اپنے ایڈ کی فائنل ریہرسل کر رہی تھی۔

"مجھے اپنی نئی فلم کے لئے ایک نئے چہرے کی ضرورت ہے' اور میں سمجھتا ہوں کہ میری تلاش ختم ہو گئی ہے۔" انہوں نے اس سے کہا تھا' اور تب سے سلطانہ اور صادق ہواؤں میں اڑ رہے تھے۔ کچھ دن وہ سوچتی رہی' لیکن سلطانہ اسے مسلسل اکسا رہی تھی۔ تب اس نے لاہور جانے کا فیصلہ کر لیا' اور ایک صبح ناشتے کی میز پر پھوپھو کو مخاطب کئے بغیر اطلاع دی۔

"میں ایک دو روز تک لاہور جا رہی ہوں۔"

پھوپھو نے بس ذرا کی ذرا نظر اٹھا کر اسے دیکھا' اور پھر اپنی پیالی میں چائے انڈیلنے لگی تھیں۔ وہ کچھ دیر تو منتظر نظروں سے انہیں دیکھتی رہی کہ شاید وہ پوچھیں کہ لاہور کیوں جا رہی ہے؟ لیکن انہوں نے تو پوچھا تک نہیں۔ "انہوں نے مجھے پالا ہے' لیکن یہ میری ماں نہیں ہیں۔ اماں صحیح کہتی ہیں کہ ان کے سینے میں میرا درد نہیں ہو سکتا۔ اصل درد تو اماں کو ہی ہو سکتا ہے' وہی میری بہتری اور بھلائی کا سوچ سکتی ہے۔" وہ ایک اجنبی سی نظر ڈال کر اپنے کمرے میں آ گئی' اور سلطانہ کو کمرے میں آتے ہی فون کیا کہ وہ لاہور جانے کے لئے تیار ہے۔

"تیری پھوپھی نے کوئی پھڈا تو نہیں ڈالا؟" سلطانہ خوش ہو گئی۔

"نہیں......"

"چل شکر ہے' تو تیاری پکڑ صادق کو ادھر کوئی کام ہے۔ دو تین روز تک چلتے ہیں۔ تو اپنا سارا سامان لے لینا۔ پیسہ' دھیلا' زیور' شیور سب۔ جانے کتنے دن ٹھہرنا پڑے۔ واسطی نے جو چیک دیا ہے نا تجھے وہ بھی کیش کروا لینا۔ ٹکٹ شکٹ لینا ہو گا جہاز کا۔ اب تیرے ساتھ ٹرین میں تو نہیں جائیں گے' بے عزتی ہو گی نا۔"

اگلے دو تین دن وہ تیاری کرتی رہی' کچھ نئے کپڑے بنوائے' لیکن اس کا خیال تھا کہ جتنے بھی دن لگے بہرحال لوٹ کر تو ادھر ہی آنا ہے' اس لئے اس نے زیور وغیرہ تو نہیں لیا' ہاں چیک بک رکھ لی تھی۔ بس جو معمولی زیور پہنے ہوئے تھی' وہی اس کے خیال میں بہت تھا۔ پھر بھی اٹیچی کیس اور ایک بیگ بن ہی گیا تھا۔ سلطانہ نے اسے فون پر بتا دیا تھا کہ پیر صبح گیارہ بجے اس کی فلائٹ ہے' وہ بائیں کندھے پر بیگ لٹکائے اور دائیں ہاتھ سے اٹیچی کیس گھسیٹتے ہوئے اپنے کمرے سے باہر نکلی' تو سامنے عرفان کو لاؤنج میں کھڑے دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ اس کے ساتھ ایک کم عمر سی لڑکی تھی۔ یہی کوئی سترہ اٹھارہ سال کی۔

وہ حیران سی اسے دیکھنے لگی۔

"یہ عرفان کب آیا؟ شاید رات کو کسی وقت۔" وہ تو سرِشام ہی اپنے کمرے میں گھس جاتی تھی۔ پھوپھو کو یقیناً اس کی آمد کا علم ہو گا' لیکن انہوں نے مجھے بتانا بھی گوارا نہیں کیا۔

عرفان کچھ دیر اسے دیکھتا رہا' پھر ایک لمبی اور گہری سانس لی۔

"کہیں جا رہی ہو شاید؟"

"ہاں......" اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"کتنے دن کا پروگرام ہے۔"

اس نے بھاری بیگ اور اٹیچی کیس کو دیکھا۔

"معلوم نہیں۔" وہ اپنے اندر ایک بے چینی سی محسوس کر رہی تھی۔

"میری شادی تک رک جاتیں۔"

عرفان نے ایک کھوجتی ہوئی سی نظر اس پر ڈالی۔ لمحہ بھر کو اس کے چہرے کے نقوش میں ارتعاش پیدا ہوا' لیکن دوسرے ہی لمحے وہ نارمل ہو گئی۔

"یہ ثنا ہے۔" عرفان نے اس لڑکی کا تعارف کروایا۔

"میری وائف...... اور تمہاری بہن...... سٹیپ سسٹر میرا مطلب ہے نکاح وہیں ہو گیا تھا' باقی تقریبات یہاں ہوں گی۔ ماموں جان بھی آ جائیں گے۔ ہفتہ دس دن تک' کچھ کام تھا انہیں۔"

لڑکی کے رخسار گلگلوں ہوئے' اور وہ تیزی سے واپس کمرے میں غائب ہو گئی۔ اس نے بیگ ایک کندھے سے دوسرے کندھے تک منتقل کیا۔

"اوکے...... میں چلتی ہوں۔"

ملائکہ نے بہت دیر سے روکی ہوئی سانس کو آزاد کیا' اور تھوڑا سا جھک کر بیگ کے سٹریپ کو پکڑا۔ عرفان نے آہستگی سے سٹریپ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔

"چلو......"

وہ خاموشی سے بیگ کندھوں پر لٹکائے ہولے ہولے چلنے لگی۔

"ملائکہ!" اٹیچی کیس گاڑی کی ڈگی میں رکھتے ہوئے عرفان نے کہا۔

"یہ تم نے اچھا نہیں کیا ملائکہ! نہ اپنے ساتھ' نہ میرے ساتھ۔ بلکہ ہم سب کے ساتھ۔ بابا کو' امی کو' سب کو تمہارا بہت صدمہ ہے ملائکہ! لیکن میں' مجھے تو تم نے مار دیا ہے۔ پتا نہیں تم نے بھی میرے متعلق اس طرح سوچا تھا یا نہیں' لیکن میں نے تمہیں بہت سوچا' بہت چاہا' بہت محبت کی تم سے۔ میں نے تم سے کبھی محبتوں کا اظہار نہیں کیا' لیکن میں نہیں سمجھتا تھا کہ مجھے اس کی ضرورت ہے' پھر ابھی تم پڑھ رہی تھیں۔ ابھی ان سب باتوں کا وقت نہیں تھا۔ میرے پاس تو تمہارے لئے اتنی محبتیں تھیں ملائکہ کہ......"

وہ ذرا سا رکا ملائکہ ساکت کھڑی تھی۔

"تم نے کبھی میری آنکھوں میں نہیں دیکھا؟ کبھی یہ محسوس نہیں کیا کہ میں تمہارے لئے کتنا حساس ہوں؟ تمہاری معمولی سی تکلیف پر تڑپ اٹھتا ہوں' مجھے یقین تھا کہ تمہارے دل میں بھی

میرے لئے بہت جگہ ہو گی' لیکن جب تم نے کہا کہ تم ماڈلنگ کو نہیں چھوڑ سکتیں' ہاں مجھے چھوڑ سکتی ہو تو جانتی ہو کیا ہوا۔ تم نے میرے برسوں کے بنائے رنگ محل کو خاک میں ملا دیا۔ میں کتنے ہی دن شاک میں رہا' کتنے دن پاگلوں کی طرح پھرا...... تم نے...... تم نے ملائکہ! تم نے مجھے مار دیا۔''

وہ ایک دم تیزی سے مڑا' اور تقریباً بھاگتے ہوئے اندر چلا گیا۔ ملائکہ کا جی چاہا' وہ بھی بھاگتی ہوئی اس کے پیچھے چلی جائے۔ اس سے سوری کر لے' اور کہے تم تو میرے لئے سب سے اہم ہو' ماڈلنگ ایکٹنگ سب تمہاری محبتوں کے سامنے کچھ بھی نہیں ہیں۔''

لیکن دوسرے ہی لمحے وہ خوبصورت سی کم عمر لڑکی' جو اس کے بے حد پیارے بابا کی بیٹی تھی' اس کی آنکھوں کے سامنے آ گئی' اور عرفان کی آواز۔

''ہمارا نکاح ہو چکا ہے۔''

''اوہ!'' اس نے اتنی شدت سے نچلے ہونٹ کو دانتوں تلے دبایا کہ خون چھلک آیا تھا۔

''کہاں جانا ہے بی بی......؟''

ڈرائیور آ کر پوچھ رہا تھا۔

''ایئرپورٹ......'' اس نے کلائی موڑ کر وقت دیکھا۔ کیا تھا اگر وہ کچھ دن اور رک جاتی' اور بابا سے اس کی ملاقات ہو جاتی۔ کتنے سالوں بعد وہ آ رہے تھے' لیکن کیا وہ ان کا سامنا کر سکے گی۔

''خیر جو ہوا' سو ہوا۔ ایک بار مجھے اپنا ٹارگٹ مل جائے' تو میں پھوپھو کو آ کر منا لوں گی۔ پھوپھو بہت دیر مجھ سے ناراض نہیں رہ سکیں گی' اور بابا تو......''

مدھم سی مسکراہٹ نے اس کے لبوں کو چھوا' لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ آج کے بعد وہ کبھی اس گھر کے گیٹ میں داخل نہیں ہو گی۔

اسے فلم میں تو چانس نہ مل سکا تھا' لیکن ایک ٹی وی ڈرامے نے اسے راتوں رات شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیا تھا۔ اس کے متعلق اگر یہ کہا جاتا کہ وہ آئی اور چھا گئی تو کچھ غلط نہ تھا۔ اس کا حسن' اس کی معصومیت' ذہانت' تعلیم اور ایکٹنگ کی تعریفوں سے اخبار بھرے تھے۔ دھڑا دھڑ انٹرویو چھپ رہے تھے۔

وہ اس گلیمر میں ایسی الجھی کہ پیچھے مڑ کر دیکھ ہی نہ پائی' اگر کبھی خیال آیا بھی تو قدم نہ اٹھ سکے کہ اس کی یہ غلطی تو معاف کر بھی دی جاتی' لیکن جو دوسری غلطی اس سے سرزد ہو گئی تھی'

یقیناً قابل معافی نہ تھی۔ لاہور آنے کے چند ہی دن بعد صادق نے مشورہ دیا تھا کہ اس کا نکاح اس کے بیٹے اللہ یار سے کر دیا جائے۔ اس صورت میں یہ خطرہ نہیں رہے گا کہ محب اللہ خان کچھ کر سکیں گے۔

''وہ حبس بے جا کا کیس کر سکتا ہے۔ باپ ہے تمہارا' اور قانوناً وہ تمہیں زبردستی لے جا سکتا ہے' کیونکہ انہوں نے زور سے اور ڈرا کر شانی سے لکھوا لیا تھا کہ اس کا تم پر کوئی حق نہیں ہو گا' اب تم بالغ ہو' اس نکاح کے بعد تمہاری پوزیشن مضبوط ہو جائے گی۔''

''لیکن......'' ملائکہ متذبذب تھی۔ اللہ یار نے میٹرک پاس کیا تھا' اور ایک الیکٹرک کے سامان مرمت کرنے والی دکان پر کام کرتا تھا' سادا سا عام سا لڑکا۔

''یہ صرف کاغذی نکاح ہو گا ملائکہ؟''

صادق نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا' لیکن پھر یہ صرف کاغذی نکاح نہیں رہا تھا۔ شہریار اس کا ثبوت تھا۔ اللہ یار باپ کی طرح ہوشیار اور چالاک نہیں تھا' اس لئے وہ وہی کرتا' جو اس کا باپ کہتا تھا۔

سو جب وہ اللہ یار کے ساتھ اپنی شادی کا سوچتی' تو اس کے قدم ٹھہر جاتے۔

''نہیں' بابا اور پھوپھو مجھے کبھی معاف نہیں کریں گے۔''

لاہور آنے کے سال بھر بعد تک تو اسے کوئی قابل ذکر کام نہیں ملا تھا۔ سلیمان واسطی کے دفتر میں ملنے والے آفتاب علی نے ایک نئی لڑکی سلیکٹ کر لی تھی' جو پہلے ٹی وی ڈراموں میں کام کرتی تھی' سو لاہور آ کر بھی وہ کچھ عرصہ تک ماڈلنگ ہی کرتی رہی' تاہم ماڈلنگ سے اتنی رقم ضرور مل گئی تھی کہ اس نے گلبرگ میں ایک بنگلہ خرید لیا تھا' اور سلطانہ کے ساتھ اس میں اٹھ آئی تھی۔

سلطانہ کے گھر میں نذیر کا رویہ انتہائی برا تھا۔ وہ شخص اسے بالکل پسند نہیں آیا تھا۔ ہر وقت سلطانہ سے لڑتا رہتا اور ان پیسوں میں حصہ مانگتا' جو ملائکہ کو ملتے تھے۔ جب کہ پیسوں کا سارا حساب کتاب صادق کے پاس تھا۔

گھر خرید لیا گیا تو سلطانہ نے کہا۔

''چل گولی مار نذیرے کو' میں اس سے طلاق لے لیتی ہوں۔ ویسے بھی دمے کا مریض ہو گیا ہے۔ ساری رات کھانس کھانس کر میرا دماغ خراب کر دیتا ہے۔'' نذیر نشے میں تھا' جب سلطانہ نے اس سے طلاق مانگی' اس نے فوراً ہی اسے طلاق دے دی' لیکن بعد میں بہت پچھتایا'

کتنی بار کوٹھی پر آیا کہ وہ نشے میں تھا' لیکن سلطانہ نے دھکے دے کر نکال دیا۔ شروع میں تو صادق اور اس کے بیوی بچے بھی ان کے ساتھ رہے' لیکن بعد میں سلطانہ اور صادق میں زبردست جھگڑا ہوا' اور سلطانہ نے صادق کو گھر سے نکال دیا۔

صادق' اللہ یار کو بھی لیتا گیا' لیکن کچھ دنوں بعد بہن بھائی پھر ایک جیسے ہو گئے' تاہم صادق نے اسے ایک گھر لے دیا تھا۔ ملائکہ اپنی زندگی میں مصروف تھی۔ اسے ان سارے جھگڑوں سے کوئی سروکار نہ تھا۔ صادق اور سلطانہ کے کہنے پر اس نے اپنی شادی کو چھپایا ہوا تھا' وہ اللہ یار سے محبت نہیں کرتی تھی۔ نہ ہی اللہ یار نے کبھی اس سے محبت کے بول بولے تھے۔ بس وہ اس کا شوہر تھا وہ دن رات شوٹنگ میں مصروف رہتی تھی' ٹی وی ڈراموں کے ساتھ ساتھ اس نے فلم سائن کر لی تھی۔ ہر طرف اس کی اداکاری کی دھوم تھی۔ "ملائکہ کی اداکاری پر حقیقت کا گمان ہوتا ہے۔" "وہ ہر مکالمے کو اس طرح ادا کرتی ہے کہ اس میں جان ڈال دیتی ہے۔" ایسے تبصرے چھپتے رہتے تھے' وہ جو ملائکہ خان کے نام سے متعارف ہوئی تھی' اب فخر سے بتاتی۔

"میں ملائکہ محب اللہ خان ہوں' میرے والد ایک بڑے بزنس مین ہیں۔"

وہ حوالہ جو چھوڑ آئی تھی' اسے اب اس حوالے کی ضرورت تھی' کہ لوگ اسے سلطانہ اور صادق کے ساتھ دیکھ کر طرح طرح کی قیاس آرائیاں کرتے تھے۔ وہ بے حد مصروف تھی' اتنی مصروف کہ رات گئے جب گھر آ کر بستر پر لیٹتی تو اسے کچھ یاد نہ رہتا' نہ پھوپھو نہ وہ گھر' نہ بابا' نہ عرفان۔ پورے دو سال وہ بے حد مصروف رہی۔ اخبار اس کی اداکاری کی تعریف سے بھرے ہوتے۔

ایک کے بعد دوسرا کامیاب ڈرامہ اور پھر یکے بعد دیگرے دو کامیاب فلموں نے اسے سب کچھ بھلا دیا تھا' لیکن جس روز اس کی تاج پوشی ہوئی' اور اسے اداکاری کی ملکہ کہا گیا' اس رات جب وہ اپنے بیڈ پر لیٹی تو اسے لگا کہ اتنی بہت ساری کامیابیوں اور کامرانیوں کے باوجود اس کا دامن خالی ہے۔ اس کے اندر عجب طرح کی ویرانی ہے' اور اس روز بے شمار دنوں بلکہ مہینوں کے بعد اس نے سلطانہ سے اللہ یار کے متعلق پوچھا۔

"وہ تو دبئی چلا گیا ہے' مزدوروں میں بھرتی ہو کر۔"

"اور مجھے بتایا تک نہیں۔"

"تمہارا اس کا کیا جوڑ تھا' ملائکہ جان! یہ تو بس ایک حفاظتی تدبیر تھی' اور اب اس کی ضرورت نہ تھی۔ میں نے اس سے کہہ دیا تھا کہ طلاق دے دے تمہیں۔ صادق نے تو بہت منع

کیا' یہ صادق بھی بڑا لالچی ہے۔ میں سمجھتی ہوں اس کی نظر تیری آمدنی پر ہے' تیرے اکاؤنٹ میں تو آدھی بھی جمع نہیں کرواتا' میں کہتی ہوں تو خود کیوں نہیں حساب کتاب رکھتی۔ یہ کم بخت ہم ماں بیٹی کو بھیک منگوائے گا۔ مجھے تو ساری زندگی اس کی چالیں سمجھ میں نہ آئیں' وہ تو اللہ یار نے جاتے جاتے اس کے سارے راز کھول دیئے۔"

"کیا اللہ یار نے مجھے طلاق دے دی؟"

ملائکہ نے کب کی رکی ہوئی سانس آزاد کی۔

"ہاں...... وہ پہلے بھی اس شادی پر رضامند نہ تھا۔ تمہارا اس کا کوئی جوڑ نہیں ہے' تمہارے اور اس کے مزاج میں کچھ بھی ایک جیسا نہیں ہے۔ وہ کہتا تھا' وہ سیدھا سادا آدمی ہے اپنے ابا جیسا نہیں ہے' اور یہ کہ اسے اپنے جیسی ہی ایک سادہ گھریلو سی بیوی کی ضرورت ہے' جو دال روٹی کھا کر گزارا کر لے' جسے زیادہ کی ہوس نہ ہو۔"

"اور شہریار......" اس کے لب حیرت سے کھلے تھے۔

"شہری کا کیا ہے وہ تو میرا بیٹا ہے۔"

وہ خاموشی سے واپس اپنے کمرے میں آ گئی۔

وہ اللہ یار سے محبت تو کجا کوئی لگاؤ بھی نہیں رکھتی تھی' اور ان دو سالوں میں تو ایک بار بھی وہ اور اللہ یار اکٹھے نہیں رہے تھے' بلکہ اس کی اللہ یار سے کوئی خاص بات بھی نہیں ہوتی تھی' حالانکہ کئی بار آتے جاتے اس کی نظر اس پر پڑتی تھی۔ پھر بھی دل کے اندر جیسے ایک گھاؤ سا پڑ گیا تھا' پہلے عرفان نے اسے ٹھکرا دیا تھا' اور اب اللہ یار جیسے مرد نے بھی اسے رد کر دیا تھا۔ حالانکہ وہ خود اس سے طلاق لینا چاہتی تھی' لیکن اب اس نے از خود اسے طلاق دے دی تھی' تو جیسے اس کی زخمی انا تڑپ رہی تھی۔ کیا وہ اس قابل نہیں ہے کہ اسے چاہا جائے۔ اس سے محبت کی جائے۔

عرفان نے کہا تھا کہ اس نے اسے بہت چاہا ہے' اس کے پاس اسے دینے اور کہنے کے لئے بہت کچھ تھا لیکن...... اور اس کے اندر عجب طرح کی تشنگی امڈ آئی۔

اسے محبت کی ہوس ہو گئی۔

وہ ہر اس شخص کی طرف لپکنے لگی' جو ذرا بھی التفات بھری نظر اس پر ڈالتا۔ وہ ملائکہ جس کے متعلق کہا جاتا تھا کہ وہ مغرور ہے' اسے خاندان کا فخر ہے' وہ کسی کو لفٹ نہیں کراتی۔ اس کے سکینڈلز چھپنے لگے' کبھی کسی صحافی کے ساتھ' کبھی کسی اداکار کے ساتھ' کبھی کسی پروڈیوسر کے ساتھ۔
پھر...... ممتاز سومرو کا نام اس کے ساتھ لیا جانے لگا۔ ممتاز سومرو ایک معزز جاگیردار......

کسی تقریب میں دونوں کی ملاقات ہوئی تھی۔

اسے محبت کی چاہ تھی' وہ لفظوں کی بھوکی تھی' اور ممتاز سومرو کے پاس لفظوں کی جادوگری تھی۔ وہ اس کی ایسی اسیر ہوئی کہ اسے لگا وہ اندر تک لبالب محبت سے بھر گئی ہے۔ ساری عمر کی تشنگی ختم ہوگئی ہے۔ عرفان سے کہیں زیادہ محبتیں تھیں' ممتاز کے پاس...... وہ اس کا ساتھ پانے کے لئے سب کچھ چھوڑنے کو تیار ہوگئی۔ عین بلندی اور عروج پر اس نے شوبز کو خیر باد کہہ دیا۔ پرانے کنٹریکٹ مکمل کیے' اور مزید کچھ بھی کرنے سے انکار کر دیا۔

سلطانہ اس پر سخت ناراض ہوئی۔

''تم پاگل ہوگئی ہو۔''

''ہاں' میں ممتاز کے لئے پاگل ہوں۔''

''شوبز میں بہت پیسہ ہے ملکی! اور ابھی چھ سات سال تک تو بہت کما سکتی ہے۔''

''ممتاز کے پاس بھی بہت پیسہ ہے۔''

''اور میں...... میرا کیا ہوگا؟'' سلطانہ گھبرائی ہوئی تھی۔

''تم یہاں اسی گھر میں رہنا۔ میں تمہیں پیسے بھیجتی رہوں گی۔''

''لیکن ملکی۔''

''بس...... مجھے جانا ہے۔''

''اور شہریار......''

''وہ تمہارا بیٹا ہے' سب کی طرح ممتاز بھی یہی سمجھتا ہے۔ وہ تمہارے پاس ہی رہے گا۔ اس کا خرچ میں دے دوں گی۔''

سلطانہ کا سمجھانا' اس کی دھمکیاں' ڈراوے سب بے معنی تھے اس کے لئے۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا' سو وہ سب چھوڑ کر ممتاز کے ساتھ اس کے گاؤں چلی گئی۔ ممتاز نے اس کے ساتھ بہت سے وعدے کیے تھے' لیکن گاؤں جا کر وہ سارے وعدے بھول گیا۔ گاؤں میں اس کی پہلے سے ہی دو بیویاں موجود تھیں' اور ملائکہ کے لئے اس کے پاس بہت کم وقت ہوتا تھا۔ زمینوں کے جھگڑے' لوگوں سے ملنا ملانا۔ وہ سارا دن مصروف رہتا تھا' اور وہ بولائی بولائی سی حویلی کے برآمدوں اور کمروں میں چکراتی پھرتی۔

ممتاز کی بیویاں اس کی بے چینی دیکھ کر ہنستیں' اور دور سے اشارے کر کے سرگوشیاں کرتیں۔ ممتاز ہفتے میں دو بار ہی اس کے پاس آتا' لیکن یہاں اس حویلی میں آ کر وہ سارے

خوبصورت لفظ کھو بیٹھا تھا' اسے لگا وہ ایسی ہی تشنہ اور خالی ہے۔ اس کے کاسے میں محبت کا کوئی سکہ نہیں ہے' اور وہ عرفان کہتا تھا کہ اس کے پاس اس کے لئے ڈھیروں محبتیں تھیں۔

اور یہ ممتاز سومرو۔

جانے کس دھوکے میں وہ اس کی طرف چلی آئی تھی۔

''اماں نے صحیح کہا تھا یہ جاگیردار ایسے ہی ہوتے ہیں۔ چار دن عیش کرے گا' اور چھوڑ دے گا۔'' ممتاز نے تو اسے نہیں چھوڑا تھا' ہاں اس نے اسے چھوڑنے کا عہد کر لیا تھا۔

''میں نے تمہیں پہلے ہی بتا دیا تھا ملائکہ محب اللہ خان کہ ہماری حویلی کی پابندیاں تم سہہ نہ پاؤ گی۔''

''میں پابندیوں سے نہیں گھبراتی ممتاز سومرو۔ اگر تمہاری محبت بھی سنگ ہوتی' لیکن اب تو یہ پابندیاں میرے لئے گلے میں پڑے طوق ہیں' جو لمحہ لمحہ دم گھونٹ رہے ہیں۔ تم مجھے آزاد کر دو۔''

اور ممتاز سومرو نے بلا جھجک اسے آزاد کر دیا۔ ایک سال دس ماہ بعد وہ واپس آ گئی' دو لاکھ حق مہر کا چیک لئے۔ سلطانہ خوش ہوگئی' صادق جس کے ساتھ ملائکہ کے جانے کے سلطانہ نے صلح کر لی تھی' کھل اٹھا۔

''میں نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا' تو اس کے ساتھ بس نہیں سکے گی خیر......''

خوشی سلطانہ کی آنکھوں سے پھوٹی پڑی تھی۔

''کیا کچھ لے کر آئی ہے؟''

''بس یہ دو لاکھ...... دو لاکھ تو تیرا حق مہر ہی تھا۔''

''ہاں یہ حق مہر ہی ہے۔''

وہ بہت تھکی ہوئی تھی' اور آرام کرنا چاہتی تھی۔

''تو اور کچھ نہیں؟ کوئی کوٹھی' کوئی بینک بیلنس سالوں میں کچھ بھی نہیں لے سکی تو اس جاگیردار کے بچے سے؟''

سلطانہ کے چہرے پر مایوسی تھی۔ وہ ایک نظر اس پر ڈال کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ پچھتاوے اس کے اندر ڈنک مارنے لگے۔ اس نے وہ سب یاد کیا جو چھوڑ آئی تھی' پھوپھو کی محبتیں' شفقتیں' بابا کا پیار اور سب سے بڑھ کر عرفان کی چاہتیں۔

''عرفان۔'' اس کے ہونٹوں سے سسکی نکلی۔

وہ بہت دیر تک روتی رہی' اور اس نے سوچا کہ وہ پھوپھو کے پاس واپس چلی جائے۔ ان کے پاؤں پر گر کر معافی مانگ لے' وہ ضرور معاف کر دیں گی۔ اس نے سلطانہ اور پھوپھو کا موازنہ کیا' تو اسے لگا کہ سلطانہ ایک لالچی عورت ہے' اور شاید اسی لئے بابا کی ان سے نبھ نہیں سکی تھی' لیکن کبھی کبھی واپس پلٹنے میں بہت دیر ہو جاتی ہے' اسے بھی دیر ہو گئی تھی۔ پھوپھو کو عرفان اپنے ساتھ کینیڈا لے گیا تھا۔ وہ گیٹ کے پاس بیٹھی بہت دیر تک روتی رہی۔ چوکیدار نے اسے پانی پلایا۔

''بابا! کیا پھوپھو مجھے یاد کرتی تھیں' کبھی انہوں نے میرا نام لیا؟''

''کیوں یاد نہ کرتی ہوں گی' پالے کی محبت تو بڑی ظالم ہوتی ہے بیٹا۔ سلطانہ بی بی تو آپ کو مرنے کے لئے چھوڑ گئی تھیں۔ ذرا سی جان کو بیگم صاحبہ نے ہی سنبھالا تھا۔''

چوکیدار نے اسے جو کچھ بتایا' اس نے اندر باہر آگ لگا دی تھی۔ وہ کراچی سے لوٹی تو سلطانہ سے الجھ پڑی۔

''تم نے میری زندگی برباد کی ہے' تم میری ماں نہیں ہو' تم نے مجھے اجاڑ دیا' میرا گھر' میرا شوہر سب چھین لیا۔ مجھے پھوپھی کا گھر چھوڑنے پر اکسایا۔''

''ارے چل اتنی ہمدرد تھی تیری پھوپھو تو روک لیتی تجھے' نہ جانے دیتی۔ اس نے تو سوچا ہو گا' خس کم جہاں پاک۔''

''ہاں' پھوپھو مجھے روک بھی تو سکتی تھی زبردستی' لیکن میں ان کی بیٹی جو نہیں تھی۔ اماں سچ کہتی ہے۔'' اسے سلطانہ کی بات سچ لگی۔

پھر کئی دن گزر گئے تو ایک روز سلطانہ نے کہا۔

''چل ختم کر اب یہ سیاپا۔ ذرا پارلر جا کر تیار شیار ہو' اور صادق کے ساتھ جا کر آفتاب صاحب سے مل لے۔ آج کل وہ ایک نئی فلم بنا رہے ہیں۔''

''مجھے کسی فلم یا ڈرامے میں کام نہیں کرنا۔''

''تو بھوکی مرے گی کیا...... میرے پاس تو کچھ نہیں ہے' کل شہری کو بھی ٹیچر نے کلاس سے باہر نکال دیا' دو ماہ سے فیس نہیں دی۔''

''اور وہ دو لاکھ......''

''گئے سب' اتنا قرض چڑھا ہوا تھا' وہ اتارا۔ تو تو چل دی تھی اس ممتاز کے ساتھ' پیچھے ہم نے کیسا وقت گزارا تجھے کیا خبر۔'' سلطانہ کی آنکھیں برسنے لگیں۔

''اچھا چل...... دیکھتی ہوں۔'' اس نے ماں کو تسلی دی۔

''میں فون کروں' صادق کو؟''

''نہیں' میں خود چلی جاؤں گی۔''

''یہ ٹھیک ہے' تو خود سمجھدار ہے' وہ تو آدھے پیسے خود رکھ لیتا ہے۔ دو سال تک چھوٹی اور بڑی سکرین پر حکومت کرنے والی ملائکہ جب آفتاب صاحب سے ملنے گئی تو چپڑاسی نے اسے انتظار کرنے کو کہا' وہ غصے سے باہر نکل گئی' اور ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں چلی گئی۔ اس کمپنی کا مالک اسے اپنے ایڈ میں لینے کے لئے اس کے پیچھے بھاگتا تھا' اس نے وعدہ کیا کہ وہ جلد ہی اسے بلا لے گا۔

''کام بنا......؟''

گھر میں داخل ہوتے ہی سلطانہ نے پوچھا' تو وہ چیخ اٹھی۔

''نہیں کر سکتی اب میں کام۔''

''تو پھر واپس کیوں آئی ہے' رہتی اس اپنے عاشق کے پاس۔'' سلطانہ نے بھی چلا کر کہا۔

کچھ دیر وہ بولتی رہی۔ ملائکہ خاموشی سے اندر کمرے میں چلی گئی' اور سلطانہ تیار ہو کر تھیٹر چلی گئی۔

کسی صحافی کو اس کی واپسی کی خبر مل گئی تھی' تو اس نے اخبار میں سرخی لگا دی۔

''شوبز کی دنیا کو اچانک چھوڑ جانے والی ملائکہ محب اللہ خان کی واپسی۔''

اور پھر تو قیاس آرائیاں ہونے لگیں' لیکن سلطانہ کے اصرار کے باوجود اس نے سٹوڈیوز کا رخ نہیں کیا' تو تھک ہار کر سلطانہ بھی خاموش ہو گئی' اور گھر اس کی تھیٹر کی معمولی آمدنی پر چلنے لگا۔ پیسہ آتا تو تھا' لیکن سلطانہ بہت فضول خرچ تھی۔ جب نوبت زیورات بکنے پر آئی' سلطانہ نے ایک بار پھر ملائکہ کو جھنجوڑا۔

''لوگ مجھے بھول چکے ہیں اماں۔''

''ایک بار تو پھر آ جائے تو تیرا ہی راج ہو گا' یہ جو سکرین پر متحرک رہی ہیں چوبیس گھنٹے' انہیں تو ایکٹنگ کی الف بے بھی نہیں آتی۔''

''میں بھی اب ایکٹنگ نہیں کر سکتی۔''

''اچھا چل صادق دبئی جا رہا ہے ایک شو ہے' تو بھی چلی جا اس کے ساتھ۔ میرا نہیں تو شہریار کا سوچ لے۔''

وہ جانے کس موڈ میں تھی کہ اس نے ہامی بھر لی' یا پھر وہ ذہنی طور پر اتنی کمزور ہو چکی تھی کہ

احتجاج کر ہی نہ سکتی تھی۔

دو ماہ بعد جب وہ دبئی سے واپس آئی تو اس کی حالت بدلی ہوئی تھی۔ وہ سگریٹ پینے لگی تھی' اونچے اونچے قہقہے لگاتی' جینز اور ٹی شرٹس پہنتی' اونچی آواز میں بات کرتی' کبھی بیٹھے بیٹھے رونے لگتی۔ شو کے پردے میں کیا ہوا تھا' اس کے متعلق نہ ملائکہ نے بتایا نہ صادق نے۔

"یہ تو نے میری بچی کو کیا کر دیا صادق۔"

سلطانہ نے صادق سے پوچھا تو وہ ہنس دیا۔

"میں نے تو کچھ کیا' تو ہی کہتی تھی نا کہ اسے زندگی کی طرف لاؤں تو لے آیا اسے زندگی کی طرف' اور بہت پیسہ کما کے لائی ہے وہاں سے۔"

لیکن وہ اب بدل گئی تھی' وہ جو سارے کے سارے پیسے سلطانہ کو دے دیتی تھی' اب اپنی رقم چھپانے لگی تھی' اور اس پر سلطانہ لڑتی' اسے برا بھلا کہتی۔

مگر وہ چپ چاپ سنتی رہتی' دبئی سے واپس آ کر اس نے نئی گاڑی بھی خرید لی تھی' اور اکثر گاڑی لے کر نکل جاتی۔

سلطانہ چاہتی تھی کہ وہ پھر شوبز میں چلی جائے۔

"تیری بیٹی اب ہیروئن نہیں بن سکتی' یہ تو ایک جملہ بھی یاد نہیں کر سکتی۔ اب مکالمے کیا یاد کرے گی۔" "کوئی تگڑی اسامی دیکھ کر اس سے شادی کر دے اس کی۔"

صادق کا مشورہ سلطانہ کو پسند آیا تھا۔

اور وہ لوگوں کو پھانس پھانس کر لانے لگی۔ اسے اب بھی کبھی کبھار تھیٹر' ڈرامے میں کسی بوڑھی نائیکہ یا ایسے ہی کوئی کردار مل جاتے تھے' وہاں کسی سے ملاقات ہوتی تو وہ ملائکہ کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملاتی۔ ملائکہ سے ملواتی' ملائکہ جو ایکٹنگ سکرین پر کرتی تھی' وہ عام زندگی میں کرنے لگی۔

وہ سلطانہ کے مہمانوں سے اپنی ذات کے حوالے سے دھڑلے سے جھوٹ بولتی۔ اس نے اتنے جھوٹ بولے تھے کہ اسے خود بھی سچ لگتا تھا' وہ سب جو وہ کہتی تھی' اب پورے یقین سے کہنے لگی تھی۔ سات سال میں لوگ اسے بھول چکے تھے۔ بعض اوقات تو قریب سے گزرنے پر کوئی اس کی طرف دیکھتا بھی نہ تھا' پہچانتا بھی نہ تھا۔

"کیا اس کی شکل بدل گئی ہے؟"

وہ گھنٹوں آئینے کے سامنے بیٹھی خود کو تکتی رہتی۔ لوگ اسے پہچانتے کیوں نہیں؟ بڑے

بڑے پروڈیوسر اس کے پاس منتیں کرنے کیوں نہیں آتے؟ وہ یہ کیوں نہیں کہتے کہ اس کے بغیر سکرین تاریک ہے' ایکٹنگ مر گئی ہے' ڈرامہ زندہ نہیں رہا ہے۔ اس نے اپنی ایک تصوراتی دنیا تخلیق کر لی تھی' جہاں وہ سکرین کی ملکہ تھی' جہاں پروڈیوسر اس کے قدموں میں گرتے تھے' اور جہاں عرفان سے زیادہ وجیہہ اور باوقار مرد اس کی محبت کا دم بھرتے تھے۔ اس صورت حال نے اس کے اندر ایک توڑ پھوڑ کا عمل شروع کر دیا تھا۔ وہ سلطانہ کے لائے ہوئے ہر شخص کی طرف لپکتی' لیکن پھر وہ مرد اسے ممتاز سومرو لگتا' محبتوں سے خالی' کھوکھلا' اور وہ پیچھے ہٹ جاتی' جس پر ماں بیٹی میں لڑائی ہو جاتی۔

"وہ اتنا دولت مند تھا' عیش کرتی ساری زندگی۔"

"لیکن اس کا دل خالی تھا' اس کے پاس محبت نہیں تھی۔"

سلطانہ اسے دوہتڑ مارتی۔

لیکن اسے تو محبت کی ہوس ہو گئی تھی۔ چاہے جانے کا خبط۔ اسی طلب میں وہ ایک بار پھر دھوکا کھا بیٹھی۔ مرزا مسعود ایک رنڈوا زمیندار تھا' جوان بیٹے شادی شدہ تھے' لیکن مرزا مسعود خود بھی جوان ہی لگتا تھا' بال ڈائی کرتا' تھری پیس سوٹ پہنتا' پجارو میں بیٹھتا۔ جب لاہور آتا تو اپنی ذاتی کوٹھی میں قیام کرتا' بھوربن میں بھی اس کی کوٹھی تھی۔ سلطانہ کو جانے کہاں ملا تھا' لیکن اس کے توسط سے ملائکہ تک پہنچا تھا۔

اس نے ملائکہ کے سارے ڈرامے اور دونوں فلمیں دیکھ رکھی تھیں۔ وہ ملائکہ سے اس کے پرانے کرداروں کے حوالے سے بات کرتا' تو اس کی آنکھیں چمک اٹھتیں۔ وہ بہت اشتیاق سے اس کی باتیں سنتی' پھر مرزا نے اسے پروپوز کر دیا۔ اور ملائکہ نے جو بھاگتے بھاگتے ہانپنے لگی تھی' ہاں کر دی۔ سارے معاملات سلطانہ اور مرزا میں طے ہو گئے تھے' اور وہ ان معاملات سے بے خبر تھی۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ مرزا مسعود کی وفادار بیوی بن کر رہے گی' چاہے کچھ بھی ہو' مرزا اسے اپنی حویلی میں لے کر نہیں گیا تھا' بلکہ لاہور والی کوٹھی میں رکھا تھا' اسے لگتا تھا کہ جیسے غلاظت میں سے اٹھ کر وہ ایک بار پھر معتبر ہو گئی ہو' لیکن ٹھیک گیارہ ماہ بعد مرزا مسعود نے اسے فارغ کر دیا۔

وہ ہکا بکا سی اسے دیکھتی رہی۔

"تم بہت اچھی ہو' لیکن میرے بیٹوں نے مجھے مجبور کر دیا ہے۔ میں انہیں نہیں چھوڑ سکتا۔"

وہ سلطانہ کے گلے لگ کر خوب چیخ چیخ کر روئی۔ یہ عورت اس کی واحد ہمدرد تھی اس دنیا میں' کتنی کوشش سے اس نے اس کا گھر بسایا تھا' لیکن اس کی قسمت ہی خراب تھی کہ وہ بس نہ سکا'

مگر سلطانہ خوش تھی یہ سودا مہنگا نہیں تھا' دس لاکھ حق مہر کے علاوہ ڈیفنس والی کوٹھی اور بے شمار زیور تھے ملائکہ کے پاس۔ کوٹھی شادی سے پہلے اس نے ملائکہ کے نام کروا لی تھی' مرزا اور اس کے بیٹوں نے بغیر کوئی پھڈا ڈالے کوٹھی خالی کر دی تھی۔ جسے سلطانہ نے کرائے پر چڑھا دیا تھا' اگر وہ سلیقے سے خرچ کرتی تو ساری زندگی بیٹھ کر کھا سکتی تھی' لیکن سلطانہ تو کرائے کے پیسے ہفتوں میں ختم کر دیتی تھی۔

❊ ❊ ❊

زندگی ایک بار پھر پرانی روٹین پر چلنے لگی تھی۔ سلطانہ اب بھی چاہتی تھی کہ وہ کسی مالدار شخص سے شادی کر لے' لیکن اس کے ذہن کے تار ٹوٹ رہے تھے۔ دل میں سناٹے اتر آئے تھے۔ تنہائیاں تھیں' اپنے بیٹے سے بھی اسے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی' یوں لگتا تھا جیسے وہ ایک کٹھ پتلی ہو' جس کی ڈور سلطانہ کے ہاتھ میں تھی' وہ جیسے ڈور ہلاتی تھی' وہ ویسے ہی کرتی تھی' لیکن کبھی کبھی وہ سلطانہ سے الجھ پڑتی۔ لڑتی لیکن پھر کچھ دیر بعد ہی اس کے گلے لگ کر اسے منا لیتی۔ اعتراف کرتی کہ وہ ہی اس بھری دنیا میں اس کی واحد ہمدرد ہے' لیکن گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ اس کی ذہنی حالت خراب سے خراب ہوتی گئی۔

ایک دو بار اس نے سلطانہ کو مارنے کی بھی کوشش کی' لیکن جسمانی لحاظ سے سلطانہ اس سے طاقتور تھی۔ سو وہ کامیاب نہ ہو سکی۔ اب سلطانہ اسے کمرے میں بند رکھنے لگی تھی۔ اس کی حالت بہت بری تھی۔ وہ کھانا پھینک دیتی' کوئی قریب جاتا تو اسے مارتی' سلطانہ اس سے تنگ آ گئی' تو ایک بار پھر اس نے صادق سے مدد لی۔ صادق اب اقبال ٹاؤن میں ایک اچھے گھر میں رہتا تھا۔

"اسے واپس پھوپھی کے پاس بھجوا دو۔" صادق نے مشورہ دیا۔

"لیکن وہ تو ملک سے باہر ہے۔"

"میں پچھلے دنوں کراچی گیا تھا' تو میں نے محب اللہ کو دیکھا تھا' کیا خبر وہ لوگ واپس آ گئے ہوں' پتا کرواتا ہوں' لیکن آج کل ذرا ہاتھ تنگ ہے' ٹکٹ کے لئے پیسے دے دینا۔"

"تیری عادتیں نہ بدلیں صادقے' بڈھا ہو گیا ہے پھر بھی......" سلطانہ ہنس دی۔

"اور دیکھ اللہ یار کو بھی فون کر دے کہ اپنے بیٹے کو سنبھالے اب۔"

"تو تو کیا اب آخرت کے سفر پر جا رہی ہے۔"

"تیری زبان میں کیڑے پڑیں صادق! میں تو شادی کر رہی ہوں۔"

"اس عمر میں؟"

"ہاں' اسی عمر میں تو زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ تنہا جیا نہیں جاتا۔"

"کسے پھانسا ہے؟"

"وہ ہے محفل سینما کا ٹکٹ بابو شیخ منیر بے چارہ' اکیلا ہے۔"

"اچھا اچھا وہ بڈھا' شاید بلیک میں ٹکٹ بیچ بیچ کر کافی مال بنا رکھا ہے اس نے۔"

"چل فضول نہ بکواس کر' اور کل ہی نکل جا کراچی۔"

اب وہ محض اتفاق ہی تھا کہ "قصر عرفان" میں سب ہی تھے۔ طویل مدت بعد وہ لوگ وطن آئے تھے' اور عرفان کا ارادہ واپس جانے کا نہ تھا' وہ یہیں سیٹل ہونے کی کوشش میں تھا۔

چوکیدار سے ساری معلومات لے کر صادق واپس آیا' تو سلطانہ خوش ہو گئی۔ ملائکہ کمرے میں بند تھی' اور کمرے کے باہر شہریار بیٹھا تھا۔ شہریار' جسے اس نے کبھی بھی بیٹا تسلیم نہیں کیا تھا' کبھی بیٹا کہہ کر پکارا نہیں تھا۔ سارا وقت اس کے بند کمرے کے باہر بیٹھا رہتا تھا۔ وہ روتی تو وہ بھی رونے لگتا' وہ چیختی تو بند دروازے کو بے بسی سے دیکھتے ہوئے وہ اسے پکارتا' ہولے ہولے تسلیاں دیتا۔

"آپا مت روؤ۔ ابھی اماں آئیں گی' تو دروازہ کھول دیں گی' تجھے بھوک لگی ہے۔"

وہ کھڑکی سے چپس کے پیکٹ اور بسکٹ کے ڈبے دور پھینکتا۔

"ایسا کر' اسے بھی ساتھ ہی بھیج دے۔" صادق نے اسے دیکھ کر مشورہ دیا۔

"اللہ یار کی بیوی نہیں رکھنے کی اسے' یہ میں تجھے بتا دوں' یا پھر اپنے اس ٹکٹ بابو سے بات کر کے رکھ لے۔ بڑھاپے کا سہارا بنے گا۔" لیکن سلطانہ کو اس کی پہلی بات پسند آئی تھی۔

"اگر نہ رکھا انہوں نے تو کسی یتیم خانے میں ڈال دیں گے۔" اس نے سوچا' اور مطمئن ہو گئی۔

یوں ملائکہ کو بارہ سال بعد وہ "قصر عرفان" میں چھوڑ آیا۔ گیٹ سے اندر کر کے وہ وہیں سے پلٹ آیا۔ نیند کے انجکشن کا اثر ابھی تک تھا۔ ملائکہ نیم مندی مندی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی کہ چوکیدار نے جھڑکا۔

"اے' کون ہو تم لوگ اور ادھر کہاں گھس آئے ہو' باہر نکلو۔"

شہریار نے بے بسی سے اسے دیکھا' اور صادق کا سمجھایا ہوا سبق دہرا دیا۔

"مجھے ملک محب اللہ خان سے ملنا ہے' وہ میرے نانا ہیں۔"

چوکیدار نے اسے اور پھر ملائکہ کو دیکھا' الجھے ہوئے بال' دونوں ہاتھوں سے سر کھجاتی ہوئی وہ میلے کچیلے کپڑوں میں ملائکہ ہی تھی۔ وہ کچھ دیر تاسف سے اسے دیکھتا رہا' پھر اندر چلا گیا۔ ملک محب اللہ خان کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

''کون ملائکہ......ہم کسی ملائکہ کو نہیں جانتے۔ نکال باہر کرو۔''

دو سال' ہاں' دو سال جب وہ سکرین پر چھائی تھی' انہوں نے کتنی اذیت سے گزارے تھے' وہ ہر ایک سے چھپتے پھرتے تھے' حالانکہ وہ ملک سے باہر تھے' پھر بھی انہیں لگتا تھا ہر بندہ انہیں دیکھ رہا ہے اور کہہ رہا ہے۔ وہ اداکارہ اس کی بیٹی ہے' پھر دو سال بعد اچانک اس نے شوبز کو خیرباد کہہ دیا' تو انہوں نے شکر کا سانس لیا' لیکن وہ دو سال کی اذیت' جب وہ فخر سے سر اٹھائے ہوئے کہتی تھی' میں ملک محب اللہ خان کی بیٹی ہوں' ملائکہ محب اللہ۔''

چوکیدار مڑا تو جانے کس جذبے کے تحت پھوپھو بھی اس کے پیچھے نکلیں۔

''آپا پلیز......''

انہوں نے روکا' لیکن وہ تو پورچ کی سیڑھیوں پر حیرت سے کھڑی اسے دیکھ رہی تھیں۔ زمین پر آلتی پالتی مارے بیٹھی وہ اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ چوکیدار نے اس کا بازو پکڑا تو اس نے غصے سے چھڑا لیا۔

''نہیں جاؤں گی۔''

وہ بے اختیار دو قدم آگے بڑھیں۔ اس نے نظر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ویرانی تھی' اجنبیت تھی' اور وحشت...... ان کی سوالیہ نظریں پریشان کھڑے لڑکے کی طرف اٹھیں۔

''یہ پاگل ہیں' آپ کو نہیں پہچانیں گی۔''

''تم کون ہو اس کے۔''

''بیٹا ہوں ان کا۔'' لڑکے کی آنکھوں میں آنسو آ گئے' اور وہ جھک کر اسے اٹھانے لگا۔

''آپا چلو گھر چلیں۔''

''بھوک لگی ہے' پہلے کھانا دے۔''

''کہاں جاؤ گے؟'' پھوپھو عجب کیفیت میں گھری کھڑی تھیں۔

''ماموں نے کہا تھا کہ اگر انہوں نے نہ رکھا' تو کسی ٹیکسی والے کو کہنا وہ ایدھی ہوم میں لے جائیں گے۔ یہ کرایہ دیا تھا ماموں نے ٹیکسی کا۔''

اس نے مٹھی کھول کر دکھائی' اور پھر بازو سے پکڑ کر ملائکہ کو اٹھانے لگا۔

پھوپھو کے اندر جیسے بھونچال سا آ گیا۔ دل پھٹنے لگا' کتنے نازوں سے پالا تھا انہوں نے اس کو' وہ ساکت کھڑی تھیں اور دل جیسے طوفانوں کی زد میں تھا۔

''امی جان!'' عرفان نے پیچھے سے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''آپ ملکی کو معاف کر دیں۔'' اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

''رہنے دو بھئی! مت کرو اس کی سفارش۔ ایسی بے شعور' احمق اور ناسمجھ لڑکیوں کا یہی انجام ہوتا ہے۔'' ملک محب اللہ خان بھی باہر نکل آئے تھے' کسی ٹیکسی والے کو روک لو۔''

''نہیں......'' ساکت کھڑی پھوپھو چونکی تھیں۔

''نہیں......''

وہ بے اختیار آگے بڑھ کر ملائکہ کے پاس بیٹھ گئیں' وہ اس کے گندے میلے ہاتھوں کو چومتی جاتی تھیں' روتی جاتی تھیں' لیکن وہ ہنس رہی تھی۔ زمین سے کاغذ اٹھا اٹھا کر منہ میں ڈال رہی تھی۔

پھوپھو نے اسے سمیٹ لیا۔ بڑے بڑے ڈاکٹرز سے اس کا علاج کروایا گیا' لیکن اس کی ذہنی حالت میں کوئی خاص تبدیلی نہ آئی تھی' ہاں وہ پہلے سے بہتر ہو گئی تھی۔ مارتی پیٹتی نہیں تھی' لیکن جب دورہ پڑتا تو اسے سنبھالنا مشکل ہو جاتا تھا۔ تب اسے فاؤنٹین ہاؤس میں ایڈمٹ کروا دیا گیا۔ عرفان سیٹل نہ ہو سکا' تو واپس کینیڈا چلا گیا' اور شہریار کو بھی ساتھ لے گیا۔ ملک محب اللہ خان اپنی فیملی کے ساتھ پاکستان آ گئے تھے۔ پھوپھو بھی یہاں ہی تھیں۔

وہ مہینے دو مہینے بعد چکر لگاتیں' لیکن ملائکہ کسی کو پہچانتی نہ تھی' لیکن اس کی حالت بہتر ہو رہی تھی۔ وہ فونٹین ہاؤس میں آنے والے ہر شخص سے کہتی کہ وہ پاگل نہیں ہے' کبھی کبھی کوئی صحیح بات بھی کر جاتی' لیکن پھر بھی ڈاکٹرز کوئی خاص پرامید نہ تھے۔ وہ ملائکہ محب اللہ' جسے محبت کی طلب تھی' لیکن جسے سچی محبت کبھی نہ ملی۔

❋ ❋ ❋

میں نے اس کہانی کو یہاں تک ہی پڑھا تھا' اس سے آگے کے اختتامی جملے پڑھنے کی ضرورت بھی نہ تھی۔ اب ملائکہ میرے سامنے تھی۔ میں اسے دیکھ رہا تھا۔ مہینے میں دو چکر لگاتا تھا۔ اس کا کیس میرے مطالعے میں رہتا تھا' لیکن مجھے بھی ڈاکٹر لطیف کی رائے سے اتفاق تھا کہ اس کے بالکل ٹھیک ہونے کے امکانات کم ہیں۔

بچپن میں لگنے والی چوٹ کا اثر تھا' یا اس کے اندر کی ٹوٹ پھوٹ ہی اتنی شدید تھی کہ بحالی

ممکن نہ رہی تھی۔ پھر بھی ہم اپنی سی کوشش میں رہتے تھے' میں گھنٹوں اس کے پاس بیٹھا رہتا' باتیں کرتا رہتا' لیکن اس کی آنکھوں میں جو اجنبیت تھی' وہ روزِ اوّل کی طرح ہی تھی۔

"میں ڈاکٹر حبیب ہوں ملائکہ!"

"اچھا' لیکن دیکھو مجھے انجکشن نہ لگانا۔" میرے تعارف کے فوراً بعد وہ کہتی۔

"نہیں لگاؤں گا۔" میں ہولے سے اس کا ہاتھ تھپتھپاتا۔

اس کے لمس سے میرے اندر اب بھی وہی ارتعاش پیدا ہو جاتا تھا' جو اس وقت ہوتا تھا۔

اگر میں اس سے شادی کر لیتا' تو شاید اس کی یہ حالت نہ ہوتی۔

کبھی کبھی میں سوچتا تھا' عجب پچھتاوا سا ہوتا۔ میری محبت شاید اس کے اندر کے خلا کو بھر دیتی' شاید۔

لیکن اس نے مجھ سے کتنے جھوٹ بولے تھے' اگر وہ سچ کہہ دیتی تو۔

میں نہیں جانتا کہ نوازش کی کہانی میں کتنا سچ ہے' اور کتنا جھوٹ' شاید واقعات و حقائق سب سچ ہوں' ہاں تھوڑی سی رنگ آمیزی کی ہو' نوازش آخر کو کہانی کار ہے نا' لیکن مجھے سب سچ ہی لگتا ہے۔

مجھے یہ کہانی مکمل ہی لگتی ہے۔ بس اس میں ایک بات نہیں ہے۔ ایک بات جو نوازش نہیں جانتا تھا' یا جانتا بھی ہے تو اس نے لکھا نہیں۔

اس نے لکھا کہ ملائکہ کو سچی محبت کبھی نہیں ملی۔ کسی نے اسے دل کی گہرائیوں سے نہیں چاہا۔ وہ محبت کی طلب میں اندھا دھند بھاگی' اور پھر اس کھوج میں ہوش و حواس کھو بیٹھی۔ اس کا من خالی کا خالی رہا۔ دل آباد نہ ہو سکا۔

یہ ہی اس کہانی کے اختتامی جملے ہیں' لیکن مجھے ان سے اتفاق نہیں ہے' کیونکہ میں ہاں میں نے اس سے محبت کی' نوازش سچ کہتا تھا کہ میں اس سے محبت کرنے لگا ہوں۔ ان بہت سارے بیتے سالوں میں مریم جیسی بیوی کے ہوتے ہوئے بھی' میں نے جسے سوچا ہے' وہ ملائکہ محب اللہ خان ہے۔ میری وہ راتیں اس کی گواہ ہیں' جو میں نے اسے سوچتے گزاریں۔

میں نے جو کو اتنا نہیں سوچا' جتنا ملائکہ کو' جو تو ایک نرم ہوا کا جھونکا تھی' جو میرے دل کو معطر کر کے چلی گئی' لیکن ملائکہ تو ایسا شجر تھی' جس کی جڑیں میرے اندر دور تک چلی گئی تھیں۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں' ویسی ہی محبت' جیسی محبت کی اسے چاہ تھی۔

اور صرف میں ہی نہیں' عرفان بھی اس سے محبت کرتا ہے۔ جب ہی تو ہر چھ مہینے بعد"

اس سے ملنے چلا آتا ہے' اتنی دور سے' وہ بھی گھنٹوں میری طرح اس کے پاس بیٹھتا۔ اس سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا ہے' وہ سنتی ہے' لیکن سمجھتی نہیں۔ وہ بات ختم کر کے پُرامید نظروں سے اسے دیکھتا ہے' تو وہ فوراً ہی کسی کی شکایت جڑ دیتی ہے۔

نمبر 3' مجھے گھور کر دیکھتی ہے۔

اس وقت عرفان کے چہرے پر پھیلتے مایوسی کے رنگ' اس کی آنکھوں میں نمی' اس کے اندر کی کیفیتوں کا اظہار کرتی ہے۔

ہاں عرفان ملک نے ابھی اس سے محبت کی ہے۔ اتنی ہی شدید محبت' جتنی شدید محبت کی وہ ہمیشہ طالب رہی۔

بلکہ عرفان کی محبت میری محبت سے ارفع ہے۔ اس کی جڑیں بہت گہری ہیں' تب سے جب وہ معصوم سی بچی تھی' جب اس کی ماں نے کہا تھا۔ "اسے تو میں اپنے غنی کی دلہن بناؤں گی۔" تب سے......

وہ ملائکہ محب اللہ جو محبتوں کی حریص تھی' جسے سچی محبتوں کی طلب تھی' اور اس طلب میں اس نے خود کو نگار کر لیا تھا۔

وہ آبلہ پا ان محبتوں کو پانے کے لئے بھاگتی رہتی تھی' وہ جو کہتی تھی۔

"میں نے اپنے باپ کے خاندان میں جانے کے لئے بہت سفر کیا ہے' لیکن میری مسافتیں رائیگاں ٹھہریں۔"

ان دنوں جب وہ میرے کلینک میں آیا کرتی تھی' تو اکثر کہتی تھی۔ اس میں تھوڑی جھوٹ کی آمیزش تھی' لیکن یہ سچ ہی تو تھا' کہ اس نے بہت سفر کیا' لیکن باپ کے خاندان میں جانے کے لئے نہیں' محبت کی طلب میں' وہ جب ہوش میں تھی' تو اسے محبت کی بہت خبط تھی' بہت لالچ تھا' اس کی ماں کہتی تھی۔

"تو مرد کی رفاقت کی بھوکی ہے' تب ہی تو اتنے عروج میں شوبز چھوڑ کر ممتاز سومرو کے پیچھے چل پڑی۔" اور وہ کہتی تھی۔

"نہیں' میں مرد کی رفاقت کی نہیں' اس کی محبت کی بھوکی ہوں۔"

وہ ملائکہ محب اللہ خان...... اب ہوش و حواس سے بیگانہ ہو چکی ہے' لیکن وہ محبت اس کے سامنے ہے' اس کی دسترس میں' وہ جب چاہے مٹھی بھر کر اس محبت کو اپنے دل میں رکھ لے' اور ثروت مند ہو جائے۔

اور ایک مرد کی نہیں' دو دو مردوں کی محبت...... ایسی محبت' جس میں کوئی کھوٹ نہیں' کوئی لالچ نہیں۔ میں نے اس سے محبت کی' لیکن اس کے سنگ زندگی گزارنے کے خواب نہیں دیکھے' تصور میں کبھی اسے اپنے گھر میں چلتے پھرتے نہیں دیکھا' لیکن عرفان نے ان سارے خوابوں کو ہمراہ لے کر اس کے خواب دیکھے' میں نے ایک بار اسے کہتے سنا تھا۔

"ملکی! ایک بار ہوش کی دنیا میں لوٹ آؤ' تو میں تمہیں وہ سارے خواب لوٹاؤں گا' جو میں نے تمہارے حوالے سے دیکھے' ملکی! مجھے تمہارا بیٹا اتنا عزیز ہو گیا ہے کہ مجھے لگتا ہے کہ جیسے وہ میرا اور تمہارا بیٹا ہو۔"

ہاں محبت اس کے سامنے پڑی ہے' اس کی دسترس میں' لیکن اب اسے محبت کی طلب نہیں ہے۔ ہم دونوں اپنے اپنے مدار کے گرد چکر لگاتے ہوئے بھی اس کی کوشش کے دائرے سے باہر نہیں نکل سکتے۔ اسی لئے بھاگے بھاگے اس کے پاس آتے ہیں۔

وہ روتی رہتی ہے' شکایتیں کرتی رہتی ہے۔

نمبر دو کی' نمبر چار کی' نمبر تین کی۔

"نمبر دو نے میرے بال کھینچے تھے۔"

اور "نمبر تین کی پلیٹ میں زیادہ چاول تھے۔"

اور محبت اس کے سامنے پڑی سسکتی رہتی ہے' لیکن وہ اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی۔ ملائکہ محب اللہ' جسے محبت کی بہت طلب تھی' لیکن جسے محبت کبھی نہیں ملی تھی۔

***

مرگِ گل سے پیشتر

بچے ماں پر جاتے ہیں یا باپ پر۔

سو اگر سفینہ اور روحیل اماں پر چلے گئے تھے' تو اس پر ان کا کوئی کمال نہ تھا' اور میں اگر ابا پر چلی گئی تھی' تو اس میں میرا کوئی قصور نہ تھا۔ لیکن اماں کے رویے نے ہمیشہ مجھے یہی احساس دلایا کہ سارا قصور میرا ہی ہے۔ میرا رنگ سانولا اور قد دراز تھا۔ باقی نقوش کیا تھے۔ میں نے کبھی ان پر غور نہیں کیا تھا۔ آنکھیں، ناک، ہونٹ اگر متناسب بھی ہوں گے' تو میری رنگت نے ان کی خوبصورتیوں کو دبا دیا تھا' میں نے' تو ہوش سنبھالتے ہی اماں کو یہ ہی کہتے' اور ٹھنڈی آہیں بھرتے سنا تھا۔

"ارے کیا تھا' جو اقصیٰ کا رنگ اپنے ابا پر نہ جاتا۔"

اور میں بہت عرصہ تک یہی سمجھتی رہی کہ یہ میرا ایسا گناہ ہے' جو انجانے میں مجھ سے سرزد ہو گیا ہے' اور جس پر میں کبھی معاف نہیں کی جا سکتی' لیکن پھر ایک روز جب میں کلاس سکس میں پڑھتی تھی۔

اس روز ہمارا ٹیٹوریل گروپ کا پیریڈ تھا' اور مس جعفری سب سے باری باری پوچھ رہی تھیں' کہ وہ کیا بننا چاہتی ہیں۔ جب مجھ سے پوچھا' تو میں نے بتایا کہ میں اماں کی طرح خوبصورت اور گوری بننا چاہتی ہوں۔

بچے ہنسنے لگے' تو مس جعفری ٹیبل کے پیچھے سے ہٹ کر میرے پاس آ کھڑی ہوئیں' اور آہستگی سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"آپ' تو اب بھی بہت خوبصورت ہیں۔"

لیکن مجھے ان کی بات پر یقین نہیں آیا تھا۔ وہ بھی ابا کی طرح جھوٹ بول رہی تھیں۔ ابا
بھی جب کبھی چھٹی پر گھر آتے' تو ضرور مجھے باور کراتے تھے' کہ میں خوبصورت ہوں۔

"میرا بیٹا بہت خوبصورت اور بہت پیارا ہے۔" وہ اکثر کہا کرتے تھے۔

ابا شارجہ میں جاب کرتے تھے' اور سال میں ایک بار دو ماہ کے لیے آتے تھے' اور ان دو
ماہ میں ان کی پوری کوشش ہوتی تھی' کہ وہ مجھے باور کراسکیں کہ میں سنیعہ اور روحیل سے کسی طرح
کم نہیں ہوں۔ شاید وہ جان گئے تھے' کہ اماں اپنی باتوں سے مجھے ہرٹ کرتی ہیں' لیکن جس
طرح مجھے ابا کی بات پر یقین نہیں آتا تھا' اسی طرح مجھے مس جعفری کی بات پر بھی یقین نہیں آیا
تھا' سو میں بے یقینی سے ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ انہوں نے شاید میری آنکھوں میں اترتی بے
یقینی دیکھ لی تھی' تب ہی وہ مسکرائی تھیں' اور نظروں ہی نظروں میں اپنی بات کا یقین دلایا تھا۔

"میں تو یہ پوچھ رہی تھی' کہ آپ ڈاکٹر بنیں گی' یا پروفیسر یا انجینئر۔"

"کچھ بھی نہیں۔" میں لاپروائی سے کندھے اچکا کر اپنی سیٹ پر بیٹھ گئی تھی۔

"میں اتنی لائق نہیں ہوں کہ کچھ بن سکوں، بس زیادہ سے زیادہ میٹرک کرلوں گی' ڈاکٹر تو
سنیعہ بنے گی۔"

پتا نہیں کیوں اچانک میری زبان سے نکل گیا تھا' اور بہت دیر بعد جب میں مس جعفری
کے سامنے ان کے روم میں بیٹھی تھی' تو مجھے یاد آیا تھا۔ ایک بار اماں نے روحیل سے یہ کہا تھا
جب روحیل نے اماں سے پوچھا تھا' کہ اقصیٰ کیا بنے گی' تو تب سے ہی یہ جملہ کہیں اندر میرے
دماغ میں کسی کونے میں محفوظ ہوگیا تھا' اور اب مس جعفری کے پوچھنے پر اس کونے سے پھسل کر
زبان پر آگیا تھا۔

مس جعفری نے تاسف سے مجھے دیکھا' اور واپس اپنی جگہ پر چلی گئیں، لیکن بریک
میں انہوں نے مجھے اپنے روم میں بلایا تھا' اور بہت دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی تھیں
اور انہوں نے ہی اس روز پہلی بار مجھے بتایا تھا' کہ بچے یا ماں پر جاتے ہیں یا باپ پر۔ اور یہ کہ
میں بھی اپنے ابا پر گئی ہوں' اور انہیں تو اس بات پر بہت فخر اور خوشی محسوس ہوتی ہے' کہ وہ اپنے
ابا کے نقش چرا لائی ہیں۔ اور کیا مجھے یہ فخر نہیں ہوتا کہ میں اپنے ابا جیسی ہوں' اور کیا ابا مجھے اچھے
نہیں لگتے۔

مس جعفری کے پوچھنے پر میں کچھ دیر سوچتی رہی تھی۔

"ابا مجھے اچھے تو بہت لگتے ہیں' لیکن میں نے اس بات پر کبھی فخر محسوس نہیں کیا کہ میں

جیسی ہوں، مجھے تو اماں جیسا ہونا اچھا لگتا ہے۔"

میں نے پوری ایمانداری سے مس جعفری کو بتا دیا تھا۔

اماں کتنی خوبصورت تھیں۔ گلابی رنگت، دلکش قامت سانچے میں ڈھلا جسم' لمبے بال،
گھٹنوں تک چھوتے ہوئے، ساحر آنکھیں' جن پر اتنی لمبی لمبی پلکیں تھیں۔

اور سنیعہ بالکل اماں کی کاپی تھی۔

اور روحیل بھی اماں جیسا تھا، ویسی ہی رنگت، ویسے ہی ہونٹ، ہاں اس کی آنکھیں ابا جیسی
تھیں۔

بڑی بڑی خوابناک آنکھیں، پیشانی اور سر بھی ابا جیسا تھا، گھنے سیاہ بالوں سے بھرا سر اور
کشادہ پیشانی۔

"آدمی کی ذات کے دو حصے ہوتے ہیں۔ ایک اس کی ظاہری شخصیت، دوسری باطنی۔
اپنے باطن کو اتنا خوبصورت بنالو کہ وہ تمہارے ظاہر پر حاوی ہو جائے اور تمہارا تو ظاہر بھی بہت
اٹریکٹو ہے۔"

مس جعفری نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی تھی' لیکن میں شروع سے ہی ڈل تھی' اور بہت
جلد مس جعفری کی بات بھول گئی تھی۔ البتہ اتنا ضرور ہوا تھا' کہ میں مس جعفری کے مضمون کو زیادہ
توجہ سے پڑھنے لگی تھی۔ وہ انگلش اور میتھ پڑھاتی تھیں' جبکہ باقی سارے مضامین میں، میں
بالکل صفر تھی۔ شاید لاشعوری طور پر میں مس جعفری کو یہ باور کرانا چاہتی تھی' کہ مجھے اس کی بات کا
کوئی غم نہیں ہے کہ میں ابا جیسی ہوں۔ لہٰذا میں ان کی کلاس میں خوش رہنے کی ایکٹنگ کرتی تھی'
اور ان کے مضمون میں سب سے زیادہ نمبر لیتی تھی۔ اس کے لئے مجھے اچھی خاصی محنت کرنا پڑتی
تھی۔ مس جعفری ہر ٹیسٹ پر میری بہت تعریف کرتی تھیں۔

شاید لاشعوری طور پر میں ان کی تعریف سننا پسند کرتی تھی۔ بہرحال جو کچھ بھی تھا' میں ان
کے مضمون میں سب سے بہتر تھی۔

حالانکہ تین سال قبل کلاس تھری میں ان ہی دو مضامین میں فیل ہونے کی وجہ سے مجھے
سینٹ جوزف سے نکال دیا گیا تھا، جہاں سنیعہ اور روحیل پڑھتے تھے۔ جس پر مجھے اس اسکول
میں داخل کرادیا گیا تھا۔ سرسید پبلک اسکول میں مجھے سینٹ جوزف اور اس اسکول کی پڑھائی اور
اسٹینڈرڈ میں کوئی خاص فرق محسوس نہیں ہوا تھا۔ بس اس کا نام بڑا تھا، یہاں بھی وہی سلیبس تھا'
اور ٹیچرز زیادہ محنت سے پڑھاتے تھے۔ لیکن میرا مسئلہ یہ تھا' کہ میں بہت ذہین نہیں تھی' اور یہ

بات بچپن سے ہی میں جانتی تھی' کہ میں بہت ذہین نہیں ہوں۔ عام طور پر مجھ جیسی لڑکیاں جو شکل وصورت میں کچھ کم ہوتی ہیں، وہ پڑھائی اور دوسرے کاموں میں تیز ہوتی ہیں' لیکن میرے ساتھ ایسا نہیں تھا۔ میں پڑھائی میں بھی پیچھے تھی' اور باقی کاموں میں بھی صفر۔

اللہ تعالیٰ نے مجھے شکل وصورت تو ابا جیسی دی تھی' لیکن ذہن ان جیسا نہیں دیا تھا۔

ابا شارجہ میں انجینئر تھے' اور اپنے تعلیمی دور میں انہوں نے کامیابیوں کے جھنڈے گاڑ دیئے تھے۔ ہمیشہ بورڈ میں پوزیشن لی۔

اگر میں بھی ابا کی طرح پوزیشن لوں تو اخبارات میں، ٹی وی اور ریڈیو پر انٹرویو آئیں اور اماں، ابا سنیعہ روحیل سب ہی مجھ پر فخر کریں۔ لیکن میں ایسا صرف سوچتی تھی' عملی طور پر میں نے کبھی اس کے لئے کوئی کوشش نہیں کی تھی۔

اس کی ایک سب سے بڑی وجہ یہ تھی' کہ میں سست بہت تھی' اور پڑھنا ایک اچھا خاصا محنت طلب کام تھا۔ میں تو ہوم ورک بھی صرف ان ہی ٹیچرز کا کیا کرتی تھی' جو سزا دیتی تھیں۔

باقی مار کھانے سے مجھے خوف آتا تھا۔ یہ نہیں کہ میں ڈرتی تھی، لیکن مجھے درد بہت ہوتا تھا' اور میرے اندر شاید قوتِ برداشت کی بہت کمی تھی۔ سو میں ان کا کام بھی کرلیا کرتی تھی' جو مارتی تھیں' اور عام طور پر اسکول میں ہی جب تک گاڑی لینے آتی کرلیا کرتی تھی۔ یا پھر کوئی ٹیچر کلاس میں نہ آتا' تو کرلیا کرتی تھی۔ کلاس سے نکلنا تو مجھے بہت پسند تھا' باہر خوب نظارے ہوتے اور پڑھنا بھی نہیں پڑتا تھا۔ اس لیے میڈم صندل کا کام تو میں نے کبھی زندگی بھر کیا ہی نہیں تھا۔

مجھے ٹی وی دیکھنا اور کہانیاں پڑھنا بہت پسند تھا۔ جب تک مجھے کہانیاں پڑھنے کا چسکا نہیں پڑا تھا' تب تک میں صرف ٹی وی دیکھا کرتی تھی۔

اسکول سے آتے ہی میں بیگ ٹی وی لاؤنج میں ہی پھینک دیتی تھی' اور پھر وہیں کسی صوفے پر دونوں پاؤں رکھ کر آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتی تھی۔ کھانے کے لیے بھی مجھے کئی بار بلایا جاتا تب جاتی۔ ان دنوں مجھے سونا بھی بہت پسند تھا۔

اکثر یونیفارم بھی تبدیل نہ کرتی تھی' اور یوں ہی بستر میں گھس جاتی تھی۔ اماں میری کاہلی پر بہت چڑتی تھیں۔ ان کا خیال تھا' کہ مجھے سنیعہ اور روحیل کے لیے اچھی مثال بننا چاہیے' جب کہ میں بڑی ہوں ان سے، لیکن مجھے اعتراف ہے کہ میں ان کے لیے کبھی اچھی مثال نہ بن سکی۔

سنیعہ میں بہت سلیقہ تھا۔ وہ اگرچہ مجھ سے دو سال چھوٹی تھی' لیکن وہ اسکول سے آکر

پہلے یونیفارم تبدیل کرتی' پھر کھانا وغیرہ کھا کر ہوم ورک کرتی' اور سلیقے سے اپنا بیگ اور کتابیں اپنی جگہ پر رکھتی جب کہ خدانخواستہ اگر مجھے ہوم ورک کرنا پڑتا تو میری کتابیں پورے کمرے میں پھیلی ہوتی تھیں۔

میرا اور سنیعہ کا کمرہ ایک ہی تھا' اور کمرے میں داخل ہوتے ہی پتا چل جاتا تھا' کہ میرا بیڈ کون سا ہے۔ میرے بیڈ پر میری ضرورت کی ہر چیز ہمہ وقت موجود رہتی تھی۔ میرے بینڈ، میرا اسکول بیگ' جسے اماں ہمیشہ کرامت بابا کے ساتھ ٹی وی لاؤنج سے اٹھوا کر میرے کمرے میں بھیجتی تھیں۔ میرا ٹیڈی بیئر، میری ایک دو گڑیاں اور ایسی ہی بے شمار چیزیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ چیزوں کی نوعیت بدلتی رہی' لیکن بیڈ پر سامان کی زیادتی کا یہی عالم رہا۔

سنیعہ موڈ میں ہوتی تو اکثر میری چیزیں ترتیب سے رکھ دیتی تھی' لیکن میں پھر انہیں بگاڑ دیتی تھی۔

جب مس جعفری سے میری دوستی ہوئی' تو مجھے کہانیاں پڑھنے کا چسکا پڑ گیا۔ دراصل میری ریڈنگ بہت کمزور تھی۔ اردو، انگلش دونوں کی۔ انہوں نے مجھے کتابیں پڑھنے کے لیے دیں۔ شروع شروع میں میں نے وہ کتابیں اس لیے پڑھیں کہ مس جعفری نے انہیں پڑھنے کے لیے دیا تھا۔ لیکن بعد میں مجھے مزا آنے لگا' اور میں اپنے سارے جیب خرچ سے کہانیوں والی کتابیں خرید لیتی تھی۔ اب میں سونے کے بجائے کہانیاں پڑھا کرتی تھی۔

ٹی وی دیکھنا، کہانیاں پڑھنا یا پھر آنکھیں موندے بستر پر لیٹے سوچنا کہ کیا ہی اچھا ہو کہ کبھی کوئی نیک پری کبھی کوئی جادوگر مجھے بھی مل جائے اور مجھے بھی اپنے جادو سے اماں جیسا بنا دے۔ بالکل ایسے جیسے نیک دل پری نے بوڑھی عورت کو اپنے جادو سے جوان بنا دیا تھا' اور خوبصورت بھی، کبھی کبھی میں سوچتی تھی' کیا ہی اچھا ہوتا اگر مس جعفری نیک دل پری ہوتیں تو وہ ضرور مجھے جادو کی چھڑی سے اماں جیسا خوبصورت بنا دیتیں۔

مس جعفری مجھے خوبصورت تو نہ بنا سکی تھیں' لیکن مجھے کتابوں کا رسیا ضرور بنا دیا تھا، اس کا فائدہ یہ ہوا تھا' کہ آٹھویں تک پہنچتے پہنچتے میری اردو اور انگلش کی ریڈنگ بہت اچھی ہوگئی تھی۔

میں نے آٹھویں میں ہی تھامس ہارڈی اور سڈنی شیلڈن کو پڑھنا شروع کردیا تھا۔ دراصل اس کے علاوہ میری اور کوئی تفریح بھی تو نہیں تھی۔ اور یوں بھی میں اماں کی خاصی ناپسندیدہ بیٹی تھی۔ اگرچہ اماں نے اس کا اظہار کبھی نہیں کیا تھا۔ لیکن پتا نہیں کیوں خود ہی خود میرے دل میں یہ احساس ہوگیا تھا' کہ اماں مجھے پسند نہیں کرتی ہیں۔ ناپسندیدگی کی سب سے بڑی وجہ تو یہ تھی' کہ

میں ان جیسی خوبصورت نہیں تھی۔

اور دوسری وجہ یہ تھی' کہ میں انتہائی پھوہڑ اور کچھ کچھ بدتمیزی بھی تھی۔ جب کہ سنیعہ بہت سگھڑ، خوش اخلاق اور ہنس مکھ تھی۔ کہانیوں کی شہزادیوں اور لڑکیوں سے مختلف کہانیوں میں عموماً چھوٹی یا بڑی بہت خوبصورت شہزادی مغرور اور ناک چڑھی ہوتی ہے' جبکہ سنیعہ اس کے بالکل برعکس تھی۔ وہ نہ تو مغرور تھی' اور نہ بداخلاق۔ بلکہ اماں کا خیال تھا' کہ میں بہت مغرور ہوں اور جانے یہ غرور کس بات کا ہے۔ سنیعہ ہمیشہ مجھ سے احترام اور پیار سے بات کرتی تھی۔ لیکن میں بہت کم اسے لفٹ کراتی تھی۔ شاید میں لاشعوری طور پر اس سے جیلس تھی' کہ وہ اماں پر چلی گئی تھی' اور میں ابا پر۔

سنیعہ ذہین بھی بہت تھی۔ جب بھی اماں اسے کوئی بات یا کام سکھاتی تھیں وہ فوراً سیکھ لیتی تھی۔ میں کچھ بھی نہ سیکھ پاتی تھی۔ پتا نہیں شاید اماں مجھے اس طرح نہیں سکھاتی تھیں' جس طرح سنیعہ کو سکھاتی تھیں۔ یا میں ہی کوڑھ مغز تھی' کہ سیکھ نہ پاتی تھی۔ سنیعہ کو ہر کام اماں مجھ سے پہلے سکھاتی تھیں۔ اور بعد میں مجھے...... اور سچ تو یہ ہے کہ مجھے سیکھنے سکھانے سے کوئی خاص دلچسپی ہی نہ تھی۔ جب اماں چھ سات دفعہ کہتیں کہ۔

''پنکی نے آج کھیر بنائی ہے۔ اقصیٰ! تم بھی سیکھ لو۔''

تب کہیں بادل نخواستہ میں کچن میں جاتی تو...... کچھ نہ کچھ گڑبڑ ہو جاتی۔

❋ ❋ ❋

ان دنوں ابا چھٹی پر آئے ہوئے تھے' اور ہماری بھی چھٹیاں تھیں' کیونکہ ہمارے امتحان ہو چکے تھے' اور چند دنوں بعد رزلٹ آنے والا تھا، میں زیادہ وقت اپنے کمرے میں گھسی ''جادو سیکھئے'' کتاب پڑھتی رہتی تھی۔ جو میں ابا کے آنے سے چند دن پہلے ہی خرید کر لائی تھی۔ اسٹار بک شاپ ہمارے اسکول کے گیٹ کے ساتھ تھی۔ اس لیے میں وہاں سے کتابیں خود ہی خرید لیتی تھی۔

اس روز میں کوئی نئی کتاب لینے گئی' تو مجھے یہ کتاب نظر آ گئی' اور میں نے خرید لی۔ آدھی سے زیادہ کتاب پڑھنے کے باوجود مجھے کوئی کام کی بات نہیں معلوم ہو سکی تھی۔ میرا خیال تھا' کہ اس میں یقیناً جادو کرنے کے طریقے بتائے گئے ہوں گے۔ اور میں جادو سیکھ کر بالکل اماں جیسی بن جاؤں گی۔ پتا نہیں مجھے اماں جیسا بننے کا کریز کیوں تھا؟ ابا کے آنے کی وجہ سے میں کتاب ختم نہیں کر سکی تھی۔ اس لیے اس روز میں جلدی جلدی کتاب پڑھ رہی تھی' کہ ابا مجھے ڈھونڈتے

ہوئے کمرے میں آ گئے۔ روحیل بھی ان کے ساتھ تھا۔

''اس دفعہ کیا میرا بیٹا مجھ سے ناراض ہے۔''

''نہیں تو ابا......'' میں نے کتاب فوراً تکیے کے نیچے رکھ دی۔

''یہ کیا پڑھ رہی تھیں تم؟''

''کتاب ہے ابا۔''

''آپی جادوگر بننا چاہتی ہیں۔'' روحیل نے ابا کی معلومات میں اضافہ کیا۔

ابا نے تکیہ ہٹا کر کتاب نکال لی' اور اسے الٹ پلٹ کر دیکھتے رہے۔

''آپی! کیا اس میں آدمی کو مکھی بنانے کا طریقہ لکھا ہوا ہے۔'' روحیل نے ابا کے کندھے کے اوپر سے جھانکتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں......'' میں نے غصے سے اسے گھورا۔ ''اور سب سے پہلے تمہیں ہی مکھی بناؤں گی۔''

''اور کیا میں پھر مکھی سے انسان بن جاؤں گا۔''

''نہیں......'' میں نے خوفناک سنجیدگی سے کہا۔ تو وہ خوفزدہ ہونے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے باہر بھاگ گیا۔

ابا نے کتاب بیڈ پر رکھ دی۔

''اقصیٰ بیٹے! اچھی اچھی کتابیں پڑھا کرو، یہ تو بڑی فضول سی کتاب ہے' کہاں سے لی ہے۔''

''یہ میں نے خود خریدی ہے اسٹار بک ڈپو سے، میرا خیال تھا' کہ اس میں سچ مچ کے جادو کا طریقہ ہوگا لیکن یہ تو یونہی ہے۔''

''تو تمہیں سچ مچ کے جادو سیکھنے کی کیا ضرورت پڑ گئی ہے۔''

ابا نے مسکرا کر مجھے دیکھا' اور پھر میرے پاس سے چیزوں کو ہٹاتے ہوئے بیڈ پر بیٹھ گئے۔

''اس لیے ابا کہ جادو کے زور سے امتحانات میں پاس ہو جائیں پتا ہے۔ سنیعہ کہتی ہے آپی اس بار فیل ہو جائیں گی' کیونکہ انہوں نے امتحانوں کے دنوں میں بھی بالکل نہیں پڑھا۔ کہانیوں والی کتابیں پڑھتی رہی ہیں۔''

روحیل ابھی تک دروازے میں کھڑا تھا۔

''سنیعہ کیا نجومی ہے' جو اسے پتا ہے کہ میں فیل ہو جاؤں گی۔ جی نہیں ایسی کوئی بات نہیں

ہے۔ میں تو جادو اس لیے سیکھنا چاہتی تھی' کہ میں اماں اور سعیعہ کی طرح خوبصورت بن سکوں، بالکل ان کے جیسی گوری، چٹی، خوبصورت سی۔"

ابا کے مسکراتے لب ایک دم بھینچ گئے' اور انہوں نے بے حد سنجیدگی سے میری طرف دیکھا۔

"بیٹا! آپ ایسا کیوں سوچتی ہو، آپ تو بے حد خوبصورت ہو۔ میری آنکھوں سے دیکھو۔ مجھے تو اپنی اقصیٰ بیٹی پنکی سے بھی زیادہ خوبصورت لگتی ہے' اور وہ ہے بھی بہت خوبصورت۔

اور مجھے سونی صد یقین تھا' کہ آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔ میرا دل رکھنے کے لیے۔ بے چارے ابا مجھے ان کی اس بے چارگی پر بڑا ترس آیا' اور میں نے بڑی بہادری سے مسکرا کر انہیں دیکھا۔

"ابا پلیز! آپ جھوٹ نہ بولیں۔ مجھے اس بات کا قطعی کوئی دکھ نہیں ہے کہ میں خوبصورت نہیں ہوں۔ یہ تو بس ویسے ہی میں نے سوچا تھا' کہ اماں کی طرح خوبصورت ہو جاؤں۔"

حالانکہ مجھے ہمیشہ ہی اس بات کا غم رہا کہ میں خوبصورت نہیں ہوں۔ لیکن مجھے ابا کا بھی خیال تھا' جو پورے دس ماہ سخت مشقت کے بعد دو ماہ آرام کرنے کے لیے آتے تھے' اور انہیں سکون و آرام کی ضرورت ہوتی تھی۔ اس لیے میں نہیں چاہتی تھی' کہ ابا میرا غم جان کر پریشان ہوں' اور پھر ابا کی پریشانی سے کیا ہوسکتا تھا' کون سا میں اماں جیسی ہو جاتی۔ اگر مجھے اماں جیسا ہونا ہوتا تو کب کی ہو چکی ہوتی' ہر رات ہی تو میں اللہ سے دعا کرتی تھی' کہ صبح اٹھوں تو بالکل اماں جیسی ہو چکی ہوں' سو صبح اٹھتے ہی سب سے پہلے میں آئینے میں خود کو دیکھتی تھی۔ اور پھر مایوس ہو کر بیڈ پر بیٹھ جاتی تھی۔ پتا نہیں اللہ تعالیٰ میری میری دعائیں کیوں نہیں قبول کرتے۔ حالانکہ میں نے اللہ تعالیٰ کو بہت سارے خط بھی لکھے تھے۔ مگر شاید کوئی خط بھی ان تک نہیں پہنچ پایا تھا۔

"بیٹا! میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں۔ آپ بہت پیاری ہو۔ بہت خوبصورت ہو' اور خوبصورتی صرف گوری رنگت میں نہیں ہوتی۔ خوبصورتی انسان کے اندر ہوتی ہے، اس کی شخصیت میں ہوتی ہے۔ اپنی شخصیت میں اتنا حسن پیدا کرلو کہ باقی سب کچھ ثانوی رہ جائے۔"

"لیکن میں اس معاملے میں بھی ڈل ہی ہوں۔ دراصل میں پیدائشی طور پر ہی کم عقل ہوں۔"

ابا حیرانی اور تاسف سے مجھے دیکھتے رہے۔

"یہ سب تم سے کس نے کہا؟"

"یہ سب......" میں نے ایک نظر ابا کو دیکھا۔

حالانکہ ایک بار اماں نے بڑے ماموں سے کہا تھا' جب وہ اپنے بچوں کے ساتھ ہمارے گھر آئے ہوئے تھے' اور میں نے اپنا رپورٹ کارڈ اماں کو دیا تھا' تاکہ وہ اس پر سائن کر دیں اب یہ محض اتفاق تھا' کہ پہلی ٹرم میں سوائے انگلش اور میتھ کے' میں سب ہی میں اڑ گئی تھی' اور اماں نے میرا کارڈ ماموں کی طرف بڑھا دیا تھا۔ ساتھ ہی انہیں بتایا تھا' غالباً یہ جتانے کے لیے کہ اگر میں فیل تھی' تو اس میں قصور میرا نہیں تھا' بلکہ میں پیدائشی طور پر ہی کم عقل تھی۔ مجھے اس وقت اماں پر بہت پیار آیا تھا' اور نہ ماموں خوامخواہ میں سمجھتے کہ میں کام چور اور نالائق ہوں۔

مگر اس وقت میں نے ابا کے سامنے کریڈٹ خود لے لیا' اور یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ میں خود بھی کچھ سمجھ رکھتی ہوں کہہ دیا۔

"یہ سب کون کہے گا' مجھے خود پتا ہے۔"

میں نے بڑے فخر سے انہیں دیکھا۔

حالانکہ میں نے جھوٹ کبھی نہیں بولا' لیکن پتا نہیں کیوں مس جعفری کے علاوہ میرا جی چاہتا تھا' کہ ابا جب بھی گھر آئیں تو میری تعریف کیا کریں، مگر ابا نے میری سمجھ کی تعریف نہیں کی' بلکہ سر جھکا کر بیٹھے کچھ سوچتے رہے۔

"ابا......!" روحیل پھر آ دھمکا "اماں کہہ رہی ہیں آپ کو بٹ صاحب کو فون بھی کرنا ہے۔"

"ہاں کرلوں گا۔" ابا نے چونک کر اسے دیکھا۔

اور یہ پتا نہیں اماں کو سارے کام اسی وقت میں کیوں یاد آتے ہیں' جب ابا میرے پاس بیٹھے ہوتے ہیں۔ اب کتنے دنوں بعد ابا میرے پاس آ کر بیٹھے تھے۔ حالانکہ انہیں شارجہ سے آئے دس دن ہو گئے تھے۔ ان دس دنوں میں وہ اتنے مصروف رہے تھے، کوئی نہ کوئی ملنے چلا آتا تھا۔ سعیعہ تو ہر وقت ادھر ہی گھسی رہتی تھی' جہاں ابا ہوتے تھے۔ لیکن مجھے خوامخواہ مہمانوں کے سامنے جانا پسند نہ تھا۔ ایک تو جب مجھے اسکول نہیں جانا ہوتا تھا' تو میرے بال الجھے رہتے تھے' میں کئی کئی دن تک نہ تو کنگھی کرتی تھی' نہ ہی کپڑے بدلتی تھی۔ دراصل میرے بال اتنے لمبے اور گھنے تھے' کہ مجھ سے خود سے سلجھائے نہیں جاتے تھے۔ حالانکہ اماں نے کئی بار مجھے مشورہ دیا تھا' کہ بال کٹوا دوں، کم از کم کنگھی کرنے کے جھنجھٹ سے بچ جاؤں گی، لیکن ابا کو لمبے بال پسند تھے'

میں نے ایک بار سنا تھا' کہ وہ اماں کے لمبے بالوں کی تعریف کر رہے تھے اور یہ بھی میں نے سوچا تھا' کہ چلو ایک چیز تو اماں جیسی ہے۔ اور اس حالت میں مہمانوں کے سامنے جانے سے اماں کی بے عزتی ہوتی تھی۔ اور اماں کو اس بات پر بے حد غصہ آتا تھا' اگر میں یوں میلی کچیلی کسی مہمان کے سامنے چلی جاتی تھی۔

سو آج ابا اتنے دنوں بعد میرے پاس آ کر بیٹھے تھے' اور اماں کو یاد آ گیا تھا' کہ انہیں بٹ صاحب کو فون کرنا ہے، میں نے گھور کر اسے دیکھا' جیسے وہ خود ہی تو ابا کو بلانے آیا ہو۔

''ابا! پنکی کہتی ہے کہ آپی کبھی بھی پاس نہیں ہو سکتیں یہ دیکھیں۔'' اس نے میری وارڈ روب کھول دی۔ جس میں کپڑوں کے بجائے کتابیں بھری تھیں۔

''آپی نے یہ سب پڑھ کر امتحان دیا ہے۔''

اس نے ایک کتاب اٹھا کر ابا کے ہاتھ میں دے دی۔

میں نے اسے مکا دکھایا۔ حالانکہ اس سے پہلے روحیل اور سعیعہ کے ساتھ کبھی لڑائی نہیں ہوئی تھی۔ لیکن آج میرا جی چاہ رہا تھا' کہ اسے دو تین زوردار گھونسے لگاؤں، بڑا آیا شرلاک ہومز کہیں کا۔

ابا کے ہاتھ میں Snow white and seven dwerf تھی۔ اور وہ اس کی ورق گردانی کر رہے تھے۔

''بیٹا! وارڈ روب تو کپڑوں کے لیے ہوتا ہے' اپنی یہ کتابیں آپ شیلف پر رکھا کریں۔''

اب ابا کو کیا پتا کہ یہ کتابیں میں نے کہاں کہاں رکھی ہوئی ہیں۔ آدھی سے زیادہ کتابیں تو میرے گدے کے نیچے تھیں۔ کچھ جوتوں کے خالی ڈبوں میں ڈال کر میں نے اپنے بیڈ کے نیچے رکھی ہوئی تھیں۔

تب ہی اماں نے بذات خود کمرے کے دروازے سے اندر جھانک کر انہیں اطلاع دی کہ کوئی صاحب ان سے ملنے آئے ہیں' اور ابا یونہی کتاب ہاتھوں میں اٹھائے اٹھائے باہر چلے گئے۔ روحیل متوقع ڈانٹ نہ پڑنے سے ازحد مایوس سا کھڑا تھا۔ مجھے اس کی مایوسی سے بڑی کمینی سی خوشی ہوئی' اور میں نے اس کا منہ چڑایا۔

''ابا مجھے کبھی نہیں ڈانٹتے۔''

''ہاں پنکی بھی یہی کہتی ہے کہ ابا تمہیں نہیں ڈانٹتے' لیکن اب کی بار جب ابا تمہاری رپورٹ کارڈ دیکھیں گے تو......''

وہ بات ادھوری چھوڑ کر باہر بھاگ گیا، لیکن میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا تھا' کہ اگر میں فیل ہو گئی تو ابا کو رپورٹ کارڈ ہرگز نہیں دکھاؤں گی' بلکہ وہاں ہی پھاڑ دوں گی۔ حالانکہ جب سے میں سرسید اسکول میں آئی تھی' کسی نہ کسی طرح پاس ہو ہی جاتی تھی۔

میں پریشان سی رات تک اپنے کمرے میں ہی بیٹھی رہی' اور ٹی وی دیکھنے کے لیے بھی باہر نہیں نکلی۔ حالانکہ اس روز ٹی وی پر میری پسندیدہ سیریل اوشین آنی تھی' بلکہ میں کھانے کے لیے بھی نہیں گئی' اور سر سے پاؤں تک چادر اوڑھے سونے کی ایکٹنگ کرتی رہی۔ پہلے کرامت مجھے بلانے آیا پھر سعیعہ اور روحیل دیکھنے آئے۔ میں سوتی بنی رہی اور جب مجھے یقین ہو گیا کہ سب کھانے میں مصروف ہوں گے تو میں نے چادر اتاری اور جھک کر بیڈ کے نیچے سے جوتوں والا ڈبہ نکال رہی تھی' کہ ابا آ گئے ان کے ہاتھ میں Snow white and seven dwerf تھی۔

''تم کھانا کھانے نہیں آئیں؟''

''وہ میں سو رہی تھی۔'' ابا کو دیکھ کر میں کھڑی ہو گئی تھی۔ ''اور پھر مجھے بھوک بھی نہیں تھی۔''

ابا چند لمحے خاموشی سے مجھے دیکھتے رہے۔ پھر میرے بیڈ پر بیٹھ گئے' اور مجھے بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''اقصیٰ بیٹے! یہ لو اپنی کتاب اور ہاں اس کتاب میں ایک خط تھا' جو تم نے اللہ تعالیٰ کو لکھا تھا' میں نے وہ خط پڑھ لیا ہے۔'' میں نے کتاب ابا سے لے لی۔

یہ کتاب تو میں نے بہت پہلے پڑھی تھی۔ جب سیونتھ میں تھی' اور تب ہی وہ خط بھی لکھا ہوگا اور میں تو اکثر اللہ تعالیٰ کو خط لکھتی رہتی تھی۔ کیونکہ مجھے اللہ سے بہت سے گلے تھے' اور اب پتا نہیں اس خط میں کیا لکھا تھا۔ شاید وہ خط میں پوسٹ کرنا بھول گئی تھی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے ابا کی طرف دیکھا۔ لیکن ابا کے چہرے پر غصہ ذرا بھی نہ تھا' بلکہ وہ کچھ اداس اداس سے لگ رہے تھے۔

''ابا! آپ نے ابھی کھانا نہیں کھایا؟''

''ہاں مجھے بھی بھوک نہیں ہے۔''

''بیٹا! آپ اتنا اچھا خط لکھتے ہو۔ تو اب ایسا کرنا مجھے خط لکھا کرنا۔ پتا ہے وہاں میں اداس رہتا ہوں' اور جب مجھے تمہارے خط ملیں گے تو میرا دل بہل جائے گا۔ یہ جو ٹیلی فون ہے نا، اس نے خطوط لکھنے کا چارم ختم کر دیا ہے۔ میرا تو بڑا جی چاہتا ہے کہ کوئی مجھے لمبے لمبے خط لکھے اور

مجھے تو پتا ہی نہیں تھا' کہ ہماری اقصیٰ بیٹی اتنے پیارے پیارے خط لکھ سکتی ہے۔ اور اب جب میں واپس جاؤں گا تو میری بیٹی مجھے خط لکھا کرے گی' وہ ساری باتیں' جو وہ اللہ تعالیٰ کو لکھتی ہے۔"

"ٹھیک ہے ابا......" میں نے وعدہ کرلیا۔ "میں آپ کو خط لکھوں گی۔"

لیکن میں نے دل ہی دل میں سوچ لیا تھا' کہ ابا کو سب باتیں کبھی نہیں لکھوں گی۔ خوامخواہ ابا پردیس میں اداس ہو جایا کریں گے۔

اس رات ابا دیر تک بیٹھے مجھ سے باتیں کرتے رہے' اور اماں کے بلانے پر بھی نہ گئے' یہاں تک سنیعہ بھی کھانا کھا کر کمرے میں آ گئی' اور انہوں نے اس سے بھی بہت سی باتیں کیں' اور ہمیں سمجھایا کہ ہمیں ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ پیار و محبت سے رہنا چاہیے۔

چونکہ رات میں دیر تک جاگی تھی۔ سنیعہ کے سو جانے کے بعد بھی مجھے نیند نہیں آئی تھی۔ متوقع رزلٹ کے خیال سے میری نیند اڑی ہوئی تھی' مجھے اپنے فیل ہو جانے کی اتنی پروا نہیں تھی' لیکن مجھے یہ خیال تھا' کہ ابا دکھی ہوں گے' اور میں نہیں چاہتی تھی' کہ ابا دکھی ہوں۔ سو دیر تک جاگنے سے صبح میری آنکھ دیر سے کھلی تھی' اور جب میں باہر آئی تو ابا ناشتہ کر کے کہیں جا چکے تھے۔ اماں کرامت اور فضل بی بی کے ساتھ کچن میں دن کے کھانے کی تیاری کر رہی تھیں۔ روحیل اور سنیعہ ٹی وی پر کارٹون دیکھ رہے تھے۔

"السلام علیکم اماں!"

"وعلیکم السلام......" اماں نے مڑ کر مجھے دیکھا تھا۔ "تمہارا ناشتہ ٹیبل پر پڑا ہے۔"

اور میں خاموشی سے ناشتہ کر کے اخبار لے کر ٹی وی لاؤنج میں آ گئی۔ اور اخبار میں سے بچوں کا صفحہ پڑھنے لگی تھی۔ جب پڑھ چکی تو ٹی وی دیکھنے لگی۔

ابا کھانے سے کچھ ہی دیر پہلے واپس آئے تھے۔ اور انہوں نے مجھے بتایا تھا' کہ وہ میری کتابوں کے لیے ایک الماری کا آرڈر دے کر آئے ہیں۔ تاکہ مجھے اپنی کتابیں وارڈ روب میں نہ رکھنی پڑیں' اور انہوں نے مجھے دو شاپر پکڑائے تھے۔

"اس میں میری بیٹی کے لیے کپڑے ہیں۔ دیکھو تو......"

اور جب میں نے شاپر کھولا تو یکدم چپ سی ہو گئی تھی۔ اس میں سرخ اور سیاہ پھولوں والا بلوچی ڈریس تھا۔ اور ایک مووَ رنگ کا سوٹ تھا۔ لیکن میں تو سرخ اور سیاہ پھولوں والے اس ڈریس کو دیکھ رہی تھی' جس کے گلے اور بازوؤں پر شیشوں کا کام تھا۔ یہ پچھلے سال کی بات تھی'

جب اماں میرے اور سنیعہ کے لیے تقریباً ایسے ہی ڈریس لائی تھیں' مجھے سیاہ رنگ کا وہ فراک بہت پسند آیا تھا' جس پر سرخ دھاگے سے شیشوں کا کام بنا ہوا تھا۔ لیکن اماں نے وہ فراک سنیعہ کو دیا تھا' اور بالکل ویسا ہی فراک جو ہلکے بادامی رنگ کا تھا' میرے لیے تھا۔ اماں بہت نفاست پسند تھیں' اور ان کا ذوق بہت اعلیٰ تھا۔

"اس رنگ میں تمہارا رنگ اور کالا لگے گا' اس لیے میں نے تمہارا یہ رنگ لیا ہے۔"

اور بلیک فراک کی طرف بڑھتے ہوئے ہاتھ میں نے فوراً پیچھے کر لیے تھے۔ اس روز میں نے اللہ تعالیٰ کو بہت لمبا سارا خط لکھا تھا۔ میرا کتنا دل چاہ رہا تھا' کہ میں وہ بلیک ڈریس پہنوں لیکن۔

"کیوں بیٹا! کیا پسند نہیں آیا۔"

"بہت خوبصورت ہے' لیکن یہ رنگ پہن کر تو میں اور بھی کالی لگوں گی' آپ یہ ڈریس سنیعہ کو دے دیں۔"

میں نے بڑی بہادری سے اپنے بے اختیار امڈ آنے والے آنسوؤں کو پیچھے دھکیل دیا تھا۔

ابا نے تڑپ کر مجھے دیکھا تھا۔

"نہیں بیٹا! یہ کسی نے آپ سے غلط کہا ہے۔ آپ آج شام ہی ڈریس پہنیں گے' اور شام ہم سب باہر کھانا کھانے جائیں گے۔"

پتا نہیں کیوں مجھے لگا تھا' جیسے ابا نے جو خط پڑھا تھا' وہ وہی تھا' جس میں اللہ تعالیٰ سے میں نے شکوہ کیا تھا' کہ میرا رنگ گورا کیوں نہیں ہے تاکہ میں......

"اوکے بیٹا......!"

ابا مجھے حیران چھوڑ کر باہر چلے گئے تھے' اور اس شام میں خوب صابن مل مل کر نہائی تھی۔ تاکہ کچھ گوری ہو جاؤں' اور میں نے بہت ڈرتے ڈرتے وہ ڈریس پہنا تھا۔

لیکن جب میں نے تیار ہو کر خود کو آئینے میں دیکھا تھا' تو میں زیادہ کالی بالکل بھی نہیں لگ رہی تھی، بلکہ مجھے اپنی رنگت پہلے کے مقابلے میں کچھ اچھی ہی لگی تھی۔

اور ابا نے مجھے بہت سراہا تھا۔

"آج ہماری اقصیٰ بیٹی بہت پیاری لگ رہی ہے، کیوں فاطمہ؟"

"ہاں......" اماں نے بڑی بے دلی سے ہاں کی تھی۔ "ویسے آپ کوئی اور رنگ......"

"فاطمہ......!" ابا نے انہیں بات مکمل کرنے نہیں دی تھی۔ "مجھے تم سے گلہ ہے کہ تم نے

اقصیٰ کے سلسلے میں مجھے مایوس کیا ہے۔"

تب اماں کی دلکش آنکھوں میں ایک لمحے کو حیرت سی اتر آئی تھی۔

"میں نے کبھی پنکی اور اقصیٰ میں فرق نہیں کیا۔ ہمیشہ ایک جیسا ایک ہی قیمت کا لباس خریدا۔ ایک ہی طرح دونوں کی تربیت کرنے کی کوشش کی۔"

"ہاں......!" ابا کے چہرے پر ملال کے رنگ بہت واضح تھے۔

"پھر بھی کہیں کوئی کوتاہی ہوئی ہے فاطمہ! جو یہ اس طرح ہوگئی ہے۔"

ابا کی آواز آہستہ تھی، لیکن میں سن رہی تھی۔

"ہر بچہ دوسرے سے مختلف ہوتا ہے عارف، اب پنکی اور اقصیٰ ایک جیسی نہیں ہوسکتیں، دونوں کی نیچر میں فرق ہے۔ مزاج میں فرق ہے، ذہانت مختلف ہیں، آپ نے خود دیکھا ہے اقصیٰ بائے نیچر ہی ایسی ہے۔ کاہل اور لاپروا اور کم ذہن میں نے تو کوئی کوتاہی نہیں کی۔"

اماں سچ ہی تو کہہ رہی تھیں میری طبیعت ہی ایسی تھی۔ میں کبھی بھی سنیعہ جیسی نہیں بن سکتی تھی۔ سنیعہ بچپن سے ہی ذہین تھی' اور پھر سنیعہ اور روحیل کو اماں خود پڑھاتی تھیں۔ میرے لیے انہوں نے ٹیوٹر رکھا تھا۔

"تم بڑی ہو' اس لیے تم ٹیوٹر سے پڑھو، یہ ابھی چھوٹے ہیں اس لیے مجھے خود پڑھانا پڑتا ہے۔"

لیکن میرا جی چاہتا تھا' کہ میں بھی اماں سے پڑھوں اس لیے میں نے کبھی ٹیوٹر سے پڑھنے کی کوشش نہیں کی تھی' بلکہ اس دوران اونگھتی رہتی تھی' یا سر نیچا کر کے سو جاتی تھی۔ نتیجتاً میں کلاس تھرڈ میں فیل ہوگئی اور اماں نے ٹیوٹر کو چھٹی دے دی۔

"اور اس کے لیے تو میں نے اسپیشل ٹیوٹر رکھا تھا' پھر بھی یہ......" نے وضاحت کی لیکن ابا خاموش ہی رہے۔

ابا کے کہنے پر ان کا دل رکھنے کے لیے میں نے وہ بلیک ڈریس پہن تو لیا تھا' لیکن سارا ٹائم جھینپی جھینپی سی رہی' اور ٹھیک طرح سے کھا بھی نہیں سکی۔ حالانکہ چائنیز کھانے مجھے بہت پسند تھے' اور ابا نے میری پسند کی چیزیں منگوائی تھیں۔ لیکن مجھے یوں لگ رہا تھا' جیسے سب لوگ مجھے ہی دیکھ رہے ہوں' اور دل ہی دل میں ہنس رہے ہوں کہ میں نے اپنے رنگ کے ساتھ میچ کر کے کپڑے پہنے ہیں۔ اس لیے میں نے گھر آتے ہی فوراً کپڑے تبدیل کرلیے' اور اس کے بعد میں نے کبھی بھی یہ ڈریس نہیں پہنا' حالانکہ سنیعہ نے بھی جس روز میرا رزلٹ تھا' مجھ سے کہا۔

"اقصیٰ! وہ بلیک والا ڈریس پہن لو' بہت اچھا لگ رہا تھا' تم پر......"

میرا خیال تھا' کہ سنیعہ میرا مذاق اڑا رہی ہے' لیکن جب میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس کا چہرہ مجھے بہت سادہ اور بے ریا سا لگا۔

"سچی اقصیٰ!"

لیکن میں نے سنیعہ کی بات پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ ہمارے اسکول میں رزلٹ والے دن بچے بغیر یونیفارم آتے تھے' جب کہ سنیعہ اور روحیل کے اسکول میں یونیفارم میں جاتے تھے۔ سنیعہ کا بڑا جی چاہتا تھا' کہ رزلٹ والے دن وہ بھی رنگ برنگے کپڑے پہن کر جائے۔ لیکن چونکہ اسے یونیفارم پہننا پڑ رہا تھا' اس لیے وہ مجھے مشورہ دے رہی تھی۔ لیکن میرا تو جی چاہ رہا تھا' کہ یونہی بغیر بال بنائے اور کپڑے تبدیل کیے اسکول چلی جاؤں' متوقع ناکامی کے خیال سے میرا دل دہلا جا رہا تھا' مجھے اپنی تو اتنی پروا نہیں تھی' بس ابا کے دکھ کا خیال تھا' کہ اس بار رزلٹ کے موقع پر ابا یہاں موجود تھے' ورنہ اماں فون پر انہیں بتا دیتی تھیں کہ اقصیٰ پاس ہوگئی ہے' ان کو اماں نے میرے نمبر تو کبھی بتائے ہی نہیں تھے' بس ابا مبارک دیتے ہوئے اتنا ہی کہتے۔

"بیٹا! تھوڑی سی اور محنت کرو تا کہ پنکی اور روحیل کی طرح کلاس میں پوزیشن لو۔"

لیکن اب تو ابا بذات خود اپنی آنکھوں سے میرا رزلٹ کارڈ دیکھیں گے۔ میں نے بڑی بے دلی سے کپڑے بدلے تھے' اور ناشتہ کرتے ہوئے ایک آدھا سلائس مشکل سے کھایا تھا۔

"کیا بات ہے اقصیٰ بیٹے۔"

"کچھ نہیں ابا۔"

"میں بتاؤں۔" روحیل نے شرارت سے مجھے دیکھا۔ "آپی کو اپنے فیل ہونے کا غم ہے۔"

"جی نہیں، میں فیل نہیں ہوں گی۔"

میں نے روحیل کو تو جواب دے دیا تھا' لیکن اندر ہی اندر مجھے یقین تھا' کہ میں ضرور فیل ہو جاؤں گی۔

جاتے جاتے بھی میں نے جادو والی کتاب کو ایک بار پھر پڑھنے کی کوشش کی تھی۔ کہ شاید کوئی ایسا طریقہ مل جائے' جس سے میری ناکامی کامیابی میں بدل جائے' لیکن ابھی میں نے چند صفحے ہی دیکھے تھے' کہ اسکول وین آگئی۔

رزلٹ آنے تک مجھے جتنی سورتیں یاد تھیں' میں نے باری باری پڑھ ڈالی تھیں۔ مجھے تین چار سورتیں ہی زبانی یاد تھیں۔ دراصل میں قرآن بھی نہیں پڑھ سکی تھی' اور اس میں بھی سراسر میری

اپنی غلطی تھی' یا بزدلی تھی۔ پتا نہیں کیوں مجھے مار سے بہت خوف آتا ہے۔

بچپن میں ایک خواب میں بہت دیکھا کرتی تھی' کہ ایک خوفناک شکل والا بندہ ہے' جو ہاتھ میں موٹا سا ڈانڈا لیے کھڑا ہے اور مجھے ڈرا رہا ہے۔ اور مجھے یوں لگ رہا ہے' جیسے خوف سے میری جان نکل جائے گی۔ میں بھاگنے لگتی ہوں' مگر وہ مجھے پکڑ لیتا ہے' اور پھر اس کا بھاری ہاتھ میرے رخسار پر پڑتا ہے' جس سے میرا سر گھوم جاتا ہے۔ پھر دوسرا تیسرا تھپڑ میں اوندھے منہ گر جاتی ہوں میرا ہونٹ پھٹ جاتا ہے' اور خون بہنے لگتا ہے۔

"اگر تم نے اپنی اماں کو تنگ کیا' تو اس سے بھی زیادہ ماروں گا میں' اور پنکھے سے الٹا لٹکا دوں گا' اور پھر تم چمگادڑ کی طرح لٹکی رہو گی۔"

پتا نہیں کیوں یہ خواب میرے ذہن سے چمٹ کر رہ گیا تھا۔ حالانکہ اماں نے تو کبھی ایک تھپڑ تک نہ مارا تھا' اور ابا تو باہر ہوتے تھے' اور جب آتے تھے' تو لاڈ پیار ہی کرتے تھے۔ اور میں تو اب بھی کبھی کبھی یہ خواب دیکھتی تھی' اور بچپن کی طرح ہی خوفزدہ ہو جاتی تھی۔

جب میں پہلے دن مسجد میں گئی تھی' وہاں میں نے مولوی صاحب کو ڈنڈا اٹھائے ایک بچے کو مارتے دیکھا تو مجھے لگا جیسے یہ خواب والا خوفناک بندہ ہے' اور میں وہاں سے بھاگ آئی تھی' اور پھر کبھی نہیں گئی۔ اماں کہہ کہہ کر ہار گئیں۔ پھر تھک کر چھوڑ دیا۔ یوں سنیعہ اور روحیل نے تو قرآن ختم کر لیا تھا' میں نہیں پڑھ سکی تھی۔

یہ سورتیں بھی ہمیں اسکول میں یاد کروائی گئی تھیں، اور آج یہ سورتیں میرے بڑے کام آئیں' اور شاید ان کا ہی اثر تھا' کہ میں پاس ہو گئی تھی۔ اگرچہ پینتیس لڑکیوں کی کلاس میں میری پوزیشن تینتیسویں تھی، لیکن میرے لیے یہ ہی کافی تھا' کہ ابا کم از کم میرے فیل ہونے کے دکھ سے بچ گئے ہیں۔

سنیعہ اور روحیل کا رزلٹ دسمبر میں آجاتا تھا' اور وہ پہلے کی طرح اپنی کلاس میں فرسٹ آئے تھے۔ میں نے میتھس میں سو نمبر لیے تھے' اور انگلش میں نائنٹی تو جب کہ باقی سارے مضامین میں تینتیس فیصد ہی تھے۔

ابا میرا رزلٹ کارڈ ہاتھوں میں لیے کچھ چپ سے بیٹھے تھے۔ روحیل ان کے کندھے کے اوپر سے جھانک کر میرے نمبر دیکھ رہا تھا۔

"آپی نے میتھس اور انگریزی میں ضرور نقل کی ہے۔" اس نے کارڈ ابا سے لے لیا۔

"جی نہیں......" میں نے روحیل کو غصے سے دیکھا جو ان دنوں ہر معاملے میں ٹانگ اڑانے

لگا تھا۔ "میں نقل نہیں کرتی کبھی بھی۔"

"تو پھر کیسے اتنے نمبر آگئے؟"

"اس لیے کہ......" میں نے کارڈ اس کے ہاتھ سے چھین لیا۔ "میتھس اور انگریزی مس جعفری پڑھاتی ہیں' اور وہ مجھے اچھی لگتی ہیں، اس لیے میں ان کا مضمون پڑھتی ہوں۔"

ابا بہت غور سے مجھے دیکھ رہے تھے۔

"اچھا تو آپ نے ضرور مس جعفری کو رشوت دی ہوگی۔"

"جی نہیں وہ رشوت نہیں لیتیں۔"

میں اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی' اور گدے کے نیچے سے عمران سیریز نکال کر پڑھنے لگی۔

عمران سیریز پڑھنے کا ایک فائدہ یہ بھی ہوتا تھا' مجھے کہ' میرے اندر اگر کوئی غصہ ہوتا تو ختم ہو جاتا تھا۔ میں خود ہی پڑھ پڑھ کر ہنستی رہتی تھی۔ اس وقت بھی میں ہنس رہی تھی' کہ ابا کمرے میں آگئے۔ وہ بے حد سنجیدہ لگ رہے تھے۔ میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"بیٹا! مجھے تمہارا رپورٹ کارڈ دیکھ کر افسوس ہوا۔"

"کمال ہے۔" میں نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

"ابا! پاس تو ہوگئی ہوں میں۔"

"صرف پاس ہونا تو سب کچھ نہیں ہوتا نا، میں چاہتا ہوں کہ تم کلاس میں اوّل آیا کرو۔"

"لیکن ابا! میں سنیعہ اور روحیل کی طرح ذہین نہیں ہوں نا۔"

"اس طرح مت کہا کرو۔" ابا کو غصہ آگیا۔

"تم بہت ذہین ہو اگر ذہین نہ ہوتیں تو انگریزی اور میتھس میں اتنے نمبر نہ لیتیں۔"

"وہ تو میں نے آپ کو بتایا ہے نا مس جعفری۔"

"لیکن بیٹا! باقی سارے مضامین بھی تو پڑھنے ہوتے ہیں۔"

"مجھے اچھے نہیں لگتے نا اور مس جعفری تو میری دوست ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ میں بھی خوبصورت ہوں' اور مجھے اس بات پر فخر کرنا چاہیے کہ میں ابا پر گئی ہوں' اور وہ مجھے اچھی اچھی کتابیں بھی دیتی ہیں۔"

"وہ صحیح کہتی ہیں بیٹا!"

ابا نے مجھے اپنے ساتھ لپٹا لیا، ان کی آواز بھاری ہوگئی تھی۔ اور پتا نہیں ابا کو کیا ہوا تھا'

لیکن جب انہوں نے مجھے سینے سے لگایا تو میرے دل میں بھی جیسے آنسو بھر گئے' لیکن میں نے انہیں آنکھوں تک نہ آنے دیا۔

ابا کچھ دیر بیٹھے مجھ سے باتیں کرتے' اور میری کتابیں دیکھتے رہے' اور انہیں اس بات پر بہت حیرت ہوئی کہ میں انگریزی ناول بہت روانی سے پڑھ لیتی ہوں۔ وہ خوش بھی بہت ہوئے۔

اگلی صبح جب میں نئی کلاس میں بیٹھی اپنی نئی کلاس ٹیچر کا بور سا لیکچر سر جھکائے سن رہی تھی' کہ چپڑاسی مجھے بلانے آیا۔ ابا آفس میں آئے ہوئے تھے' اور مس جعفری سے باتیں کر رہے تھے۔

''مس جعفری! میں آپ کا بے حد ممنون ہوں' اور عمر بھر آپ کا احسان مند رہوں گا۔''

جب میں آفس میں داخل ہوئی تو ابا مس جعفری سے کہہ رہے تھے۔

''وہ تو ٹھیک ہے سر! لیکن آپ اتنے پڑھے لکھے ہیں' مگر حیرت ہوتی ہے کہ آپ جیسے لوگوں پر کہ آپ اپنے ہی بچوں میں تفریق کر کے انہیں کمپلیکسز...... میں مبتلا کر دیتے ہیں' حالانکہ ہر بچہ خوبصورت ہوتا ہے۔ رنگ، صورت، شکل۔''

اور پھر مس جعفری کی نظر مجھ پر پڑی' تو انہوں نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''کم آن اقصیٰ، اقصیٰ تو بہت ذہین بچی ہے۔'' انہوں نے ابا کی طرف دیکھا۔

''اگر آپ اس کا انگریزی اور اردو کا مضمون دیکھیں تو یقین نہ آئے کہ یہ کسی آٹھویں کلاس کی بچی نے لکھا ہے۔ ساری کلاس نے رٹے رٹائے مضمون لکھے ہیں جب کہ......''

انہوں نے چپڑاسی کو بلا کر پیپرز منگوائے۔ میں دل ہی دل میں ان کی کم فہمی پر ہنسی کہ وہ مجھے ذہین سمجھتی ہیں۔ حالانکہ میں ذہین بالکل بھی نہ تھی۔ اور یہ مضامین تو میں نے یوں ہی اپنے پاس سے بنا کر اوٹ پٹانگ سے لکھ دیئے تھے۔ میں نے اکثر انگریزی ناول اور کہانیوں کو چھ چھ دفعہ پڑھا تھا' اور بعض جملے میرے ذہن میں رہ گئے تھے' جو میں نے مضمون میں لگا دیئے تھے۔ کیونکہ عمران سیریز پڑھنے کی وجہ سے میں کتاب سے مضمون رٹ ہی نہیں سکی تھی۔

''بیٹا! میں نے آپ کی میڈم سے درخواست کی ہے کہ وہ آپ کو پڑھایا کریں گھر پر بھی۔''

''سچ میڈم؟''

انہوں نے سر ہلا دیا۔

اور مجھے از حد خوشی ہوئی' کیونکہ نائنتھ میں اب میڈم نے صرف انگریزی پڑھانی تھی۔ میتھس تو سر ریاض کے پاس تھا۔

''اور آپ سب مضامین میں اچھے نمبر لیں گی۔''

''جی......!'' میں نے سر ہلا دیا۔

''لیکن اندر سے میں خاصی مایوس تھی' اور میں ابا یا مس جعفری کی غلط فہمی دور نہیں کر سکی تھی' کہ میں اتنی ذہین ہرگز نہیں ہوں۔''

مس جعفری کے گھر میں ان کے والد اور والدہ تھیں' اور ابا کے بے حد اصرار پر وہ اس بات پر راضی ہوئی تھیں کہ چار سے چھ بجے تک وہ مجھے گائیڈ کریں گی' اور یہ کہ مجھے ان کے گھر جانا پڑے گا۔ کیونکہ وہ خود کسی کے گھر جا کر نہیں پڑھاتیں۔ ابا نے کہا تھا' کہ ڈرائیور مجھے چھوڑ جایا کرے' گا اور لے بھی جائے گا۔

یوں ابا واپس شارجہ جانے سے پہلے میری پڑھائی کی طرف سے کچھ مطمئن ہو گئے تھے۔

❋ ❋ ❋

جب پہلے روز میں مس جعفری کے گھر جانے لگی' تو روحیل نے پوچھا۔

''آپی! آپ کی میڈم آپ کو قرآن بھی پڑھائیں گی۔''

''کیا مطلب؟'' ابا نے روحیل کی طرف دیکھا۔

''آپی کو تو قرآن پڑھنا بھی نہیں آتا۔'' روحیل کے انکشاف پر ابا حیران رہ گئے تھے۔

''دراصل......!'' میں شرمندہ ہو گئی۔ ''وہ مجھے مولوی صاحب سے ڈر لگتا تھا۔''

تب اماں نے ابا کو ساری تفصیل بتا دی تھی۔

''تمہیں چاہئے تھا' فاطمہ! تم گھر پر کسی مولوی صاحب کا انتظام کر لیتیں۔''

ابا نے تاسف سے اماں کی طرف دیکھا تھا' اور یوں میرے لیے مولوی صاحب کا انتظام بھی ہو گیا۔ مگر یہ الگ بات تھی' کہ مجھے مولوی صاحب کچھ پسند نہیں آئے تھے۔

پہلے ہی روز انہوں نے جس طرح مجھے دیکھ کر حیرت کا اظہار کیا تھا' اس سے میرے پندار پر خاصی چوٹ پڑی تھی۔

ایک تو میری عمر ہی چودہ پندرہ سال تھی، دوسرا میرا قد پانچ فٹ سے اوپر ہی تھا' اور مولوی صاحب ہر روز بڑے واضح الفاظ میں اس بات کا اظہار کرتے تھے۔

''اتنی بڑی ہو کر آپ نے ابھی تک قرآن نہیں پڑھا۔ حد ہو گئی لادینیت کی لاحول

ولاقوۃ۔"

اور تب چند دن بعد ہی میں نے ان کی چھٹی کرا دی۔

"مولوی صاحب اب آپ مجھے پڑھانے نہ آیا کریں۔ ہم نے ایک خاتون کا انتظام کرلیا ہے۔"

اور انہوں نے اس بات کو بہت سراہا۔

"یہ صحیح کیا آپ نے، یعنی لاحول ولا...... آپ نامحرم سے پڑھ رہی تھیں' اور ہمیں بہت ناگوار گزرتا تھا۔"

اماں نے دو ایک روز تک مجھ سے پوچھا' اور اس بات پر تشویش کا اظہار کیا کہ مولوی صاحب کیوں نہیں آرہے اور پھر خود ہی بھول گئیں' اور میں نے بھی اطمینان کا سانس لیا۔ البتہ مس جعفری کے ہاں میں باقاعدگی سے جاتی تھی۔

اور جو کچھ وہ پڑھاتیں' اسے کوشش کر کے یاد بھی کرتی اور مس جعفری درمیان میں باتیں بھی کرتی جاتیں چائے بنا کر والدین کو دیتیں تو میں بھی ان کے ساتھ کچن میں جا کر انہیں چائے بناتے دیکھتی رہتی تھی۔ یوں چائے بنانا مجھے آ گیا تھا۔ بلکہ ایک بار جب مس جعفری کو فلو ہو رہا تھا' تو میں نے چائے بنائی تھی' اور مس جعفری اور ان کے ابا، اماں نے بے حد تعریف کی تھی۔ اور کمال یہ ہوا تھا' کہ میں نے کچن میں کوئی گڑبڑ بھی نہیں کی تھی' حالانکہ گھر میں ایک بار جب ایک دوپہر کو میرے سر میں شدید درد ہو رہا تھا' تو میں چائے بنانے کے لیے کچن میں گئی' تو خود بخود ہی میرے ہاتھ سے گر کر دو پیالیاں ٹوٹ گئیں۔ دودھ سارا ابل کر چولہے پر گر پڑا۔

مس جعفری کبھی کبھار شام کو چائے کے ساتھ پکوڑے یا دہی بڑے یا کلب سینڈوچ بنا لیتیں۔ سو جو جو چیزیں وہ پکاتی تھیں، وہ مجھے بھی پکانا آ گئی تھیں۔

ابا نے جاتے جاتے مجھے تاکید کی تھی' کہ میں انہیں خط لکھا کروں۔ اور وہ ساری باتیں' جو میں اللہ تعالیٰ کو لکھتی ہوں انہیں لکھا کروں' اور انہوں نے اماں سے بھی کہا تھا' کہ اقصیٰ کے خط" پوسٹ کروا دیا کریں۔ یوں ابا کے جانے کے بعد میں نے انہیں کوئی دس خط لکھے تھے۔ مگر پتا نہیں انہیں کیوں نہیں ملے تھے۔

اس روز ابا کا فون آیا تو میں ٹی وی لاؤنج میں ہی تھی۔ اماں شاید کچن میں فضل بی بی کے ساتھ تھیں میں نے ریسیور کیا ابا کی آواز سن کر بہت خوشی ہوئی۔

"ارے ابا! آپ نے اتنے دنوں بعد فون کیا۔ کیا آپ بہت مصروف ہوتے ہیں۔"

"نہیں بیٹا! میں تو فون کرتا رہتا ہوں' لیکن تم کبھی سو رہی ہوتی ہو کبھی مولوی صاحب سے پڑھ رہی ہوتی ہو تو......"

"مولوی صاحب تو......"

میں نے فوراً زبان دانتوں تلے دبالی۔ خوامخواہ پردیس میں ابا دکھی ہوں گے۔

"اور بیٹا! آپ کی پڑھائی کیسی جا رہی ہے؟"

"ابا...... ابا میں فرسٹ ٹرم میں سیکنڈ آئی ہوں۔ دو دن ہوئے ہیں مجھے رپورٹ کارڈ ملا ہے۔ اماں سے سائن کروانا یاد ہی نہیں رہتا۔"

"ارے واہ!" ابا بے حد خوش ہوئے۔ "کیا انعام لے گا میرا بیٹا۔"

"کچھ بھی نہیں، آپ مس جعفری کے لیے اچھا سا گفٹ لے آئیں۔"

"ضرور ان کے لیے بھی لائیں گے اور تمہارے لیے بھی۔ لیکن یہ تو بتاؤ آپ نے مجھے خط کیوں نہیں لکھے۔"

"میں نے آپ کو پورے دس خط لکھے ہیں۔"

میں نے انگلیوں پر گن کر بتایا۔

"لیکن مجھے تو ایک خط بھی نہیں ملا۔"

"میں نے تو اماں کو دیے تھے' کہ وہ پوسٹ کروا دیں"

اور تب ہی اماں نے اندر آ کر مجھ سے ریسیور لے لیا، دوسری طرف شاید ابا نے خطوں کا پوچھا تھا۔

"میں نے تو کرامت کو دے دیے تھے' پوسٹ کرنے کے لیے' اب پوچھوں گی۔"

اور میں ابا سے بات کر کے بے حد خوش ہوئی تھی' اور مجھے اپنا رپورٹ کارڈ یاد آ گیا تھا' جس پر دستخط کروانے تھے۔ میں اماں کو باتیں کرتا چھوڑ کر بیگ سے رپورٹ کارڈ نکالنے چلی گئی۔ اماں، سمیعہ اور روحیل سب کو ہی میرا رزلٹ کارڈ دیکھ کر حیرت ہوئی تھی۔

"ضرور آپی نے جادو سیکھ لیا ہے۔" روحیل نے سمیعہ سے کہا۔

"اور یہ جادو کی چھڑی مس جعفری کے پاس ہے نا اقصیٰ؟" سمیعہ نے مجھ سے پوچھا۔

"ہاں، میڈم مجھ پر بہت محنت کرتی ہیں پڑھاتی ہیں سنتی ہیں' اور پھر ٹیسٹ لیتی ہیں۔"

اس روز اماں کچھ چپ چپ سی تھیں، پتا نہیں کیوں انہیں میرے سیکنڈ آنے پر اتنی خوشی نہیں ہوئی تھی۔

''اور کیا پتا اگلی بار میں فرسٹ آ جاؤں۔''

پہلی بار زندگی میں مجھے اپنے اوپر کچھ یقین سا آیا تھا' کہ میں بھی سدیعہ اور روحیل کی طرح اگر محنت کروں تو فرسٹ آ سکتی ہوں۔ لیکن میرے ساتھ مسئلہ یہ تھا' کہ میں خود انتہائی کاہل اور سست تھی' اور مجھے کہانیاں اور جاسوسی ناول کا پڑھنے کا اتنا چسکا پڑ گیا تھا' کہ میں نے اپنے گھر سے نزدیک ایک لائبریری سے کرامت سے منگوا کر وہاں موجود تقریباً سب ہی ناول پڑھ ڈالے تھے' خاص طور پر ایچ اقبال ...... مظہر کلیم اور ابن صفی کے ناول تو میں نے کئی کئی بار پڑھے تھے' یہ تو مس جعفری تھیں' جن کے پاس بیٹھ کر میں کورس کی کتابیں پڑھ لیتی تھی' ورنہ گھر آ کر تو میں نے کبھی بیگ کھول کر بھی نہیں دیکھا تھا۔

اور ٹریجڈی یہ ہوگئی تھی' کہ اب میں باقاعدگی سے مس جعفری کے ہاں جا نہ پاتی تھی۔ کبھی تو یوں ہوتا کہ میں تیار ہو کر بیٹھتی تو ڈرائیور غائب ہوتا۔

کبھی اماں کو کہیں جانا ہوتا۔

کبھی ڈرائیور اتنا لیٹ آتا کہ میں انتظار کر کر کے تھک چکی ہوتی۔

پھر یوں ہوا کہ اماں نے ایک لیڈی کلب جوائن کر لیا اور اماں کے جانے کا بھی وہی وقت ہوتا' جو میرے جانے کا۔ اماں کبھی ڈرائیور کو بجھوانا بھول جاتیں اور کبھی اتنی دیر سے بھیجتیں کہ وقت گزر چکا ہوتا۔ ظاہر ہے وہ وقت مس جعفری کے کام کا ہوتا تھا۔ انہوں نے کچن میں کام کرنا ہوتا تھا۔ یوں میں مہینے میں دو تین بار ہی جا پاتی تھی' اور یہ دو تین بار کا جانا بھی بس یوں ہی تھا۔ روٹین ڈسٹرب ہونے سے مس جعفری بھی بیزار ہوگئی تھیں اور پڑھائی میں وہ دلچسپی پیدا نہ ہو پاتی تھی۔

''تم ابھی ہائی کلاس میں ہو اقصیٰ! خود پڑھا کرو۔ گھر میں کلاس میں دھیان سے سنا کرو۔'' انہوں نے مجھے سمجھایا تھا' لیکن گھر میں میرے پاس کرنے کو اور بھی بہت سے کام تھے۔

مثلاً ٹی وی دیکھنا، ناول پڑھنا اور سونا۔

''مجھ سے گھر میں نہیں پڑھا جاتا میڈم......!''

''تو پھر باقاعدگی سے آؤ نا۔''

''میں تو آنا چاہتی ہوں لیکن اماں ڈرائیور کو ساتھ جو لے جاتی ہیں۔''

''اقصیٰ! ایک بات پوچھوں؟''

میں نے سر ہلا دیا تو مس جعفری نے پوچھا کہ'' کیا اماں تمہاری سگی ماں ہیں۔''

''ہاں ایک دم سگی۔'' مجھے مس جعفری کی بات پر بہت ہنسی آئی۔

سوتیلی مائیں تو بہت ظالم ہوتی ہیں' میں نے بہت ساری کہانیاں بچپن میں پڑھی تھیں' لیکن اماں تو ذرا بھی ظالم نہ تھیں' نہ کبھی انہوں نے مجھے مارا تھا' بلکہ انہوں نے تو کبھی ڈانٹا تک نہ تھا۔ اور نہ ہی کبھی بھوکا رکھا تھا۔ سدیعہ کے اور میرے کپڑے بھی بالکل ایک جیسے ہوتے تھے۔ بس میرے کپڑوں کا کلر ہلکا ہوتا اور سدیعہ کا شوخ' ظاہر ہے اماں اس بات کا بہت خیال رکھتی تھیں کہ میرے لیے وہ میری رنگت کے حساب سے ہی کپڑے خریدیں۔ بہت یاد کرنے پر بھی مجھے اماں کا کوئی ظلم یاد نہ آیا۔ میں نے مس جعفری کو یقین دلایا کہ اماں کے سوتیلا ہونے کے امکانات صفر برابر بھی نہیں ہیں۔''

''پھر تمہارے ساتھ ان کا رویہ ایسا کیوں ہے؟''

انہوں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔'' تمہارے بہن بھائی تو سینٹ جوزف میں پڑھتے ہیں' اور تمہیں انہوں نے سرسید میں داخل کرایا ہے۔''

''ارے آپ کو نہیں پتا میڈم......'' میں نے ان کی معلومات میں اضافہ کیا۔

''میں تھری کلاس میں فیل ہوگئی تھی' اس لیے انہوں نے مجھے سرٹیفکیٹ دے دیا تھا، یہ ان کا اصول ہے وہ فیل ہونے والے بچوں کو نہیں رکھتے۔''

''خیر تم ریگولر آؤ تو بہتر ہوگا تمہارے لیے۔''

لیکن میں ریگولر نہ ہو سکی، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سیکنڈ ٹرم میں میری اٹھارہویں پوزیشن تھی' اور پھر فائنل میں بھی تقریباً یہی حال رہا۔

❋ ❋ ❋

ابا فائنل رزلٹ پر نہ آ سکے تھے، کچھ پراجیکٹ زیر تکمیل تھے۔ اس لیے ابا لیٹ ہو گئے تھے۔ روحیل نے انہیں فون پر میرے رزلٹ سے مطلع کر دیا تھا۔ اس روز اماں گھر پر نہ تھیں' میں روحیل اور سدیعہ ہی تھے' میں صوفے پر لیٹی سر کے نیچے کشن رکھے ابن صفی کا'' زمین کے بادل'' پڑھ رہی تھی۔ جب روحیل نے مجھے آ کر بتایا کہ ابا کا فون ہے۔ میں ناول وہاں پھینک کر بھاگی۔ ابا نے حال احوال پوچھا' اور اس افسوس کا اظہار کیا کہ میں نے بہت اچھے نمبر نہیں لیے۔ کیا تم مس جعفری کے پاس نہیں جا رہی ہو اقصیٰ۔''

''نہیں ابا! کبھی جاتی ہوں۔ گاڑی ہی فارغ نہیں ہوتی، اماں نے لیڈیز کلب جوائن کر لیا ہے' اور وہ وہاں چلی جاتی ہیں۔ میں نے آپ کو خط میں لکھا بھی تھا' کہ مجھے کوئی دین وغیرہ

لگوادیں یا کرامت سے کہیں وہ مجھے رکشے پر چھوڑ آیا کرے۔"

"مگر بیٹے! مجھے تو آپ کا کوئی خط نہیں ملا۔" ابا کچھ پریشان سے ہو گئے تھے۔

"ابا! آپ کو تو پتا ہے میں خود نہیں پڑھ سکتی۔ میں نالائق جو ہوں۔ وہ تو مس جعفری......!"

اور ابا نے ایکدم ہی فون رکھ دیا یا سلسلہ کٹ گیا۔ اگرچہ ابا سے بہت تھوڑی بات ہوئی تھی' پھر بھی میں خوش ہو گئی تھی۔ اتنے سارے دن ہو گئے تھے' ابا سے بات کیے۔ پتا نہیں ابا کب فون کرتے تھے۔ مجھے پتا ہی نہیں چلتا تھا' اور جب پتا چلتا تو سب سے باتیں کرتے کرتے میری باری آتی تو کارڈ ہی ختم ہو جاتا تھا۔ میں نے سوچ رکھا تھا' کہ جب ابا پاکستان آئیں گے تو ان سے ضرور پوچھوں گی کہ وہ مجھ سے بات کیوں نہیں کرتے۔ اماں کہتی تھیں کہ سعیعہ اور روحیل چھوٹے ہیں پہلے وہ بات کرلیں اور......"

اماں جب واپس آئیں تو میں روحیل اور سعیعہ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھے ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ روحیل نے انہیں بتایا۔

"ابا کا فون آیا تھا۔"

"آج اس وقت کیوں آیا۔ خیریت تھی' نا؟" اماں پریشان ہو گئیں۔

"ہاں......!" سعیعہ نے مڑ کر اماں کو دیکھا۔

"روحیل اور اقصیٰ نے بات کی تھی۔"

"تم نے بات کیوں نہیں کی؟"

"میں تو بات کرتی ہی رہتی ہوں، اقصیٰ کی بات کم ہوتی ہے ابا سے۔ سو اچھا ہوا آج اس نے بات کرلی۔"

سعیعہ اماں کی بات کا جواب دے کر ٹی وی دیکھنے لگی تو دل ہی دل میں مجھے سعیعہ پر بہت پیار آیا۔ سعیعہ میں جہاں اور بہت سی خوبیاں تھیں وہاں یہ صفت بھی تھی' کہ اسے دوسروں کا بھی خیال رہتا تھا۔ میرا اور روحیل کا۔

اماں اور ابا کا۔

لیکن میرے اندر یہ خوبی بھی نہیں تھی' اگر میں کوئی دلچسپ ناول پڑھ رہی ہوتی تو اتنی محو ہوتی تھی' کہ مجھے اردگرد کی خبر نہیں ہوتی تھی۔ ایک بار جب سعیعہ کے سر میں درد تھا' تو مجھے اس کا بالکل خیال نہیں تھا' میں مزے سے اپنی کتابیں پڑھتی رہی، لیکن جب اگلے روز میرے سر میں درد ہوا تو سعیعہ نے کئی بار مجھ سے پوچھا۔

"اقصیٰ ٹیبلٹ لادوں؟"

"بہت زیادہ درد تو نہیں ہو رہا۔"

وغیرہ وغیرہ۔

لیکن شاید پیدائشی طور پر میں بے حس بھی تھی۔ اماں نے کئی بار کہا تھا' کہ میرے اندر بہت بے حسی ہے اور شاید اماں صحیح ہی کہتی تھیں۔ اور پتا نہیں اللہ تعالیٰ نے مجھ میں کوئی بھی اچھائی کیوں نہیں رکھی تھی۔ لیکن شاید یہ میرے اندر کی بے حسی ہی تھی' کہ میں زیادہ دیر کسی بھی چیز کے متعلق نہیں سوچتی تھی۔ سو یہ خیال بھی جلد ہی میرے ذہن سے نکل گیا تھا' اور میں اپنی دلچسپیوں میں کھو گئی تھی۔

❋ ❋ ❋

اماں کو ابا کے فون کا بہت شدت سے انتظار تھا' لیکن ہوا یوں کہ ابا کا فون تو نہ آیا وہ خود آ گئے۔ بالکل اچانک بغیر اطلاع کیے۔ میں اس وقت پورچ کی سیڑھیوں پر بیٹھی تھی' اور ڈرائیور کا انتظار کر رہی تھی' جسے اماں نے ٹیلر کے پاس بھیجا ہوا تھا۔ لیکن ڈرائیور آدھ گھنٹے کا کہہ کر دو گھنٹے سے پہلے نہیں آیا تھا۔ اور اب اگر آ بھی جاتا تو میرا مس جعفری کے ہاں جانا ممکن نہ تھا۔ تب بالکل اچانک ابا آ گئے۔ ٹیکسی سے سامان اتار کر انہوں نے گیٹ کے اندر رکھا۔

"ابا......!" میں دوڑ کر ان سے لپٹ گئی۔ گود میں رکھی کتابیں اور فائل نیچے گر گئی تھی۔

"ابا! آپ بغیر اطلاع کے۔"

"ہاں ہم نے سوچا اپنی بیٹی کو سرپرائز دیں۔"

انہوں نے میری پیشانی کو چوما۔ "اور یہ آپ یہاں بیٹھ کر کیا کر رہی تھیں؟"

"وہ خان بھائی کا انتظار کر رہی تھی' مجھے میڈم کی طرف جانا تھا' پڑھنے۔" میں نے جھک کر اپنی کتابیں اور فائل اٹھائی اور کرامت کو آواز دی۔

"کرامت، کرامت!"

"کرامت میری آواز سن کر باہر آ گیا۔"

"ابا کا سامان اندر لے چلو۔"

ابا کے اس طرح اچانک آنے پر میں سعیعہ اور روحیل بہت خوش تھے' البتہ اماں کچھ پریشان ہو گئی تھیں۔

"خیریت تو ہے نا آپ ٹھیک ہیں؟"

"ہاں خیریت ہے، بس اچانک ہی پروگرام بن گیا۔"

ابا کچھ تھکے تھکے سے لگ رہے تھے۔ حالانکہ جب وہ پہلے آتے تھے' تو بہت فریش ہوتے تھے۔

"لیکن ابا! آپ تو کچھ بیمار بیمار سے لگ رہے ہیں۔" میں ان کے ساتھ جڑی بیٹھی تھی۔

"ارے نہیں، بس سفر کی تھکان ہے۔ آرام کروں گا تو فریش ہو جاؤں گا۔"

انہوں نے بہت پیار سے مجھے دیکھا۔

"تو پھر ٹھیک ہے ابا! آپ کچھ دیر آرام کرلیں۔" میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ "رات کو بیٹھ کر باتیں کریں گے۔"

"ہاں بچو! اپنے ابا کو آرام کرنے دو۔"

اماں نے بھی میری تائید کی۔ تو سعیعہ اور روحیل بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ روحیل تو ٹی وی لاؤنج میں چلا گیا۔ میں اور سعیعہ اپنے کمرے میں آ گئے' اماں بھی ابا کو سو جانے کی ہدایت کرتے ہوئے کچن میں چلی گئیں۔

سعیعہ تو کمرے میں آتے ہی اپنا اسکول بیگ کھول کر بیٹھ گئی' اور میں نے حسبِ معمول ایک ناول اٹھالیا۔ اور پڑھتے پڑھتے سو گئی' کیونکہ ایک تو رات میں دیر تک جاگ کر جاسوسی ناول پڑھتی رہی تھی' دوسرا پھر صبح جلدی اٹھنا پڑ گیا تھا' کہ مجھے ہوم ورک کرنا تھا' اور سر ریاض سے ہاتھوں پر ڈنڈے کھانا مجھے بالکل پسند نہ تھا۔ وہ بالکل لحاظ نہیں کرتے تھے' اور دوسرا مجھے اپنا یونیفارم بھی استری کرنا تھا۔ سعیعہ کی عادت تھی' کہ وہ رات کو ہی اپنا بیگ اور یونیفارم تیار کر کے رکھ دیتی تھی' اور مجھے بھی نصیحت کرتی رہتی تھی' کہ میں بھی رات کو ہی یونیفارم استری کر کے رکھ دیا کروں۔ لیکن میں تو ایسی کاہل اور سست تھی' کہ بعض اوقات یوں ہی یونیفارم اٹھا کر پہن لیتی تھی۔ سعیعہ اس پر بہت چڑتی تھی۔

کم از کم یونیفارم تو ٹھیک کر کے پہنا کرو۔ دو تین منٹ تو لگتے ہیں۔ لیکن مجھے کوئی ایسا خاص پروا نہیں ہوتی تھی' ان باتوں کی۔

پتا نہیں میں کتنی، دیر تک سوئی جب میری آنکھ کھلی تو کمرے میں اندھیرا تھا' اور باہر روشنیاں جل رہی تھیں میں نے کروٹ بدل کر سعیعہ کے بیڈ کی طرف دیکھا وہ بیڈ پر نہیں تھی۔

"ابا یقیناً آرام کر چکے ہوں گے۔"

مجھے ایک دم خیال آیا' اور میں فوراً اٹھ کر بیٹھ گئی۔ تب ہی سعیعہ کمرے میں داخل ہوئی'

اس نے لائٹ جلا کر مجھے دیکھا۔

"ابا جاگ گئے ہیں؟"

"ہاں......" میں نے دیکھا' اس کی آنکھیں گلابی ہو رہی تھیں۔

"کیا ہوا پنکی! سر میں درد ہے کیا؟"

میں نے بیڈ سے پاؤں نیچے لٹکاتے ہوئے پوچھا' حالانکہ میں ایسی باتوں کی طرف دھیان نہیں دیتی تھی' اور نہ ہی اتنی فارمل تھی۔

"اقصیٰ......" سعیعہ میرے بیڈ پر آ کر بیٹھ گئی۔ "تم خود پڑھتی نہیں ہو، محنت نہیں کرتی ہو۔ سارا وقت رسالے اور ناول پڑھتی رہتی ہو اور ابا سمجھتے ہیں کہ اس میں اماں کا قصور ہے۔ اور پتا ہے۔" اس کی آواز بھرا گئی۔

"آج تمہاری وجہ سے پہلی بار ابا اور اماں کی لڑائی ہوئی ہے۔ ابا بہت غصہ ہو رہے ہیں اماں پر۔ اقصیٰ تم خود کو بدل نہیں سکتیں تھوڑا سا۔"

میں نے سعیعہ کی باقی بات نہیں سنی' اور تقریباً بھاگتی ہوئی ابا کے کمرے میں آئی۔ کھلے دروازے میں سے میں نے دیکھا ابا اپنی رائٹنگ ٹیبل کے پاس کھڑے تھے' اور ان کی پیٹھ دروازے کی طرف تھی' اماں بیڈ پر بیٹھی تھیں' اور ان کی پیشانی پر ناگواری سے شکنیں پڑی تھیں۔

"قصور تمہارا ہی ہے فاطمہ بیگم! تم اسے مانو یا نہ مانو۔"

"ابا!" میں یکدم اندر داخل ہوئی۔ اماں نے ناگواری سے مجھے دیکھا۔ ابا بھی پلٹ کر مجھے دیکھنے لگے۔

"ابا! بھلا اس میں اماں کا کیا قصور ہے اگر میں پڑھتی نہیں، محنت نہیں کرتی، یہ تو میری اپنی غلطی ہے نا۔ میرا جی نہیں چاہتا پڑھنے کو' مجھے کورس کی کتابیں بہت بور لگتی ہیں' اور ان کا کوئی فائدہ نہیں دکھتا۔ اور پھر میں اتنی ذہین بھی نہیں ہوں سعیعہ اور روحیل جتنی اگر محنت کر بھی لوں تو اتنے نمبر حاصل نہیں کر سکتی۔"

ابا میز سے ٹیک لگائے مجھے دیکھ رہے تھے۔ اماں کے ماتھے کی شکنیں صاف ہو گئی تھیں۔

"ابا!" میں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ان کے قریب آ کھڑی ہوئی۔

"سارے بچے کبھی بھی ایک جیسے نہیں ہو سکتے' کبھی کبھار ہی ایسا ہوتا ہوگا کہ سب بہن بھائی ایک جیسے ہوں، ایک ہی سی ذہانت کے مالک' ورنہ کوئی بہت ذہین ہوتا ہے کوئی کم ذہین اور کوئی بالکل ہی ڈل ہو سکتا ہے میری طرح۔"

ابا نے یکدم تڑپ کر مجھے دیکھا' لیکن بولے کچھ نہیں۔

''ابا ......'' میں نے ٹیبل پر رکھے ان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

''آپ مجھے سنیعہ اور روحیل کی طرح ہی کیوں دیکھنا چاہتے ہیں' آپ مجھے ایسے ہی Accept کرلیں' جیسے میں ہوں۔ کم ذہن اور کم عقل، اماں سے لڑائی نہ کریں۔''

میرے اندر جل تھل ہونے لگی' حالانکہ میں بہت کم روتی ہوں۔ بلکہ روتی نہیں ہوں کوئی بھی تکلیف کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو۔ بچپن میں ایک بار میں سیڑھیوں سے گر پڑی تھی' اور میرے سر پر بہت شدید چوٹ آئی تھی۔ ٹانکے لگے تھے' تب بھی نہیں روئی تھی۔ میں نے بہت کوشش کی، پھر بھی دو بدتمیز آنسو پلکوں کی باڑ توڑ کر میرے رخساروں پر پھیل آئے۔

ابا نے تڑپ کر بے اختیار مجھے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔

''بیٹا ...... اقصیٰ بیٹا!''

ابا کی آواز بھاری ہوگئی تھی۔ تب ہی فضل بی بی نے اماں سے آکر کچھ کہا تو اماں اٹھ کر باہر چلی گئیں۔ میں نے ابا کے سینے سے لگے لگے دیکھا۔ اماں کے چہرے پر بہت سکون اور اطمینان تھا۔

''ایسا نہیں ہے، ایسا نہیں ہے۔ تمہیں بھلا میں کیوں Accept نہیں کروں گا۔ تم ...... تم تو مجھے بیٹا سب سے زیادہ پیاری ہو۔ سنیعہ اور روحیل سے بھی زیادہ پہلی' اولاد تو والدین کو بہت پیاری ہوتی ہے۔ مجھے اور تمہاری اماں کو کتنا انتظار تھا' تمہارا اور تمہارے آنے سے پہلے ہی ہم نے تمہارے لیے خواب دیکھنے شروع کردیے تھے۔ اور پھر جب تم ہوئیں تو تمہاری ماما تمہیں ڈاکٹر بنانا چاہتی تھی' اور میں کہتا تھا' میری بیٹی انجینئر بنے گی' میری طرح۔''

''ماما، یعنی اماں'' میں نے ابا کی طرف دیکھا۔

''ہاں ......!'' وہ آنسوؤں میں مسکرائے۔

''میں نے یہ کبھی نہیں چاہا بیٹا کہ تم سنیعہ اور روحیل کی طرح ہو جاؤ' لیکن یہ خواہش ضرور ہے میری کہ تم ہمارے خوابوں کے مطابق اعلیٰ تعلیم حاصل کرو۔''

''سوری ابا!''

مجھے از حد افسوس ہوا کہ میں ابا اور اماں کے خوابوں کو پورا نہیں کرسکتی تھی۔ میں افسردہ سی ابا سے الگ ہوکر ان کے سامنے بیڈ پر بیٹھ گئی' اور ان کی طرف دیکھا' ان کے چہرے پر سوز ہی سوز بکھرا تھا۔

''نہیں بیٹا! ابھی تو بہت وقت ہے تمہارے پاس تم اب بھی دل لگا کر پڑھو، محنت کرو تو بہت آگے نکل سکتی ہو۔ مجھے اس کا پورا یقین ہے۔ وعدہ کرو بیٹا! آج سے بہت محنت کرو گی۔''

وہ پُرامید نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔

''جی ابا!'' میں نے کمزور آواز میں کہا' کیونکہ میں جانتی تھی' کہ میں بہت اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی اہلیت نہیں رکھتی' مجھے ابا کے یقین پر خوف محسوس ہوا' اور اگر یہ یقین ٹوٹ گیا' تو ابا کو کس قدر دکھ ہوگا۔

''ابا! میں محنت تو کروں گی لیکن ......'' میں نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔

''آپ جانتے ہیں نا میں بہت زیادہ ذہین نہیں ہوں۔''

اب کے دکھ کی شدت کو کم کرنے کے لیے میں مسکرائی۔

''اور پتا ہے آپ کو مس جعفری کہتی ہیں بچے ماں باپ پر ہی جاتے ہیں۔ میں شکل و صورت میں تو آپ پر چلی گئی ہوں' اور ذہانت میں اماں پر۔ اماں نے بھی تو انٹر سے آگے نہیں پڑھا۔ کیا پتا میں بھی انٹر تک ہی پڑھ سکوں۔ سنیعہ اور روحیل نے شکل اماں کی لی اور ذہن آپ کا لے لیا۔ اور میں نے ذہن اماں کا لے لیا، میں ننھیال پر چلی گئی اور وہ ددھیال پر۔'' میں ہنسی۔

''نہیں، نہیں بیٹا! تمہاری اماں کے خاندان والے تو بہت ذہین، بہت ایجوکیٹڈ لوگ ہیں تمہارے ماموں، تمہاری خالائیں، سب لوگ بہت بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہیں۔''

''اچھا ......!'' مجھے ابا کی بات پر حیرت ہوئی میرا خیال تھا' اماں کے خاندان والے زیادہ ایجوکیٹڈ لوگ نہیں ہیں۔ دراصل مجھے اپنے ماموں، خالاؤں یا ان کی اولادوں سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ یوں بھی اماں کا میکہ ملتان میں تھا' اور ہم لوگ دو تین سال میں ایک آدھ بار ہی ملتان جاتے تھے' وہ بھی چند دنوں کے لیے اور وہاں سے بھی کبھی کبھار ہی کوئی آتا تھا، لیکن میں کم ہی ان سے گھلتی ملتی تھی۔ اپنی عادت کے مطابق سلام دعا کرکے اپنی کتابوں میں گم ہو جاتی تھی' اور جب کبھی ہم ملتان جاتے تھے' تب بھی میں زیادہ گھل مل نہ پاتی تھی، کیونکہ وہاں بھی میرے چھوٹے ماموں کے ایک بیٹے کو ڈائجسٹوں کا چسکہ تھا۔ سو میں جتنے دن وہاں رہتی تھی' انہیں ہی چاٹتی رہتی تھی۔

مجھے ان کی ایجوکیشن یا عہدوں کے متعلق کچھ زیادہ پتا نہ تھا۔

''اور تمہاری اماں تو بہت بے حد ذہین، بہت انٹلیکچوئل ......''

''اچھا ......!'' میں نے ابا کی بات کاٹی۔'' پھر اماں نے پڑھا کیوں نہیں۔ انہوں نے

صرف انٹر کیوں کیا؟''

''بس تمہاری طرح......'' ابا نے چونک کر مجھے دیکھا۔ ''شوق ختم ہو گیا تھا۔ مگر تم نے تو وعدہ کیا ہے نا پڑھو گی۔''

''جی ابا......'' میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ لیکن اندر سے مجھے یقین تھا' پورا کہ ابا کو مجھ سے مایوسی ہی ہو گی۔

ابا صرف پندرہ دنوں کے لیے آئے تھے' لیکن انہوں نے وعدہ کیا تھا' کہ وہ بہت جلد سب کچھ سمیٹ کر ہمیشہ کے لیے پاکستان آ جائیں گے۔ اور اس بات سے ہم تینوں ہی بہت خوش تھے۔ میں، ردحیل اور سمیعہ۔

ان پندرہ دنوں میں ابا نے ہم سب کو خوب گھمایا۔ خوب شاپنگ کروائی۔ وہ مجھے ساتھ لے کر مس جعفری کے ہاں بھی گئے تھے' اور حسبِ وعدہ مس جعفری کے لیے گفٹ بھی لائے تھے۔ خوبصورت سوٹ اور پرفیوم۔

انہوں نے میرے لیے الگ سے گاڑی لے دی تھی۔ تا کہ مجھے ٹیوشن کے لیے جانے میں پرابلم نہ ہو۔ اماں نے کہا بھی تھا' کہ میرے لیے گھر پر کسی ٹیوٹر کا انتظام کر دیں گی۔ لیکن ان کا خیال تھا' کہ میں کسی اور ٹیوٹر سے نہیں پڑھ سکتی' مجھے صرف مس جعفری ہی ہینڈل کر سکتی ہیں' اور یہ صحیح بھی تھا۔

ابا نے ان پندرہ دنوں میں مجھے ڈرائیونگ سکھا دی تھی' لیکن قانونی طور پر ابھی میرا لائسنس نہیں بن سکتا تھا۔ ابا نے ایک الگ ڈرائیور کا انتظام بھی کر دیا تھا۔ یہ ڈرائیور دراصل ابا کے دوست کے ہاں ملازم تھا' اور اس کی ڈیوٹی صرف اتنی ہی تھی' کہ وہ مجھے مس جعفری کے ہاں ڈراپ کر دیا کرے اور پھر پک کر لے۔

اماں کو یہ ساری باتیں پسند تو نہیں آئی تھیں، لیکن انہوں نے ابا سے کچھ نہیں کہا تھا، ابا جاتے ہوئے کافی مطمئن تھے' مس جعفری نے انہیں اطمینان دلایا تھا' کہ وہ میرا بہت خیال رکھیں گی۔ انہوں نے مس جعفری سے کہا تھا۔

''میڈم! میں عمر بھر کے لیے آپ کا ممنون ہوں، آپ کا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔''

مس جعفری چائے بنانے کے لیے اٹھیں تو میں نے ان سے کہا کہ میں بنا لیتی ہوں۔ دراصل مس جعفری کے گھر میں ان کے بوڑھے والدین کے علاوہ اور کوئی نہیں رہتا تھا۔ مس جعفری کچن میں میرے ساتھ آئیں اور مجھے ہدایات دے کر چلی گئیں۔

میں نے چائے دم کر کے رکھی پھر ان کے کہنے کے مطابق پاپڑ تلے اور کچھ اسنیکس وغیرہ پلیٹوں میں رکھ کر جب ڈرائنگ روم میں آئی تو ابا کو حیرت کے ساتھ بہت خوشی ہوئی تھی۔

''اقصیٰ بیٹے! آپ نے تو بہت اچھی چائے بنائی ہے۔''

''ہاں میں نے میڈم سے سیکھا ہے' چائے بنانا۔''

اور تب ابا نے دوبارہ مس جعفری کا شکریہ ادا کیا تھا۔

ابا نے میرے کہنے پر مجھے الگ کمرہ سیٹ کر دیا تھا' اور اس میں الگ سے فون بھی لگوا دیا تھا' تا کہ جب وہ چاہیں مجھ سے بات کر سکیں۔ دراصل سمیعہ نے ابا سے کہا تھا' کہ میں آدھی آدھی رات تک جاگ کر جاسوسی ناول اور فضول کتابیں پڑھتی ہوں' جس کی وجہ سے اس کی نیند ڈسٹرب ہوتی ہے کیونکہ اسے روشنی میں نیند نہیں آتی۔ میری عادت تھی' کہ میں پڑھتے پڑھتے لائٹ جلی چھوڑ کر ہی سو جاتی تھی۔ سمیعہ صحیح کہہ رہی تھی، میں نے اس کی تائید کی تھی۔ سمیعہ کے ساتھ والا بیڈ روم جو عموماً گیسٹ روم کے طور پر استعمال ہوتا تھا' ابا نے مجھے سیٹ کروا دیا تھا۔ میں اپنی اس اہمیت پر بے حد خوش تھی' اور میں نے سوچا تھا' کہ میں ابا کی پوری نہ سہی' آدھی امیدوں پر تو پورا اترنے کی کوشش کروں گی۔ سو اسکول میں بھی دھیان سے پڑھتی اور مس جعفری کے ہاں بھی اب باقاعدگی سے جاتی تھی۔ ابا ہر ہفتے فون پر مجھ سے بات کرتے تھے' اور اب مجھے ابا سے اس بات پر کوئی گلہ نہیں تھا' کہ میری باری پر ان کا کارڈ کیوں ختم ہو جاتا ہے۔ اب مجھے انہیں خط لکھنے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ میں ہر بات ان سے فون پر کر لیتی تھی۔ یوں بھی خط تو انہیں ملتے ہی نہیں تھے' ایک بار ان کے جانے کے بعد کرامت نے مجھ سے گلہ کیا۔

''اقصیٰ بی بی! آپ نے خوامخواہ مجھے صاحب سے ڈانٹ کھلوا دی کہ میں خط صحیح طرح سے پوسٹ نہیں کرتا حالانکہ آپ نے تو مجھے کبھی کوئی خط پوسٹ کرنے کے لیے دیا ہی نہیں تھا۔ میں نے تو بتا دیا تھا۔ میں نے تو بتا دیا تھا' صاحب کو صاف صاف کہ اقصیٰ بی بی نے مجھے کبھی کوئی خط نہیں دیا۔''

''ہاں تو میں اماں کو خط دیتی تھی' اب مجھے کیا پتا اماں کس کو خط دیتی رہیں۔ پوسٹ کرنے کے لیے۔''

''ہاں صاحب نے پوچھا تو تھا' بی بی صاحب سے۔''

''تو ٹھیک ہے اماں نے بتا دیا ہوگا۔ تم خوامخواہ باتیں نہ بناؤ۔ میں پوچھ لوں گی اماں سے کہ وہ خط کس کو دیتی تھیں۔''

میں نے اسے بھگا دیا۔ بعد میں مجھے اماں سے پوچھنا یاد ہی نہیں رہا۔

❋ ❋ ❋

میں بہت مگن تھی۔ اور بہت خوش مجھے لگتا تھا' جیسے میں ایک دم بہت امیر ہوگئی ہوں۔ اپنا کمرہ، اپنی گاڑی، اپنا فون۔ سنیعہ اور روحیل بھی مجھے رشک سے دیکھتے تھے۔ ابا نے مجھے میرے پسندیدہ رنگوں کے ڈھیروں کپڑے خرید کردیے تھے۔ وہ الگ سے میرے نام مجھے جیب خرچ بھیجنے لگے تھے۔ حالانکہ پہلے بھی مجھے پاکٹ منی ملتی تھی۔ لیکن وہ پاکٹ منی اماں دیا کرتی تھیں مگر اب ابا ڈائریکٹ میری طرف بھیجنے لگے تھے۔

ایک بار میں سنیعہ اور روحیل کو مس جعفری کے پاس بھی لے گئی۔

"میڈم! یہ میری بہن اور بھائی ہیں' دونوں بہت لائق ہیں اور ہمیشہ فرسٹ آتے ہیں۔

"تم بھی اگر محنت کرو تو فرسٹ آسکتی ہو۔" مس جعفری نے مسکرا کر مجھے دیکھا تھا۔

"کیوں سنیعہ! ٹھیک کہہ رہی ہوں نا میں۔"

"بس میڈم!" سنیعہ بہت مودب تھی۔ "اقصیٰ ذہین تو ہے لیکن لاپروا ہے۔"

"دراصل......" روحیل کی آنکھوں میں شرارت تھی۔

"بجو کو عمران اور فریدی بننے کا شوق ہے، جاسوس بننا چاہتی ہیں۔"

"اور آپ کیا بنیں گے؟"

"انجینئر جبکہ سنیعہ ڈاکٹر بنے گی۔"

اور وہ دونوں کتنے اچھے تھے' ابا کا اور اماں کا خواب پورا کریں گے اور ایک میں تھی' نالائق۔

میں افسردہ ہوگئی اور اس روز گھر آکر میں نے سارے ناول، میگزین اور ڈائجسٹ اٹھا کر الماری میں لاک کردیے' اب انہیں امتحان کے بعد ہی پڑھوں گی۔ لیکن میں زیادہ دنوں تک اپنے عہد پر قائم نہ رہ سکی تھی۔

اچانک ہی مس جعفری کی شادی طے پاگئی تھی' اور شادی کے بعد نہ صرف یہ کہ انہوں نے جاب چھوڑ دی تھی' بلکہ وہ رخصت ہوکر کراچی چلی گئی تھیں۔ میں ازحد اداس تھی۔ سنیعہ نے مجھے مشورہ دیا کہ میں ان کے ٹیوٹر سے پڑھ لیا کروں۔ لیکن میرا موڈ ہی نہیں بنا۔ حالانکہ ابا نے بھی کہا کہ میں اب ان کے ہی ٹیوٹر سے ہی پڑھ لیا کروں۔ سنیعہ نائنتھ میں تھی' اور میں میٹرک میں۔ لیکن ابا سے وعدہ کرنے کے باوجود میں سنیعہ کے ٹیوٹر سے پڑھنے نہ گئی۔ حالانکہ جب وہ

پڑھانے آئے تو سنیعہ مجھے بلانے بھی آئی کہ سر آگئے ہیں اور اماں نے بھی ایک دو بار کہا، لیکن میں نے سوچا۔ خود ہی پڑھ لوں گی۔ یاد ہی تو کرنا ہے۔ میتھس ویسے ہی مس جعفری نے مجھے ختم کروادیا تھا' اور میں نے مس جعفری سے وعدہ بھی کیا تھا' کہ میں اب خود سے ہی دل لگا کر پڑھوں گی۔ اور کچھ دن میں باقاعدگی سے پڑھتی بھی رہی اور ہوم ورک بھی کرتی رہی لیکن پھر ہولے ہولے یہ روٹین ٹوٹ ہی گئی۔ اسکول سے آکر میں کچھ دیر آرام کرتی اور جب روحیل اور سنیعہ کے سر آتے پڑھانے' تب میں بھی اپنی کتابیں لے کر بیٹھ جاتی تھی' کہ جو کچھ اسکول میں پڑھایا گیا ہے اسے دہرالوں۔ لیکن ان ہی دنوں اماں کو خیال آیا تھا' کہ میں اتنی بڑی لوتھا کی لوتھا ہوگئی ہوں اور ابھی تک مجھے چاول بھی ابالنے نہیں آتے جبکہ بقول ان کے سنیعہ مجھ سے چھوٹی ہونے کے باوجود اچھی خاصی کوکنگ کرلیتی تھی۔

"اقصیٰ بیٹے!" اس روز میں ایک نیمریکل کے ساتھ الجھی ہوئی تھی' جو کسی طرح سے حل نہیں ہو پا رہا تھا' کہ اماں میرے کمرے میں آگئیں۔

"میری خواہش ہے کہ تم کچھ کوکنگ وغیرہ بھی سیکھ لو۔"

"جی اماں!" میں نے فائل رکھ دی۔ حالانکہ اماں کے آنے سے پہلے میں سوچ رہی تھی' کہ سنیعہ کے ٹیوٹر سے یہ نیمریکل سمجھ لوں۔

"تو آؤ بیٹا! آجاؤ کچن میں، اس وقت میں فارغ ہوں۔"

ظاہر ہے اماں اسی وقت فارغ ہوتی تھیں۔ میں اماں سے کوکنگ سیکھنے لگی۔ لیکن اماں کا طریقہ صحیح نہیں تھا۔ وہ سب کٹنگ وغیرہ مجھ سے کرواتیں، لیکن پکانے کا کام خود ہی کرتی تھیں' میں بس کھڑی دیکھتی رہتی تھی۔ یوں میں کچن میں اماں کے ساتھ کھڑی ہوکر انہیں شام کے لیے سالن بناتے دیکھتی رہتی تھی۔ فارغ ہونے تک سر پڑھا کر چلے جاتے تو ہمیشہ کی طرح ٹی وی دیکھا جاتا مجھے خود ٹی وی دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ آخری پروگرام تک ٹی وی دیکھتی تھی۔

پھر اماں نے میری ڈیوٹی پھلکے بنانے کی بھی لگادی تھی۔ لیکن اماں کا خیال تھا' کہ روٹی بنانا پریکٹس سے ہی آسکتا ہے چنانچہ رات کے کھانے پر اب میں ہی پھلکے بنایا کروں۔ اور جب میں ماہر ہوجاؤں گی تو یہ کام سنیعہ کے سپرد کردیا جائے گا۔

"بیٹا! لڑکیوں کو ہر کام آنا چاہیے اور تمہیں پتا ہے کہ تمہارے ابا ہر کام میں تمہیں پرفیکٹ دیکھنا چاہتے ہیں۔"

سو نہ چاہتے ہوئے بھی میں یہ کام کرنے لگی۔

اگرچہ شروع میں تو یہ کچھ دن عجیب ٹیڑھے میڑھے سے پھلکے بنے لیکن بعد میں کچھ بہتر ہوگئے اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں رات گئے تک بمشکل ہوم ورک ہی ایک دو مضامین کا کرپاتی اور مجھے نیند آجاتی تھی' اور سونے سے پہلے مجھے عمران سیریز کا نیا ناول بھی لازمی پڑھنا ہوتا تھا' نیا نہ ملتا تو پرانا ہی پڑھ لیتی تھی' اور یہ حقیقت ہے کہ میں عمران سیریز کی ایک ہی کتاب کو دسویں بار بھی اسی دلچسپی اور شوق سے پڑھتی تھی' جتنی دلچسپی سے میں نے پہلی بار پڑھی تھی۔ یہ ایسا شوق مجھے پڑ گیا تھا' جو چھوٹتا ہی نہ تھا۔

یوں میری پڑھنے والی روٹین ختم ہوگئی۔ دو چار بار سوچا تھا' کہ چھٹی والے دن کی پوری کرلوں گی کہ مس جعفری نے مجھ سے وعدہ لیا تھا' کہ میں کسی دن بھی اپنا سبق مس نہیں کروں گی لیکن اکثر ہی اماں کہیں گھومنے کا پروگرام بنالیتیں...... میں نے کہا بھی کہ اماں مجھے پڑھنا ہے۔ لیکن اماں نے ساتھ چلنے پر اصرار کیا۔

''اب انجوائے کریں گے اور تم گھر بیٹھی بور ہوتی رہوگی۔ آ کر پڑھ لینا۔''

روحیل اور سعیعہ بھی ضد کرتے ساتھ چلنے کی۔

یوں غیر محسوس طریقے پر میں اسٹڈی سے پھر دور ہوگئی۔ اب پھر وہی میں تھی' اور وہی میری روٹین اس پر ستم یہ ہوا تھا' کہ گھر کے قریب ہی ایک لائبریری بن گئی تھی' جہاں سے کرائے پر کتابیں مل جاتی تھیں۔ پھر بھی شاید یہ مس جعفری کی سابقہ محنت کا نتیجہ تھا' یا اسکول میں ٹیچرز اتنی اچھی طرح سے پڑھادیتے تھے' کہ میں میٹرک کے بورڈ کے امتحان میں فیل ہونے کے بجائے فرسٹ ڈویژن میں پاس ہوگئی تھی۔ اگرچہ میرے نمبر بہت زیادہ نہ تھے' اور کلاس میں بھی میری پوزیشن آخری لڑکیوں میں تھی۔ فرسٹ ڈویژن سے سات آٹھ نمبر ہی زیادہ تھے۔ مجھے ڈر تھا' کہ ابا خفا ہوں گے یا دکھ کا اظہار کریں گے لیکن انہوں نے کچھ نہیں کہا تھا' بلکہ حوصلہ افزائی ہی کی تھی۔

''میں تم سے اس سے بھی زیادہ توقع رکھتا ہوں' اقصیٰ!'' اس سال ابا چھٹیوں میں نہیں آسکے تھے۔ چونکہ ان کا پروگرام ہمیشہ کے لیے آنے کا تھا۔ اس لیے وہ بہت مصروف تھے۔ بہت سارے پراجیکٹ تھے' جو انہیں ہینڈ اوور کرنے تھے' اور اس میں ان کا کم از کم ایک سال اور لگ جانا تھا۔

❋ ❋ ❋

میرے نمبر چونکہ کم تھے۔ اس لیے مجھے سائنس میں تو داخلہ نہیں مل سکا تھا' لیکن آرٹس میں

مل گیا تھا' یہاں سحرش اور فارحہ سے میری دوستی ہوگئی تھی۔ دونوں کزن تھیں۔ سحرش کے والد بہت بڑے ڈاکٹر تھے' جبکہ فارحہ کے والد گورنمنٹ آفیسر تھے۔ دونوں بہت شوخ و شریر تھیں اور بہت جلد مجھ سے فری ہوگئی تھیں۔ سحرش اور فارحہ میں کوئی ایسی بات ضرور تھی' کہ میں ان سے بہت سارے دن دور نہ رہ سکی تھی۔ وہ دونوں بہت مزے کی باتیں کرتی تھیں۔ ان کے ڈھیروں ڈھیر کزن تھے' جن کے ساتھ ان کا ہنسی مذاق ہوتا رہتا تھا۔

وہ اپنی شرارتیں اور اپنے کزنوں کی باتیں مجھے بتاتی رہتی تھیں۔

''یار! تمہارا کوئی کزن وغیرہ نہیں ہے تمہاری طرح اسمارٹ اور خوبصورت سا......''

فارحہ نے ایک دن پوچھا۔

''ارے میں کہاں خوبصورت ہوں۔ میری چھوٹی بہن ہے ناں سعیعہ، وہ بہت پیاری ہے۔ بہت خوبصورت۔''

''ہوگی......'' سحرش نے ''بھٹہ'' کھاتے ہوئے کہا۔

''لیکن تم بھی کم نہیں ہو...... قسم سے تمہاری ان خوابناک آنکھوں کا تو کوئی مول ہی نہیں' اگر میں لڑکا ہوتی کھٹ سے اپنا دل تمہارے قدموں میں ڈال دیتی۔ اور پھر تمہارا قد...... اس قد پر تو لڑکے جان دیتے ہیں آج کل، ویسے کتنا ہے تمہارا قد۔''

''فی الحال پانچ فٹ پانچ انچ لیکن مزید بڑھنے کا امکان ہے۔'' میں ہنسی۔

''پتا ہے۔ میرا ایک کزن ہے۔ عدنان۔ وہ کہتا ہے سحرش اگر تمہارا قد پانچ فٹ چار انچ ہوتا تو میں قسم سے پورے دل و جان سے تم پر عاشق ہو جاتا لیکن اب مجبوری یہ ہے کہ تم صرف پانچ فٹ کی بونی ہو' جو میرے چھ فٹ قد کے ساتھ بالکل نہیں سجوگی۔ سچ وہ تمہیں دیکھ لے نا تو پاگل ہو جائے۔ لمبے بال بھی اس کا کریز ہیں اور تمہارے بال۔ کاش میرے بال ایسے ہوتے اقصیٰ تمہاری طرح...... یقیناً تمہاری امی نے خوب دیکھ بھال کی ہوگی بچپن میں۔ تمہارے بالوں کی۔''

''نہیں تو...... ایسا کچھ نہیں کیا دراصل میری اماں کے بال بھی بہت لمبے اور گھنے ہیں۔ گھٹنوں کو چھوتے ہوئے۔ سو یہ وراثت میں ملے ہیں۔ بس یہ ایک ہی چیز تو اماں کی مجھے ملی ہے...... باقی تو میں ساری کی ساری ابا پر ہوں اور سعیعہ بالکل اماں جیسی ہے۔

''اور تمہارے کزنز سب سعیعہ پر فدا ہیں۔'' فارحہ نے پوچھا۔

''ارے نہیں...... ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔ میرے ابا تو اکلوتے ہیں۔ سو ددھیال میں

تو کوئی نہیں ہے۔ دادا دادی تو ہمارے بچپن میں ہی فوت ہو گئے تھے' ننھیال ہمارا ملتان میں ہے وہاں بہت کم آنا جانا ہوتا ہے۔'' میں نے تفصیل بتائی۔

''بڑے ماموں کے بیٹے تو سب ہی شادی شدہ ہیں۔ منجھلے ماموں دبئی میں ہیں اور چھوٹے ماموں کے تین بیٹے تو ہیں۔ ایک شادی شدہ ہیں۔ دو کی ابھی شادی نہیں ہوئی ایک تو پڑھاکو سے ہیں اور دوسرے بھی بس اویں سے ہیں۔ خالائیں میری دو ہیں بچپن میں دیکھا تھا' انہیں۔ دونوں امریکہ میں ہیں۔''

''چلو چھٹی ہوئی۔'' سحرش نے بیگ سے ٹشو پیپر نکال کر ہاتھ صاف کیے'' تمہارا کوئی فون فرینڈ بھی نہیں ہے۔''

''نہیں تو۔''

''ہائے تمہاری زندگی کتنی ڈل ہے اقصیٰ! بور نہیں ہوتی ہو۔ ہر وقت پڑھنا اور صرف پڑھنا۔''

''نہیں تو' ہر وقت تو نہیں پڑھتی ہوں۔ ٹی وی دیکھتی ہوں اور ناول پڑھتی ہوں۔ جاسوسی ناول تو بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔''

''یار! تمہارے پاس تو اتنی سہولتیں ہیں۔ اپنا فون، اپنی گاڑی۔ تم تو بڑی آسانی کے ساتھ دو تین افیئر چلا سکتی ہو۔''

میں حیرت سے ان کی باتیں سن رہی تھی۔

''کبھی رانگ نمبر نہیں آتے؟'' سحرش نے پوچھا۔

''بہت کم......''

''کسی نے بار بار کبھی رنگ نہیں کیا کہ بات کرو مجھ سے، دل گھبرا رہا ہے اداس ہوں۔ اکیلا ہوں۔''

''نہیں تو، ایسا تو کبھی نہیں ہوا۔''

''کبھی ایسا ہوا تو چانس مس مت کرنا۔''

اور غیرارادی طور پر کئی روز تک میں کسی رانگ نمبر کی منتظر رہی اور پھر ہولے ہولے ذہن سے سحرش اور فارحہ کی باتیں نکل گئیں۔

* * *

بڑے ماموں آئے تو سنیعہ اور روحیل ان کے ساتھ ملتان چلے گئے۔ روحیل نے جانے کی

ضد کی تو اماں نے اجازت دے دی۔ یوں گھر پر صرف اماں اور میں رہ گئے۔ سنیعہ اور روحیل کے جانے سے گھر میں اداسی سی ہو گئی تھی۔ میری اس سولہ سترہ سالہ زندگی میں پہلی بار سنیعہ اور روحیل اکیلے ملتان گئے تھے' اور میں ان کے جانے سے بہت اداس تھی۔

''اماں!''

سنیعہ اور روحیل کو گئے تین دن ہو گئے تھے' اور اماں ٹی وی لاؤنج میں بیٹھی خبریں سن رہی تھیں کہ میں بھی اپنے کمرے سے آ گئی۔

''اماں! آپ سنیعہ اور روحیل کو بلا لیں، میرا دل بہت اداس ہو گیا ہے ان کے بغیر......'' میں ان کے پاس ہی بیٹھ گئی۔

''مگر ابھی تو انہیں تین دن بھی نہیں ہوئے گئے ہوئے۔''

''مگر میرا دل نہیں لگتا۔ گھر میں کتنی اداسی ہو گئی ہے ان کے بغیر۔''

''ہاں یہ تو ہے۔'' اماں بھی اداس ہو گئیں۔

''پھر بلا لیں نا......'' میں نے اصرار کیا۔

''کہاں ممکن ہے بلانا...... ماموں اتنے اصرار سے لے کر گئے ہیں پہلی بار ماموں کے گھر رہنے کے لیے گئے ہیں اور بہت خوش ہیں دونوں...... تمہاری چھٹیاں ہو جائیں تو پھر ہم بھی چلیں گے۔ تم ایسا کرو کوئی مووی وغیرہ لگا کر دیکھ لو۔ دل بہل جائے گا۔''

''سب تو کئی بار دیکھ چکی ہوں۔'' میں نے بیزاری سے کہا۔

''تو؟'' اماں نے گہری نظروں سے مجھے دیکھا۔

''کرامت سے کہہ کر کوئی نئی مووی منگوا لو۔''

''مگر کون سی اماں؟'' میں خوش ہو گئی۔

''جو مرضی منگوا لو۔''

اماں نے فراخدلی سے اجازت دے دی تو ایک لمحہ کو میں سوچ میں پڑ گئی' مجھے تو موویز کے نام تک معلوم نہ تھے۔

''سحرش اور فارحہ۔'' میں نے چٹکی بجائی۔ انہیں تو موویز دیکھنے کا کریز تھا' اور انڈین اداکاران کے پسندیدہ تھے۔

میں نے اماں کو بتا کر فارحہ کو فون کیا۔

کرامت مووی لے آیا۔ اماں نے کچھ دیر بیٹھ کر میرے ساتھ مووی دیکھی' مجھے ڈر تھا' کہ

وہ فضول قسم کے رقص دیکھ کر مجھے منع نہ کر دیں لیکن اماں نے کچھ نہیں کہا اور مجھے مووی دیکھتا چھوڑ کر خود مسز الطاف کو فون کرنے چلی گئیں اور مسز الطاف سے ان کی گفتگو گھنٹہ بھر سے کیا کم ہوتی تھی...... میں مزے سے مووی دیکھتی رہی۔ واقعی میرا دل بہل گیا تھا۔

رات ابھی میں سوئی ہی تھی' کہ فون کی بیل ہوئی۔ میں نے سمجھا کہ ابا کا فون ہے مگر دوسری طرف کوئی اور تھا۔

''آپ کو کس سے بات کرنی ہے؟''

''آپ ہی بات کرلیں۔''

''آدھی رات کو آپ کو شرم نہیں آتی۔ دوسروں کو تنگ کرتے ہوئے۔''

''پلیز میں بور ہو رہا تھا۔ نیند نہیں آ رہی تھی۔''

''تو سلیپنگ پلز کھا کر سو جائیں۔''

میں نے کہا کہ بیل آف کرکے سو گئی کہ مجھے نیند میں کسی کی مداخلت پسند نہ تھی۔ سونا میری دوسری ہابی تھی...... بلکہ جب تک مجھے کہانیاں پڑھنے کا چسکا نہیں پڑا تھا' تو سونا میری پہلی ہابی تھی۔

صبح جب میں نے کالج میں سحرش اور فارحہ کو بتایا تو وہ دونوں پیچھے پڑ گئیں۔

''کس قدر بور ہو تم اقصیٰ! بے چارے سے بات کر لیتیں۔ تمہاری آواز اس کے لیے لوری کا کام انجام دیتی۔''

''یونہی کر لیتی بات خوامخواہ میں۔''

''آج اگر اس کا فون آیا تو بات کر لینا۔''

''اور وہ پیچھے ہی پڑ گیا تو۔ مجھے اماں سے ڈر لگتا ہے۔''

''اماں کو کیا الہام ہوگا۔ دل توڑنا بری بات ہے۔''

''ضروری تو نہیں کہ وہ پھر فون کرے۔''

میں نے نیم رضامندی سے یوں کہا جیسے آج اگر اس نے فون کیا تو میں بات کر ہی لوں گی۔

''ارے ایک بار نہیں دس بار فون کرے گا وہ تمہیں اور جب تک تم بات نہ کرلو گی جان نہیں چھوڑے گا۔''

سحرش نے بڑے یقین سے کہا۔

اور واقعی رات جب میں اپنے کمرے میں آئی اور میں نے ٹاس کا ''لیٹ آف دی ویلز'' پڑھنے کے لیے نکالا تو بیل ہوئی۔ دوسری طرف وہی تھا۔

''پلیز، فون مت رکھیے گا۔ یقین کیجئے۔ میں ایک بہت شریف لڑکا ہوں۔ رات تو یوں ہی رانگ نمبر مل گیا تھا۔ لیکن یقین کیجئے ساری رات سو نہیں سکا۔ آپ کی خوبصورت آواز نے سونے نہیں دیا۔ آپ کو پتا ہے۔ آپ کی آواز میں کتنا سحر ہے، کتنی نغمگی ہے' یوں جیسے دور کہیں خوبصورت جھرنے بہہ رہے ہوں۔''

میرے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی اور پورے وجود میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی۔

میں نے ریسیور رکھ دیا۔ بیل پھر ہوئی اور مسلسل ہوتی رہی۔

''ہیلو......!''

''پلیز مجھ سے بات کرلیں۔ صرف بات کرنے سے کیا نقصان ہوگا۔ میں غریب خوش ہو جاؤں گا۔ آپ کی آواز سن کر۔''

''پلیز اب مجھے رنگ مت کیجئے گا۔ میں اسٹڈی کر رہی ہوں۔''

''اچھا آپ اسٹڈی کرلیں۔ میں کچھ دیر بعد کرلوں گا۔'' وہ بھی ایک ہی ڈھیٹ تھا۔

میں نے ریسیور رکھ دیا، لیکن پھر میں ناول نہ پڑھ سکی۔ دل میں گدگدی سی ہو رہی تھی۔ کتنی دیر تک ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں خود کو دیکھتی رہی۔ سحرش کہتی تھی' کہ میں بڑی آفت ہوں اور یہ لڑکا کہہ رہا تھا' کہ میری آواز بہت خوبصورت ہے۔

میں نے ہولے ہولے بول کر اپنی آواز کی خوبصورتی محسوس کرنے کی کوشش کی۔

لیکن اماں نے تو ہمیشہ ہی کہا۔

''اقصیٰ کا رنگ گہرا ہے۔ اپنے ابا پر چلی گئی ہے۔ مجھے اس کی بڑی فکر ہے۔ کون اسے پوچھے گا۔'' میں دل گرفتہ سی ہو کر آئینے کے سامنے سے ہٹ آئی۔

''آج کل کے لڑکوں کی پسند بہت بدل گئی ہے یار!'' فارحہ نے ایک دن مجھے سمجھایا تھا۔

''وہ رنگ شکل کو اہمیت نہیں دیتے۔ بس اسٹائل ہو اور تمہارے جیسا کمپلیکشن ہے اس پر تو آج کل کے لڑکے مرتے ہیں۔''

''سانولی سلونی محبوبہ تیری چوڑیاں شرنگ کرکے۔'' سحرش تالی بجا کر گانے لگی تھی۔

وقتی طور پر مجھے ان کی باتوں پر یقین آ جاتا لیکن پھر خود بخود ہی اندر اداسی اتر آتی اور دل میں اللہ میاں سے شکوے جاگ اٹھتے۔ اللہ میاں کے خزانے میں کیا کمی ہو جاتی' جو وہ مجھے بھی

سمیعہ جیسا بنا دیتا۔

اور اب یہ لڑکا کہہ رہا تھا' کہ میری آواز بہت خوبصورت ہے۔ پتا نہیں جھوٹ بول رہا تھا' یا سچ...... صبح سحرش سے پوچھوں گی۔

میں نہ جانے کتنی دیر تک یونہی ہاتھ گود میں دھرے ساکت بیٹھی رہی کہ پھر بیل ہوئی۔ یکدم میرا دل زور سے دھڑکا اور میں نے ریسیور اٹھالیا' دوسری طرف وہی تھا۔

"پیاری لڑکی! کیا اسٹڈی کرلی آپ نے؟"

"آپ کو کیا خبر کہ میں پیاری ہوں۔ میں بہت بدصورت ہوں۔"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" وہ ہنس پڑا۔ "آپ کی آواز اتنی خوبصورت ہے تو آپ خود کیسی ہوں گی اس کا اندازہ لگا سکتا ہوں۔"

"جی نہیں میں بالکل بھی خوبصورت نہیں ہوں۔"

"چلیے نہ سہی خوبصورت۔ ہم تو آپ کی آواز کے عاشق ہیں۔"

"فضول' مجھے آپ سے بات نہیں کرنی آئندہ رنگ مت کیجئے گا۔" میں نے ریسیور رکھ دیا لیکن پھر بیل ہونے لگی۔

"پلیز میں آپ سے دوستی کرنا چاہتا ہوں۔ آخر اس میں حرج ہی کیا ہے۔"

"ہے حرج۔"

"کیا میں آپ کو کھا جاؤں گا۔ جن بھوت ہوں' جو ریسیور سے باہر نکل آؤں گا۔"

مجھے ہنسی آ گئی۔

"آخر کیا ملے گا آپ کو اس سے۔"

"آپ کو کیا پتا کیا مل جائے گا، ارے آپ کی آواز تو اگر ساری زندگی سنتا رہوں تو جی نہ بھرے۔ آپ اپنی آواز کے سحر سے واقف ہی نہیں ہیں، جکڑ لیا ہے اس نے مجھے اسیر کرلیا ہے۔"

"تو آزاد کرالیں خود کو۔"

"آزاد ہی تو نہیں ہونا چاہتا۔ عمر بھر کے لیے اسیر ہونا چاہتا ہوں۔"

اور مجھے پتا ہی نہیں چلا اور پورے دو گھنٹے تک میں اس سے بات کرتی رہی۔

"کمال ہے ایک بج گیا ہے' وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔" میں نے فون بند کردیا۔

اور جب میں لیٹی تو بہت دیر تک اس کی باتیں میرے کانوں میں گونجتی رہیں اور خود مجھے اپنے اوپر بھی حیرت ہوئی کہ میں...... کیا میں اس طرح کی برجستہ باتیں بھی کرسکتی ہوں...... حالانکہ میرا خیال تھا' کہ میں کسی سے بھی اعتماد سے بات نہیں کرسکتی۔ شاید یہ سحرش اور فارحہ کی صحبت کا اثر تھا۔

کالج میں بھی میرے کانوں میں اس کی ہی باتیں گونجتی رہیں۔ سحرش اور فارحہ دونوں ہی غیر حاضر تھیں۔ سو گھر آتے ہی میں نے فون کیا تاکہ انہیں بتا سکوں کہ آج رات میری اس سے بات ہوئی ہے۔ اس نے اپنا نام دانش بتایا تھا' اور میں نے سحرش کی ہدایت کے مطابق اپنا غلط نام بتایا تھا' "انیلا" لیکن سحرش گھر پر بھی نہ تھی۔ وہ اور فارحہ دونوں ہی کسی عزیز کی شادی میں شرکت کے لیے کھاریاں گئی ہوئی تھیں۔

دن بھر میں جاگتی رہی اور اسے ہی سوچتی رہی، کمال ہے آج میرا دل کوئی ناول یا کتاب پڑھنے کو بھی نہیں چاہا بلکہ آنکھیں موندے عجیب سے احساسات میں گھری رہی۔ کبھی دل میں گدگدی ہونے لگتی کبھی پورے وجود میں سنسناہٹ ہونے لگتی۔ دل تیزی سے دھڑکنے لگتا اور کبھی یوں لگتا جیسے یکدم تیزی سے دھڑک کر ڈوب گیا ہو۔

❋ ❋ ❋

شام کو چائے پی کر میں لان میں آ بیٹھی۔ اماں بھی وہیں آ گئیں۔

"کیا سوچ رہی ہو؟"

"کچھ نہیں اماں!"

"پڑھائی کر رہی ہو نا؟"

"جی!" میں نے نظریں چرا لیں۔

"ٹیوٹر وغیرہ کی ضرورت تو نہیں ہے۔"

"نہیں۔ آرٹس کے مضامین میں ٹیوٹر کیا کرنا ہے' خود ہی پڑھنا ہوتا ہے۔"

"ہاں یہ تو ہے۔ بور ہو رہی ہو تو کوئی مووی منگوا لو۔ کرامت!"

انہوں نے کرامت کو آواز دی اور پھر خود ہی اسے کوئی اچھی سی مووی لانے کے لیے کہا۔

"اماں اتنی اچھی ہیں۔ اتنی محبت کرتی ہیں مجھ سے۔ اتنا خیال ہے انہیں میرا۔"

مجھے اپنی گزشتہ سوچ پر ندامت سی ہوئی۔ پتا نہیں کیوں کبھی کبھی بچپن میں ذہن میں یہ خیال آتا تھا' کہ اماں میری کم صورتی کی وجہ سے مجھ سے محبت نہیں کرتیں اور پھر وقت کے ساتھ ساتھ یہ خیال پختہ ہو گیا تھا' کہ اماں سعیعہ اور روحیل سے زیادہ محبت کرتی ہیں کیونکہ وہ خوبصورت ہیں اور مجھ سے اتنی محبت نہیں۔

میں نے اماں کو بہت پیار سے دیکھا۔

"سعیعہ اور روحیل کا فون آیا تھا؟"

"ہاں تمہیں بہت پوچھ رہے تھے۔"

"آپ مجھے ماموں کے گھر کا نمبر دیجئے گا' میں انہیں فون کروں گی۔"

"ڈائری میں لکھا ہوگا۔"

اماں کچھ دیر لان میں میرے ساتھ بیٹھی رہیں پھر اندر چلی گئیں کچھ دیر بعد کرامت مووی

لے آیا۔

اور میں ٹی وی لاؤنج میں مووی لگا کر بیٹھ گئی اور پھر تو میرا معمول ہی بن گیا' دن کو مووی دیکھتی اور رات کو دیر تک دانش سے باتیں کرتی۔ دانش بہت خوبصورت باتیں کرتا تھا۔ میں اس کی باتوں کے سحر میں کھوئی جاتی تھی۔

"نیلی! یہ کیا ہے۔"

ایک روز اس نے کہا۔

"میں دن بھر تمہیں سوچتا رہتا ہوں اور وقت کاٹنا مشکل ہو جاتا ہے کہ کب رات ہو اور کب تم سے بات ہو۔ نیلی! تم نے مجھے ناکارہ بنا دیا ہے۔ میں تو کسی کام کا نہیں رہا یار...... ! مجھ سے ملو نا! تمہیں دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"نہیں۔ میں تم سے نہیں ملوں گی۔ میں ایک معمولی سی شکل کی لڑکی ہوں۔"

میرا احساس کمتری عود کر آیا تھا' اور اگر اس نے مجھے دیکھ کر' مجھ سے مل کر مجھے رد کر دیا تو اور مجھے لگا جیسے میرا دل بند ہو جائے گا اگر دانش میری زندگی سے نکل گیا تو۔

کیا میں دانش سے محبت کرنے لگی ہوں۔

"محبت!" میں نے حیران ہو کر سوچا اور ہر روز دیکھی جانے والی موویز کے کئی مناظر میری نگاہوں کے سامنے آ گئے۔

"تو کیا یہ محبت ہے۔"

میں حیران سی ریسیور ہاتھ میں پکڑے کھڑی تھی' اور مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا' کہ دانش کیا کہہ رہا تھا۔

"تم خاموش کیوں ہو گئی ہو نیلی! یقین کرو تم بہت خوبصورت ہو...... تمہارا دل بہت خوبصورت ہے۔ شکل وصورت اور جسم تو ثانوی چیز ہے۔ جسم تو ڈھل جاتا ہے نیلی...... محبت باقی رہتی ہے اور میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں...... تم یقین کرو یا نہ کرو۔" اور یقین نہ کرنے کی کوئی بات تھی' ہی نہیں اس کا لفظ لفظ اس کی محبتوں کی گواہی دیتا تھا۔ سو میں نے اس سے ملنے کا فیصلہ کر لیا کہ خود میرا بھی دل چاہتا تھا' اس سے بات کرنے کا ملنے کا۔

"نیلی! تم صبح کالج مت جانا گیٹ پر میرا انتظار کرنا، میں تمہیں وہاں سے پک کر لوں گا اور پھر چھٹی کے ٹائم وہاں ہی ڈراپ کر دوں گا۔"

میرا دل بہت تیزی سے دھڑکنے لگا۔

"مجھے ڈر لگ رہا ہے دانی!"

"ارے ڈرنے کی کیا بات ہے جان! میں تم سے محبت کرتا ہوں۔"

اس نے مجھے اپنی گاڑی کا نمبر بتا دیا تھا۔ سو اسے پہچاننا مجھے بالکل بھی مشکل نہ لگا۔

"ارے تم کتنی چھوٹی ہو نیلی! کس قدر فضول۔ اتنی خوبصورت ہو تم، اتنی دلکش کہ سیدھی دل میں اتر رہی ہو۔ اور یہ ڈریس تم پر کتنا سوٹ کر رہا ہے' تمہاری آنکھیں دل چاہتا ہے کہ ساری زندگی سامنے بٹھائے تمہیں دیکھتا رہوں ...... میں تو تمہاری ان آنکھوں میں ڈوب گیا ہوں۔ شاید اب کبھی ابھر نہ سکوں۔"

دانش عام سی شکل وصورت کا عام سا لڑکا تھا۔ درمیانے قد کا سانولا اور کچھ دبلا پتلا سا لیکن مجھے تو وہ بہت خوبصورت لگا اور اس کی باتیں ...... جی چاہتا تھا' بس سنتی رہوں اور وقت رک جائے۔

دانش نے حسبِ وعدہ مجھے گیٹ کے پاس ڈراپ کر دیا تھا۔

"پھر کب ملو گی نیلی؟"

"پتا نہیں۔"

"ادھر دیکھو نا میری طرف۔"

وہ آنکھوں میں محبت بھرے مجھے دیکھ رہا تھا۔

"اچھا اب جاؤ نا۔ ابھی میری گاڑی آ جائے گی۔"

"او کے پھر رات میں بات ہو گی۔"

"او کے۔"

ملاقات کیا ہوئی تھی' اس کی باتوں میں اور وارفتگی اور والہانہ پن آ گیا تھا۔

"نیلی! جب سے تمہیں دیکھا ہے' دل قابو میں نہیں ہے۔" وہ اکثر کہتا تھا۔

ان دنوں میرے اندر بہت سی تبدیلیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ میں خود سے بہت لاپروا رہتی تھی' اب اپنا خیال رکھنے لگی تھی ...... کالج جانے سے پہلے اہتمام سے تیار ہوتی۔ ہلکا سا میک اپ۔ ہونٹوں کے رنگ سے میچ کرتی ہوئی لپ اسٹک اور شاید یہ سارا کمال اس محبت کا تھا' جو میرے دل میں پھول کھلائے ہوئے تھی۔

❋ ❋ ❋

سمیعہ اور روحیل آ گئے تو انہوں نے حیرت سے مجھے دیکھا۔

"ارے یہ آپی ہیں نا اور وہ بھی چھٹی والے دن۔"

روحیل نے میرے اردگرد چکر لگا کر غور سے مجھے دیکھا۔

میں سلیقے سے بال بنائے استری شدہ کپڑے پہنے ہلکا پھلکا میک اپ کیے بہت فریش سی لاؤنج میں بیٹھی اخبار دیکھ رہی تھی۔

"یعنی ہماری عدم موجودگی میں یہ انقلاب۔"

میں گھر میں یونہی بغیر استری کے کپڑے پہن لیتی اور چھٹی والے دن تو بال بنانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ یوں ہی سر جھاڑ منہ پہاڑ پھرتی رہتی تھی۔

"آپ کو کہیں جانا ہے آپی۔"

"نہیں۔" میں نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

"سچی ...... آپی مسکرا رہی ہیں۔" روحیل نے اور زیادہ حیرت کا اظہار کیا۔

"تو کیا میں پہلے کبھی مسکراتی بھی نہیں تھی۔" میں نے خود اپنے آپ سے پوچھا اور روحیل سے شکوہ کیا۔

"بہت خراب ہو تم لوگ ...... وہاں جا کر بیٹھ گئے اور یاد بھی نہیں کیا۔"

"نہیں یاد تو بہت کیا۔" روحیل اب بھی شرارت سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

"لیکن آپ یہ بتائیں۔ آپ اور اماں آئے کیوں نہیں۔ اماں نے کہا تھا' کہ آپ کی چھٹیوں میں آئیں گے۔"

"ہاں بس یونہی چھٹیوں کے بعد میرے ٹیسٹ تھے' نا اور مجھے تیاری کرنا تھی۔"

میں نے جھوٹ بولا۔ حالانکہ جب اماں نے ملتان چلنے کو کہا تو میرا دل جیسے ڈوب گیا' پورا ایک ہفتہ دانی سے بات نہیں ہو گی۔

"اماں آپ چلی جائیں، مجھے تیاری کرنا ہے اپنے پیپرز کی۔"

"کیا تم اکیلی رہو گی؟" اماں کچھ متذبذب تھیں۔

"تو کیا ہے سب تو ہیں، فضل بی بی، کرامت اور ڈرائیور۔"

"تمہارے ابا ناراض ہوں گے کہ تمہیں اکیلا چھوڑ کر چلی گئی۔"

اور مجھے اماں پر بے حد پیار آیا۔

"ٹھیک ہے اماں! دو تین دن کے لیے چلے جائیں گے۔"

"میں تو مر جاؤں گا' نیلی اتنے دن تم سے بات نہیں کروں گا تو۔"

میں نے دانی کو بتایا تو وہ جذباتی ہونے لگا۔ مگر میں نہیں چاہتی تھی' کہ اماں میری وجہ سے جا ہی نہ سکیں۔ لیکن ہوا یوں کہ اماں کو فلو ہو گیا اور ساتھ ہی ٹمپریچر بھی۔ تب اماں نے ماموں کو فون کر دیا کہ وہ خود ہی روحیل اور سنیعہ کو چھوڑ جائیں کیونکہ ان کی چھٹیاں ختم ہونے والی تھیں۔

اس روز ہم دیر تک ٹی وی لاؤنج میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ سنیعہ اور روحیل وہاں کی باتیں بتاتے رہے۔ جب میں کمرے میں جانے کے لیے اٹھی تو سنیعہ نے مسکرا کر مجھے دیکھا۔

''اقصیٰ! آج بہت پیاری لگ رہی ہو، ہمیشہ ایسے ہی رہا کرو۔''

''تھینک یو۔'' میں نے سنیعہ کا شکریہ ادا کیا۔

اور یہ سارا اعجاز محبت کا تھا' جس نے مجھے پُر اعتماد ہی نہیں' خوش مزاج بھی بنا دیا تھا۔

محبت سے بڑا تریاق زہروں کا نہیں ہے۔

میں نے دل ہی دل میں کہا اور مسکرا کر سنیعہ کو دیکھا۔

شام میں جب میں سو کر اٹھی تو ابھی سنیعہ اور روحیل سو رہے تھے' اور اماں گیلری میں کھڑی کرامت کو کچھ سودا لانے کے لیے کہہ رہی تھیں۔

''سنو کرامت!'' ٹی وی لاؤنج کی طرف جاتے ہوئے میں نے کہا۔

''سری دیوی کی کوئی اچھی سی مووی لے آنا۔''

لیکن اماں نے اسے منع کر دیا۔

''بیٹا! سنیعہ کا بورڈ کا امتحان ہے۔ دو ماہ ہی تو رہ گئے ہیں۔ ظاہر ہے مووی لگے گی تو وہ بھی لازمی دیکھے گی اور اس کا ٹائم ویسٹ ہوگا اور پھر تمہارے بھی تو ٹیسٹ ہیں۔ تمہارے نمبرز اچھے نہ آئے تو تمہارے ابا ناراض ہوں گے۔''

اماں صحیح کہہ رہی تھیں۔ میں واپس اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اتنے دن ہو گئے تھے' میں نے ایک لفظ تک نہ پڑھا تھا۔ میں نے کتابیں نکالیں۔ لیکن کتابیں کھولے دانش کے تصور میں کھو گئی۔

دانش کی محبت میرے لہو میں اتر گئی تھی۔ کبھی کبھی ہم مل بھی لیتے...... اور ہر بار جیسے تشنگی بڑھ جاتی۔

''دل چاہتا ہے روز ملیں۔'' دانش حسرت سے کہتا۔

''لیکن یہ ممکن نہیں ہے۔'' کبھی کبھی مجھے خوف سا محسوس ہوتا کہ اگر ابا کو پتا چل گیا تو انہیں کس قدر دکھ ہو گا لیکن پھر دانش کی محبت ہر احساس پر غالب آ جاتی۔

اس کی باتوں میں اتنا سحر تھا' کہ میں روز بروز اس سحر میں جکڑتی جا رہی تھی' اور مجھے لگتا تھا' جیسے میں اب اس طلسم سے کبھی آزاد نہ ہو سکوں گی۔ اس کی آواز' اس کی گفتگو جذبے لٹاتی۔

''تم میری زندگی ہو نیلی! میری جان ہو۔ میں تمہارے بنا جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔''

اور زندگی کا یہ رنگ کس قدر خوبصورت تھا' میں تو جیسے ہر بات سے بیگانہ ہو گئی تھی۔

ٹی وی کے سامنے بیٹھ کر۔

کھانے کی ٹیبل پر۔

سنیعہ اور روحیل سے باتیں کرتے ہوئے۔

کالج میں کورس کی کتابیں سامنے کھولے میں صرف اسے ہی سوچتی رہتی تھی' اور میرا خیال تھا' کہ زندگی یوں ہی گزرتی رہے گی' اتنی ہی خوبصورت اور حسین۔

دانش نے کہا تھا' کہ اپنی تعلیم مکمل کرتے ہی وہ مجھے پرپوز کرے گا۔ اس کے والد بزنس مین تھے' اور وہ ڈیفنس میں رہتا تھا' اور مجھے یقین تھا' کہ ابا اس کا پرپوزل قبول کر لیں گے اور اس یقین نے میرے اندر اور اعتماد پیدا کر دیا تھا' اور اب میں بغیر کسی خوف کے اس سے ملنے چلی جاتی تھی۔ مہینے میں کم از کم ایک بار ضرور ہم ملتے تھے۔

اماں سے میں بڑے فراٹے سے جھوٹ بول رہی تھی' کہ مجھے سحرش کی طرف یا فارحہ کی طرف جانا ہے اور اماں نے مجھے کبھی ان کی طرف جانے سے نہیں روکا۔ چونکہ کالج سے جانا اب مشکل ہو جاتا تھا۔ اس لیے کہ ڈرائیور نے روحیل اور سنیعہ کو بھی لینا ہوتا تھا' اور ان کی جلد چھٹی ہو جاتی تھی۔ اس لیے وہ باہر انتظار کیا کرتے تھے۔ میں نہیں چاہتی تھی' کہ سنیعہ اور روحیل کسی روز مجھے دانش کی گاڑی سے اترتے دیکھ لیں۔

❊ ❊ ❊

اس روز بھی میں اماں کو سحرش کا بتا کر گھر سے نکلی تھی۔ اماں کو میں نے یہی بتایا تھا' کہ سحرش کا ڈرائیور مجھے پک کر لے گا لیکن ہوا یوں کہ واپسی پر جب ایک کولڈ اسپاٹ پر گاڑی روک کر دانش نے میرے اور اپنے لیے کوک لی تو اچانک میری نظر سامنے اٹھی۔ ہماری گاڑی سامنے تھی' اور اماں کی نظریں مجھ پر تھیں۔ وہ غالباً وہاں آئس کریم پیک کروانے کے لیے رکی تھیں۔ لیکن جوں ہی میری نظر اماں کی نظروں سے ملیں اماں دوسری طرف دیکھنے لگیں۔ میرا رنگ یک دم زرد پڑ گیا اور ہاتھ کانپنے لگے۔ اسی اثناء میں اماں کی گاڑی ٹرن لے کر دوسری سمت مڑ گئی تھی۔

''کیا ہوا؟'' دانش نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"وہ اماں..... اس گاڑی میں وہ جو وہائٹ کرولا تھی۔ اس میں اماں تھیں۔"

"ممکن ہے انہوں نے تمہیں نہ دیکھا ہو۔"

دانش نے مجھے تسلی دی لیکن مجھے یقین تھا' کہ اماں نے مجھے دیکھ لیا ہے۔

"اب کیا ہوگا دانی؟" میرا دل خوف سے کانپ رہا تھا۔

"کچھ نہیں ہوگا، بہت ہوگا تو ڈانٹیں گی تمہیں، ایک نہ ایک دن تو پتا چلنا ہی تھا۔ بس کچھ وقت سے پہلے پتا چل جائے گا۔"

"اماں تو مجھے مار ہی دیں گی۔"

"میری جان! حوصلہ کرو۔ میں ہوں نا تمہارے ساتھ۔ اگر زیادہ حالات خراب ہو گئے تو ہم کورٹ میرج کرلیں گے' تم آ جانا کسی طرح بس۔ اور تمہیں کوئی نقصان پہنچانا نیلی تو میں برداشت نہیں کروں گا۔ کچھ بھی کردوں گا۔ تم گھبراؤ مت۔ اعتماد سے بات کرنا۔ ایسا کیا کیا ہے، میری گاڑی میں میرے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھے ہی دیکھا ہے نا..... کہہ دینا سحرش کا بھائی تھا' تمہیں ڈراپ کرنے آیا تھا۔ وہاں سے کوک لینے رک گیا تھا۔ بس گھبرانا نہیں۔ اعتماد سے بات کرنا۔"

دانش نے بہت ساری تسلیاں اور حوصلہ دیا تھا' لیکن پھر بھی جب میں گھر میں داخل ہوئی تو میری ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ اماں نے مجھے کبھی ڈانٹا یا مارا نہیں تھا' پھر بھی پتا نہیں کیوں مجھے اماں سے خوف آتا تھا۔ بلکہ بچپن میں تو میں ان سے بات کرتے ہوئے بھی خوفزدہ ہو جاتی تھی' جبکہ سنیعہ اور روحیل اماں سے لاڈ کرتے اور ضدیں بھی کیا کرتے تھے۔ پورچ میں صرف میری گاڑی کھڑی تھی' یعنی اماں ابھی نہیں آئی تھیں اور مجھ سے بڑی غلطی ہوئی تھی' جب میں جارہی تھی' تو اماں سنیعہ سے کہہ رہی تھیں کہ انہیں ٹیلر کی طرف جانا ہے۔ سنیعہ کو اپنی جو شرٹ ٹھیک کروانی ہے وہ دے دے۔ مجھے پتا تھا' اماں بھی باہر جارہی ہیں' پھر میں کیوں گئی۔

پیشانی سے پسینے کے قطرے صاف کرتی ہوئی میں سیدھی اپنے کمرے میں آ گئی۔ سنیعہ اپنے کمرے میں تھی' جبکہ روحیل ٹی وی لاؤنج میں ٹی وی پر "ماریو کونٹرا" لگائے بیٹھا تھا۔ کچھ دیر بعد ہی اماں بھی آ گئیں۔ پورچ میں گاڑی رکنے اور پھر اماں کی باتیں کرنے کی آواز آئی وہ سنیعہ کے دروازے پر کھڑی اسے کچھ بتا رہی تھیں۔ پھر شاید انہوں نے میرے متعلق پوچھا تھا۔

"آپی اپنے کمرے میں ہیں۔"

روحیل نے انہیں بتایا تھا۔ پھر مجھے اپنے کمرے کی طرف قدموں کی چاپ محسوس ہوئی تو

میرے ہاتھوں پیروں سے جان نکل گئی۔ لیکن اماں کے بجائے سنیعہ تھی۔

"اقصیٰ! یہ دیکھو اماں سوٹ لائی ہیں۔ ایک میرا، ایک تمہارا۔ تمہیں کون سا پسند ہے؟"

"جو بھی اماں لائی ہیں، ٹھیک ہے۔"

میں نے بمشکل اپنی آواز کی لرزش پر قابو پایا۔

"اماں نے کہا ہے۔ جس کو جو رنگ پسند ہے' وہ لے لے۔"

"تو تم پسند کرلو۔" دونوں رنگ ہی اچھے تھے۔ براؤن کلر کے ہی شیڈ تھے۔

"تمہیں کیا ہوا ہے اقصیٰ؟" سوٹ بیڈ پر رکھتے ہوئے سنیعہ نے میری طرف دیکھا۔

"کچھ نہیں..... بس وہ سر میں کچھ درد ہے۔" میں نے پیشانی سے پسینے کے قطرے صاف کیے۔

"کوئی ٹیبلٹ لے لو۔" میں نے سر ہلا دیا تو وہ ٹیبلٹ کھانے کی تاکید کرتی ہوئی چلی گئی۔

میں کمرے میں اس کے انتظار میں بیٹھی رہی کہ ابھی اماں آتی ہیں۔ دیکھ لیے جانے کی ندامت، خوف، شرمندگی سے میری عجیب سی کیفیت ہو رہی تھی۔ میں یونہی بازو گھٹنوں کے گرد لپیٹے بیڈ پر بیٹھی رہی۔ یہاں تک کہ فضل بی بی مجھے کھانے پر بلانے آ گئی۔

"تو کیا اماں نے مجھے نہیں دیکھا۔" میں نے حیرت سے سوچا۔

اگر دیکھا ہوتا تو ضرور مجھے ڈانٹتیں، برا بھلا کہتیں۔ لیکن جب میں نے نظر اٹھائی تھی' تو اماں ادھر ہی دیکھ رہی تھیں۔ شاید فاصلے سے اماں نے مجھے نہ پہچانا ہو۔ میں نے دل کو حوصلہ دیا لیکن پھر بھی مجھ میں اماں کا سامنا کرنے کی ہمت نہ تھی۔ اس لیے میں نے فضل بی بی سے کہہ دیا کہ مجھے بھوک نہیں ہے اور فضل بی بی کے جانے کے کچھ دیر بعد روحیل نے دروازے سے جھانکا۔

"آپی! آج کا ڈنر مس کرنے والا نہیں ہے۔ بھوک نہیں ہے تب بھی زبردستی بھوک پیدا کرکے آ جائیں۔ اماں کے ایف سی لائی ہیں، آپ کے پسندیدہ فلیور میں آئسکریم ہے اور بھی بہت کچھ ہے۔ کم آن۔"

میرے منہ میں پانی بھر آیا تھا' اور بھوک بھی محسوس ہو رہی تھی۔ دوپہر کو دانش سے ملنے کے اشتیاق میں ٹھیک طرح سے کھا نہیں پائی تھی، ایسا ہی ہوتا تھا' جس روز مجھے دانش سے ملنا ہوتا، میری بھوک پیاس اڑ جاتی تھی۔ لیکن میں دل پر جبر کیے پڑی رہی۔ کم از کم آج تو اماں سے سامنا کرنے کی مجھ میں ہمت نہ تھی۔

"نہیں اس وقت تو سردرد سے برا حال ہے، میرا حصہ رکھ دینا۔"

"جی نہیں۔"

روحیل مجھے چھیڑتا ہوا چلا گیا۔

چند دن پہلے ہی "اقبال ڈے" پر اس نے تقریر کی تھی' اور وقت بے وقت اقبال کے اشعار کوڈ کرتا رہتا تھا۔

رات دانش کا فون آیا تو میرے اعصاب اس وقت تک شل ہو چکے تھے۔ سو میں اس سے زیادہ دیر بات نہ کر سکی۔

"تم یونہی پریشان ہو رہی ہو، اگر اماں نے دیکھا ہوتا تو اب تک تمہاری کلاس ہو چکی ہوتی۔ مائیں اتنی فراخدل نہیں ہوتیں کہ بیٹی کو کسی غیر لڑکے کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھے دیکھیں اور پھر بھی خاموش رہیں۔"

وہ مطمئن ہو گیا تھا' اس کی باتوں سے مجھے بھی ڈھارس ہوئی۔

اور اگلے چند دنوں میں مجھے بھی یقین آ گیا کہ اماں نے مجھے نہیں دیکھا۔ ان کے کسی بھی رویے سے یا بات سے یہ ظاہر نہیں ہو رہا تھا' کہ انہوں نے مجھے دیکھا ہے' سو کچھ دنوں بعد میں بھی ریلیکس ہو گئی تاہم دانش کے اصرار کے باوجود میں باہر جانے سے کترانے لگی تھی' کہ اگر اس روز اتفاق سے اماں نے نہیں دیکھا تھا' تو پھر کسی روز دیکھ سکتی تھیں۔

ہاں کبھی کبھار جب میرے آخری پیریڈ فری ہوتے تھے' تو کالج کی بیک پر ایک مشہور بیکری تھی' اور اس سے منسلک "پیزا شاپ" تھی۔ پیزا اسی بیکری میں بنتا تھا۔ البتہ اس شاپ میں چھ سات ٹیبل ڈال دیے گئے تھے' جہاں بیٹھ کر پیزا کھایا جا سکتا تھا۔ مجھے سحرش نے اس کے متعلق بتایا تھا' سو میں بھی گھنٹہ بھر کے لیے وہیں دانش سے مل لیتی تھی۔

❋ ❋ ❋

یوں مجھے دانش سے فون پر بات کرتے اور ملتے تقریباً ایک سال ہو گیا تھا' اور اب دانش ضد کر رہا تھا' کہ کسی روز میں زیادہ دیر تک اس کے پاس رہوں یہ بھی کوئی ملنا ہوا۔ اتنے لوگوں کی موجودگی میں تو ڈھنگ سے دیکھ بھی نہیں پاتا۔ لیکن جب سے وہ کولڈ اسپاٹ والا واقعہ ہوا تھا۔ مجھے کہیں اور جانے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔

"یار! کسی پبلک پلیس پر نہیں جائیں گے۔ تم میرے گھر آ جاؤ۔"

"تمہارے گھر۔"

"ہاں میرے گھر۔ میرے ممی ڈیڈی ان دنوں کراچی گئے ہوئے ہیں چھوٹی بہن کے پاس میرا بھانجا پیدا ہوا ہے اس لیے۔"

"اچھا۔ میں سوچوں گی۔"

"اتنی دیر تک مت سوچنا کہ ممی ڈیڈی واپس آ جائیں۔"

میں ان دنوں گھر پر تھی' کیونکہ ہمارے پروموشن ٹیسٹ ہو چکے تھے۔ سمیعہ بھی میٹرک کا امتحان دے کر فارغ ہو چکی تھی۔ چندروز میں اس کا رزلٹ آنے والا تھا۔

"سنو تم اماں سے سحرش یا فارحہ کے گھر جانے کا بہانہ کر کے آ جاؤ۔" دانش نے مشورہ دیا۔

"بلکہ ایسا کرو کہ سحرش سے کہو۔ وہ تمہیں گھر سے پک کر لے پھر میں تمہیں اس کے گھر سے پک کر لوں گا۔"

"مگر......"

"یار! وہ تمہاری رازدار دوست ہے۔ کیا اتنا بھی نہیں کر سکتی۔

"میں تم سے ملنے کے لیے بہت بے تاب ہوں۔"

"اچھا" میں نے وعدہ کر لیا کہ سحرش سے بات کر کے اسے بتا دوں گی کہ کب کا پروگرام بنا ہے۔ لیکن ہوا یوں کہ سحرش گھر پر نہ تھی...... حسبِ معمول وہ دونوں یعنی فارحہ اور سحرش اپنے کسی عزیز کے ہاں پشاور گئی ہوئی تھیں۔

میں نے دانش کو فون کیا۔ تاکہ اسے سحرش کے نہ ہونے کا بتا سکوں لیکن اس کا فون انگیج تھا۔ دوبارہ کچھ دیر بعد نمبر ملایا تو دوسری طرف سے ایک اجنبی آواز سنائی دی اور یہ آواز تو میں لاکھوں میں پہچان سکتی تھی۔ غالباً لائن مل گئی تھی' اور دانش اپنے کسی دوست سے بات کر رہا تھا۔ یونہی شرارت سے میں ان کی باتیں سننے لگی تاکہ بعد میں دانش کو چھیڑوں۔

"اور سناؤ یار! تمہارا رومینس کہاں تک پہنچا۔"

"عروج پر ہے۔"

"سیریس ہو۔"

"لاحول ولا۔" دانش نے بے اختیار کہا۔ "احمق سمجھا ہے تم نے مجھے۔"

"لیکن یار! وہ تمہارا بھاگ بھاگ کر اس کے کالج گیٹ پر جانا...... پیزا شاپ میں ملاقاتیں۔ ہم سے کچھ چھپا ہے کیا۔"

"ہا ہا! اس کا یہ مطلب تو ہرگز نہیں ہے کہ میں سیریس ہوں...... جسٹ فار انجوائے منٹ

میری جان۔ ذرا اس طرح زندگی متحرک رہتی ہے۔ ہلچل سی اچھی لگتی ہے اور پھر فون پر تو یار...... نیند بہت اچھی آتی ہے' اس سے بات کرنے کے بعد۔"

"اور وہ لڑکی آئی مین نیلی کیا وہ بھی جسٹ فار......"

"ظاہر ہے، ویسے اس کا نام نیلی نہیں اقصیٰ ہے۔"

"تو کیا پہلے اس نے اپنا نام غلط بتایا تھا۔"

"ہاں اسی سے اندازہ کرلو کہ وہ اس میدان میں نئی نہیں ہے۔"

"لیکن تمہاری اس روز والی باتوں سے تو اندازہ ہوتا تھا' کہ وہ تمہارے ساتھ سیریس ہے۔"

"ہوتی رہے یار سیریس۔ ایسی رانگ نمبر پر ملنے والی لڑکیاں قابلِ اعتبار کہاں ہوتی ہیں۔ ان سے دوستی تو کی جاسکتی ہے انہیں گھر میں نہیں بسایا جاسکتا۔ پوری نسل کی تربیت کرنا ہوتی ہے اسے۔"

میرے کان شاں شاں کر رہے تھے' اور دل میں جیسے کوئی بھالے اتار رہا تھا۔ دوسری طرف سلسلہ منقطع ہوگیا تھا' پھر بھی میں ریسیور ہاتھ میں تھامے بہت دیر تک بیٹھی سامنے دیوار کو خالی خالی نظروں سے دیکھتی رہی۔ جیسے میں سکتے کی حالت میں تھی۔ جیسے کوئی بہت انہونی بات ہوگئی تھی۔ سر پر چھت گر پڑی ہو۔ یا زلزلہ آ گیا ہو...... اور زلزلے سے تمام فلک بوس عمارتیں گر گئی ہوں۔ پتا نہیں کتنی دیر میں اسی کیفیت میں بیٹھی رہی۔ سامنے والی دیوار اس پر لگی پینٹنگ اور دیوار کے ساتھ رکھی صوفہ چیئرز آہستہ آہستہ دھند کے پیچھے چھپتی جارہی تھیں۔ یکا یک میں نے ریسیور پھینک دیا اور تکیے پر اوندھے منہ گر کر تڑپ تڑپ کر رونے لگی۔ پتا نہیں کب تک میں یونہی روتی رہی۔ روتے روتے میری ہچکیاں بندھ جاتیں۔ میں کچھ دیر کو آنسو پونچھتی اور لمحہ بھر بعد پھر آنسوؤں کے سمندر ابل پڑتے۔ یہ کیسا دکھ تھا' کہ اندر ہی اندر دل چیرے جارہا تھا۔

اذیت...... شدید اذیت کی لہریں میرے وجود میں اٹھ رہی تھیں۔ میرا جی چاہ رہا تھا' کہ اپنے آپ کو ختم کرلوں۔ یہ اذیت مجھ سے برداشت نہیں ہورہی تھی۔

باہر اندھیرا پھیل گیا تھا۔ میں کھانے کے لیے بھی نہ گئی۔ پوری رات میں نے تڑپتے روتے اور بے قراری و بے چینی میں گزاردی تھی۔ فون کئی بار بجتا رہا میں نے اٹھ کر تار نکال دیا۔ کبھی میرا جی چاہتا، دیواروں سے سر ٹکراؤں، کبھی جی چاہتا' دانش کو مار کر خود کو بھی ختم کرلوں۔

دانش نے کتنی توہین کی تھی۔

میری محبت کی۔ فریب دیا تھا۔ دھوکا دیا تھا۔

وہ اس کی لفظ لفظ محبت میں بھیگی باتیں وہ اپنے شدید جذبوں کا اظہار۔ کیا سب جھوٹ تھا۔ دھوکا تھا۔

ساری رات مجھے یوں لگتا رہا، جیسے کوئی مٹھیاں بھر بھر انگارے میرے وجود پر پھینک رہا ہو۔ یہ اذیت مجھ سے برداشت نہیں ہورہی تھی۔ صبح جب فضل بی بی مجھے ناشتے کے لیے بلانے آئی تو میں نے بمشکل سر اٹھا کر اسے دیکھا اور پھر سر نیچے رکھ دیا۔

"آپ کی طبیعت خراب ہے کیا؟"

"ہوں۔" میں نے سر ہلادیا۔ میرا سر درد سے پھٹ رہا تھا' اور پورا وجود دہک رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد سمیعہ آئی۔

"کیا ہوا اقصیٰ؟"

"کچھ نہیں۔" میں نے بمشکل آنکھیں کھولیں۔ سمیعہ نے آگے بڑھ کر میری پیشانی پر ہاتھ رکھا اور پھر ایک دم ہاتھ پیچھے ہٹالیا۔

"ارے تمہیں تو بہت ہائی ٹمپریچر ہے۔"

"شاید۔" میں نے اٹھنے کی کوشش کی تھی' لیکن پھر میرا سر زور سے چکرایا اور مجھے ہوش نہ رہا اور جب مجھے ہوش آیا تو میں ہاسپٹل میں تھی۔ سمیعہ اور اماں میرے پاس تھیں۔ ایک لمحہ کو تو مجھے کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ میں کہاں ہوں مگر پھر مجھے سب کچھ یاد آ گیا۔

دانش کی گفتگو۔ اپنا دکھ اور اذیت اور میری آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ سمیعہ نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

"تمہیں بہت تیز بخار تھا۔ اس لیے بے ہوش ہوگئی تھیں' پریشانی والی کوئی بات نہیں ہے۔"

لیکن میرے آنسو تو بہتے چلے جارہے تھے' کہ اپنے دکھ سے اور اپنی اذیت سے صرف میں ہی واقف تھی' اور یہ اذیت میری رگوں کو کاٹ رہی تھی۔ میں نے اپنے آنسو چھپانے کے لیے کروٹ بدل لی۔ چند دن بعد بظاہر میں ٹھیک ہوکر ہاسپٹل سے آگئی تھی' لیکن میرا دل جیسے خالی ہوگیا تھا۔

ندامت، شرمندگی، دکھ، اذیت میں ساری ساری رات جاگتی اور روتی رہتی۔

یہ میں نے کیا کیا تھا۔ اماں اور ابا کے اعتماد کو دھوکا دیا تھا' اور پھر بھی ہاتھ کیا آیا تھا۔

کبھی نہ ختم ہونے والی اذیت اور دکھ......

اور یہ کیسا اتفاق تھا' کہ میں نے دانش کی گفتگو سن لی تھی۔ ورنہ شاید میں اس کی محبت میں

کتنا آگے تک چلی جاتی۔

شاید ابا کی کوئی نیکی، اماں کی کوئی دعا کام آ گئی تھی۔ ورنہ...... ورنہ یہ اتفاق ہی تو تھا' کہ میں دانش کے خیالات سے واقف ہو گئی تھی۔ ایک سال کے مختصر سے عرصہ میں' میں زندگی کے بہت سے تجربوں سے گزر گئی تھی۔ محبت کی مسرت سے لے کر اس کے دکھ اور عذاب تک کو میں نے سہہ لیا تھا۔

بچھڑ جانے کا دکھ، ہجر و فراق کی اذیت، بے وفائی کا عذاب سب ——

میں دانش سے نفرت کرنا چاہتی تھی۔ اسے بھولنا چاہتی تھی' لیکن نہ میں دانش سے نفرت کر سکی نہ اسے بھول سکی۔ وہ میری اولین چاہت تھا۔ میرے نوخیز دل میں کھلنے والی پہلی محبت کا امین، وہ بے وفا تھا۔ اس کی محبت دھوکا تھی' میری تو نہیں۔ بیٹھے بیٹھے میرا دل ڈوبنے لگتا۔ میری آنکھیں ڈبڈبا جاتیں۔ میں اپنے ہاتھوں کو دیکھتی۔ جنہیں کبھی اس نے بہت محبت سے اپنے ہاتھوں میں لیا تھا۔ میرے ہاتھوں پر اس کا لمس زندہ ہو جاتا۔ میرے کانوں میں اس کے محبت بھرے لفظ گونجنے لگتے اور اندر برسات ہونے لگتی۔

میں زیادہ تر اپنے کمرے میں گھسی رہتی۔ ہر شے سے میری دلچسپی ختم ہو گئی تھی' حتیٰ کہ کتابوں سے بھی۔ میں کئی کئی دن تک کنگھی نہ کرتی، بال نہ بناتی۔ کالج میں موسم گرما کی چھٹیاں ہو چکی تھیں۔ میں پروموٹ تو ہو گئی تھی' لیکن میرے نمبر بہت کم تھے۔ میں نے فون کا تار ہنوز نہیں جوڑا تھا' اور روحیل سے کہہ دیا تھا' کہ ابا کو بتا دینا کہ فون خراب ہے۔ سو اس روز ابا کا فون آیا تو روحیل مجھے بلانے آیا۔ ابا کی آواز سنتے ہی میرے اندر سے جیسے سمندر ابل پڑے تھے۔ بمشکل میں نے اپنے اوپر قابو پایا تھا۔

''اقصیٰ بیٹے! کیسی ہو۔ تمہاری اماں نے بتایا تھا۔ تم بہت بیمار رہتی ہو۔ اپنا خیال رکھا کرو۔ میں بہت جلد آنے کی کوشش کر رہا ہوں۔''

''جی ابا!'' میں نے ریسیور اماں کو دے دیا اور وہیں بیٹھ گئی۔

''اقصیٰ!'' سعیعہ نے بہت محبت سے مجھے دیکھا۔

''تمہیں کیا ہے۔ تم روز بروز کمزور ہوتی جا رہی ہو۔ اپنی ڈائٹ کا خیال رکھا کرو۔ کوئی پرابلم ہے تمہیں۔''

''نہیں تو......''

''اماں! اقصیٰ کی خوراک بیماری کے بعد سے بہت کم ہو گئی ہے۔ آپ ایک بار اسے ڈاکٹر

کے پاس لے جائیں، معلوم نہیں کیا ہے۔''

''اچھا!'' اماں نے سرسری نظروں سے مجھے دیکھا۔ ''کل لے جاؤں گی۔''

''محترمہ ابھی ڈاکٹر بنی نہیں اور ابھی سے ڈاکٹری شروع کر دی۔'' روحیل نے اسے چھیڑا۔

''انشاء اللہ بن جاؤں گی ایک دن۔''

اس نے بڑے یقین سے کہا اور میں بڑی مشکل سے آنسو روکے وہیں بیٹھی رہی۔ روحیل اور اماں چلے گئے۔

''تم اپنا رزلٹ دیکھ کر پریشان ہو نا۔'' سعیعہ نے اندازہ لگایا۔

''میرا جی چاہا میں سعیعہ سے کہہ دوں سب کچھ اپنی حماقت، اپنی بے وقوفیاں اور اپنے دکھ، شاید دل پر دھرا بوجھ کم ہو جائے۔ شاید اندر ہر دم ہوتی برسات میں کمی آ جائے۔ لیکن پتا نہیں کیوں میں سعیعہ سے کبھی بے تکلف نہ ہو سکی تھی۔ حالانکہ وہ عمر میں مجھ سے صرف دو سال چھوٹی تھی' اور کلاسز کے حساب سے ایک سال پیچھے تھی۔ پتا نہیں کیوں ہم دونوں میں دوستی نہ ہو سکی تھی۔ شاید وہ بہت پڑھاکو تھی۔ یا پھر اس کی بے تحاشا خوبصورتی کی وجہ سے میں لاشعوری طور پر احساسِ کمتری میں مبتلا تھی۔

''کوئی بات نہیں، اگر اب نمبر کم ہیں تو...... تم ابھی سے محنت شروع کر دو تو فائنل میں انشاء اللہ اچھے نمبر آ جائیں گے۔''

اس نے مجھے خاموش دیکھ کر تسلی دی۔ تب ہی اماں نے اسے بلا لیا۔ اور میں اپنے کمرے میں چلی گئی۔

زندگی میرے لیے سزا بن گئی تھی۔ میں ہر لمحہ اپنے اندر مرتی رہتی۔

❋ ❋ ❋

چھٹیوں میں ہی سعیعہ کا رزلٹ آ گیا تھا' اور اس نے بورڈ میں پوزیشن حاصل کی تھی' اور یہ بہت خوشی اور فخر کی بات تھی' ہم سب کے لیے۔

میں بھی بے حد خوش تھی' میں نے بے اختیار اسے گلے سے لگا کر پیار کیا تھا۔ اس روز دیر تک سب جاگتے رہے تھے' اور اگلے روز روحیل کے ضد کرنے پر اماں ہمیں باہر ڈنر کے لیے لے گئی تھیں۔ میرا قطعی جی نہیں چاہ رہا تھا' لیکن اس خیال سے کہ کہیں سعیعہ یہ نہ سمجھے کہ مجھے اس کی کامیابی کی خوشی نہیں ہے۔ میں چلی گئی تھی' اور ''ولیج'' میں کھانا کھاتے ہوئے اچانک ہی میری نظر سامنے پڑی تھی۔ بالکل سامنے دانش اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھا تھا' اور اس کی نظریں میری

طرف ہی تھیں۔ میری آنکھوں کے آگے آنسوؤں کی دھند سی آ گئی' پھر تمام وقت میرا خود سے جنگ کرتے گزرا۔ بے اختیار امڈ آنے والے آنسوؤں کو پیچھے دھکیل دھکیل کر میں تھک گئی۔

"کیا ہے اقصیٰ! تم تو کچھ بھی نہیں لے رہی ہو۔"

سنیعہ نے مجھے ٹوکا تو میں نے چونک کر اپنی پلیٹ کی طرف دیکھا۔

"وہ جی متلا رہا ہے پنکی! لگتا ہے جیسے الٹی ہو جائے گی۔" میں نے ہاتھ میں پکڑا ہوا کانٹا اور چھری پلیٹ میں رکھ دی۔

"طبیعت خراب تھی' تو گھر پر بتا دیتیں' ہم لوگ کل آ جاتے۔"

"نہیں گھر میں تو ٹھیک تھی' بس اچانک ہی ابھی خراب ہوئی ہے لیکن تم لوگ پریشان نہ ہو ٹھیک ہو جائے گا ابھی۔"

"بجو کے لیے پیک کروالیں گے۔"

روحیل نے روسٹ کے ساتھ انصاف کرتے ہوئے مشورہ دیا۔ میں دونوں ہاتھ گود میں دھرے ساکت بیٹھی تھی۔ کبھی کبھی میری نظریں بے اختیار دانش کی طرف اٹھ جاتیں حالانکہ میں اسے دیکھنا نہیں چاہتی تھی' اور ویلیج سے باہر آ کر میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ مجھے لگتا تھا' کچھ دیر اور وہاں بیٹھے رہے تو میرا دل پھٹ جائے گا۔ گھر آ کر میں سیدھی اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

"اقصیٰ!" اماں نے مجھے آواز دی۔

"جی......" میں نے مڑ کر انہیں دیکھا۔ سنیعہ اور روحیل ٹی وی لاؤنج کی طرف چلے گئے تھے۔

"تمہیں بہن کی کامیابی پر خوش ہونا چاہیے تھا' نہ کہ۔"

میں نے حیرت سے انہیں دیکھا۔ یہ اماں کیا کہہ رہی تھیں۔ مجھے سنیعہ کی کامیابی کی از حد خوشی تھی۔ میں تو کسی اور ہی عذاب میں مبتلا تھی' اور اماں......

"اماں! آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔ میں تو بہت خوش ہوں۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

میں نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا اور اب تک زبردستی روکے ہوئے آنسو رخساروں پر پھسل آئے۔

اماں عجیب طرح سے مسکرائیں اور واپس چلی گئیں۔

مجھے اماں کی بدگمانی پر دکھ ہوا اور میں بہت دیر تک روتی رہی اور روتے روتے جانے کب

سو گئی۔

اماں مجھ سے بدگمان تھیں۔ میں ان کی بدگمانی دور کرنا چاہتی تھی' انہیں بتانا چاہتی تھی' کہ مجھے سنیعہ کی کامیابی کی از حد خوشی ہوئی ہے اور میں کبھی بھی سنیعہ سے جیلس نہیں ہوئی تھی۔ مجھے پتا تھا' کہ وہ بہت ذہین ہے اور میں اس جیسی نہیں ہوں۔ یہ تو خداداد عطیہ ہے لیکن مجھے سمجھ میں نہیں آتا تھا' کہ کیسے یہ بدگمانی دور کروں اور کہیں سنیعہ بھی مجھ سے بدگمان نہ ہو جائے۔

کہیں وہ بھی یہ نہ سمجھ لے کہ میں اس کی شاندار کامیابی سے جل گئی ہوں۔ اس خیال سے میں اکثر سنیعہ کے پاس جا کر بیٹھ جاتی' خوامخواہ ہنسنے اور خوش ہونے کی ایکٹنگ کرتی لیکن اندر دل میں سائیں سائیں ہوتی رہتی۔

بہت جلد میں ایکٹنگ سے اوب گئی اور اپنے آپ میں کھو گئی۔

آخر میں اتنی عاقبت نااندیش کیوں ہوں۔ میں سنیعہ کی طرح کیوں نہیں ہو سکی۔ میں نے کیوں ایک اجنبی لڑکے سے باتیں کیں اور پھر۔ میرے پاس سوچنے کے لیے بہت کچھ تھا۔ میں اپنے آپ میں مگن رہتی۔ اپنے آپ سے لڑتی جھگڑتی رہتی۔

ایک بار پھر میرے دل میں بے شمار شکوے اور گلے بھر گئے تھے۔ سنیعہ کو "کنیرڈ" میں ایڈمیشن مل گیا تھا۔ وہ اپنی پڑھائی میں مگن ہو گئی تھی۔ میرا کالج جانے کو جی نہ چاہتا تھا۔ میں ہفتے میں ایک دو دن کالج جاتی تھی...... زندگی میں کسی شے میں میرے لیے کوئی دلچسپی نہ رہی تھی۔ پتا نہیں میں کیسے جی رہی تھی۔

❋ ❋ ❋

ابا ہمیشہ کے لیے آ گئے تھے۔

"یہ اقصیٰ کو کیا ہوا ہے؟"

مجھے دیکھ کر ابا کو شاک سا لگا۔

"کچھ بھی نہیں ابا۔"

میں نے مسکرانے کی کوشش کی اور میری نظر سنیعہ پر پڑی۔ ہلکے فیروزی رنگ کے سوٹ میں وہ بہت فریش لگ رہی تھی۔ جبکہ میں بہت تھکی تھکی اور نڈھال سی تھی۔ ایئرپورٹ آتے ہوئے میں نے یونہی آئینے میں دیکھا تھا۔ میری آنکھوں کے گرد راتوں کو جاگ جاگ کر اور مسلسل رونے سے حلقے پڑ گئے تھے۔ میرا رنگ اور بھی سانولا سا ہو گیا تھا۔

ابا بار بار تشویش سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ رات کو سونے سے پہلے وہ میرے کمرے میں

آئے۔

"کیا بات ہے اقصیٰ بیٹے! آپ اتنے کمزور کیوں ہو رہے ہو۔"

وہ میرے پاس ہی بیڈ پر بیٹھ گئے۔

"وہ ٹمپریچر ہوا تھا' نا۔"

"اماں نے تو کچھ نہیں کہا۔"

"نہیں بھلا اماں نے کیا کہنا تھا؟" میں نے نظریں جھکا لیں۔

"سوری ابا! میں بہت اچھے نمبر نہیں لے سکی۔"

"کوئی بات نہیں بیٹا! اب میں آ گیا ہوں نا تو خود آپ کو گائیڈ کروں گا۔"

ابا کچھ دیر میرے پاس بیٹھے باتیں کرتے رہے اور میرا جی چاہ رہا تھا۔ ابا کے پاؤں کے پاس بیٹھ کر ان کے گھٹنوں پر سر رکھ کر اپنی غلطی کا اعتراف کرلوں۔ ابا کو بتادوں کہ میں صرف کم شکل اور کم عقل ہی نہیں بلکہ بہت خراب بھی ہوں۔ بہت بری ہوں' میں نے ان کے اور اماں کے اعتبار کو دھوکا دیا ہے۔ مگر میری ہمت نہ ہوئی' سر جھکائے بیٹھی رہی اور میرے آنسو میرے اندر گرتے رہے۔

ابا آتے ہی بہت مصروف ہوگئے تھے، کیونکہ وہ وہاں سے جاب چھوڑ آئے تھے' اگرچہ یہاں ایک پرائیویٹ کمپنی میں ان کے دوست نے ان کے لیے جاب کا بندوبست کر رکھا تھا۔ لیکن ابا کا خیال اپنی کنسٹرکشن کمپنی بنانے کا تھا۔ سو وہ اسی سلسلے میں بہت مصروف ہوگئے تھے' اور حالات کا جائزہ لے رہے تھے۔ سو انہیں بہت دنوں پتا ہی نہیں چلا کہ میں کالج نہیں جا رہی ہوں۔ لیکن اس روز وہ گھر پر تھے' میں پانی لینے کے لیے کمرے سے باہر نکلی تو وہ گیلری میں کھڑے تھے' مجھے دیکھ کر چونکے۔

"ارے بیٹا! آپ کالج نہیں گئے؟"

"نہیں تو۔"

"کیوں بیٹے طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔" وہ میرے قریب چلے آئے۔

"جی۔"

"پھر بلاوجہ تو چھٹی نہیں کرنا چاہیے۔"

"وہ ابا!" میں نے جھجکتے ہوئے ان کی طرف دیکھا۔

"میں پڑھنا نہیں چاہتی ابا۔"

"کیوں بیٹا؟" انہیں ازحد حیرت ہوئی۔

"میرا جی نہیں چاہتا پڑھنے کو۔ میں شاید پڑھ نہیں سکتی۔"

"یہ تم سے کس نے کہا کہ تم پڑھ نہیں سکتی ہو۔"

ابا کے لہجے سے لگ رہا تھا' کہ میری بات سے انہیں ازحد دکھ ہوا ہے۔

"کسی نے نہیں۔" میں نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے کچل ڈالا۔ میں ابا کے سامنے رونا نہیں چاہتی تھی' لیکن آنسو تھے' کہ امڈے چلے آ رہے تھے۔

"یہ بہت غلط سوچ ہے آپ کی۔ بیٹا آپ نے پڑھنا ہے۔ کل سے آپ کالج جائیں گی اور اس سلسلے میں آپ کا کوئی عذر نہیں سنوں گا اور کوئی مشکل ہو تو میں ہوں نا گھر پر میں خود آپ کی مدد کروں گا۔" تب ہی فون کی بیل ہوئی اور ابا فون کی طرف متوجہ ہوگئے اور میں واپس اپنے کمرے میں آ گئی۔

میں ابا کو کیسے سمجھاؤں کہ میرے لیے زندگی ختم ہوگئی ہے اپنے تمام تر رنگوں سمیت اور مجھے کسی بھی شے سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔

سحرش اور فارحہ نے کئی بار فون کیا تھا' اور بتایا تھا' کہ دانش میرے لیے اداس ہے۔ مجھ سے بات کرنا چاہتا ہے۔ لیکن میں نے سحرش سے کہہ دیا تھا' کہ اسے کہہ دے کہ مجھے اب نہ تو اس سے بات کرنا ہے نہ ملنا ہے۔ وہ سمجھ لے کہ میں اس کے لیے مر چکی ہوں۔

لیکن دل تھا' کہ اسے سکون نہیں ملتا تھا۔ کیسی بے سکونی تھی۔ اور ابا چاہتے تھے' کہ میں کالج جاؤں لیکن میں جانتی تھی' کہ اگر میں کالج چلی بھی گئی تو، تو بھی کیا ہوگا۔ میرا ذہن، میرا دل اور دماغ میرے اختیار میں کہاں ہے۔ پھر بھی مجھے کالج تو جانا تھا۔ میں ابا سے ضد نہیں کر سکتی تھی۔ سو اگلے روز سے کالج جانے لگی۔

❋ ❋ ❋

ابا نے جاب کرلی تھی' اور فی الحال اپنی کنسٹرکشن کمپنی کھولنے کا ارادہ ملتوی کر دیا تھا۔ کیونکہ بقول ان کے' اس میں بہت ساری مشکلات تھیں، اپنے ہاں کے محکموں کی کارکردگی سے ابا کچھ مایوس ہوگئے تھے۔ سو جاب کرلینے سے جب ایک روٹین سیٹ ہوگئی تو انہوں نے میری طرف توجہ دی اور میرے ساتھ ساتھ وہ سعیعہ اور روحیل کی اسٹڈی کا بھی خیال کرتے اور انگلش خود پڑھاتے تھے۔ جب کہ سائنس سبجیکٹس کے لیے ٹیوٹر آتا تھا۔ ابا کے پاس بیٹھے بیٹھے میں کھو جاتی تھی، مجھے دانش کا خیال آ جاتا۔ مجھے اپنی توہین پر رونا آتا۔

دانش میری زندگی سے نکل گیا تھا' جیسے میرے لیے اب زندگی میں کچھ نہیں رہا تھا۔

"کیا بات ہے بیٹا؟" ابا پڑھاتے پڑھاتے اکثر پوچھتے۔

"تم اتنی چپ چپ کیوں رہتی ہو۔ کیا سوچتی ہو۔ کوئی بات ہے تو مجھے بتاؤ۔"

"کچھ بھی نہیں ابا! کوئی بات نہیں۔"

میں ابا سے کیا کہتی کہ مجھے کیا ہے۔

اس روز میں کالج سے آئی تو روحیل نے گیلری میں مجھے اطلاع دی۔

"صفدر ماموں آئے ہیں۔"

صفدر ماموں دبئی میں تھے' اور طویل عرصہ بعد آئے تھے۔ میں نے شاید کہیں بچپن میں انہیں دیکھا تھا۔ مجھے ان کی شکل صورت یاد نہ تھی۔

"پورے چودہ سال بعد وہ پاکستان آئے ہیں۔"

روحیل نے میری معلومات میں مزید اضافہ کیا۔

"اماں بہت خوش ہیں، وہ سب کے لیے بہت سارے گفٹ لائے ہیں۔ اماں کے لیے، میرے سمیعہ اور ابا کے لیے۔ اور تمہارے لیے بھی ایک سوٹ ہے۔"

"اچھا۔"

مجھے صفدر ماموں سے ملنے کا کوئی خاص اشتیاق نہ تھا۔ میں سیدھی اپنے کمرے میں چلی گئی، ظاہر ہے کھانے پر ملاقات ہو جاتی۔ میں یوں بھی ننھیال سے زیادہ فری نہ تھی۔ پتا نہیں کیوں میں نے اس پر کبھی غور نہیں کیا تھا۔ بڑے اور چھوٹے ماموں بھی آتے تو میں کبھی بہت اشتیاق سے نہیں ملتی تھی' اور ان سے تو اپنے ہوش میں مجھے پہلی بار ملنا تھا۔ اور پھر میں بہت ڈسٹرب تھی' کالج گیٹ سے نکلتے ہوئے میں نے دانش کو دیکھا تھا، وہ فارحہ کے ساتھ "پیزا شاپ" کی طرف جا رہا تھا۔

اس نے مجھے نہیں دیکھا تھا۔ میں تیزی سے آ کر گاڑی میں بیٹھ گئی تھی۔ لیکن میرا دل جیسے بھر بھر آ رہا تھا۔

دانش کی باتیں۔

اپنی محبت، اپنے جذبے۔

روحیل کے بلانے کے باوجود میں نے مڑ کر پیچھے نہیں دیکھا تھا' اور اپنے کمرے میں آ کر بہت سارا رو کر اور منہ ہاتھ دھو کر جب میں باہر آئی تو سمیعہ بھی کالج سے آ چکی تھی' اور کرامت

کھانا لگا رہا تھا۔

صفدر ماموں بھی کھانے کے کمرے میں تھے، میں سر جھکائے اندر داخل ہوئی تھی۔

"ماموں! یہ اقصیٰ ہے، آپ نے پہچانا۔"

روحیل جو صفدر ماموں کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھا تھا، اس نے کہا تو میں نے جھکا ہوا سر اٹھایا اور پھر جیسے ماہ و سال کی گردش وہیں تھم گئی۔

بڑی بڑی مونچھیں' جنہوں نے اوپر والے ہونٹ کو چھپا رکھا تھا۔ بڑی بڑی سرخی مائل آنکھیں، گہرا سانولا رنگ، اماں اور بڑے ماموں اور چھوٹے ماموں بھی گورے تھے' پھر یہ۔ یہ۔

میں انہیں ہی دیکھ رہی تھی۔

"خبردار اگر تم نے اماں کو تنگ کیا یا روئیں تو پنکھے سے الٹا لٹکا دوں گا۔ اور چمگادڑ کی طرح لٹکی رہو گی ہمیشہ۔"

میرے کانوں میں جیسے کسی نے سرگوشی کی۔

وہ ہی خواب والا آدمی۔

بے اختیار میرا ہاتھ اپنے رخسار پر چلا گیا اور میری چیخ نکل گئی۔

"کیا ہوا؟" ابا نے ایک دم اٹھ کر مجھے تھام لیا۔

"ابا۔ یہ۔ یہ۔" میری زبان سے کچھ بے ربط سے لفظ نکلے تھے' اور پھر میں ابا کے بازوؤں میں جھول گئی تھی۔

شاید یہ دانش کو دیکھنے اور مسلسل رونے کا اثر تھا' یا پھر صفدر ماموں کو دیکھ کر وہ خواب والا آدمی تصور میں آ گیا تھا' یا نہ جانے کیا بات تھی' کہ میں بے ہوش ہو گئی تھی۔ جب میں ہوش میں آئی تو وہیں ڈائننگ روم میں کارپٹ پر لیٹی تھی۔ اور میرا سر ابا کی گود میں تھا، میرے ہونٹ ہولے ہولے لرز رہے تھے، شاید میں کہہ رہی تھی' کہ "یہ مجھے الٹا لٹکا دیں گے۔ یہ مجھے ماریں گے۔ انہوں نے مجھے مارا ہے۔"

"بیٹا! ہوش کرو۔"

ابا نے مجھے آنکھیں کھولتے دیکھ کر میرے رخسار تھپتھپائے اور چند لمحوں بعد میں مکمل طور پر ہوش میں آ کر اٹھ بیٹھی اور حیران نظروں سے ابا کو دیکھا۔

"مجھے کیا ہوا تھا؟"

"کچھ نہیں، شاید تم۔"

ابا نے بات ادھوری چھوڑ دی اور میری نظریں صفدر ماموں کی طرف اٹھیں اور میرا رنگ یکدم زرد پڑ گیا۔ میں نے بے اختیار ابا کا ہاتھ تھام لیا۔ میں کوئی چھوٹی بچی نہیں تھی' لیکن پتا نہیں کیوں مجھے صفدر ماموں سے خوف آ رہا تھا، ابا نے میرا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔

"اٹھو بیٹا! کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔"

"ابا! مجھے بھوک نہیں ہے، میں اپنے کمرے میں جاؤں گی۔"

"ٹھیک ہے، جاؤ۔"

"کمال ہے۔" میں نے باہر جاتے جاتے سنا۔ صفدر ماموں کہہ رہے تھے۔ "اتنی پرانی بات اس کے ذہن میں موجود ہے، حالانکہ تب تو یہ بالکل بچی تھی۔ دو تین سال کی۔ یہ نہ جانے کس بات پر رو رہی تھی' اور آپ کے کہنے پر میں نے اسے ڈرایا تھا۔ یاد ہے نا آپ کو آپا؟"

"ظاہر ہے بچوں کو ڈرایا بھی جاتا ہے۔ مارا بھی جاتا ہے۔" اماں نے جواب میں کہا تھا۔

مگر میرا ذہن اتنا الجھا ہوا تھا' کہ میں نے اماں اور صفدر ماموں کی بات پر بالکل غور نہیں کیا۔

کمرے میں آ کر نہ جانے کب میں سو گئی تھی' پھر شام کو میری آنکھ کھلی تھی۔ اماں اور روحیل صفدر ماموں کے ساتھ شاپنگ کے لیے گئے ہوئے تھے۔ سعیدہ پڑھ رہی تھی' اور ابا گیلری میں اپنی مخصوص چیئر پر خاموش بیٹھے جانے کیا سوچ رہے تھے۔

"ابا۔" میں نے ان کے پاس جا کر آہستگی سے انہیں ہلایا تو انہوں نے چونک کر مجھے دیکھا۔

"آج بہت سوئی ہو بیٹا! کیا بہت تھک گئی تھیں۔"

"جی ابا! پتا نہیں کیوں نیند آ گئی تھی۔ کتابیں لے آؤں پڑھنے کے لیے۔"

"نہیں، آج چھٹی ہے۔ باپ بیٹی دونوں باتیں کریں گے۔" وہ مسکرائے۔ اور انہوں نے کرامت کو آواز دی۔

"کرامت! میرے اور اقصیٰ کے لئے چائے لے آؤ اور ساتھ کھانے کے لیے بھی کچھ لانا۔ اقصیٰ نے دن کو بھی کچھ نہیں کھایا۔"

میں وہیں ابا کے پاس بیٹھ گئی۔

"ابا! آپ نے کھانا کھایا تھا؟"

پتا نہیں کیوں مجھے گمان گزرا تھا' کہ ابا نے بھی کھانا نہیں کھایا ہوگا۔

"نہیں۔ بھوک نہیں تھی، ابھی ہم دونوں چائے کے ساتھ کچھ کھاتے ہیں۔ ٹھیک ہے نا۔" وہ مسکرائے۔

اور میں اندر ہی اندر شرمندہ سی ہو گئی۔ یقیناً میری وجہ سے ابا پریشان ہو گئے ہوں گے۔

"سوری ابا!" میں نے شرمندگی سے انہیں دیکھا۔

"میری وجہ سے آپ کو پریشانی ہوئی لیکن پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا۔ میں نے آپ کو ایک خط میں لکھا تھا' نا ابا کہ میں بچپن سے ہی ایک خواب بہت دیکھتی ہوں، جس میں ایک شخص مجھے ڈراتا ہے اور میں اتنی بڑی ہو کر بھی ڈر جاتی ہوں۔

پتا نہیں کیوں میں نے صفدر ماموں کی طرف دیکھا تو مجھے لگا جیسے وہ خواب والے آدمی ہوں، اور۔ میں خوفزدہ ہو گئی۔ مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ میں بھاگ رہی ہوں اور اتنی بڑی ہوں اور سامنے صفدر ماموں ہیں۔ سوری ابا۔"

"کوئی بات نہیں بیٹا! ہو جاتا ہے کبھی کبھی ایسا، انسانی ذہن بہت عجیب اور پیچیدہ ہوتا ہے۔" انہوں نے میرے ہاتھ تھپتھپائے۔

"لیکن بیٹا! اتنا زیادہ کسی بھی بات کے بارے میں مت سوچا کرو، اتنی حساسیت اچھی نہیں ہوتی۔ اس زندگی میں پتا نہیں کتنی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ زندگی ہمیشہ ایک سی نہیں رہتی ہے۔ کبھی کبھی تو یہ بندے کو اپنی ٹھوکروں پر رکھ لیتی ہے حالات کو بہادری سے فیس کرنا سیکھو۔"

"جی ابا!" میں نے سر جھکا لیا اور سوچا۔

"ابا کو کیا پتا کہ زندگی واقعی میرے لیے کتنی مشکل ہو گئی ہے اور اتنی کم عمری میں کتنا بڑا درد سہہ لیا ہے میں نے۔"

"بیٹا! تمہاری میڈم جعفری کیسی ہیں پھر کبھی ان سے ملاقات ہوئی؟" ابا نے ایک دم موضوع بدل دیا۔

"نہیں ابا۔ پھر تو کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔"

"اور یہاں کالج میں کون سی میڈم سب سے اچھی لگتی ہے۔"

"سب اچھی ہیں لیکن مس جعفری جیسا کوئی نہیں ہے۔"

"اچھا! اور کوئی نئی دوست بنی۔"

"کوئی خاص نہیں، فارحہ اور سحرش سے کچھ دوستی تھی۔ لیکن اب وہ بھی نہیں ہے۔"

"کیوں بیٹا! ناراضی ہو گئی کیا؟"

”نہیں، ناراضی بھی نہیں بس یونہی۔“

”بیٹا! دوست اتفاق سے اگر کوئی مل جائے تو اسے کھونا نہیں چاہیے۔ اچھا دوست بہت بڑی نعمت ہوتا ہے۔“

”مگر ابا! وہ اچھی دوست نہیں ہیں، بہت فضول ہیں۔“

”اور میں کیسا ہوں؟“ ابا نے میری آنکھوں میں جھانکا۔

”آپ تو بہت اچھے ہیں ابا۔“

”تو پھر میرے ساتھ دوستی ہو سکتی ہے کیا؟“

”جی۔“ میری آنکھیں یکدم چمک اٹھیں اور دل میں پھول سے کھل اٹھے۔

”تو پھر دوستی پکی۔“ انہوں نے ہاتھ آگے بڑھایا تو میں نے اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

”اور جو دوست ہوتے ہیں بیٹا! ان سے کبھی کوئی بات نہیں چھپائی جاتی، ہر بات کہہ دی جاتی ہے۔ اب مجھے بتائیں آپ ہر وقت کیا سوچتی رہتی ہیں۔ کون سی بات آپ کو پریشان کر رہی ہے۔ کیا اماں نے کچھ کہا ہے بیٹا؟“

”نہیں تو ابا۔ اماں تو کبھی کچھ نہیں کہتیں۔“

ابا کی آنکھوں میں محبت تھی، شفقت تھی، تشویش تھی۔

میرے اندر جل تھل ہونے لگی۔ یہ اتنے محبت کرنے والے اتنے اچھے ابا کو اگر پتہ چل جائے کہ میں۔ میں کیسی ہوں۔ اور میں نے انہیں دھوکا دیا ہے تو۔ آنسو امڈ امڈ کر باہر آنے لگے۔ میں نے بہت کوشش کی کہ آنسوؤں کو روک لوں لیکن وہ پلکوں کی باڑ توڑ کر رخساروں سے بہہ نکلے۔

ابا نے تڑپ کر مجھے دیکھا۔

”اقصیٰ بیٹا! کیا بات ہے جو کچھ آپ کے دل میں ہے کہہ دو بیٹا۔ میں ہوں نا آپ کا ابو، آپ کی ہر بات کو سننے کے لیے۔ آپ کی ہر خواہش پورا کرنے کے لئے، کسی سے کوئی گلہ ہے تو مجھے بتاؤ آپ کی وجہ سے بیٹا میں اندر سے بیمار ہو گیا ہوں۔ آپ اتنی چپ چپ، اتنی الگ تھلگ، اتنی اداس اداس کیوں ہو۔“

ابا کی آواز بھرا گئی، مجھے لگا جیسے میرا دل پھٹ جائے گا۔ ابا مجھ سے کتنی محبت کرتے تھے۔ کتنا خیال تھا انہیں میرا اور میں۔

”ابا۔“ میں اٹھ کر ان کے پاؤں کے پاس بیٹھ گئی اور اپنے ہاتھ ان کے گھٹنوں پر رکھ دیے۔

”میں نالائق اور کند ذہن ہی نہیں کم عقل اور بے وقوف بھی ہوں۔“

”بری بات بیٹا! ایسے نہیں کہتے۔“ ابا نے تاسف سے مجھے دیکھا۔

”نہیں ابا! آپ کو نہیں پتا، میں نے کیا کیا ہے۔ میں نے۔“

آنسوؤں سے میرا حلق رندھ گیا، لیکن میں نے سب کچھ بتا دیا ہولے ہولے، ٹھہر ٹھہر کر۔

ابا ساکت سے بیٹھے سنتے رہے۔

”ابا۔ پلیز، مجھے معاف کر دیں۔ میں بہت بری ہوں، بہت خراب ہوں۔ آپ بہت دور تھے اور مجھ سے کوئی محبت نہیں کرتا تھا۔ بڑے ماموں، چھوٹے ماموں اور ان کے گھر والے سب۔ اور اماں کوئی بھی نہیں۔ میں سعیقہ کی طرح خوبصورت نہیں ہوں اور اس کی طرح لائق بھی نہیں ہوں اور دانش نے کہا تھا کہ میں خوبصورت ہوں اور اس نے کہا تھا کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔“

میں بے تحاشا رو رہی تھی۔ ابا نے میرے سر پر ہاتھ رکھا۔ ان کا ہاتھ ہولے ہولے لرز رہا تھا۔ میں نے ذرا سی نظریں اٹھا کر انہیں دیکھا۔ ان کا رنگ زرد ہو رہا تھا اور چہرہ ستا ستا لگ رہا تھا۔ شاید وہ مجھ سے خفا ہو گئے تھے۔ شاید انہیں میری بات سن کر بہت دکھ ہوا تھا۔

میرے آنسو اور روانی سے بہنے لگے۔

”مت روؤ، مت روؤ اقصیٰ مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔“ ابا نے مجھے یکدم سینے سے لگا لیا۔

”ابا! آپ نے مجھے معاف کر دیا؟“

میں نے ان کے سینے سے لگے لگے پوچھا۔

”اور کیا آپ اب بھی مجھ سے محبت کریں گے اور مجھے اچھا سمجھیں گے۔“

”آدمی غلطیوں سے سیکھتا ہے بیٹا! مجھے یقین ہے کہ آئندہ آپ ایسی کوئی غلطی کبھی نہیں کریں گی جو ہوا اسے بھول جاؤ۔ بھولنے کی کوشش کرو، شاید اس میں کچھ کوتاہی میری بھی ہے۔ لیکن وعدہ کرو بیٹا آئندہ ایسی کوئی بات نہیں ہوگی اور یہ کہ اب کوئی بھی بات مجھ سے نہیں چھپاؤ گی۔“

”وعدہ۔“ ان سے الگ ہو کر میں نے ہاتھوں کی پشت سے آنسو پونچھے۔

”اور یہ کیا بات ہوئی بھلا کہ میں اچھا سمجھوں گا۔ بیٹا آپ ہیں ہی بہت اچھی اور یہ بات

اپنے ذہن سے نکال دو کہ آپ خوبصورت نہیں ہو۔ آپ کو یاد ہے آپ کی میڈم نے آپ سے کہا تھا' حسن گوری رنگت میں نہیں ہوتا۔ حسن تو آپ کی شخصیت میں، آپ کی ذات میں ہوتا ہے۔ ٹھیک ہے نا، اب آپ جائیں منہ ہاتھ دھوئیں اور ریلیکس ہو کر آئیں۔ کرامت چائے لاتا ہی ہوگا۔"

اور منہ دھوتے ہوئے میں نے دل میں عہد کیا کہ اب میں کبھی ابا کو دکھ نہیں دوں گی اور وہی کروں گی' جو ابا چاہتے ہیں اور بہت محنت سے بہت دل لگا کر پڑھوں گی۔ اور میں نے اس عہد کو نبھانے کی پوری کوشش کی۔ ابا خوش تھے' اور میری اسٹڈی سے مطمئن تھے۔

"مجھے یقین ہے، میرا بیٹا اس بار پوزیشن لے گا۔"

ابا میرے ٹیسٹ چیک کرتے ہوئے بہت یقین سے کہتے تھے۔

لیکن میری کم حاضریوں کی وجہ سے میرا ایڈمیشن نہ جا سکا۔ ابا خود پرنسپل سے بھی ملے اور انہیں یقین دلایا کہ میری تیاری مکمل ہے۔ اور یہ کہ میں بہت اچھے نمبر لوں گی لیکن انہوں نے معذرت کر لی کہ وہ اصول کے خلاف کچھ نہیں کر سکتیں۔ ابا افسردہ سے تھے' اور میں شرمندہ تھی۔ ابا نے اتنی محنت کی تھی' اور میں امتحان نہیں دے پا رہی تھی۔

"خیر، کوئی بات نہیں، اگلے سال دے دینا۔ مزید تیاری بھی ہو جائے گی۔"

ابا نے مجھے تسلی دی تھی' لیکن انہوں نے اماں سے گلہ کیا۔

"تمہیں اس بات کا خیال رکھنا چاہیے تھا' کہ اقصیٰ بلاوجہ چھٹیاں نہ کرے۔"

"مجھے کیا خبر کہ یہ کالج کے بہانے کہاں چلی جاتی ہے۔"

اماں کا لہجہ اتنا کڑوا اور تلخ تھا' کہ اس کی کڑواہٹ مجھے اپنے اندر تک اترتی محسوس ہوئی، ابا کا رنگ یکدم سرخ ہو گیا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"مطلب تو آپ اقصیٰ سے پوچھیں کہ یہ کالج کے بہانے کہاں چلی جاتی تھی۔" اماں نے کبھی اس طرح بات نہیں کی تھی۔ کبھی غصہ نہیں ہوئی تھیں، کبھی ڈانٹا نہیں تھا' لیکن پتا نہیں کیوں آج ان کے لہجے میں نئی کڑواہٹ گھلی ہوئی تھی۔

"میں نے خود دیکھا تھا' اسے ایک دن کسی لڑکے کے ساتھ اور غلطی تو آپ کی ہے۔ جوان لڑکی کے کمرے میں الگ سے فون رکھوا دیا۔ کیا آپ کو نہیں پتا کہ ماحول کیا ہے اور۔"

پتا نہیں اماں نے مزید کیا کہا تھا، میں نے سنا نہیں۔ میرے کان سائیں سائیں کر رہے

تھے۔

تو کیا اماں کو پتا تھا، اماں جانتی تھی' کہ میں۔ لیکن پھر اماں نے مجھے ڈانٹا کیوں نہیں، کچھ کہا کیوں نہیں۔

"آدھی آدھی رات تک فون پر باتیں کرتی تھی۔ میں نے پوچھا تھا' اس کی فرینڈ سے، اس کے گھر جانے کا بہانا کر کے ملنے جاتی تھی، وہ تو ایک لڑکا ہے' جس کے ساتھ میں نے دیکھا نہ جانے اور کتنے لڑکوں سے فون پر دوستی کر رکھی ہے۔۔۔"

"چپ کر جاؤ فاطمہ! اس سے آگے مزید ایک لفظ مت کہنا۔" ابا کی آواز لرز رہی تھی۔

اماں یکدم چپ ہو گئیں۔ میں ساکت بیٹھی تھی۔

"اقصیٰ" ابا نے میری طرف دیکھا۔

"بیٹا! آپ اپنے کمرے میں جاؤ۔" انتہائے ضبط سے ان کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور پورا وجود ہولے ہولے لرز رہا تھا، میں نے ٹیبل پر سے اپنی کتابیں اٹھائیں اور باہر نکل آئی۔

"اور تم نے اسے روکا، منع کیا، سمجھایا، مجھے بتایا؟ نہیں فاطمہ بیگم۔"

باہر آتے آتے میں نے سنا۔ غیرارادی طور پر میں باہر ہی ٹھہر گئی۔

"تم ماں تھیں، تمہارا فرض تھا' کہ تم اسے روکتیں، منع کرتیں، وہ تو نادان تھی۔ کیا تمہارا فرض نہیں تھا' کہ تم اسے سمجھاتیں۔"

اماں نے خدا جانے کیا کہا تھا، میں سن نہیں سکی۔

"نہیں فاطمہ! کوئی دلیل مت دو۔ میں نے تمہیں سمجھنے میں بہت غلطی کی میں نے سب کچھ جان لیا ہے۔ ساری جمع تفریق کا ایک ہی جواب ہے، کاش میں کچھ پہلے یہ سب جان لیتا۔ تم میرے تصور سے بھی زیادہ Cunning (چالاک) ہو۔ تم نے میرے اعتبار، میرے بھروسے کو ٹھیس پہنچائی ہے۔ میں تمہیں کبھی معاف نہیں کر سکتا۔"

اماں نے پھر کچھ کہا تھا' بہت آہستگی سے' جسے میں سن نہیں سکی تھی۔

"اقصیٰ کے متعلق کچھ مت کہنا۔ کچھ بھی نہیں، اس نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے، ایک ایک لفظ۔"

ابا کے لہجے میں ٹھہراؤ آ گیا تھا۔ اور میرے اندر عجیب سی ہلچل مچی تھی۔ میں تھکے تھکے قدموں سے اپنے کمرے میں آ گئی۔

کچھ دیر بعد جب ابا میرے کمرے میں آئے تو میں نے نگاہیں جھکائے رکھیں تاکہ ابا کو

معلوم نہ ہونے پائے کہ میں روئی ہوں۔ مگر ابا کی نظروں نے دیکھ لیا لیکن انہوں نے جتایا نہیں۔

''کیا خیال ہے، آج پڑھنے کا موڈ ہے۔''

''نہیں ابا! آج نہیں۔ یوں بھی میری تیاری تو مکمل ہے اور ابھی پورا سال ہے۔''

''پورے سال کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے بیٹا! کہ تم بالکل لاپروا ہو جاؤ۔ اس طرح تو سب ذہن سے محو ہو جائے گا۔ تھوڑی بہت اسٹڈی جاری رکھو۔''

''جی!''

''اور۔'' ابا کچھ کہتے کہتے رک گئے۔

''اور یہ کہ رونا بھی نہیں ہے چھوٹی چھوٹی باتوں پر، یہاں اس دنیا میں سب کچھ ہماری مرضی کے مطابق نہیں ہوتا اور ہمیں بہت کچھ فیس کرنا پڑتا ہے۔''

اس روز پھر ابا نے دیر تک مجھ سے بیٹھ کر باتیں کیں۔ اور شام کو ہم تینوں کو آئس کریم کھلانے لے گئے۔

میں نے ازحد محنت کی تھی' اور میرے پیپرز میری توقع سے بھی زیادہ اچھے ہوئے تھے۔ سبیعہ نے بھی میرے ساتھ ہی ایف ایس سی کا امتحان دیا تھا۔ اب ہم دونوں ایک ہی کلاس میں تھے۔ مجھے اپنے دو سال ضائع جانے کا بہت قلق تھا، لیکن گزرا ہوا وقت واپس نہیں آ سکتا تھا۔ امتحانوں سے فارغ ہونے کے کچھ دنوں بعد ہی ابا نے مجھے اور سبیعہ کو برٹش کونسل میں اسپوکن انگلش کی کلاسز لینے کے لیے کہا مگر سبیعہ کا موڈ نہ بن سکا لیکن میں جانے لگی۔

ابا مجھے اور روحیل کو وقت دیتے تھے۔

ابا مجھے برٹش کونسل خود چھوڑنے اور خود لینے جاتے تھے۔ ہفتے میں صرف تین دن کلاسز ہوتی تھیں اور باقی دن ابا ضرور کہیں نہ کہیں باہر جانے کا پروگرام بنا لیتے تھے' اگر روحیل کا ٹیسٹ وغیرہ ہوتا تو پھر ایک لمبی ڈرائیو کر کے اور آئس کریم کھا کر ہم واپس آ جاتے تھے' اماں بھی ہمارے ساتھ نہیں گئیں نا ابا نے کبھی ان سے ساتھ چلنے کو کہا۔ میں نے محسوس کیا تھا' کہ ابا اور اماں کے درمیان بات چیت بھی نہ ہونے کے برابر تھی، یہ احساس ہوتے ہی میں نے کئی دن تک بغور جائزہ لیا۔ اماں کوئی بات کہتیں تو ابا سر ہلا دیتے یا ہوں کہنے پر اکتفا کرتے۔ خود سے کوئی بات نہ کرتے تھے۔

میں نے آرٹس گروپ میں پہلی پوزیشن لی تھی' اور سبیعہ نے بھی فرسٹ کلاس لی تھی۔ ابا کی خوشی دیکھنے والی تھی۔ مجھے گلے لگاتے ہوئے ان کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

''میں آج بہت خوش ہوں۔ بے حد۔''

خود میرا دل بھی بھر بھر آ رہا تھا' لیکن میں ضبط کیے مسکراتی رہی تھی، سبیعہ اور روحیل بھی خوش تھے' اور ٹی وی پر انٹرویو دیتے ہوئے میں نے سامنے بیٹھے ابا کی طرف دیکھا۔ ان کا سر فخر سے اٹھا ہوا تھا' اور آنکھیں دمک رہی تھیں۔

''آپ نے اپنی بہن کی طرح سائنس کیوں نہیں لی۔ آپ ڈاکٹر یا انجینئر نہیں بننا چاہتی تھیں۔''

مجھ سے سوال کیا گیا تو میں گھبرا گئی۔

''شاید میرے لیے سائنس کیمیکلس پڑھنا مشکل تھا' اور میں۔''

''ایسی بات نہیں ہے سر! اقصیٰ اگر پری میڈیکل میں جاتی تو یقیناً وہاں بھی پوزیشن لیتی، بات رجحان کی ہے ورنہ یہ مجھ سے زیادہ ذہین ہے۔ انگلش میں اس نے بورڈ میں سب سے زیادہ نمبر لیے ہیں۔''

سبیعہ نے میری بات کاٹ دی تھی، مجھے اس پر بہت پیار آیا۔

خدا کا شکر کہ سبیعہ اور روحیل نے کبھی میری شکل کی وجہ سے مجھے ناپسند نہیں کیا تھا۔ میں ڈاکٹر یا انجینئر نہیں بن سکتی تھی' لیکن میں نے سوچ لیا تھا' کہ میں سی ایس ایس کروں گی اور مجھے بہت اچھے کالج میں ایڈمیشن بھی مل گیا تھا' اور میں نے شروع سال سے ہی محنت کرنا شروع کر دی تھی۔

میرے پاس لٹریچر اور سائیکالوجی تھے۔ میرے اندر غیر محسوس طور پر تبدیلیاں پیدا ہوئی تھیں۔ میں کوشش کرتی تھی' کہ فارغ ہو کر کچن میں اماں کے ساتھ کام کر سکوں۔ اماں سے بات بھی کرتی تھی' لیکن اماں بہت کم میری باتوں کا جواب دیتی تھیں۔ ان کی ناراضی مجھے سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ اب تو میں نے پوزیشن لے لی تھی' اور میں پہلے جیسی بے وقوف اور احمق اور لاابالی نہیں تھی۔ پھر بھی پتا نہیں کیوں اماں مجھ سے کبھی محبت نہ کر سکیں۔ سبیعہ بہت بڑی ہو گئی تھی۔

ابا اب بہت مطمئن لگتے تھے' لیکن ان کے اور اماں کے درمیان اب بھی بات چیت کم ہی ہوتی تھی۔

✵ ✵ ✵

میرے بی اے کے ایگزام ہو گئے تھے' اور سبیعہ دوسرے سال کے فائنل پیپرز کی تیاری کر رہی تھی' اور ایک طرح سے اپنے کمرے میں بند تھی' اور میں ازحد بور ہو رہی تھی' اس روز میں

ٹی وی لاؤنج میں بیٹھی میگزین دیکھ رہی تھی' کہ ابا آ گئے۔

''کیا ہو رہا ہے؟''

''کچھ نہیں بور ہو رہی ہوں۔ سوچ رہی ہوں، رزلٹ آنے تک کوئی کورس کرلوں۔ کوکنگ یا بیکنگ کا۔''

''ٹھیک ہے لیکن میرا خیال ہے تم سی ایس ایس کی تیاری شروع کردو۔ اب تک ریلیکس ہو چکی ہوگی۔''

''جی ابا!''

''تو ایسا ہے کہ میں فریش ہو کر آتا ہوں تو ہم باہر چلتے ہیں۔ کچھ کتابیں خریدیں گے۔''

میں ایک دم خوش ہوگئی۔

''ہاں مجھے آپ اچھی اچھی کتابیں خرید دیں، بہت دنوں سے میں نے کچھ بھی نہیں پڑھا۔''

بک کارنر پر اپنے لیے کتابیں دیکھتے ہوئے اچانک ہی میری نظر دوسرے کاؤنٹر پر وِش کارڈز دیکھتے دانش پر پڑی اور عین اسی لمحے اس نے بھی مجھے دیکھا تھا' اور پھر کارڈز وہیں چھوڑ کر تیزی سے وہ میری طرف آیا۔

''نیلی۔ سوری۔ اقصیٰ تم۔ تم کیسی ہو، کہاں ہوتی ہو۔ یقین کرو اقصیٰ! ان تین سالوں میں ایک منٹ کے لیے بھی میں تمہیں نہیں بھولا۔ پتہ نہیں تم یکدم، اچانک کیوں خفا ہوگئی تھیں۔ کم از کم میرا قصور بتایا ہوتا۔''

میں نے گھبرا کر ابا کی طرف دیکھا' جو میرے ساتھ ہی کھڑے تھے۔ اگرچہ دانش کی آواز بہت آہستہ تھی، ابا بھی کچھ فاصلے پر کھڑے کوئی کتاب دیکھ رہے تھے، تاہم وہ ہماری طرف متوجہ ہوگئے۔

''ابا۔'' میں ایک قدم بڑھا کر ابا کے پاس آ کھڑی ہوئی۔

''یہ دانش ہے۔''

میری آواز آہستہ تھی' لیکن اتنی بھی نہیں کہ دانش نہ سن سکے۔ وہ ایک دم گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔ ابا کی سوالیہ نظریں اس کی طرف اٹھیں۔

''السلام علیکم!'' بے اختیار اس کے ہونٹوں سے نکلا۔

ابا نے صرف سر ہلانے پر اکتفا کیا اور پھر میرا ہاتھ پکڑ کر دوسرے کاؤنٹر کی طرف بڑھ

گئے۔

میں بے حد پزل ہو رہی تھی۔ ابا کے ہاتھ میں دبا ہوا میرا ہاتھ پسینہ پسینہ ہو رہا تھا' اور سینے کے اندر میرا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ میں نے تقریباً تین سال بعد اسے دیکھا تھا' اور ان تین سالوں میں، میں خود کو یہ باور کرانے کی کوشش کرتی رہی تھی' کہ میں اسے بھول چکی ہوں لیکن شاید ایسا نہیں تھا' میں اسے نہیں بھولی تھی۔ وہ اسی طرح میرے دل میں' میرے اندر موجود تھا۔

آج وہ سامنے نظر آیا تھا' تو جیسے دل اسے بہت ساری رعایتیں دینے کو تیار ہو رہا تھا۔

اپنے کانوں سے سب کچھ سننے کے باوجود۔

کیا خبر اس دوست نے جھوٹ بولا ہو۔

کیا پتا۔ آنسو تھے کہ امڈے چلے آ رہے تھے۔ سخت شعوری کوشش سے میں نے انہیں باہر نکلنے سے روکا۔ کتابوں سے میری دلچسپی یکایک ختم ہوگئی تھی' اور ابا نے بھی شاید اسے محسوس کرلیا تھا، چنانچہ چند کتابیں لے کر انہوں نے پے منٹ کی اور ہم باہر نکل آئے' باہر نکلتے ہوئے اسے دوبارہ دیکھنے کی خواہش میں غیر ارادی طور پر میں نے مڑ کر دیکھا تھا' لیکن وہ کہیں نظر نہیں آیا تھا۔ ابا نے راستہ بھر اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کی تھی' بلکہ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے تھے۔ مثلاً یہ کہ انہوں نے بھی سی ایس ایس کا امتحان دینے کا سوچا تھا'، تیاری بھی کی تھی' لیکن ادھر سی ایس ایس کے ایگزیم کی ڈیٹ آئی ادھر انہیں جاب مل گئی۔ سو انہوں نے امتحان نہیں دیا۔

میں کوشش کر رہی تھی' کہ میرا دھیان ابا کی باتوں کی طرف رہے، لیکن بار بار دھیان دانش کی طرف چلا جاتا تھا۔ میں کوئی ناسمجھ لڑکی نہ تھی، بیس سال کی سمجھ دار لڑکی تھی' پھر بھی رات بھر میرے آنسو میرے تکیے کو بھگوتے رہے۔ یہ کچی عمر کی محبت۔ جو پتا نہیں محبت تھی' بھی یا نہیں مگر جس نے اندر سے زندگی کے رنگ مٹا دیے تھے، میں جو کچھ کر رہی تھی' صرف ابا کی خاطر۔

میں انہیں دکھ نہیں دینا چاہتی تھی۔

رات ایک بجے بیل ہوئی تھی۔ میرے کمرے میں فون نہیں تھا۔ ابا کے آنے کے بعد اسے گیلری میں رکھ دیا گیا تھا اور اسی فون کی بیل ہو رہی تھی۔ اور میرے دل نے کہا یہ۔ یہ یقیناً دانش کا فون ہوگا۔

میرے اندر دل مچل رہا تھا' کہ ایک بار، صرف ایک بار اسکی آواز سن لوں، لیکن میں ضبط کیے بیٹھی رہی۔ تھوڑے سے وقفے کے بعد پھر بیل ہوئی۔ ابا اٹھ کر گیلری میں آئے تھے' اور ان کے پیچھے ہی اماں بھی تھیں۔

"کس کا تھا؟" میں نے اماں کی آواز سنی۔

"رانگ نمبر تھا۔" ابا کے قدموں کی آواز اور اماں کی بڑبڑاہٹ سناٹے اور خاموشی میں سنائی دی تھی۔

"میری تو جان ہی نکل گئی کہ آدھی رات کو خدا خیر کرے، بھائی جان کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں تھی۔"

"دانش۔ دانش۔" میرا دل ایک ہی نام دہرا رہا تھا۔

"یہ اسی کا فون تھا۔ یقیناً اسی کا۔" میں نے گھٹنوں پر سر رکھ دیا اور رونے لگی۔

صبح ناشتے پر میرا سر بھاری ہو رہا تھا' اور آنکھیں سرخ' ابا نے گہری نظروں سے مجھے دیکھا لیکن کہا کچھ نہیں۔

* * *

اور ایک بار پھر میں نے خود کو کتابوں میں گم کر دیا۔ ابا نے سی ایس ایس کے سوالات کے متعلق کتابیں تلاش کر لی تھیں اور اس سلسلے میں وہ مجھے گائیڈ کر رہے تھے۔ میرا رزلٹ آ گیا اور میں نے یونیورسٹی میں پہلی پوزیشن لی تھی۔ اس روز بھی ابا کی خوشی دیدنی تھی۔

"اب بتاؤ، تم تو کہتی تھیں کہ تم نالائق، کم عقل اور کند ذہن ہو۔"

میری نگاہیں بے اختیار اماں کی طرف اٹھ گئیں۔ اماں کی آنکھوں میں اتنی سرد مہری تھی' کہ ایک لحہ کو جیسے میرے وجود میں برف سے اتر گئی لیکن دوسرے ہی لمحے روحیل نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

وہ خوشی سے بھنگڑا ڈال رہا تھا۔

سبیعہ بھی اپنے کمرے سے موٹی سی کتاب ہاتھ میں لیے باہر نکل آئی تھی۔

روحیل کے اصرار پر ابا ہم سب کو ڈنر کے لیے باہر لے گئے۔ روحیل نے سبیعہ کو بھی ساتھ چلنے پر تیار کر لیا۔

"ڈاکٹر صاحب! ایسی خوشیاں روز روز سیلیبریٹ نہیں کی جاتیں۔ اور ابھی تو بجو کے ذاتی جیب خرچ سے بھی ٹریٹ لی جائے گی۔"

"ضرور۔" میں مسکرائی۔

"اماں! آپ تیار نہیں ہوئیں؟" میں نے حیران ہو کر دیکھا۔

"نہیں، تم لوگ جاؤ۔" اماں نے نگاہیں اٹھائے بغیر کہا۔

"مگر کیوں اماں؟" میں نے بے اختیار پوچھا۔

"پہلے تو آپ جاتی تھیں اور آج تو اسپیشل ڈے ہے، بجو نے پوزیشن لی ہے اور یہ کتنی خوشی کی بات ہے۔" روحیل بھی تیار ہو کر آ گیا تھا۔

"یوں ہی میرا جی نہیں چاہتا باہر جانے کو۔ بوڑھی ہو گئی ہوں' تم لوگ جاؤ۔"

"نہیں بالکل بھی نہیں۔ آپ بالکل بھی بوڑھی نہیں ہوئی ہیں۔ کیوں ابا؟" سبیعہ نے ابا کی طرف دیکھا' جو بظاہر لاتعلق سے بیٹھے تھے۔

"آپ کہیں نا اماں سے، ساتھ چلیں۔"

روحیل نے بھی ابا سے سفارش کی تو ابا نے ہاتھ میں پکڑا ہوا ریموٹ نیچے رکھتے ہوئے اماں کی طرف دیکھا۔

"فاطمہ! بچے کیا کہہ رہے ہیں۔ تیار ہو جاؤ۔"

اماں اٹھ کھڑی ہوئیں شاید وہ بھی چاہتی تھیں کہ ابا کہیں ان سے خود ساتھ چلنے کو۔

مجھے بے حد خوشی ہوئی تھی' کہ اماں ساتھ جا رہی تھیں ورنہ میں دل ہی دل میں نادم رہتی تھی' کہ ابا اور اماں کے درمیان جو کچھ بھی رنجش ہے' میری وجہ سے ہے۔

اماں تیار ہو کر آئیں تو بہت دلکش لگ رہی تھیں، پیرٹ گرین رنگ کے سوٹ میں ان کی بے حد گوری رنگت دمک رہی تھی۔ روحیل اور سبیعہ سارا وقت چہکتے رہے اور ایک دوسرے سے ہنسی مذاق کرتے رہے' جب کہ اماں ابا اور میں خاموش سے تھے۔ روحیل گاہے گاہے مجھے بھی چھیڑتا رہا۔ وہ بہت زندہ دل اور خوش مزاج تھا۔ سبیعہ اگرچہ اپنی پڑھائی میں مگن رہتی تھی' لیکن اس وقت وہ بھی انجوائے کر رہی تھی' لیکن میرا دھیان بار بار اماں کی طرف چلا جاتا تھا۔ تاہم بہت یادگار ڈنر تھا۔ روحیل کی باتوں سے سب نے ہی کچھ نہ کچھ انجوائے کیا تھا۔

* * *

ابا کی خواہش پر میں نے یونیورسٹی میں ایڈمیشن لے لیا تھا۔ انگلش لٹریچر میں۔ ادب سے مجھے یوں بھی دلچسپی تھی۔ سو میں اپنی پڑھائی میں مگن ہو گئی تھی' اور ابا ایک بار پھر اپنی کنسٹرکشن کمپنی بنانے کے سلسلے میں مصروف ہو گئے تھے۔ ان کے پاس تجربہ تھا، ٹیلنٹ تھا' اور انہیں ایک ایسا بندہ مل گیا تھا' جس نے قانونی پیچیدگیوں اور مشکلات کو حل کرانے کا وعدہ کر لیا تھا۔ لیکن اپنی شدید ترین مصروفیات کے باوجود ابا میرے لیے وقت نکال لیتے' کتنے بھی تھکے ہوئے ہوتے، کچھ دیر میرے پاس آ کر ضرور بیٹھتے اور مجھ سے میری اسٹڈی کے متعلق پوچھتے اور تاکید کرتے

کہ میں سی ایس ایس کی تیاری بھی کرتی رہوں۔

یونیورسٹی میں آ کر میرے اندر اعتماد آ گیا تھا' جب کہ اماں کے سامنے یہ اعتماد کرچی کرچی ہو جاتا۔ وہ ایسی نظروں سے دیکھتی تھیں، مجھے اپنا آپ بہت معمولی لگنے لگتا۔ میں خود کو مجرم سمجھنے لگتی تھی' جیسے میں نے اماں کی کوکھ سے پیدا ہو کر بہت بڑا جرم کیا ہو۔ اگرچہ اماں نے زندگی بھر مجھے ڈانٹا نہیں تھا۔ برا بھلا نہیں کہا تھا۔ مارا نہیں تھا' لیکن انہوں نے میرے اندر اپنی لاشعوری طور پر کی جانے والی باتوں سے بہت سارے کمپلیکسز پیدا کر دیے تھے۔ شاید یہی وجہ تھی' کہ اماں کے سامنے میرا سارا اعتماد ختم ہو جاتا تھا۔ لیکن یونیورسٹی میں میں پڑھائی کے علاوہ دیگر سرگرمیوں میں بھی حصہ لینے لگی تھی' اور ابا اس بات پر خوش تھے۔ سب اپنی اپنی جگہ بے حد مصروف تھے۔

❋ ❋ ❋

میرے فائنل امتحان ہونے والے تھے، سنیعہ آخری سال میں تھی' کہ اچانک ابا بیمار پڑ گئے۔ ان کے گردے خراب ہو گئے تھے۔ دراصل ابا کو قیام شارجہ کے دوران ہی شوگر ہو گئی تھی' لیکن ابا نے کوئی خاص توجہ نہ دی تھی۔ یوں ان کی صحت بہت اچھی تھی' اس لیے بظاہر کچھ محسوس نہیں ہوتا تھا' لیکن اندر ہی اندر بیماری اپنا کام کر رہی تھی۔ دونوں گردوں نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔

ڈاکٹر نے ڈائی لیسز کا مشورہ دیا۔ یہ بہت تکلیف دہ عمل تھا' جس سے ابا ہر ہفتے گزر رہے تھے۔ میں یونیورسٹی سے آتے ہی ابا کے کمرے میں چلی جاتی اور پھر سارا وقت وہاں ہی گزارتی۔

"بیٹا! اپنی پڑھائی پر توجہ دو۔ تمہارا فائنل ہے۔"

"میری تیاری ہے ابا! آپ فکر نہ کریں۔"

مجھے لگ رہا تھا' جیسے ابا مجھ سے بچھڑنے والے ہیں' میرا جی ایک منٹ بھی ابا سے الگ ہونے کو نہ چاہتا تھا۔

اسی دوران میرے پیپرز بھی ہو گئے۔

"میری خواہش تھی' کہ میں کم از کم اس وقت زندہ رہتا' جب تک تمہاری شادی نہ ہو جاتی لیکن اب۔"

اس روز میں آخری پیپر دے کر آئی تھی' اور ابا کی طبیعت کافی بہتر لگ رہی تھی۔ سنیعہ کچھ

دیر پہلے ہی انہیں دیکھ کر گئی تھی۔ اماں اپنے کمرے میں سو رہی تھیں۔

"پلیز ابا!" میں نے انہیں ٹوک دیا۔ "آپ ایسی بات نہ کریں۔ آپ انشاء اللہ زندہ رہیں گے بہت عرصے تک۔"

ابا لمحہ بھر چپ رہے۔

"اقصیٰ بیٹے میں دانش سے ملا تھا۔" میں نے یکدم حیران ہو کر انہیں دیکھا۔

"ہاں بیٹا یاد ہے نا "بک کارنر" پر وہ ملا تھا' اور پھر دو تین دن بعد جب میں دوبارہ تمہارے لیے وہ کتابیں لینے گیا' جن کی لسٹ میں دے کر آیا تھا' تو وہ پھر مجھے وہاں مل گیا۔ تب میں نے اسے اپنے آفس میں ملنے کو کہا۔ میں تمہیں خوش دیکھنا چاہتا تھا' میں اس سب کی تلافی کرنا چاہتا تھا، جو انجانے میں ہو گیا تھا۔ بیٹا! میں نے تمہارے دل میں جھانک کر دیکھ لیا تھا۔ لیکن سوری بیٹا! میں تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکا۔ اگرچہ وہ مجھے کسی پہلو سے بھی تمہارے قابل نہیں لگا تھا' پھر بھی میں نے اس سے کہا کہ وہ اپنے والدین کو لا سکتا ہے لیکن شادی تمہارے ماسٹرز کرنے کے بعد ہو گی۔ لیکن اس نے معذرت کر لی یہ کہہ کر کہ اس کی منگنی ہو چکی ہے۔"

"ابا؟" میں نے ان کے ہاتھ تھام لیے اور میرے آنسو ان کے ہاتھوں پر گرنے لگے۔

"روؤ مت۔" ابا نے ہاتھ اٹھا کر میرے آنسو پونچھے۔ میں نے دیکھا ان کے ہاتھوں میں لرزش تھی' اور وہ کس قدر پیلے پیلے ہو رہے تھے۔

دوسرے دن ابا کی طبیعت بگڑ گئی اگرچہ ابھی ڈائی لیسز کی ڈیٹ نہیں آئی تھی، لیکن ابا کو ہاسپٹل میں ایڈمنٹ کروانا پڑا۔ اب ہر دو دن بعد گردے واش کیے جانے لگے۔

"کوئی اور علاج نہیں رہا سوائے اس کے کہ کوئی گردہ دے۔" بالآخر ڈاکٹر نے کہہ دیا۔

"میں۔ میں دوں گی اپنا گردہ۔"

میرے آنسو بہہ رہے تھے۔

"پلیز ڈاکٹر۔ آپ میرا گردہ ابھی نکال لیں اور ابا کو لگا دیں۔"

"نہیں اقصیٰ بیٹا! نہیں تم ابھی ینگ ہو، تمہارے لیے زندگی بہت وسیع ہے۔"

"پلیز ابا! مجھے کچھ نہیں ہو گا۔ آپ کچھ مت کہیں۔ آپ کے بغیر میں کیا کروں گی جی کر۔ آپ کو میری قسم ابا! مجھے مت روکیں۔"

ابا خاموش ہو گئے تھے' پھر بھی انہوں نے روحیل سے کہہ کر اخبار میں "ضرورت گردہ" کا اشتہار دلوا دیا تھا۔

میں سارا وقت ہاسپٹل میں رہتی تھی۔ روحیل بھی زیادہ تر ساتھ رہتا۔ سنیعہ بھی تین چار چکر لگاتی تھی۔ اس کے پروفیسرز ڈاکٹرز سب ہی ابا کا بہت خیال رکھ رہے تھے۔ اماں بھی آتی رہتی تھیں۔

انہوں نے کہا تھا' کہ وہ ہاسپٹل میں رہ جاتی ہیں لیکن ابا نے منع کر دیا۔

''روحیل اور اقصیٰ ہیں نا میرے پاس۔''

اماں آتیں تو ابا آنکھیں موند لیتے۔ میں نے کئی بار محسوس کیا تھا' اچھے بھلے باتیں کرتے کرتے ابا آنکھیں بند کر لیتے تھے۔ اماں خاموش بیٹھی رہتیں اور پھر سنیعہ کے ساتھ چلی جاتیں۔ ابا کے دوست کولیگز اور ان کی کمپنی میں کام کرنے والے ملازم بھی آتے رہتے تھے۔

اس روز بھی میں ابا کے پاس بیٹھی ان کا بازو دبا رہی تھی' کہ دروازے پر دستک دے کر کوئی اندر آ گیا۔

''مکرم بھائی! آپ آ گئے۔'' ابا ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئے۔ ''اب تو میں مایوس ہی ہو گیا تھا۔''

''میں دراصل کراچی گیا ہوا تھا' سو آپ کا پیغام تاخیر سے ملا تاہم ملتے ہی میں پہلی جو فلائٹ ملی' اسی سے آ گیا۔'' وہ شخص ابا کے پاس ہی بیٹھ گیا تھا۔

''یہ آپ نے کیا حالت بنالی ہے بھائی صاحب؟'' اس نے ابا کے گرد اپنے بازو حمائل کر دیے۔

ابا نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے میری طرف دیکھا۔ ''یہ اقصیٰ ہے۔''

''ارے یہ اقصیٰ ہے۔'' وہ شخص بے تابانہ اٹھا اور اس نے مجھے لپٹا کر پیار کیا۔

''بیٹے! یہ آپ کے ماموں ہیں، مکرم ماموں۔''

''ماموں۔ مگر انہیں تو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔''

میں حیران تھی۔

''مکرم! تمہارے آنے سے مجھے بہت سکون مل گیا ہے۔ میں اقصیٰ کے لیے بہت پریشان تھا' یہ تمہارے حوالے۔ مجھے کچھ ہو جائے تو تم اس کے وارث ہو۔''

''آپ بے فکر رہیں، ہمارے گھر میں کوئی بھی اقصیٰ کو نہیں بھولا۔ ہم نے اسے یاد رکھا ہوا ہے، ابی جان تو ہر روز ہی اس کا ذکر کرتے ہیں کہ اب اقصیٰ اتنی بڑی ہو گئی ہو گی۔ اب اتنی بڑی۔ اس کی پوزیشن آئی۔ ٹی وی پر اسے تمہارے ساتھ دیکھا تو ابی جان نے اتنی خوشی منائی کہ۔''

''میں جانتا ہوں۔'' ابا کی آواز میں نقاہت تھی۔

''میں نے جس محرومی سے اقصیٰ کو بچانے کے لیے آپ لوگوں سے دور کیا تھا' وہ محرومی۔''

ابا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور آواز رندھ گئی۔

''ریلیکس بھائی صاحب! میں آ گیا ہوں نا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ انشاء اللہ۔''

''اقصیٰ بیٹا! اگر میں نہ رہوں تو تم اپنے ماموں کے ساتھ چلی جانا، وہاں بہت محبتیں ملیں گی تمہیں۔ تمہارے نام سے میں نے کچھ رقم ڈیپازٹ کرائی ہے، حساب حفیظ صاحب سے لے لینا۔''

''ابا پلیز آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں اور مجھے کہیں نہیں جانا۔''

مجھے یقین تھا' کہ انشاء اللہ ابا ٹھیک ہو جائیں گے۔ میرا بلڈ گروپ وہی تھا' جو ابا کا تھا' او پازیٹو اور میرے ٹشوز بھی ابا سے میچ کر گئے تھے' اور ابھی کچھ دیر پہلے ہی ڈاکٹر نے مجھے بتایا تھا۔ ابھی میں نے ابا کو نہیں بتایا تھا' یوں میں نے سوچ لیا تھا' کہ ابا کو یہ بات گردے کی تبدیلی کے بعد ہی بتائی جائے کہ میرا گردہ انہیں لگا ہے البتہ سنیعہ کو علم تھا۔

''تم بہت بہادر ہو اقصیٰ! میں نے سوچا تھا' لیکن ہمت نہیں ہوئی۔ حالانکہ میں بھی ابا سے اتنی ہی محبت کرتی ہوں۔''

''سنیعہ! تم تو خود ڈاکٹر بننے والی ہو۔ ابا گردے کی تبدیلی کے بعد زندہ رہیں گے نا۔''

''انشاء اللہ میں تمہیں وارڈ میں لے چلوں گی۔ وہاں آٹھ نمبر بیڈ کی مریضہ پچھلے دس سال سے ایک گردے پر زندہ ہے۔ اس نے اپنے بھائی کو اپنا گردہ دیا تھا۔''

''اور اس کا بھائی۔''

''وہ بھی زندہ ہے۔''

سنیعہ کی باتوں سے میں بہت پرامید ہو گئی تھی۔ ابا کی اس دن کی باتوں سے مجھے جس حقیقت کا ادراک ہوا تھا' میں اس سے جان بوجھ کر نظریں چرا رہی تھی۔ البتہ مکرم ماموں مجھے بہت اچھے لگے تھے۔

شفیق اور مہربان۔

میں انہیں ابا سے باتیں کرتا چھوڑ کر ان کے لیے چائے بنانے چلی گئی۔ واپس آئی تو ابا کی بات پر مسکرا رہے تھے۔ اور ان کے چہرے پر بہت رونق تھی۔

''مکرم! سلجوق کو لے کر جلدی آنا، میرے پاس بہت وقت نہیں ہے۔ میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔''

"آپ پریشان نہ ہوں، میں اسی لیے تو جا رہا ہوں واپس۔ ورنہ میں اس حالت میں آپ کو چھوڑ کر ایک لمحے کے لیے بھی نہیں جاتا۔ اور صرف سلجوق ہی نہیں ابی جان اور ارقم بھائی جان بھی آئیں گے۔ ارقم بھائی اسلام آباد میں تھے' ورنہ وہ ساتھ ہی آتے۔ آپ ہم سے دور ضرور ہو گئے تھے' لیکن دل سے کبھی دور نہیں ہوئے۔ ایلا اور اقصیٰ کے حوالے سے آپ ہمیشہ ہمارے گھر کے ہر فرد کو عزیز رہے۔ ایلا کے بعد بھی اتنے ہی عزیز' جتنے اس کی زندگی میں تھے۔

ابی جان تو آپ کی بیماری کا سن کر تڑپ اٹھے تھے۔ ان کے اختیار میں نہیں تھا' کہ وہ اڑ کر آپ کے پاس پہنچتے۔ اور ارقم بھائی ہی کیا اس گھر کا ہر فرد ایلا سے کیا ہوا وعدہ کبھی نہیں بھولا۔ بس مناسب وقت کا انتظار تھا۔"

ابا کی آنکھوں میں آنسو تھے' اور مکرم ماموں ابا کے ہاتھ تھامے ہولے ہولے کچھ کہہ رہے تھے۔ میں نے چائے ان کی طرف بڑھائی تو انہوں نے مسکرا کر مجھے دیکھا اور پھر چائے پیتے ہی وہ اٹھ کر کھڑے ہوئے۔

"مکرم! دیر نہ کرنا۔" ابا نے پھر التجا کی۔

"آپ فکر نہ کریں۔ میں کل ہی آنے کی کوشش کروں گا۔ مسئلہ سلجوق کا ہے۔ اس نے چند ماہ پہلے ہی جوائن کیا ہے۔ آج کل وہ کچھ آؤٹ آف اسٹیشن ہے۔ ممکن ہے اسے کانٹیکٹ کرنے میں ایک آدھ روز کی تاخیر ہو جائے لیکن اس سے زیادہ نہیں۔"

"او کے۔" پھر وہ میرے بالوں پر پیار کر کے چلے گئے اور ابا کچھ دیر مجھے دیکھتے رہے' کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن پھر لیٹ کر آنکھیں موند لیں۔ شاید اتنی دیر تک مکرم ماموں سے باتیں کرنے کی وجہ سے وہ بہت تھک گئے تھے۔ لیکن گزرے دنوں کی نسبت بہت پرسکون لگ رہے تھے۔ میرے ذہن میں بہت سے سوال مچل رہے تھے' لیکن یہ موقع ان باتوں کا نہیں تھا۔

میں ہولے ہولے ان کے بازو دبانے لگی اور کچھ ہی دیر بعد وہ سو گئے۔

اگلے دو دن ان کی طبیعت بہت بہتر رہی، وہ مجھ سے روحیل سے اور سنیعہ سے باتیں کرتے رہے۔ بہت دیر تلک روحیل کو اپنی کمپنی کے معاملات سمجھاتے رہے۔ اماں آئیں تو تھک کر انہوں نے آنکھیں موند لیں اور کروٹ بدل لی۔ اماں بہت دیر تک خاموش بیٹھی رہیں۔ پھر سنیعہ سے ان کی بیماری کے متعلق بات کرتی رہیں کہ ڈاکٹر کیا کہتے ہیں کیا کوئی امید ہے۔ آپریشن کب ہوگا؟ ڈاکٹر کرمانی کب کراچی سے آئیں گے وغیرہ وغیرہ۔ اس دوران ابا کروٹ بدلے لیٹے رہے۔

* * *

ڈاکٹر کرمانی جنہوں نے ابا کا اور میرا آپریشن کرنا تھا، وہ کراچی گئے ہوئے تھے' اور ایک دو روز بعد آنے والے تھے۔ میں چاہتی تھی' کہ جلد از جلد ابا کا آپریشن ہو جائے اور موت کا خطرہ ٹل جائے لیکن ڈاکٹر کرمانی کو اچانک ہی کراچی جانا پڑ گیا تھا۔

"اقصیٰ! تم اور روحیل آج گھر چلے جاؤ میں اور اماں رک جاتے ہیں۔" سنیعہ نے جانے سے پہلے کہا۔

"نہیں، نہیں۔ تمہیں پڑھنا بھی ہوتا ہے۔ میں ٹھیک ہوں یہاں، البتہ روحیل اگر جانا چاہتے ہے تو چلا جائے اور اماں رک جائیں۔"

میں ایک لمحے کے لیے بھی ابا کے پاس سے ہٹنا نہیں چاہتی تھی۔ پتا نہیں کیوں مجھے خوف سا تھا' جیسے میں ابا کے پاس سے گئی تو جانے ابا کو کیا ہو جائے گا۔

"اچھا ابا! خدا حافظ۔" سنیعہ نے ابا کو خدا حافظ کہا تو انہوں نے کروٹ بدل کر اسے دیکھا۔

"خدا حافظ بیٹا!" انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر ہونٹوں سے لگایا۔

"آج اماں رک جاتی ہیں۔ روحیل گھر چلا جائے گا۔"

میں نے ابا سے کہا لیکن ابا خاموش ہی رہے۔ اماں کچھ دیر سوالیہ نظروں سے ابا کو دیکھتی رہیں لیکن پھر سنیعہ کے ساتھ باہر نکل گئیں پتا نہیں کیوں مجھے گمان گزرا کہ وہ چاہتی ہیں کہ ابا انہیں رکنے کو کہیں۔ لیکن ابا نے ان کی سوالیہ نظروں کو نظر انداز کر دیا تھا۔

"ابا!" میں اماں سے کہوں رکنے کو۔"

میں نے جھک کر آہستگی سے پوچھا۔ انہوں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"ابا! کیا آپ اماں سے خفا ہیں۔"

میں نے آج پھر پوچھا لیکن ابا نے میری بات کا جواب نہیں دیا تھا' اور آنکھیں بند کر لی تھیں۔

ابا اتنے بیمار تھے' پھر بھی اماں کے اور ان کے درمیان بات چیت نہ ہوتی تھی' حالانکہ اماں ہر شام باقاعدگی سے انہیں دیکھنے آتی تھیں۔

کچھ دیر بعد انہوں نے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا۔

"روحیل کہاں ہے؟"

"اماں اور سعیقہ کو چھوڑنے گیا ہے۔"

"اچھا، تمہارے مکرم ماموں نہیں آئے۔"

"نہیں۔"

"اچھا اقصیٰ بیٹے! تم میرے بعد اپنے ماموں کے ساتھ چلی جانا۔"

"ابا! آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ کو کچھ نہیں ہوگا۔" میں روہانسی ہوگئی۔

"ڈاکٹر کرمانی آجائیں تو آپ کا گردہ تبدیل ہو جائے گا۔"

"کیا گردہ مل گیا ہے؟" انہوں نے پوچھا۔

"جی ابا۔ انتظام ہوگیا ہے۔"

"کون ہے وہ، شاید کوئی بہت مجبور ہوگا۔" انہوں نے افسردگی سے کہا۔

"جی۔" میں نے نگاہیں چرالیں۔

"سنو بیٹا اگر آپریٹ ہونے تک میں نہ رہوں تو بھی اس شخص کو جو گردہ دے رہا ہے، کچھ رقم ضرور دے دینا۔ کوئی بہت بڑی مجبوری ہوگی۔ اس کی تب ہی تو۔"

"محبت سے بڑی مجبوری اور کیا ہوتی ہوگی۔" میں نے دل ہی دل میں سوچا۔

"مکرم آجاتے تو اچھا تھا۔" انہوں نے جیسے اپنے آپ سے کہا، وہ کچھ بے چین سے تھے۔

"ابا! ڈاکٹر کو بلاؤں۔"

"نہیں، اقصیٰ بیٹے تمہارے معاملے میں مجھ سے اگر کوئی کوتاہی ہوگئی ہو تو اپنے ابا کو معاف کر دینا اور روز محشر اپنی ماما کے سامنے میری سفارش کرنا۔"

"ابا!" میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میں بہت کچھ پوچھنا چاہتی تھی، اپنی ماما کے بارے میں۔ اپنی ماں کے بارے میں لیکن یہی کہہ سکی۔

"ابا پلیز آپ ایسی باتیں نہ کریں۔"

"اچھا!" وہ مسکرائے۔

"روحیل! آئے تو مجھے بتانا۔" تب ہی روحیل آگیا۔

"ابا! روحیل آگیا ہے۔"

"روحیل ذرا حفیظ صاحب کو فون کرو بیٹا کہ وہ مکرم کو فون کریں، اس نے آنے میں اتنی دیر کیوں کر دی ہے۔"

حفیظ صاحب ابا کی کمپنی میں ان کے بزنس پارٹنر اور گہرے دوست تھے۔

روحیل اٹھ کر باہر چلا گیا تاکہ حفیظ انکل کو فون کر آئے۔

پوری رات ابا بے چین رہے، میں اور روحیل جاگتے رہے۔ بظاہر کوئی تکلیف نہ تھی، لیکن گھبراہٹ تھی۔ ڈیوٹی ڈاکٹر دو تین بار آیا اور تسلی دے کر چلا گیا۔

وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد آنکھیں کھول کر مکرم ماموں کا پوچھتے رہے۔ خدا خدا کر کے صبح ہوئی تو ان کی طبیعت کچھ بہتر سی لگی۔ بے چینی بھی نہیں تھی۔

ناشتے کے وقت حفیظ انکل آگئے۔ اور انہوں نے بتایا کہ آج کسی وقت مکرم ماموں سب کے ساتھ آرہے ہیں۔ ابا پرسکون ہوگئے۔

"میں گھر سے اماں یا سعیقہ کو لے کر آتا ہوں، آپ کچھ دیر گھر جا کر باتھ وغیرہ لیں، آرام کر لیں۔" روحیل نے گھر جانے سے پہلے مجھ سے کہا۔

"آپ ساری رات جاگتی رہی ہیں اور پھر۔" وہ ذرا سا رکا "ابھی ڈاکٹر راجہ نے بتایا ہے کہ ڈاکٹر کرمانی آج شام آرہے ہیں۔"

"تھینک گاڈ۔" میں نے شکر ادا کیا۔

"آپ ٹھیک تو ہیں نا بجو! ڈر تو نہیں لگ رہا ہے۔"

"نو ناٹ ایٹ آل۔"

میں نے ذرا بھی خوف محسوس نہیں کیا۔ اور ابا کے پاس بیٹھ کر انہیں دیکھنے لگی۔ وہ کتنے زرد لگ رہے تھے اور ان کے ہونٹ سپید ہو رہے تھے۔ کچھ دیر بعد ہی اماں اور سعیقہ آگئیں۔ سعیقہ کچھ دیر ٹھہر کر کالج چلی گئی۔ ابا سوئے ہوئے تھے۔

"چلیں، آپ کو گھر لے چلوں۔"

"آج تو ابا کا ڈائی لیسز بھی ہونا ہے۔" میں نے اسے یاد دلایا۔

"ہاں۔"

"میں تب تک رکوں گی یہاں ہی، شام کو چلی جاؤں گی۔"

اس نے کوئی تبصرہ نہ کیا کیونکہ جانتا تھا میں نہیں جاؤں گی۔ پھر روٹین کے مطابق ابا کو ڈائی لیسز کے لیے لے جایا گیا۔ جانے سے پہلے انہوں نے ایک بار پھر مکرم ماموں کا پوچھا اور پھر اماں کی طرف دیکھا۔

"جو کچھ تم نے کیا ہے فاطمہ! اس کے لیے میں نے تمہیں معاف نہیں کیا' یاد رکھنا۔"

میں نے دیکھا، اماں کا رنگ زرد ہو گیا تھا' لیکن وہ سپاٹ چہرے کے ساتھ بیٹھی رہیں۔
مجھے ایک دم اماں پر ترس آ گیا۔

"غلطیاں تو انسانوں سے ہی ہوتی ہیں، آپ نے کہا تھا۔ یاد ہے نا آپ کو اور معاف کر دینا خدا کو بہت پسند ہے۔"

میں نے ابا کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔

"تم بیٹا! بالکل اپنی ماما جیسی ہو، فراخ دل اور سمندر ظرف۔"

ان کا انداز سرگوشی کا سا تھا' پھر انہوں نے گہری سانس لی اور اماں کی طرف دیکھا۔

"فاطمہ! سیعہ اور روحیل کا خیال رکھنا۔ میرے بعد انہیں میری کمی محسوس نہ ہونے دینا۔"

جب سے ابا بیمار ہوئے تھے۔ پہلی بار انہوں نے اماں سے اتنی بات کی تھی۔

تب ہی روحیل وارڈ بوائے کے ساتھ آ گیا اور وہ ابا کو ڈائی لیسز کے لیے لے گئے۔ اس سے پہلے بھی کتنی ہی بار ابا کو ڈائی لیسز کے لیے لے جایا گیا تھا' لیکن پتا نہیں کیوں اس بار میرا دل ابا کے خالی بستر کو دیکھ کر ڈوب گیا۔ اور ان کی تکلیف کے خیال سے میں رو پڑی۔

اماں ساکت بیٹھی ہوئی تھیں۔ میرا دل چاہ رہا تھا' کہ اماں کچھ کہیں۔ کچھ بولیں تا کہ دل میں آتے وہم پریشان نہ کریں۔ لیکن اماں نے کوئی بات نہ کی۔ وہ پتا نہیں کیا سوچ رہی تھیں۔ پھر بہت دیر ہو گئی، وہ ابا کو واپس نہیں لائے۔ اس سے پہلے تو اتنی دیر کبھی نہیں ہوئی تھی۔ جتنا وقت پہلے لگتا تھا' اس سے کہیں زیادہ دیر ہو گئی تھی۔ پھر سیعہ آ گئی کالج سے سیدھی۔

"سیعہ!" اسے دیکھتے ہی میرے آنسو نکل پڑے۔

"کیا ہوا؟" وہ گھبرا گئی۔

"وہ ابا کو ڈائی لیسز کے لیے لے گئے تھے' مگر معمول سے زیادہ دیر ہو گئی ہے۔"

"دیکھتی ہوں۔"

میں بھی اس کے ساتھ باہر آ گئی، کوریڈور میں ہی ہمیں روحیل مل گیا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

"اقصیٰ۔ اقصیٰ بجو۔"

"ابا ہمیں چھوڑ کر چلے گئے۔ ڈائی لیسز کے دوران ہی تین بار اٹیک ہوا اور۔"

"نہیں۔ نہیں۔"

"بھلا ابا اتنے ظالم ہو سکتے ہیں، بھلا وہ مجھے یوں اکیلا چھوڑ کر جا سکتے ہیں۔"

مجھے روحیل کی بات پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے، کل تو ڈاکٹر کرمانی کو ان کا گردہ تبدیل کرنا تھا۔ میرے ٹشوز میچ ہو گئے ہیں۔ میرا بلڈ گروپ وہی ہے پھر بھلا۔"

میں بے یقینی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ سیعہ روحیل کے گلے لگی رو رہی تھی۔ پھر جانے کہاں سے مکرم ماموں آ گئے ان کے ساتھ اور لوگ بھی تھے۔

"آپ نے اتنی دیر کیوں کر دی۔"

میں نے شکوہ کیا۔ پھر جیسے خود سے ہی سرگوشی کی۔

"نہیں، وہ تو کل سے آپ کے منتظر ہیں چلیں آپ۔" میں نے اٹھ کر ان کا ہاتھ تھاما تو انہوں نے مجھے ساتھ لپٹا لیا۔

"اقصیٰ۔ اقصیٰ بیٹے! بھائی صاحب چلے گئے۔"

اور میں جو انہیں دوسری بار دیکھ رہی تھی' اور اپنے اور ان کے درمیان موجود رشتے سے ابھی تک بے خبر تھی' پھر بھی ان سے لپٹ کر زور زور سے رونے لگی۔

✵ ✵ ✵

ابا چلے گئے تھے' اور میرے پاس جیسے کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ میں سوچتی تھی، میں کیوں زندہ ہوں اور میں کیوں نہ ابا کے ساتھ ہی چلی گئی۔ مکرم ماموں اور ان کے ساتھ آئے ہوئے لوگ کب گئے' مجھے کچھ ہوش نہ تھا' مجھے تو یہ بھی نہیں پتا تھا' کہ کب ابا کو گھر لایا گیا تھا' اور کب وہ اپنے آخری سفر پر روانہ ہوئے تھے۔ میں تو وہیں مکرم ماموں کے بازوؤں میں ہی ہوش کھو بیٹھی تھی۔ اتنا یاد ہے کہ سیعہ نے مجھے جھنجھوڑ کر کہا تھا۔

"اقصیٰ! ابا کو دیکھ لو ایک بار، پھر یہ چہرہ کبھی دکھائی نہیں دے گا۔ اقصیٰ ابا جا رہے ہیں۔"

تب سیعہ کے سہارے سوئی سوئی کیفیت میں ابا کے پاس آئی تھی۔ ان کی آنکھیں بند تھیں۔ رنگ بالکل زرد ہو رہا تھا' اور ہونٹوں پر جیسے ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔

"ابا۔"

مجھے لگا تھا' جیسے میرا دل پھٹ جائے گا اور میں سیعہ سے لپٹ کر رو پڑی تھی۔ اور اب ابا کو گئے ہوئے بھی اتنے دن ہو گئے تھے' اور مجھے یقین نہیں آ رہا تھا' کہ ابا چلے گئے ہیں۔ صبح سے شام تک میں بیٹھی سوچتی رہتی۔

ابا کی ایک ایک بات۔

ایک ایک انداز۔

کیا ان کے بعد کوئی مجھ سے اتنی محبت کر سکے گا۔ جتنی ابا نے کی۔

میری حماقتوں، بے وقوفیوں اور نالائقیوں کے باوجود، ابا کو کہاں سے لاؤں۔

گھر میں اتنی خاموشی ہوتی کہ اس خاموشی سے خوف آتا۔

ابا کے چالیسویں کے بعد مکرم ماموں کا فون آ گیا۔

"بیٹا! آپ نے کیا سوچا ہے، آپ کو یاد ہے، آپ کے ابا نے کیا کہا تھا۔"

"نہیں۔" میں ساکت رہ گئی۔ ابھی میں کچھ بھی نہیں سوچنا چاہ رہی تھی۔

"آپ ابھی اپ سیٹ ہیں۔ جب آپ ایزی فیل کریں۔ تب اپنے آپ کو تیار کر لیں۔ ذہنی طور پر کہ آپ کے ابا کی یہی خواہش تھی' میں پھر فون کروں گا اور آپ میرا نمبر لکھ لیں۔ ضرورت پڑے تو کر لینا۔"

اور میں کتنی ہی دیر تک ریسیور ہاتھ میں لیے ساکت بیٹھی رہی۔

***

اس روز بڑے دنوں بعد میں ٹی وی لاؤنج میں آ کر بیٹھی تھی۔ اماں فون پر کسی سے بات کر رہی تھیں۔ میں چپ چاپ انہیں باتیں کرتا دیکھتی رہی، ابا کو رخصت ہوئے اتنے دن ہو گئے تھے' اور میری اماں سے ایک بار بھی بات نہیں ہوئی تھی۔ میرا کتنا جی چاہا تھا' کہ اماں مجھے گلے سے لگا کر تسلی دیں' بالکل ایسے ہی' جیسے انہوں نے سنیعہ اور روحیل کو گلے لگایا تھا۔ ان کے آنسو پونچھے تھے۔

"اماں۔" وہ فون کر کے مڑیں تو میں نے ان کے بازو پر ہاتھ رکھ کر انہیں اپنی طرف متوجہ کیا۔

"نہیں ہوں میں تیری اماں!" اماں نے بہت سختی سے میرا ہاتھ جھٹک دیا۔

"اماں پلیز۔"

"مت کہو مجھے اماں، نہیں ہے میرا تمہارے ساتھ کوئی رشتہ۔ مر چکی ہے تمہاری ماں۔"

انہوں نے پھر میرے ہاتھ جھٹک دیے۔

اماں کی آنکھوں میں اتنی نفرت تھی' کہ مجھے لگا میں اس نفرت سے راکھ ہو جاؤں گی۔ سر سے لیکر پاؤں تک میرا وجود نفرت کی اس آگ نے جلا کر راکھ کر دیا۔

"یہ۔ یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ اماں۔"

بازوؤں پر گاؤن رکھے اور ہاتھ میں فائل پکڑے تھکی تھکی سنیعہ اسی وقت ٹی وی لاؤنج میں

داخل ہوئی تھی۔

"سچ کہہ رہی ہوں۔"

اماں کے ہونٹوں سے نکلتا ہوا ہر لفظ میرے وجود پر انگارہ بن کر گر رہا تھا۔

"مر گئی اسے جنم دینے والی۔ اور میرے لیے یہ جیتا جاگتا عذاب چھوڑ گئی۔"

سارے منظر میری آنکھوں کے سامنے دھندلے ہو گئے۔ اور دل جیسے ساتھ چھوڑ بیٹھا۔

"اقصیٰ، اقصیٰ!"

سنیعہ نے لپک کر مجھے سنبھالنا چاہا۔ میں نے سنیعہ کو اپنی طرف لپکتے دیکھا اور پھر سب کچھ آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔

***

سارے سوالوں کے جواب مل گئے تھے۔ ایک بار مس جعفری نے پوچھا تھا" آپ کی والدہ سوتیلی ہیں۔" میں نے بڑے یقین سے کہا تھا۔ "نہیں یہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے اور اب۔ اب دن میں دس بار میں خود سے کہتی' یہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے کہ اماں۔ اور ہر بار دل جیسے ڈوبنے سا لگتا۔ اور پھر ابا کی طرح میں نے بھی حساب کتاب کر لیا۔ ساری جمع تفریق اور جواب

بچپن سے لے کر اب تک ہر بات۔

ابا کی وہ باتیں جو مجھے سمجھ میں نہیں آئی تھیں۔

اب خود بخود ان کے معنی سمجھ میں آ گئے تھے۔

ابا کی اماں سے ناراضی تو یہ سب یوں تھا، میں دو دن تک کمرے سے باہر نہیں نکلی تھی۔

سنیعہ اور روحیل کے لیے بھی یہ انکشاف نیا تھا' لیکن ان کا رویہ ویسا ہی تھا' جیسے اس سے انہیں کوئی فرق نہیں پڑا ہو لیکن اماں۔

اف ان کی آنکھوں کی وہ نفرت۔

اور ابا شاید اس نفرت کو جانتے تھے، تب ہی انہوں نے مجھے مکرم ماموں کے ساتھ جانے کو کہا تھا۔

تو کیا مجھے یہاں سے جانا ہوگا۔

اماں سے میرا کوئی ناتا نہیں تھا' لیکن اس گھر سے، سنیعہ اور روحیل سے تو میرا ناتا بہت گہرا تھا۔ میرا دل جیسے خالی ہو گیا تھا۔

میں رونا چاہتی تھی۔ لیکن آنسو دور دور تک کہیں نہیں تھے۔ اماں کی آنکھوں کی نفرت نے

مجھے راکھ کر دیا تھا۔ میں بہت اذیت میں تھی۔

''ابا۔ ابا۔'' میں چیخ چیخ کر رونا چاہتی تھی۔ دیواروں سے سر ٹکرانا چاہتی تھی' لیکن میرا وجود پتھر کا ہو رہا تھا۔

پھر ہولے ہولے میرے پتھر وجود میں حرکت پیدا ہوئی۔ شاید دو دن ہو گئے تھے' یا تین دن میں کمرے سے باہر نکلی اور مکرم ماموں کو فون کیا۔

''ماموں، مجھے آ کر لے جائیں۔''

''او کے بیٹا! تم ٹھیک تو ہو نا۔'' اور اثبات میں جواب دے کر میں اپنے کمرے میں آ گئی۔

اس ایک جملے کو کہنے میں اذیتوں کے جس پل صراط سے مجھے گزرنا پڑا تھا، اس نے مجھے چور چور کر دیا تھا۔ میں بہت دیر تک کمرے میں آ کر نڈھال سی بیٹھی رہی۔

یہ کمرا۔ یہ شیلف۔ جہاں ابا نے خود اپنے ہاتھ سے میری کتابیں رکھی تھیں اسے ڈیکوریٹ کیا تھا۔ کیسی یادیں وابستہ تھیں۔

ایک ایک پل یاد آ کر تڑپا رہا تھا۔

ابا اکثر یہاں میرے بیڈ پر ہی آ کر بیٹھ جاتے تھے۔ اور مجھ سے چھوٹی چھوٹی باتیں کرتے تھے' اور ان کی آنکھوں میں شفقت و محبت کے دریا موجزن ہوتے تھے۔

اور پھر ماموں آ گئے مجھے لینے۔ میں نے سوئی سوئی کیفیت میں اپنی چیزیں اکٹھی کیں۔ اپنی کتابیں، ابا کی تصویریں، ان کے دیے ہوئے گفٹ۔ پتا نہیں مجھے کیا لینا تھا' اور کیا نہیں۔ مجھے خود سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ میں نے دھندلی آنکھوں سے چیزیں پیک کیں۔ سعیعہ اور روحیل کو حیرت تھی۔

میرے پاس ان کی بات کا کوئی جواب نہ تھا۔

''اقصیٰ! مت جاؤ۔'' سعیعہ کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

میں اماں کو خدا حافظ کہنے ان کے کمرے میں گئی۔ اماں نے نہ میرے سلام کا جواب دیا اور نہ نظر اٹھا کر مجھے دیکھا۔ سعیعہ اور روحیل گیٹ تک مجھے چھوڑنے آئے۔

''یہ گھر تمہارا بھی اتنا ہی ہے جتنا ہمارا۔'' روحیل نے مجھے گلے لگا کر کہا۔

''اماں سے تمہارا کوئی رشتہ نہ سہی لیکن ہمارے ساتھ تمہارا جو رشتہ ہے' وہ بہت مضبوط ہے۔ ہماری رگوں میں دوڑنے والا لہو ایک ہے۔''

سعیعہ خاموش کھڑی تھی' لیکن اس کے رخسار آنسوؤں سے بھیگتے جا رہے تھے۔ میری

آنکھیں خشک صحرا ہو رہی تھیں، میں اتنا رو چکی تھی' کہ شاید میرے اندر سے آنسو ختم ہو چکے تھے۔

''ہمیں بھلانا نہیں اقصیٰ! یاد رکھنا۔ فون کرتی رہنا۔'' سعیعہ نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا اور بازو پھیلا دیے۔

''مت جاؤ اقصیٰ!'' میرے گلے سے لگتے ہی وہ بے اختیار ہو گئی۔

''پہلے ابا ہمیں چھوڑ گئے ہیں اور اب تم جا رہی ہو۔''

''بیٹا! اقصیٰ آتی رہے گی تم سے ملنے۔''

مکرم ماموں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

میرے قدموں میں زنجیریں پڑ گئی تھیں اور پاؤں زمین نے جکڑ لیے تھے' جیسے میں لوہے کا ٹکڑا تھی، اور میرے پاؤں کے نیچے زمین مقناطیسی بن گئی تھی۔ مکرم ماموں گاڑی کا دروازہ کھولے کھڑے تھے۔

مکرم ماموں نے شاید تیسری بار مجھے بلایا تو میں نے سخت شعوری کوشش سے اس طلسم سے خود کو آزاد کرایا اور تیزی سے گاڑی کا دروازہ کھول کر بیٹھ گئی اور آنکھیں بند کر لیں تاکہ کسی کو بھی نہ دیکھ سکوں۔ سعیعہ روحیل سامنے پورچ کی سیڑھیوں پر کھڑے کرامت اور فضل بی بی کسی کو بھی نہیں، میری آنکھوں میں جلن ہو رہی تھی' اور دل جیسے پانی ہو کر آنکھوں کی راہ باہر نکلنے کو بے تاب ہو رہا تھا۔ میں سر جھکائے بیٹھی تھی۔ مجھے ڈر تھا' کہ اگر میں نے سر اٹھا کر مکرم ماموں کی طرف دیکھا تو میرا ضبط ختم ہو جائے گا۔ شاید میں دھاڑیں مار مار کر رونے لگوں۔ پتا نہیں کیا کیا کچھ یاد آ کر دل چیرے جا رہا تھا۔

مکرم ماموں نے بھی مجھے مخاطب نہیں کیا تھا' اور خاموشی سے گاڑی ڈرائیو کرتے رہے تھے' اور جب گاڑی لاہور کی حدود سے باہر نکل آئی تو کافی آگے جا کر انہوں نے اسٹیئرنگ پر ہاتھ رکھے رکھے میری طرف دیکھا۔

''ٹیک اٹ ایزی بیٹا! وہاں سب تم سے محبت کرنے والے اور تمہیں چاہنے والے لوگ ہیں۔ برسوں سے تمہارے منتظر۔ تمہیں بالآخر وہاں ہی آنا تھا' لیکن شاید اس طرح سے نہیں مگر بہت ساری باتوں میں انسان بہت بے بس، بہت بے اختیار ہو جاتا ہے۔

عارف بھائی زندہ رہتے تو تم شاید اس طرح اس انداز میں رخصت نہ ہوتیں۔ پھر بھی تم پریشان نہ ہو۔ جس وقت تمہارا دل چاہا بہن بھائیوں سے امی سے ملنے کو تو بس کہہ دینا ہم تمہیں یہاں لے آئیں گے اور پھر فون بھی ہے، تم جب جس وقت چاہو سعیعہ اور روحیل سے بات

کر سکتی ہو۔"

ان کے لہجے میں شفقت تھی۔ چہرے اور آنکھوں میں ایک نرم نرم سا تاثر تھا۔ وہ راستے بھر مجھ سے ہلکی پھلکی باتیں کرتے رہے اور راستے میں ہی انہوں نے گھر کے ہر فرد سے میرا تعارف کرا دیا تھا۔

"گھر میں سب سے اہم شخصیت ابی جان کی ہے۔ ابی جان سے ہم سب بہت محبت کرتے ہیں اور وہ بھی ہم سب پر جان دیتے ہیں۔ کسی بچے کی معمولی سی تکلیف بھی ان سے برداشت نہیں ہوتی۔"

کرم ماموں ہولے ہولے بول رہے تھے' اور میں دھیان سے سن رہی تھی۔

"ابی جان اس گھر میں سب سے زیادہ تمہارے مشتاق ہیں اور بیتے سالوں میں سب سے زیادہ انہوں نے ہی تمہیں یاد کیا ہے۔ اور عارف بھائی نے تمہاری جب جب اور جو جو تصاویر بھیجیں، انہوں نے سنبھال کر رکھی ہوئی ہیں، ایلا۔ یعنی تمہاری ماں! ابی جان کی لاڈلی بہت پیاری بیٹی تھیں۔ بلکہ وہ تو ہم تینوں بھائیوں کی لاڈلی تھی۔ ہم تینوں سے چھوٹی تھی۔ اور ہم سب کو بہت پیاری تھی۔ امی جان کی ڈیتھ کے وقت وہ صرف تین سال کی تھی' اور ہم نے اسے ہتھیلی کا چھالا بنا کر رکھا ہوا تھا۔

ارقم بھائی گھر میں سب سے بڑے ہیں۔ اس وقت سیشن کورٹ میں جج ہیں۔ ان کے تین بیٹے ہیں۔ سب سے بڑے سلجوق ہیں، جو اس وقت ایس پی ہیں پھر عباد ہیں' جو ہائر ایجوکیشن کے لیے ملک سے باہر ہیں اور عباد سے چھوٹے حماد ہیں' جو فی الحال پڑھ رہے ہیں اسلام آباد یونیورسٹی میں۔ فزکس ان کا سبجیکٹ ہے اور اٹامک انرجی میں جاب کرنا ان کا خواب۔

ارقم بھائی کے بعد میں ہوں۔ اور تمہارے بابا کی طرح انجینئر ہوں۔ مجھ سے چھوٹے عزم ہیں دو عدد بچوں کے باپ ہیں، خود بہت بڑے سرجن ہیں لیکن تم دیکھو گی تو عادت و مزاج میں بچوں کو بھی مات کیے ہوئے ہیں۔ ایلا کے بعد ابی جان کی ناک کا بال بنے ہوئے ہیں۔ بیٹی ان کی میڈیکل کے آخری سال میں ہے اور بیٹا ابھی میٹرک کا اسٹوڈنٹ۔ مانا اور حسان دونوں بہت پیارے بچے ہیں اور جب سے انہیں تمہارے متعلق پتا چلا ہے' وہ تم سے ملنے کے بہت مشتاق ہو رہے ہیں۔"

کرم ماموں کی باتیں سنتے ہوئے میرا ذہن بار بار الجھ جاتا تھا۔ پتا نہیں مجھے وہاں جانا چاہیے یا نہیں، اور پتا نہیں وہ سب لوگ کیسے ہوں گے ارقم ماموں اور ان کے بچے، عزم ماموں

اور ان کی فیملی۔

راستے میں ایک جگہ کرم ماموں نے گاڑی روکی۔

"کیا خیال ہے بیٹے! کچھ دیر رکیں، کچھ ریفرشمنٹ۔"

مگر میرا کچھ بھی کھانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔

"پھر بھی بیٹا! چلو ایک کپ چائے لے لیتے ہیں۔ میں بھی مسلسل ڈرائیونگ سے کچھ تھک سا گیا ہوں۔"

وہ واقعی مسلسل ڈرائیونگ کر رہے تھے۔ لاہور میں تو صرف گھنٹہ بھر ہی رکے تھے۔ میں ان کے خیال سے گاڑی سے اتر آئی تھی، ہوٹل کے ہال میں بیٹھتے ہوئے اچانک ہی میری نظر اٹھی تھی' اور پھر ساکت ہو گئی تھی۔ وہ بلاشبہ دانش ہی تھا' اور اس کے ساتھ شاید اس کی نئی نویلی دلہن تھی۔ عام سی شکل وصورت اور چھوٹے سے قد کی گول مٹول سی لڑکی کے ہاتھوں پر مہندی رچی تھی' اور کلائیوں میں سونے کی چوڑیاں تھیں۔ چہرے پر عجیب طمانیت، غرور اور فخر کا سا احساس دمک رہا تھا' اور مجھے بڑی شدت سے احساس ہوا کہ دنیا گول ہے اور یہاں کبھی نہ کبھی کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی موڑ پر ہمیں وہ لوگ مل جاتے ہیں' جن سے بچتے پھرتے ہیں۔ اور جن سے بچھڑنا عذاب اور پھر انہیں دیکھنا اور ملنا اس سے بڑا عذاب ہوتا ہے۔

بالکل غیر ارادی طور پر میں اپنا اور اس کا موازنہ کرنے لگی اور کوئی جیسے میرے دل میں بار بار سوئیاں چبھونے لگا۔ ضبط کی کوشش میں میرا چہرہ تپ اٹھا اور آنکھیں جلنے لگیں۔ شاید وہ ہنی مون ٹرپ پر مری جا رہے تھے' یا پھر مری سے واپس آ رہے تھے۔ دو تین گھونٹ لے کر میں نے کپ ٹیبل پر رکھ دیا۔

"بیٹا! یہ سینڈوچ تو لے لو۔"

میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ مجھے ڈر تھا' کہ اگر میں بولی تو میری آواز میرا بھرم کھو دے گی۔

"بیٹا!" کرم ماموں نے کچھ کہنا چاہا لیکن پھر خاموش ہو گئے۔ شاید وہ میری کیفیات کو محسوس کر رہے تھے۔

تو کیا یہ ضروری تھا' کہ وہ اس وقت اس سفر پر جاتے ہوئے مجھے دکھائی دے جاتا۔ جب میں اسے بھولنے لگتی ہوں تو وہ پھر میرے سامنے آ جاتا ہے۔ اور اب ابا کی بیماری، ان کی جدائی اور پھر اماں کے انکشاف نے مجھے اندر تک ہلا کر رکھ دیا تھا' اور دانش کا خیال خود بخود میرے ذہن سے نکل گیا تھا' کہ آج پھر۔ اور مجھے پھر ابا کا خیال آ گیا۔

اور اہا نے اس سے۔ خود جا کر کہا اور اس نے معذرت کر لی۔ اس کے لیے اس لڑکی کے لیے جو اتنی عام سی تھی۔

احساسِ توہین سے میرا رُواں رُواں جل اٹھا۔ تپنے لگا۔ مکرم ماموں بل دے کر اٹھے اور اٹھتے اٹھتے میں نے ایک بار پھر اسے دیکھا اور عین اسی لمحے اس کی نظر مجھ پر پڑی میں نے اس کی آنکھوں میں پہچان کے واضح سائے ابھرتے دیکھے۔ ایک لمحہ تو وہ اپنی بیوی کی طرف سے غافل ہو گیا جو نہ جانے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کیا کہہ رہی تھی۔

ایک لمحہ کو میرا جی چاہا کہ میں اس کی ٹیبل پر جاؤں اور کوئی جملہ، کوئی ایسا جملہ کہوں کہ وہ ساری زندگی جلتا رہے اور ہمیشہ کے لیے اپنی بیوی کی نظروں میں بے اعتبار ہو جائے۔ وہ جو اس وقت بڑے مان، فخر اور اپنائیت سے اسے دیکھ رہی تھی' لیکن میں ایسا نہ کر سکی۔ تاہم مجھے پہلی بار محسوس ہوا کہ وہ ہمیشہ کے لیے میرے دل سے نکل گیا۔

اور گاڑی میں مکرم ماموں کے برابر بیٹھتے ہوئے مجھے لگا' جیسے میرا دل بالکل خالی ہو گیا ہو ویران اور بنجر۔

اور پھر راولپنڈی تک کا باقی ماندہ سفر جانے کیسے کٹا۔

''یہ سیٹلائٹ ٹاؤن کا بی بلاک ہے۔''

ایک وسیع سڑک کا موڑ کاٹتے ہوئے مکرم ماموں نے کہا۔

''اور اس سڑک کے اینڈ پر جہاں ایدھی سینٹر کا بورڈ ہے وہاں سے دائیں طرف ہمارا گھر ہے۔ وہ گھر' جہاں تمہاری مما پیدا ہوئیں پلی بڑھیں اور پھر وہ ایک لمحہ کو رکے۔

''اور اسی گھر میں تم بھی پیدا ہوئی تھیں۔ اقصیٰ۔''

میں نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا' کہ میری جائے پیدائش راولپنڈی ہوگی۔ اور یہ گھر۔

اور میں نے بڑے سے سیاہ گیٹ کو دیکھا' جو ہارن کی آواز پر یوں کھل گیا تھا' جیسے نہ جانے کب سے اس طرف کوئی منتظر کھڑا ہو۔ اور پھر گاڑی پورچ میں رکتے ہی بہت سارے لوگ وہاں آ گئے تھے۔

''مکرم! اتنی دیر کر دی۔'' ایک باوقار سے شخص نے بے چینی سے پورچ کی سیڑھیوں سے اترتے ہوئے کہا۔

وہ بے تابانہ میری طرف بازو پھیلائے بڑھے۔

میں نے ایک نظر ان کے پھیلے ہوئے بازوؤں کو دیکھا۔

''یہ ابی جان ہیں بیٹے! آپ کے نانا ابو۔''

''ابی جی!'' میرے ہونٹ لرزے۔ لیکن آواز کہیں اندر ہی حلق میں گھٹ گئی۔

''میری بچی، میری ایلا کی نشانی۔''

ابی جان کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے' اور پھر میں جیسے بے اختیار سی ہو کر ان کے پھیلے ہوئے بازوؤں میں سما گئی اور وہ جو میں لاہور سے لے کر یہاں تک ضبط کرتی ہوئی آئی تھی، وہ ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے۔ اس مہربان سینے سے لپٹ کر سارے درد جاگ اٹھے تھے۔ ساری اذیتیں زندہ ہو گئی تھیں۔ جانے کتنی دیر میں ان سے لپٹی رہی پھر مکرم ماموں اور عزم ماموں نے ایک ساتھ ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''ابی جان پلیز ریلیکس، آپ کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔''

''یہ عزم ہیں۔'' ابی جان نے مڑ کر ان کی طرف دیکھا تھا۔

اونچے لمبے، بے حد شاندار اور خوبصورت سے عزم ماموں مجھے دیکھ کر مسکرائے تھے۔

''بہت انتظار کروایا تم نے اقصیٰ۔ طویل برسوں کا انتظار۔''

اور پھر بہت سارے لوگ آ گئے۔ ماہا، سنان، غزالہ باجی، جو عزم ماموں کی وائف تھیں اور پتا نہیں کون کون۔

سب کی آنکھوں میں محبتیں تھیں۔ گرم جوشی تھی۔ وارفتگی تھی' اور یہ سب کچھ میرے لیے بہت نیا تھا۔ بہت انوکھا تھا۔ ابی جان میرے گرد بازو حمائل کیے کیے اندر لاؤنج تک آئے تھے۔

سب لوگ بول رہے تھے، نہ جانے کیا کیا پوچھ رہے تھے۔ ماہا مجھ سے جڑ کر بیٹھی تھی۔

''یار! میں تمہیں بڑا مس کرتی تھی۔ جب سے مجھے پتا چلا تھا' کہ میری ایک کزن ہے تو مجھے تم پر بہت غصہ آتا تھا' کہ تم وہاں کیوں جا کر بیٹھ گئی ہو۔ یہاں ہوتیں اس گھر میں تو۔''

''میں گواچی گائے کی طرح اکیلی نہ پھرا کرتی۔''

سنان نے لقمہ دیا تو ماہا نے گھور کر اسے دیکھا اور پھر میری طرف متوجہ ہو گئی۔

''یہاں اس گھر میں لڑکیوں کی کمی ہے۔ ایک اکیلی میں، یہ سب تو حماد، عباد وغیرہ اپنا گروپ بنائے پھرتے تھے' اب تم آ گئی ہو نا تو دیکھنا سب سے خوب بدلے لوں گی۔''

''کس سے بدلے لو گی؟'' ایک نیلی آنکھوں اور براؤن بالوں والا دلکش سا لڑکا اندر داخل ہوا۔

''تم سے اور کس سے۔''

ماہا نے مڑ کر اسے دیکھا اور پھر بتایا۔

''یہ حماد ہے۔''

پھر ارقم ماموں اور ثمینہ مامی بھی آ گئیں۔

''ماہا۔'' مکرم ماموں نے اس سے کہا۔ ''بیٹا! کھانا لگواؤ' آج اقصیٰ بہت تھکی ہوئی ہے' اسے آج کے دن ریسٹ کرنے دو۔''

پھر انہوں نے ابی جان سے آہستہ آہستہ کچھ کہا' انہوں نے ان کی تائید کی۔

''مکرم صحیح کہہ رہے ہیں۔ آج کھانا جلدی لگوادو مکرم نے مسلسل ڈرائیونگ کی ہے اور اقصیٰ بھی تھکی ہوئی ہے۔''

میں نے متشکر نظروں سے مکرم ماموں اور ابی جان کی طرف دیکھا۔ میں واقعی لیٹنا چاہتی تھی۔ آنکھیں بند کر کے سکون سے سونا چاہتی تھی' میں نے بہت طویل ذہنی سفر کیا تھا' اور میں اس وقت ان سب کی محبتوں کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ سو کھانا کھاتے ہی میں ماہا کے ساتھ اپنے کمرے میں آ گئی۔

***

یہ گھر بہت بڑا اور بہت خوبصورت تھا' یہاں ابی جان' عزم ماموں' غزالہ مامی' سنان اور ماہا رہتے تھے۔ ماہا کے کمرے کے ساتھ ہی میرے لیے کمرہ سیٹ کیا گیا تھا' اور بہت خوبصورتی سے سیٹ کیا ہوا تھا۔ سامنے کارنس پر ابا کی اور ماما کی تصویر تھی۔ ماما بہت خوبصورت لگ رہی تھیں' میں جب بھی کمرے میں آتی تو بہت دیر تک کارنس کے پاس کھڑی دیکھتی رہتی یہاں تک کہ آنکھیں دھندلا جاتیں۔

''تمہارا کمرہ میں نے اور ابی جان نے مل کر سیٹ کیا ہے۔'' ماہا نے مجھے فخر سے بتایا تھا۔

''مشورہ تو میں نے بھی دیا تھا۔''

سنان بہت شوخ مزاج کا اور ہنس مکھ لڑکا تھا' اسے دیکھ کر مجھے روحیل یاد آ جاتا۔ وہ چند دنوں میں ہی مجھ سے بے تکلف ہو گیا تھا۔ ماہا اور اس کے درمیان ہمہ وقت دلچسپ نوک جھوک ہوتی رہتی' حماد آ جاتا تو پھر تو اس کے عیش ہو جاتے تھے۔ وہ دونوں مل کر ماہا کو عاجز کر دیتے تھے' اس گھر کے دائیں بائیں بالکل ساتھ جڑے ہوئے ارقم ماموں اور مکرم ماموں کے گھر تھے۔ عباد تو ملک سے باہر تھے' اور سلجوق اپنے کسی سرکاری دورے پر۔ سو ابھی تک ان سے میری ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔ اور نہ ہی بینا مامی سے' وہ اپنے والدین سے ملنے کراچی گئی ہوئی تھیں۔

سو مکرم ماموں زیادہ وقت ادھر ہی ہوتے تھے۔ دوپہر اور رات کا کھانا ادھر ہی کھاتے تھے' البتہ ناشتہ گھر پر ہی کرتے تھے۔ ان کی کوئی اولاد نہ تھی۔

سب نے اپنی محبتوں کے دامن پھیلا دیے تھے۔ یوں لگتا تھا' جیسے میں برسوں سے یہیں رہتی آ رہی ہوں کسی نے ایک لمحہ کے لیے بھی اجنبیت کا احساس نہیں دلایا تھا۔ ہاں ثمینہ مامی کم بات کرتی تھیں شاید ان کا مزاج ہی ایسا تھا' اور وہ ادھر ابی جان کے گھر بھی کم آتی تھیں۔

ابی جان کا تو جی چاہتا تھا' کہ ہر وقت مجھے اپنے سامنے بٹھائے رکھیں۔

ابی جان نے مجھے ماما کی ساری تصاویر دکھا دیں۔ ان کے پاس ایک البم میں صرف ماما کی تصاویر تھیں' ان کے بچپن سے لے کر میری پیدائش تک کی ساری تصاویر۔

''تم بالکل اپنی ماما کی طرح ہو اقصیٰ بیٹے۔ بالکل وہی قد' ویسے ہی بال' وہی ہونٹ' وہی ناک۔''

ابی جان نے مجھے بتایا تو ایک لمحہ کو میں اپنے گھر پہنچ گئی۔

کتنی راتیں رو رو کر میں نے اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگی تھیں کہ میں اپنی اماں جیسی ہو جاؤں۔ میں اماں جیسا بننا چاہتی تھی' اور ابی جان نے مجھے بتایا تھا' کہ میں بالکل اپنی ماما جیسی ہوں۔

کبھی کبھی ابی جان اداس ہو جاتے۔

''پتا نہیں عارف نے تمہیں اپنے ساتھ لے جا کر اچھا کیا تھا' یا برا لیکن ہم سب کو اس نے تم سے جدا کر دیا تھا۔ اپنے طور پر وہ صحیح تھا' اس نے تمہاری بہتری کا ہی سوچا تھا' لیکن ہم تمہارے بغیر کس طرح رہے۔ یہ ہم ہی جانتے ہیں' ایلا کے بعد تم بھی چلی گئی تھیں۔ ایلا کو تو قدرت نے لے لیا اور تمہیں عارف اپنے ساتھ لے گیا۔''

ابا نے ایک بار بے خیالی میں کہہ دیا تھا' کہ ''نہیں نہیں تمہاری ماما کے خاندان والے تو سب بہت پڑھے لکھے اور ایجوکیٹڈ لوگ ہیں۔'' اور مجھے تھوڑی سی حیرت ہوئی تھی' لیکن اب میں نے دیکھ لیا تھا' کہ سب ہی کس قدر ایجوکیٹڈ تھے۔ غزالہ مامی اور ثمینہ مامی نے بھی ماسٹرز کر رکھا تھا' ابی جان پندرہ سال تک گارڈن کالج کے پرنسپل رہے تھے' اور آج کل ریٹائرڈ تھے اور یہاں ابی جان کے گھر میں اتنی بڑی لائبریری تھی' اور اتنی کتابیں تھیں کہ میں ششدر رہ گئی تھی۔

میرا جی چاہا تھا' کہ میں یہ ساری کتابیں پڑھ ڈالوں لیکن ابھی میرا کچھ کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا' بیٹھے بیٹھے میرا دل گھبرا جاتا۔ میرے آنسو اندر ہی اندر گرتے۔

مجھے ابا یاد آ جاتے۔

ان کی وہ خاموشی، وہ چپ، اتنے سال انہوں نے صرف میری وجہ سے اماں سے بات نہیں کی تھی۔ وہ ہر وقت میرے لیے پریشان رہتے تھے۔

اور جب میں نے ٹاپ کیا تھا' تو ان کی وہ خوشی، وہ مسرت مجھے بھولتی ہی نہ تھی۔ پھر ان کے آخری لمحے ان کی وہ بے چینی صرف اور صرف میرے لیے۔

مجھے سفینہ یاد آتی' جس کے ساتھ میں کبھی زیادہ بے تکلف نہیں ہو سکی تھی۔ لیکن جو کبھی نہ کبھی کوئی بات کہہ کر مجھے اپنی محبت کا احساس دلاتی رہتی تھی۔

اور پھر روحیل یاد آ جاتا۔ اس کی چھیڑ چھاڑ، اس کی شرارتیں، پتا نہیں کیوں مجھے کبھی بھی اس کا تنگ کرنا، چھیڑنا، برا نہیں لگا تھا' بلکہ میں اسے ترکی بہ ترکی جواب دیتی تھی۔ اور مجھے اماں بھی یاد آتی تھیں۔ جنہیں ہمیشہ اپنی ماں ہی سمجھا تھا۔

پھر وہ اچانک انکشاف، وہ ان کی آنکھوں کی نفرت جس نے پورے وجود کو راکھ کر دیا تھا۔

اور یہ سب مجھے یہاں اتنی محبتوں کے باوجود اپ سیٹ کیے رکھتا تھا۔ اس روز بھی میں گھبرا کر لان میں نکل آئی تھی۔

"اقصیٰ تمہارا فون ہے۔"

"میرا فون۔" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ہاں، ہاں، تمہارا۔ شاید لاہور سے ہے۔"

"کیا اماں کا؟" میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا۔ کیا خبر انہوں نے مجھے واپس بلایا ہو۔ آخر میرا گھر تو وہی ہے نا جو ابا کا گھر ہے۔ میں نے سوچا اور اپنی اس سوچ پر میں ایک لمحے کو حیران سی رہ گئی۔ تو کیا میں اب تک اتنے دنوں سے اس انتظار میں ہوں کہ اماں مجھے واپس بلا لیں گی۔

دوسری طرف سفینہ تھی۔

"اقصیٰ! کیسی ہو؟"

مجھے لگا' جیسے اس کی آواز بھرائی ہوئی ہو۔

"اچھی ہوں اور تم کیسی ہو؟"

"اچھی ہوں۔ خوش ہو اقصیٰ۔"

"ہاں۔ پتا نہیں۔"

"ہم۔ سب تمہیں بہت مس کرتے ہیں۔"

"کیا اماں بھی؟" بے اختیار میرے لبوں سے نکل گیا۔

وہ لمحہ بھر خاموش رہی۔

"تمہارا کمرا میں صاف کروا دیتی ہوں روز ہی۔"

اس نے بات بدل دی۔ وہ تو اتنی پڑھاکو سی تھی' اور اس کے پاس تو فرصت ہی نہیں ہوتی تھی۔

"یہ روحیل سے بات کرو۔"

"کیسی ہیں بجو۔ سنا ہے وہاں آپ کے بڑے کزن وغیرہ ہیں۔ لڑائی جھگڑا تو نہیں ہوتا۔ اور کہیں ایک دو کا سر تو نہیں پھوڑ دیا؟"

اس نے مجھے ہنسانے کی کوشش کی۔ میں جانتی تھی' کہ وہ ہنس نہیں رہا ہے۔ ان سے بات کر کے میرا دل اور بھی بھاری سا ہو گیا۔ پتا نہیں اندر باہر اتنی اداسیاں کیوں تھیں۔ ایک لمحہ کو میرا جی چاہا کہ ابی جان سے کہہ کر واپس چلی جاؤں، لیکن پھر اماں کی وہ نفرت۔ ابا کی تاکید۔ میں گود میں ہاتھ دھرے ساکت بیٹھی تھی۔ سنان نے ٹی وی کی آواز آہستہ کر دی تھی۔ ماہا ہاتھ میں موٹی سی کتاب لیے اندر داخل ہوئی۔

"جائیے جائیے خاتون! آپ اپنی کتابوں میں سر دھنیے آپ کو دوسروں سے کیا کام؟"

"مگر کیوں؟" ماہا نے کتاب بند کر دی۔

"یعنی کہ اتنے دن ہو گئے اقصیٰ کو آئے ہوئے اور ابھی تک کہیں گھمانے لے کر نہیں گئے۔"

"ارے واہ حماد بھائی! آپ نے تو میرے دل کی بات کہہ دی ہے۔" سنان نے چٹکی بجائی۔

"روز گارڈن۔"

"نہیں یار "چھتر" کا پروگرام رکھ لو۔"

"یہ صحیح ہے۔"

ماہا بھی وہیں ہی بیٹھ گئی اور وہ زور و شور سے پروگرام بنانے لگے۔

شاید یہ سب مجھ پر ترس کھاتے ہیں اس لیے مجھے خوش رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جانے کہاں سے یہ خیال میرے دل میں آ گیا اور مجھے مزید اداس کر گیا۔

"ارے ہاں!" حماد کے ساتھ کسی بات پر بحث کرتے کرتے اچانک ماما کو یاد آیا۔

"مینا مامی آ گئی ہیں۔"

"بغیر اطلاع کے اچانک ہی آ گئیں۔ دراصل جب سے انہوں نے اقصیٰ کا سنا تھا' بہت بے چین ہو رہی تھیں۔ اور ادھر آنے ہی والی ہوں گی' مجھے ابھی ابھی فضل داد نے بتایا ہے۔"

"اور دوسری خبر یہ ہے کہ آج رات سلجوق بھائی بھی آ رہے ہیں۔"

"اور یہ خبر بھی تمہیں فضل داد نے دی ہوگی۔ تمہارا جاسوس، پوچھتا ہوں ابھی جا کر فضل داد سے۔"

وہ اٹھ کر تیزی سے باہر لپکا اندر آتے ہوئے مکرم ماموں سے ٹکرا گیا۔

ماما نے مسکرا کر مجھے دیکھا اور پھر مکرم ماموں کے پیچھے داخل ہوتی، مینا ممانی کی طرف اشارہ کیا، جو مڑ کر حماد سے کوئی بات کرنے لگی تھیں۔

"یہ مینا مامی ہیں اور تمہاری سب سے بڑی عاشق۔"

"بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے میں نے تو اس سے پہلے انہیں کبھی نہیں دیکھا تھا۔"

میں نے سوالیہ نظروں سے ماما کی طرف دیکھا۔

"دراصل جب پھپھو کی ڈیتھ ہوئی تو تم صرف دو ماہ کی تھیں اور پھر تین سال تک مینا مامی نے ہی تمہیں اپنے پاس رکھا تھا اور جب تم تین سال کی ہوئیں تو عارف انکل تمہیں اپنے ساتھ لے گئے اور سنا ہے کہ مینا مامی تمہاری جدائی میں بیمار بھی ہو گئی تھیں۔" مینا مامی نے مجھے گلے لگا لیا۔

"یہ۔ یہ تم ہو اقصیٰ۔ بالکل ایلا جیسی وہی ہونٹ، وہی آنکھیں، وہی قد، ایک لمحہ کو مجھے لگا جیسے ماہ و سال پلٹ آئے ہوں اور میرے سامنے ایلا بیٹھی ہو۔"

وہ کتنی ہی دیر تک مجھے لپٹائے کھڑی رہیں اور ان کے آنسو میرے کندھوں کو بھگوتے رہے۔ خود میرا دل جیسے پانی ہو رہا تھا۔

"اب بس بھی کرو مینا۔"

"بالآخر مکرم ماموں نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو انہوں نے مجھے خود سے علیحدہ کیا۔

"اور ابا نے پتا نہیں کیوں ان سب کی محبتوں سے محروم کر دیا تھا۔"

اس روز مینا مامی کے ساتھ باتیں کرتے ان کی بے تحاشا محبت کو محسوس کرتے ہوئے میں نے کئی بار سوچا۔

"میں اور ایلا بہت گہری دوست تھیں بچپن سے ہی۔ ہم نے ایک ہی اسکول، ایک ہی کالج میں پڑھا۔ اکٹھا ایم بی بی ایس کیا۔ ایک ہی ہاسپٹل میں، ایک ہی دن جوائن کیا اور ہماری شادیاں بھی اکٹھی ہوئیں۔ میرا ولیمہ اور ایلا کی بارات ایک دن ہی تھی' اور پھر صرف ایک ہفتے کے فرق سے نیلی اور تم پیدا ہوئیں۔ تم نیلی سے ایک ہفتہ بڑی تھیں، مگر نیلی بہت مختصر زندگی لے کر آئی تھی۔ صرف دو ماہ میری گود میں رہی اور۔" اور ان کی آواز بھرا گئی۔

"ارے ارے آنٹی! ادھر دیکھیں آپ کا پسندیدہ پروگرام آ رہا ہے ٹی وی پر۔"

سنان نے ریموٹ اٹھا کر آواز اونچی کی تو مینا مامی ادھر متوجہ ہو گئیں۔ کچھ دیر بعد ابی جان بھی وہیں آ گئے اور انہوں نے ماما سے کہا۔

"اپنی ممی سے کہو، آج سب ادھر ہی کھانا کھائیں گے۔"

میں جب سے آئی تھی، میں نے دیکھا تھا کہ سب لوگ ہفتے میں کم از کم دو بار ضرور رات کے کھانے پر ابی جان کی طرف اکٹھے ہوتے تھے' اس روز ابی جان کے چہرے پر بڑی رونق ہوتی تھی' اور وہ دور امریکہ میں بیٹھے عباد کو ضرور یاد کرتے تھے' اور آج بھی وہ عباد کا ہی ذکر کر رہے تھے، جب ایس پی کی فل یونیفارم میں سلجوق اندر داخل ہوئے۔ دراز قد، ڈارک براؤن بال اور ڈارک براؤن ہی آنکھیں، گوری رنگت وہ ارقم ماموں سے بہت مشابہ تھے۔ لیکن ان کا قد ارقم ماموں سے بھی نکلتا ہوا تھا۔

"بیٹا! اتنی دیر کر دی ہم نے تو اب مایوس ہو کر کھانا شروع کر دیا تھا۔"

"سوری ابی جان! بس وہ ایمرجنسی میں کہیں جانا پڑ گیا تھا۔ سیدھا وہاں سے ہی آ رہا ہوں۔"

وہ ابی جان کی برابر والی کرسی پر بیٹھ گئے۔ ابی جان کے گھر کا ڈائننگ ہال بھی بہت وسیع تھا، دو بڑی ٹیبلز لگی ہوئی تھیں۔ میں نے محسوس کیا تھا' کہ کھانا کھاتے ہوئے سلجوق نے دو تین بار بہت گہری نظروں سے مجھے دیکھا تھا۔ اور پتا نہیں کیوں ان کے اس طرح دیکھنے سے میں گھبرا گئی تھی۔ ایک بار میری ان سے نظر ملی تو انہوں نے مسکرا کر سر جھکا لیا۔

کھانے کے بعد جب میں اپنے کمرے کی طرف جا رہی تھی' تو راستے میں ماما نے پوچھا۔

"تمہیں سلی بھائی کیسے لگے اقصیٰ!"

"تم سب لوگ بہت اچھے ہو۔"

"میں سب لوگوں کی نہیں صرف سلی بھائی کی بات کر رہی ہوں۔"

"ظاہر ہے وہ بھی اچھے ہوں گے۔" میں نے الجھ کر اسے دیکھا۔

"وہ واقعی بہت اچھے ہیں اقصیٰ۔" ماما کے لہجے میں ایک بہن کا فخر تھا۔

سلجوق ایک ہفتے کی چھٹی پر آئے تھے اور اس ایک ہفتے کے دوران کتنی ہی بار میرا ان سے سامنا ہوا اور مختصر سی بات چیت بھی ہوئی۔ اور پتا نہیں کیوں ہر بار مجھے یوں لگا جیسے سلجوق بہت گہری نظروں سے مجھے دیکھ رہے ہوں اور ان کے اس طرح دیکھنے سے میں پزل سی ہو جاتی تھی۔ پتا نہیں سلجوق مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہے ہیں میرا احساسِ کمتری عود کر آتا تھا۔ شاید میں ان سب سے میل نہیں کھاتی تھی۔ سوائے مکرم ماموں کے جن کا رنگ گندمی تھا سب ہی گورے چٹے تھے۔ اس وقت بھی میں بہت دیر سے لان کے بیچوں بیچ بنے خوبصورت فوارے کو دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ بینا مامی سے جا کر پوچھوں ماما کی رنگت کیسی تھی؟

بینا مامی نے مجھے بہت محبت دی تھی ان چند دنوں میں ہی انہوں نے مجھ پر محبتوں کی بوچھاڑ کر دی تھی۔ میں ننھی بچی نہیں تھی لیکن وہ میرے ساتھ اس طرح ٹریٹ کرتی تھیں جیسے میں چھوٹی سی بچی ہوں۔ وہ ابی جان سے بھی بہت دیر تک جھگڑتی رہی تھیں۔ ان کی خواہش تھی کہ میں ان کے ساتھ ان کے گھر میں رہوں۔

"ابی جان! اقصیٰ میری بیٹی ہے۔ میرا حق ہے اس پر، ایلا نے جاتے سے اسے مجھے دیا تھا۔"

اور ابی جان شفقت سے مسکراتے رہے تھے۔

جب ابی جان اپنی اسٹڈی میں ہوتے سب مصروف ہوتے۔ ماما کالج چلی جاتی تو میں بینا مامی کی طرف آ جاتی تھی۔

اس وقت بھی میں بینا مامی کی طرف آئی تھی لیکن ان کی کوئی کولیگ آئی ہوئی تھیں سو میں لان میں آ کر بیٹھ گئی تھی۔

اچانک ہی مجھے لگا جیسے کوئی مجھے دیکھ رہا ہے۔ میں نے یکدم نظریں اٹھائیں تو سامنے کچھ فاصلے پر سلجوق کھڑے تھے۔ مجھے اپنی طرف دیکھتے پا کر وہ مسکرائے اور قریب چلے آئے۔

"کیا سوچتی رہتی ہیں آپ ہر وقت۔ میں تقریباً چار منٹ سے کھڑا دیکھ رہا تھا۔ آپ اپنے آپ میں اتنی گُن تھیں کہ آپ کو میری موجودگی کا احساس ہی نہیں ہوا۔"

"کچھ نہیں، یوں ہی بس۔" میں گھبرا سی گئی۔

"اقصیٰ!" وہ قریب ہی بیٹھ گئے۔ "یہاں سب آپ کے اپنے ہیں اپنے آپ کو ایڈجسٹ

کرنے کی کوشش کریں۔ آپ کو ہمیشہ رہنا ہے اسی گھر میں۔" وہ مسکرائے۔

"اور۔" سلجوق کی نظریں میرے چہرے پر تھیں۔ "اتنے سارے دن ہو گئے، آپ کو یہاں آئے ہوئے لیکن ابھی تک یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ آپ کیا کرتی ہیں۔ پڑھ رہی تھیں، یا پڑھ چکی ہیں؟"

"میں نے ابا کی ڈیتھ سے کچھ دن پہلے ایم اے کا ایگزام دیا تھا۔ ابھی رزلٹ نہیں آیا۔"

"اوہ۔ خوب۔ اور یہاں کیا مصروفیت ہے۔"

"کچھ نہیں، بس یونہی۔"

"کچھ مصروفیت ڈھونڈ لیں۔ ابی جان کی لائبریری میں بہت اچھی اچھی کتابیں ہیں وہ پڑھا کریں، کچھ دلچسپی ہے ادب سے۔"

"ہوں۔" میں نے سر ہلا دیا۔

"ظاہر ہے، ادب کی طالبہ ہیں تو دلچسپی تو ہو گی۔" سلجوق پھر مسکرائے۔

"اچھا بتائیں۔ کیا کیا کچھ پڑھ ڈالا، آپ کو حیرت ہو گی کہ میں بھی ادب کا طالب علم ہوں۔"

سلجوق بہت ہلکے پھلکے انداز میں بہت دیر تک باتیں کرتے رہے یہاں تک کہ بینا مامی آ گئیں۔

"ارے سلی بیٹا! تم کب آئے؟"

"بہت دیر ہو گئی، اقصیٰ سے باتیں کر رہا تھا، کچھ اپنی کچھ ان کی سن رہا تھا۔ آپ سنائیں۔ کیسی ہیں آپ، کب جوائن کر رہی ہیں اپنی جاب۔"

"میرا ارادہ تو تھا کہ کر لوں لیکن تمہارے چاچو نہیں کرنے دے رہے، کہتے ہیں فی الحال ریسٹ کرو۔ حالانکہ بہت سمجھا چکی ہوں کہ معمولی سا انجائنا کا اٹیک تھا۔ ایک ماہ تو ریسٹ کر لیا ابھی کچھ دیر پہلے ڈاکٹر زیبا آئی ہوئی تھیں۔ وہ بھی کہہ رہی تھیں کہ مجھے اب جوائن کر لینا چاہیے۔"

"اچھا تو بینا مامی اس لیے گھر پر تھیں میں نے ایک بار سوچا بھی تھا کہ پوچھوں کہ انہوں نے ایم بی بی ایس کرنے کے باوجود جاب کیوں نہیں کی۔ تو وہ بیمار تھیں اور میں۔ شاید سلجوق صحیح کہہ رہے تھے کہ میں ایڈجسٹ ہونے کی کوشش نہیں کر رہی ہوں۔"

"مامی!" میں نے ان کا ہاتھ تھام لیا۔ "آپ نے مجھے بتایا بھی نہیں کہ آپ بیمار تھیں؟"

"میری جان کوئی بیمار شمار نہیں تھی۔ معمولی سا انجائنا کا اٹیک ہوا تھا' ایک ماہ پہلے اور ایک ماہ سے چھٹی پر ہوں اور سچ تو یہ ہے کہ جب سے تمہیں دیکھا ہے لگتا ہے میں کبھی بیمار ہوئی ہی نہیں تھی۔ اور ابھی میں نے زیبا سے کہہ کر ایک ماہ کی مزید چھٹی لے لی ہے۔ اپنی بیٹی کے لیے۔"

وہ بھی وہیں بیٹھ گئی۔

"آخر ابا نے ایسا کیوں کیا۔ مجھے آپ سب سے جدا کر دیا۔ کبھی آپ لوگوں سے ملانے بھی نہیں لائے۔"

وہ سوال جو بہت سارے دنوں سے میرے دماغ میں چکرا رہا تھا' یکدم میرے لبوں پر آ گیا۔

"بیٹا!" بیناماما جیسے ماضی میں جھانک رہی تھیں۔ "تمہاری ماما اور میں بچپن سے ہی بہت گہری دوست تھیں' ہمارے گھر بھی ساتھ ساتھ تھے۔ ادھر بیک پر جو گرین ہاؤس ہے وہ ہمارا گھر ہے۔ لیکن ڈیڈی کی ڈیتھ کے بعد میری ممی بھائی کے پاس کراچی چلی گئی ہیں اور گرین ہاؤس کو کرائے پر چڑھا دیا ہے۔ میں اکثر ایلا کے پاس آتی رہتی تھی۔ یہاں اس گھر میں مجھے کبھی اجنبیت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ بلکہ میں خود کو اس گھر کا ایک فرد ہی سمجھتی تھی۔ سو عارف بھائی بھی میرے لیے اجنبی نہیں تھے' جو ایلا کے پھپھوزاد بھائی تھے' اور کراچی میں اپنے والدین کے ساتھ رہتے تھے' اور کبھی کبھار ملنے آتے رہتے تھے۔ ان دنوں ایلا کی دادی ماں بھی زندہ تھیں اور اپنی اکلوتی بیٹی یعنی ایلا کی پھپھو کی ڈیتھ کے بعد ہمہ وقت عارف بھائی سے ملنے کو بے چین رہتی تھیں۔ ایلا کی پھپھو عارف بھائی کی پیدائش کے چند دن بعد ہی وفات پا گئی تھیں۔ اور ان کے والد نے دوسری شادی کر لی تھی' اور عارف بھائی کی سوتیلی والدہ نے انہیں بہت محبت سے پالا تھا۔ خود ان کی اپنی کوئی اولاد نہیں تھی' لیکن اس کے باوجود کہ عارف بھائی کو یہاں وہاں سب جگہ بہت محبتیں ملی تھیں۔ کبھی کبھی مجھے محسوس ہوتا تھا' کہ عارف بھائی بہت خاموش، اداس اور چپ چپ رہتے ہیں۔ بظاہر تو ان کی زندگی میں کوئی کمی نہ تھی، چاہنے والے ماں باپ۔ رافعہ آنٹی کی تو جان اٹکی ہوئی تھی' ان میں اور یہاں دادی جان، ابی جان سب ہی انہیں بہت چاہتے تھے، مکرم سے تو ان کی بہت دوستی تھی۔ ایک بار میں نے ایلا سے پوچھا تھا' کہ عارف بھائی کبھی کبھی بہت اداس سے کیوں لگتے ہیں۔ تو ایلا نے کہا تھا' شاید وہ کم گو ہیں ان کا مزاج ہی ایسا ہے یہ تو بعد میں ایلا کی ڈیتھ کے بعد جب اچانک انہوں نے تمہیں اپنے ساتھ لے جانے اور کبھی نہ ملانے

کا فیصلہ کیا تھا' تو تب میں نے جانا کہ ان کی اداسی کا سبب کیا تھا۔"

وہ آہستہ آہستہ بول رہی تھیں اور میں بہت دھیان سے سن رہی تھی، سلجوق بھی خاموشی سے مامی کی بات سن رہے تھے۔

"بیٹا! ابھی عارف بھائی پڑھ ہی رہے تھے' کہ ان کے والدین یکے بعد دیگرے چند ماہ کے وقفے سے وفات پا گئے تو وہ ہمیشہ کے لیے یہاں آ گئے اور پھر تعلیم مکمل کرنے کے بعد ان کی اور ایلا کی شادی ہو گئی لیکن خدا کو یہ ساتھ منظور نہ تھا' تم دو ماہ کی تھیں کہ ایک روز ہاسپٹل سے آتے ہوئے ایلا کی گاڑی کو حادثہ پیش آ گیا اور دو دن موت و زیست کی کشمکش میں گرفتار رہنے کے بعد ایلا سب کو چھوڑ کر چلی گئیں۔"

ان کی آواز بھرا گئی۔

"وقت کسی کے لیے نہیں رکتا۔ وہ گزرتا چلا جاتا ہے۔ عارف بھائی کی تنہائی اور اداسی دادی جان سے دیکھی نہ گئی تو انہوں نے عارف بھائی کی شادی کا سوچا۔ عارف بھائی اس کے لیے تیار نہ تھے، لیکن ابی جان اور دادی جان نے انہیں مجبور کر دیا۔ ابی جان کو ایلا بہت عزیز تھیں لیکن عارف بھائی بھی کم عزیز نہ تھے۔ ان کی اکلوتی بہن کے بیٹے تھے' اور انہوں نے کبھی ارقم بھائی، مکرم، عزم اور عارف میں فرق نہیں کیا تھا۔

عارف بھائی ان دنوں لاہور میں تھے' اور وہاں ہی جاب کر رہے تھے۔ انہوں نے دادی جان کے فیصلے پر سر جھکا دیا تھا۔ اور دادی جان نے کسی جاننے والے کی معرفت فاطمہ بھابی سے ان کا نکاح کر دیا۔ فاطمہ بھابی غیر تھیں لیکن چند ہی دنوں میں اندازہ ہو گیا تھا' کہ وہ اچھی بیوی ثابت ہوں گی۔ عارف انہیں جان کر یہاں نہیں لائے تھے، انہیں ابی جان اور ہم سب کا خیال تھا' اور یہ بات پہلے ہی طے ہو چکی تھی' کہ فاطمہ لاہور میں عارف بھائی کے ساتھ رہیں گی۔ سو ملتان سے رخصت ہو کر وہ سیدھی لاہور اسی گھر میں آئی تھیں' جو عارف بھائی کو اپنی کمپنی کی طرف سے ملا ہوا تھا' اور شادی کے چند ہی دنوں بعد عارف بھائی تمہیں لینے آ گئے۔ تم ان کی بیٹی تھیں اگر وہ تمہیں اپنے پاس رکھنا چاہتے تھے' تو ان کو روکا نہیں جا سکتا تھا۔ لیکن جو فیصلہ انہوں نے کیا اس پر سب نے ہی احتجاج کیا۔ لیکن وہ اپنے فیصلے میں اٹل تھے۔"

"میں نے عمر بھر محرومی کا درد سہا ہے۔" انہوں نے ابی جان سے کہا۔ "اور میں نہیں چاہتا کہ میری بیٹی اس کرب سے گزرے میں نے اس سلسلے میں فاطمہ سے بات کر لی ہے۔ امی جان نے مجھے بہت چاہا لیکن میں ہمیشہ سوچتا تھا' کہ یہ میری ماں نہیں ہیں۔ یہاں آتا تو دادی جان ہر

وقت امی کی باتیں کرتی رہتیں تو یہ احساس دوچند ہوجاتا تھا' میں کبھی امی جان سے اتنی محبت نہیں کرسکا جتنا ان کا حق تھا' انہوں نے مجھے سگی اولاد سے بڑھ کر چاہا' لیکن میرے اندر کا احساس محرومی عمر کے ساتھ ساتھ میرے اندر پلتا رہا۔ میں چاہتا ہوں کہ اقصیٰ کو کبھی معلوم نہ ہو کہ فاطمہ اس کی سگی ماں نہیں ہے اور اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ یہاں سے تعلق توڑلوں' کم ازکم اس وقت تک جب تک اقصیٰ کی شادی نہیں ہوجاتی۔'' شاید عارف بھائی نے اپنے تجربوں کی روشنی میں صحیح سوچا ہو لیکن ہم میں سے کسی کو ان کا یہ فیصلہ پسند نہیں آیا تھا' تاہم کوئی انہیں مجبور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ تم ان کی اولاد تھیں اور وہ تمہارے لیے' سوچنے اور فیصلہ کرنے کا حق رکھتے تھے۔ میں نے ان سے تمہیں بہت مانگا تھا۔ شاید مجھے احساس ہوگیا تھا' کہ میں اب کبھی ماں نہ بن سکوں گی لیکن عارف بھائی نے کہا کل جب میری اپنی اولاد ہوجائے گی تو شاید کبھی نہ کبھی کہیں نہ کہیں لاشعوری طور پر ہی سہی' کوئی فرق مجھے لگا تو۔ نہیں بینا بھابی! میں نہیں چاہتا کہ میری بیٹی کی شخصیت مسخ ہو۔ یہ زندگی میں کسی مقام پر بھی ہرٹ ہو۔ حالانکہ مجھے پتا ہے کہ آپ نے راتوں کو جاگ کر اقصیٰ کو سنبھالا ہے۔ ایک ماں کی طرح اس کا خیال رکھا ہے۔ اگر فاطمہ میرے ساتھ تعاون کرنے کے لیے تیار نہ ہوتی تو میں کبھی اسے آپ سے لے کر نہ جاتا۔''

اور ابا۔ ابا نے کتنی کوشش کی تھی۔ کتنی قربانیاں دی تھیں میرے لیے۔ میری شخصیت کو مسخ ہونے سے بچانے کے لیے۔ پھر بھی۔ پھر بھی میری شخصیت میں کتنی کمزوریاں اور خامیاں پیدا ہوگئی تھیں۔ کتنے جھول تھے۔

مجھے شدت سے احساس ہوا کہ انجانے میں میری ذات سے ابا کو کتنا دکھ پہنچا تھا' اور اب نے مجھ سے کتنی محبت کی تھی۔ کتنی شدید محبت۔ میں نے ہونٹ بھینچ لیے اور میرے آنسوؤں نے میرے اندر اودھم سا مچادیا۔

''چلیں مامی! آپ کی بیٹی اب آپ کے پاس لوٹ آئی ہے۔ سارے ارمان پورے کریں۔''

سلجوق نے ماحول کی اداسی دور کرنے کی کوشش کی'' بلکہ ایک زبردست دعوت ہونی چاہیے اس سلسلے میں۔''

''کیوں نہیں۔'' مامی مسکرا رہی تھیں لیکن میرا دل اداس تھا۔ مجھے ابا یاد آرہے تھے۔ ان کی باتیں یاد آرہی تھیں۔ میں اک دم اٹھ کھڑی ہوئی اور سلجوق اور مامی کو وہیں باتیں کرتا چھوڑ کر اپنے کمرے میں آگئی۔ تینوں گھروں کے لان میں ایک دوسرے کے گھر جانے کے لیے چھوٹے

چھوٹے دروازے تھے' اور ہم وہی استعمال کرتے تھے۔

* * *

اور یہ اس روز کی بات تھی' جب ابی جان مجھے ماما کا کلینک دکھانے لائے تھے' گھر سے ملحق۔

''یہ کلینک میں نے ایلا کے لیے بنوایا تھا۔ وہ تمہاری وجہ سے پریشان رہتی تھی' اور جاب چھوڑنا چاہتی تھی۔ اس کا خیال تھا' کہ تم ابھی چھوٹی ہو اور تمہیں ایلا کی ضرورت ہے۔ میں نے سوچا تھا' کہ یہاں کلینک بنوادوں گا تو تمہاری وجہ سے اسے آسانی رہے گی اور اس کی تعلیم بھی ضائع نہیں جائے گی' لیکن ابھی کلینک سیٹ بھی نہیں ہوا تھا' کہ وہ چلی گئی۔ اور میں نے سوچا تھا' کہ تم جب یہاں آؤ گی تو اس کلینک میں بیٹھو گی اپنی ماما کی جگہ پر۔''

تب ہی ابا کی شدید خواہش تھی' کہ میں ڈاکٹر بنوں۔ اور میں ڈاکٹر نہیں بن سکی۔

میں نے ابی جان کی طرف دیکھا اور میری آنکھیں دھندلا گئیں۔

میں بہت نالائق' کند ذہن بچی تھی۔ میں کبھی ڈاکٹر نہیں بن سکتی تھی۔ میرے اندر وہ ٹیلنٹ ہی نہیں تھا۔ میں بہت کم عقل ہوں ابی جان میں۔''

میرے سارے کمپلکس عود کر آئے تھے' اور میری آواز بھرا گئی اور آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں حالانکہ میں رونا نہیں چاہتی تھی۔

''اور یہ اس صدی کا سب سے بڑا لطیفہ ہے ابی جان کہ بورڈ میں ٹاپ کرنے والی نالائق اور کند ذہن ہے۔''

سلجوق جانے کب ابی جان کو ڈھونڈتے ہوئے یہاں آگئے تھے۔

''وہ۔ وہ تو ابا نے میرے ساتھ اتنی محنت کی تھی' ورنہ میں حقیقتاً بہت نالائق ہوں۔'' میں نے آنسو پونچھتے ہوئے ان کی طرف دیکھا۔

''میں کلاس تھری میں Detained ہوگئی تھی' اس لیے مجھے سینٹ جوزف سے نکال دیا گیا تھا۔''

''اچھا۔'' سلجوق کی آنکھوں میں شرارت تھی۔

''یہ تو اتنی اہم خبر تھی' کمال ہے آپ نے اب تک اس سے مطلع کیوں نہیں کیا۔''

''سلجوق!'' ابی جان نے اسے گھورا'' میری بیٹی کو تنگ نہیں کرو۔''

''اوکے ابی جان!'' سلجوق ایک دم سنجیدہ ہوگئے۔ ''میں آپ سے ملنے آیا تھا' جارہا

ہوں۔"

"اچھا۔" ابی جان نے انہیں گلے لگالیا۔ "خدا حافظ بیٹا! وہاں جا کر فون ضرور کر دینا۔"

"جی بہتر۔ خدا حافظ اقصیٰ۔"

انہوں نے ایک گہری نظر مجھ پر ڈالی' وہی اندر تک اترتی ہوئی نظر۔

"اپنا خیال رکھیے گا۔"

"بیٹا تم اس طرح کیوں سوچتی ہو، ایسا کیوں کہتی ہو۔"

سلجوق کے جانے کے بعد ابی جان میری طرف متوجہ ہو گئے۔

"تم بہت ذہین ہو، بہت سمجھ دار ہو۔ یہ تو رجحان کی بات ہے ناں تمہارا رجحان میڈیکل کی طرف نہیں ہے۔ غلطی تو ہماری ہے نا کہ ہم نے سوچ لیا تھا' کہ تم ڈاکٹر بنو گی اور پتا ہے بیٹا! عارف کو بھی شعر و شاعری اور ادب سے بہت لگاؤ تھا، یہ جو میری اسٹڈی میں شاعری سے متعلق کتابیں ہیں ناں یہ سب عارف کی چوائس ہیں۔"

ابی جان مجھے بہلا رہے تھے' لیکن میرے اندر پچھتاوے اتر آئے تھے، کاش میں وقت کو پیچھے لے جا سکتی' میں نے کتنے سارے لوگوں کی امیدوں کو توڑا تھا۔ کاش میں تھوڑی سی اور ذہین ہوتی۔ کاش میں ڈاکٹر بن سکتی تو آج ابی جان کو کتنا فخر ہوتا مجھ پر اور ماما کی روح بھی خوش ہوتی۔

"ابی جان! کیا میں اب ڈاکٹر نہیں بن سکتی۔"

"فضول باتیں مت سوچا کرو۔"

انہوں نے پیار سے میرے گال تھپتھپائے۔

"بہت سی باتیں اس طرح نہیں ہو پاتیں' جیسی ہم نے سوچ رکھی ہوتی ہیں۔ تمہارے پاپا نے جو کچھ سوچا تھا، اس طرح نہیں ہو سکا۔ حالانکہ ماں جی نے تو بہت سوچ سمجھ کر فاطمہ کا انتخاب کیا تھا۔ ایلا کی ماں نہیں تھی' اور ماں جی نے اسے ماں بن کر ہی پالا تھا۔ وہ اسے بھی تنہا نہیں دیکھ سکتی تھیں اور پھر رافعہ کی مثال سامنے تھی' جس طرح اس نے عارف کو محبت سے پرورش کیا تھا۔ خیال تھا' کہ فاطمہ بھی اسی طرح تمہاری پرورش کرے گی اور ہم مطمئن تھے۔ بیٹا تمہیں ہر ہر پل یاد کرنے کے باوجود خوش تھے' کہ تم اپنے باپ کے پاس ہو۔ ہر طرح کے احساس محرومی سے دور پرورش پا رہی ہو۔ جس روز تمہیں ٹی وی پر دیکھا تھا۔ اس روز تو میرا جی چاہتا تھا' کہ اڑ کر تمہارے پاس پہنچوں اور تمہاری خوشی میں شریک ہو جاؤں۔ اس روز ہم سب نے یہاں گھر میں تمہاری کامیابی کی خوشی منائی تھی۔ اتنے دنوں سے سنبھالا ہوا دل تمہیں دیکھنے کو بے چین ہو گیا تھا'

اور تب میں نے مکرم سے کہا تھا' کہ وہ عارف سے رابطہ کرے۔ اور پھر نہ صرف یہ کہ عارف سے مکرم نے رابطہ کیا بلکہ وہ ان سے ملنے بھی گئے۔"

"لیکن مکرم ماموں! مجھ سے تو نہیں ملے تھے۔" میں نے ابی جان کی طرف دیکھا۔

"ہاں تم سے نہیں ملے تھے۔ بس آفس میں ہی عارف سے مل آئے تھے۔ پتا نہیں عارف سے مکرم کی کیا بات ہوئی تھی' لیکن یہ ہوا کہ اب اکثر مکرم اور عارف کی بات چیت ہوتی رہتی تھی۔ اور مکرم سے ہی مجھے پتا چلا تھا' کہ فاطمہ رافعہ آپا جیسی نہیں بن سکی تھیں۔ شاید ان کا رویہ تمہارے ساتھ۔"

"نہیں، نہیں۔" میں نے ایک دم ابی جان کی بات کاٹ دی۔

"اماں تو بہت اچھی ہیں۔ انہوں نے کبھی مجھ میں اور سعیعہ میں فرق نہیں کیا۔"

بے اختیار میرے لبوں سے نکلا۔ میں نہیں چاہتی تھی' کہ اماں کا امیج خراب ہو۔ شاید میرے دل کو یہ یقین تھا' کہ ایک روز مجھے واپس جانا ہے پھر خوامخواہ ماں کی برائی کرنے سے فائدہ۔

❋ ❋ ❋

مگر آنے والے دنوں نے یہ ثابت کر دیا تھا' کہ میرا یقین غلط تھا۔ کتنے بہت سارے دن گزر گئے تھے' نہ سعیعہ نے فون کیا تھا' نہ روحیل نے۔ میں نے دو تین بار فون کیا تو دو بار اماں نے اٹینڈ کیا اور ایک بار کرامت نے بتایا کہ سعیعہ بی بی ہاسپٹل گئی ہیں اور روحیل گھر پر نہیں ہے۔ سعیعہ تو ہمیشہ ہی بہت مصروف رہتی تھی پڑھائی میں اور اب ہاسپٹل میں مصروف ہو گئی۔ لیکن روحیل۔ روحیل نے بھی مجھے فون نہیں کیا تھا۔ شاید وہ مجھے بھول گئے تھے۔

پھر بھی جب ایک ویک اینڈ پر سلجوق آئے تو انہوں نے بتایا کہ وہ کسی کام سے لاہور جا رہے ہیں تو ابی جان نے ان سے کہا کہ وہ مجھے بھی ساتھ لے جائیں اور سعیعہ اور روحیل سے ملوا لائیں لیکن میں نے منع کر دیا۔ جب انہیں میری پروا نہیں تھی' تو میں، میں کیوں پروا کرتی۔

"کیا مجھ پر اعتبار نہیں ہے۔ اقصیٰ!" سلجوق کو میرے انکار سے افسوس ہوا تھا۔ اور وہ ابی جان سے میرے نہ جانے کا سن کر میرے کمرے میں ہی چلے آئے تھے۔

"نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔" میں پریشان سی ہو گئی۔ "میں تو بس یونہی جانا چاہ رہی تھی، وہ کل ہی تو سعیعہ سے بات ہوئی تھی۔ ان کا ملتان جانے کا پروگرام تھا۔"

میں نے جھوٹ بولا۔

"میں سمجھا شاید میرے ساتھ اکیلے جانا مناسب نہیں سمجھا آپ نے۔" وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائے۔

"اندر آنے کو نہیں کہیں گی۔" وہ ابھی تک دروازے کے بیچوں بیچ کھڑے تھے۔

"جی آئیے پلیز۔"

"تھینک یو۔" اندر آ کر انہوں نے کمرے کو تنقیدی نظروں سے دیکھا۔

"کمرہ تو بہت خوبصورت سیٹ کیا ہے آپ نے۔"

"نہیں تو میں نے تو نہیں، وہ تو ماما نے سیٹ کیا تھا' میرے آنے سے پہلے۔ میں اتنی سلیقہ مند نہیں ہوں۔"

"آپ نے اپنے بارے میں کوئی اچھی رائے بھی رکھی ہے۔" وہ بیٹھ گئے میں خاموش رہی۔ اب سلجوق کو بھلا کیا پتا کہ یہ محض رائے نہیں ہے بلکہ حقیقت ہے کہ میں ذرا بھی سگھڑ نہیں ہوں۔

"بہرحال آپ اپنے متعلق جیسی بھی رائے رکھتی ہوں، میری رائے آپ کے متعلق بہت اچھی ہے۔"

میں نے یکدم نظریں اٹھائیں اور مجھے محسوس ہوا جیسے ان کی آنکھوں میں کوندا سا لپکا ہو۔ لبوں پر شریری مسکراہٹ تھی۔ یہاں تو سب ہی میرے متعلق اچھی رائے رکھتے تھے' کسی کو کیا پتا تھا' کہ میں کس قدر احمق اور بے وقوف لڑکی ہوں اور اگر کسی کو پتا چل جائے کہ مجھ سے کتنی بڑی حماقت سرزد ہو چکی ہے تو۔"

مجھے یکدم دانش کا خیال آ گیا، دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔

"اقصیٰ!" سلجوق نے میری طرف دیکھا تو میں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

"کیا بات ہے، آپ بیٹھے بیٹھے کھو جاتی ہیں۔ پریشان ہو جاتی ہیں، میں جانتا ہوں کہ یہ بہت بڑا دکھ ہے کہ انکل عارف کے بعد آپ کو اتنا اچانک اور اس طرح گھر چھوڑنا پڑ گیا۔ ہم سب آپ کے اپنے ہیں۔ آپ کو شاید اندازہ نہیں ہے کہ ابی جان آپ سے کتنی محبت کرتے ہیں اور پھر پیا جی ہیں۔ جنہوں نے ہمیشہ آپ کو اپنی بیٹی سمجھا۔"

مجھے اندازہ تھا، میں نے چند دنوں میں ہی جان لیا تھا' کہ یہاں سب کے پاس میرے لیے کتنی بے تحاشا محبتیں تھیں اور کاش یہ ساری محبتیں مجھے وقت پر مل جاتیں۔ تو شاید وہ سارے نقصان نہ ہوتے' جو ہوئے تھے۔ وہ کمیاں کمزوریاں' جو میری شخصیت میں پیدا ہو گئی تھیں نہ

ہوتیں۔

"یوں بھی آپ نے ایک نہ ایک دن تو یہاں آنا ہی تھا۔" ان کے ہونٹوں پر ایک دلکش سی مسکراہٹ آ کر ٹھہر گئی تھی۔

میں نے ذرا کی ذرا نگاہیں اٹھا کر سلجوق کی طرف دیکھا اور پھر فوراً ہی نگاہیں جھکا لیں۔ وہ بہت گہری نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔

"پلیز اقصیٰ زندگی کی حقیقت کتنی بھی تلخ ہوں۔ انہیں قبول کرنا پڑتا ہے اور آپ، آپ ایسا کیوں نہیں کرتیں، سی ایس ایس کی تیاری شروع کر دیں پھر سے۔ مکرم چچا نے بتایا تھا' کہ آپ سی ایس ایس کی تیاری کر رہی تھیں۔"

"ابا کی خواہش تھی' کہ میں سی ایس ایس کروں دراصل ابا اماں پر ثابت کرنا چاہتے تھے' کہ میں نالائق نہیں ہوں۔"

میری زبان سے بے اختیار نکل گیا۔

"یہ تو حقیقت ہے اسے ثابت کرنے کی ضرورت نہیں ہے لیکن میرا خیال ہے کہ آپ انکل کی خواہش ضرور پوری کریں۔ ان کی روح خوش ہو گی۔"

"جی لیکن ابا خود تیاری کروا رہے تھے مجھے۔"

"میں آپ کی ہیلپ کروں گا تیاری میں لاہور سے واپس آ کر، پورے ایک ماہ کی چھٹی لی ہے میں نے۔"

سلجوق کے لہجے میں نرمی تھی۔ میں نے متشکر نظروں سے انہیں دیکھا' تب ہی ثمینہ ممانی نے دروازے سے اندر جھانکا۔

"سلی! تم یہاں بیٹھے ہو اور ادھر تمہاری خالہ جان اور فزا کب سے آئی بیٹھی ہیں۔"

سلجوق کھڑے ہو گئے۔ "جی ماما! بس آتا ہوں۔ ابی جان سے ملنے آیا تھا' اور اقصیٰ کے پاس بیٹھ گیا۔ خالہ جان کب آئی ہیں۔"

"ابھی کچھ دیر پہلے ممانی نے ایک گہری نظر مجھ پر ڈالی اور بنا کچھ کہے واپس مڑ گئیں۔ پتا نہیں کیوں مجھے محسوس ہوا' جیسے ممانی جان کو سلجوق کا یہاں بیٹھ کر مجھ سے بات کرنا اچھا نہیں لگا۔

* * *

لاہور سے واپس آنے کے دوسرے ہی دن وہ کچھ سوال و جواب کی کتابیں لے کر آ گئے۔

میں اس وقت ابی جان کے پاس بیٹھی کئی بار پہلے کی دیکھی ہوئی ان کی البم میں ماما کی تصویریں

دیکھ رہی تھی۔ ان ساری تصویروں میں ماما کتنی پیاری، کتنی خوبصورت اور دلکش لگ رہی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں اعتماد اور یقین کی روشنی تھی۔ کیا ماما کو اپنی رنگت کا کوئی کمپلیکس نہ تھا۔ ان کی تصاویر دیکھتے ہوئے میرے ذہن میں آیا تھا، دو دن قبل ہی تو بینا مامی نے میرے پوچھنے پر مجھے بتایا تھا' کہ ماما کا رنگ بہت گوارا نہیں تھا' بلکہ مکرم ماموں کی طرح تھا۔ تب ہی سلجوق نے کتابیں میری طرف بڑھا دیں۔

"لیجیے یہ رہیں آپ کی بکس اور بندہ بھی، حسب وعدہ حاضر ہو گیا ہے۔"

ابی جان سے مل کر سلجوق میری طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ ابی جان نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا تو سلجوق نے انہیں بتایا کہ وہ مجھے سی ایس ایس کی تیاری میں مدد دیں گے کیونکہ وہ آج کل چھٹی پر ہیں۔ دراصل وہ احتجاجاً چھٹی لے کر آ گئے تھے' کہ اپنے آفیسر سے ان کا کچھ اختلاف ہو گیا تھا۔ ماما نے مجھے بتایا تھا۔

ابی جان نے بہت خوشی کا اظہار کیا۔

"یہ تو بہت اچھا سوچا تم نے بیٹا' یوں بھی اقصیٰ کے پاس کوئی مصروفیت نہیں تھی۔ ماما اپنی پڑھائی میں مصروف رہتی ہیں۔ اور بینا بھی ہاسپٹل چلی جاتی ہے اب۔"

"آپ کو پتا ہے ابی جان! ہم ہمیشہ اچھا ہی سوچتے ہیں۔"

سلجوق ابی جان کے پاس بیٹھ گئے۔ ابی جان مسکرا دیے۔

ماما نے مجھے بتایا تھا' کہ سلجوق ابی جان کے بہت لاڈلے ہیں۔ خود سلجوق بھی ابی جان سے بہت اٹیچڈ ہیں اور میں دیکھ رہی تھی' کہ سلجوق کو دیکھتے ہی ابی جان کے چہرے پر رونق اتر آئی تھی۔ میں نے البم بند کر دی اور ابی جان کی طرف دیکھا۔

"ابی جان! چائے کے لیے آپ نے کہا تھا' کہ کچھ دیر بعد پئیں گے تو اب بنوا لوں۔"

"ہاں۔ کیوں بیٹا چائے چلے گی؟"

"ضرور، لیکن شرط یہ ہے کہ اقصیٰ کے ہاتھ کی بنی ہو۔"

سلجوق نے مسکرا کر مجھے دیکھا تو میں ایک دم گھبرا گئی اور بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا۔

"اگر اچھی نہ بنی تو؟"

اماں کا خیال تھا' کہ میں کبھی کوئی کام ڈھنگ سے نہیں کر پاؤں گی۔ میرا احساس کمتری یکدم عود کر آیا تھا۔ مجھے لگا تھا' جیسے میں چائے بناؤں گی تو ضرور کچھ گڑبڑ ہو جائے گی۔

کچن میں ماما کو دیکھ کر میں یکدم خوش ہو گئی۔ وہ اپنے لیے چائے بنانے ہی آئی تھی' میں اسے ابی جان اور سلجوق کے لیے بھی چائے بنانے کا کہہ کر اپنے کمرے میں چلی آئی، اگلے روز شام کے وقت سلجوق آئے تو ناراضی کا اظہار کیا۔

"سوری۔ دراصل میں اچھی چائے نہیں بنا سکتی۔"

"خدا کے لیے اقصیٰ! اپنے متعلق سارے فیصلے خود مت کریں۔ کیوں خود کو ڈی گریڈ کرتی ہیں آپ، چلیں آج آپ چائے بنائیے۔ میں فیصلہ کروں گا کہ آپ کیسی چائے بناتی ہیں اور اگر اچھی نہ ہوئی تو میں آپ کو سکھاؤں گا چائے بنانا، آپ کو پتا ہونا چاہیے کہ میں بہت اچھی چائے بناتا ہوں۔"

سلجوق کا انداز بہت دوستانہ تھا' اور اس روز سلجوق نے میری بنائی ہوئی چائے کی از حد تعریف کی۔

❋ ❋ ❋

سلجوق گھر پر تھے' سو کئی بار ان سے سامنا ہوتا' کبھی بینا مامی کے گھر کبھی ابی جان کے پاس اور پھر شام کو کچھ دیر کے لیے۔ وہ باقاعدگی سے مجھے سی ایس ایس کی تیاری کے سلسلے میں گائیڈ کرتے، سنان، حماد اور ماما بھی آ جاتے پھر خوب رونق رہتی۔ حماد اور سنان کی دلچسپ باتیں بینا ممانی اور کبھی کبھار عزم ماموں بھی آ جاتے۔ عزم ماموں اور حماد سلجوق بالکل دوستوں کی طرح باتیں کرتے۔

سب ہی کا رویہ یہاں اچھا تھا' کہ میں ہولے ہولے محسوس کرنے لگی تھی' جیسے میں بہت عرصے سے یہاں رہ رہی ہوں۔ یہاں سب ہی بہت مصروف رہتے تھے۔ بینا مامی نے بھی ہاسپٹل جوائن کر لیا تھا۔ میں نے ابی جان سے کہا تھا' کہ میں بھی کچھ کرنا چاہتی ہوں کوئی جاب وغیرہ۔

"ضرور۔" ابی جان نے میری حوصلہ افزائی کی تھی۔ "تمہارا رزلٹ آ جائے اور پھر تم۔ سی ایس ایس کا ایگزام دے لو تو۔"

اور میں نے سلجوق سے بھی کہا تھا' کہ مجھے جاب کرنا ہے۔

"کیوں؟"

"مصروف رہنے کے لیے۔"

"کوئی اور مصروفیت تلاش کر لیں، جاب ضروری ہے کیا؟" ان کی آنکھوں میں شرارت

تھی۔

"بھلا اور کیا مصروفیت ہو سکتی ہے۔ مجھے تو سوائے مطالعہ کے اور کوئی شوق نہیں ہے۔"

"وہ شوق تو آپ کا پورا ہو رہا ہے۔ ابی جان کی لائبریری ختم ہو جائے تو میری لائبریری حاضر ہے۔ اس کے علاوہ بھی تو مصروفیات ہو سکتی ہیں۔"

وہ بدستور میری آنکھوں میں دیکھ رہے تھے۔ میں اسی وقت بینا مامی کی طرف آئی ہوئی تھی۔ اور بینا مامی کچن میں تھیں اور میں لاؤنج میں ان کے انتظار میں بیٹھی اخبار دیکھ رہی تھی' کہ سلجوق آ گئے تھے۔ ان کے ہونٹوں پر شریری مسکراہٹ تھی۔

"مثلاً شادی کر لیں۔ بلکہ اب آپ کی شادی ہی ہونا چاہیے پہلے۔"

"شادی۔" میں نے حیرانی سے سلجوق کی طرف دیکھا۔

"کمال لڑکی ہیں آپ، لڑکیاں تو شادی کے نام پر شرما جاتی ہیں، رخساروں پر رنگ بکھر جاتے ہیں اور آپ یوں دیکھ رہی ہیں مجھے' جیسے میں نے شادی کا ذکر نہ کیا ہو بلکہ کسی جن بھوت کا نام لیا ہو۔"

میں نے نگاہیں جھکا لیں۔ شادی کے متعلق تو میں نے کبھی سوچا ہی نہ تھا' کہ مجھے بھی شادی بھی کرنا ہوگی، اور پھر بھلا مجھ سے کون شادی کرے گا۔ پھر سے بہت سارے کمپلیکسز میرے اندر بیدار ہو گئے تھے۔ بچپن میں کتنی بار اماں نے کہا تھا۔

"اتنی گہری رنگت بھلا کون شادی کرے گا اس سے؟" اور وہ دانش کتنی بار اس نے کہا تھا۔

"اقصیٰ ہم دونوں صرف ایک دوسرے کے لیے بنائے گئے ہیں، میں تو پاگل ہو گیا ہوں ہر لمحہ دعا کرتا ہوں کہ تمہیں اپنی دلہن کے روپ میں دیکھوں۔"

اور وہ سب جھوٹ تھا، فریب، دھوکا۔ میرے اندر برسات ہونے لگی۔ میں نے یکدم ہونٹ بھینچ لیے اور سر جھکا لیا۔

"اقصیٰ!" سلجوق پریشان ہو گئے۔ "کیا میرا مذاق برا لگ گیا۔"

میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"نہیں، آپ کو ضرور میری بات سے تکلیف ہوئی ہے حالانکہ ایسی کوئی بات میں نے نہیں کی جس سے آپ کو تکلیف ہو، پھر بھی اگر برا لگا ہے تو سوری میں تو اقصیٰ آپ۔ آپ سے بہت شدید محبت کرنے لگا ہوں، مجھے تو پتا ہی نہیں چلا کہ کب کیسے اس ایک ماہ میں آپ میرے اندر سرایت کر گئی ہیں۔ میرے وجود میں اتر گئی ہیں، میں اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، جلوت و خلوت

میں آپ کو سوچنے لگا ہوں۔"

"محبت۔" میرے دل میں کسی نے سوئی سی چبھو دی۔ دانش نے بھی تو مجھ سے محبت کی تھی' مگر مجھے محبت پر اعتبار تھا' نہ یقین۔ سلجوق مسلسل بول رہے تھے' دھیمے دھیمے جذبوں سے لبریز لہجہ رگ و پے میں اترتا ہوا سا۔ دانش کا لہجہ بھی یوں ہی ہوتا تھا' پور پور جذبوں کی برسات میں بھیگا ہوا۔

میں ایک دم اٹھی اور تقریباً بھاگتی ہوئی وہاں سے نکلتی چلی گئی۔

❋❋❋

سلجوق کی چھٹیاں ختم ہو چکی تھیں لیکن چھٹی ختم ہوتے ہی اس کا ٹرانسفر راولپنڈی ہو گیا تھا۔ عزم ماموں نے ان کی ٹرانسفر کی خوشی میں عثمانیہ میں سب کو ڈنر دیا تھا۔ یہاں سب چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو یوں ہی سیلیبریٹ کر کے اپنے اندر خوشیوں کے پودے لگاتے رہتے تھے۔

میرا رزلٹ آیا تو روحیل نے فون کیا۔

"بجو! مبارک ہو آپ اپنے ڈیپارٹمنٹ میں دوسرے نمبر پر ہیں۔ ان حالات میں جب ابا بیمار تھے، پیپر دینا اور پھر سیکنڈ پوزیشن لینا بڑی بات ہے۔"

اتنے دنوں بعد اس کی آواز سن کر میرے اندر پانی اکٹھا ہونے لگا تھا، میں اس سے یہ بھی نہ پوچھ سکی کہ اتنے دن اس نے فون کیوں نہیں کیا۔"

"اماں اور سعیعہ کیسے ہیں؟"

"سب اچھے ہیں بجو! میں بہت جلد آؤں گا آپ سے ملنے۔"

اور پھر کتنے ہی دن گزر گئے نہ روحیل آیا اور نہ ہی سعیعہ نے فون کیا۔ پتا نہیں کیوں مجھے یقین تھا' کہ اگر اب تک سعیعہ نے فون نہیں کیا تو اب ضرور فون کر کے مبارکباد دے گی۔ اسے تو ان چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال رہتا تھا' پھر پتا نہیں کیوں اس نے فون نہیں کیا تھا۔ میرے اندر اداسی جیسے ڈیرے ڈال کر بیٹھ گئی تھی۔

یہاں سب نے ہی مجھے گفٹ دیے تھے۔ ابی جان نے سب کی دعوت کی تھی، ماما نے اپنی بہت ساری سہیلیوں سے مجھے متعارف کروایا تھا۔ اور سب نے ہی مجھے سراہا تھا۔ اس روز میں نے ماما کا لایا ہوا سوٹ پہنا تھا۔ اور ماما نے زبردستی میرا ہلکا ہلکا میک اپ بھی کر دیا تھا۔ بینا مامی نے تو مجھے یکدم گلے لگا کر پیار کیا۔

"آج تو تم بالکل ایلا کی طرح لگ رہی ہو۔ اور کس قدر پیاری۔"

ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

"نہیں بری بات بیٹا، آج خوشی کا دن ہے، ہماری بیٹی کی کامیابی کی خوشی ہے' آج کے دن کوئی آنسو نہیں۔"

کرم ماموں بھی اچانک ہی وہاں آ گئے تھے' اور بینا مامی نے فوراً ہی آنسو پونچھ ڈالے۔

سلجوق کی نظریں بار بار میری طرف اٹھتیں اور میں بے چین سی ہو جاتی۔ آخر سلجوق کیوں نہیں سمجھتے کہ میرے نزدیک یہ سارے جذبے اپنے معنی کھو چکے ہیں۔ سب خوش تھے' میں بھی خوش ہونا چاہتی تھی' لیکن اندر سے خوش نہیں ہو پا رہی تھی۔

میں ایک دم اچانک کتنی تہی داماں ہو گئی تھی' اور اچانک ہی کتنا کچھ میری جھولی میں آ پڑا تھا۔ کیا کھویا اور کیا پایا تھا۔ میرا دل بے طرح اداس تھا۔ سب کے جانے کے بعد میں بہت دیر تک یونہی لان میں اکیلی بیٹھی سوچتی رہی، کیا تھا' کہ یہ سب محبتیں مجھے بھی مل جاتیں اور ابا تک روحیل اور سعدیہ کی محبتیں بھی نہ کھوتیں، تب اچانک ہی سلجوق میرے پاس آ کر بیٹھ گئے۔

"اقصیٰ! یہ آپ اکیلی یہاں کیوں بیٹھی ہیں اور یہ ماہا کدھر ہے۔"

"ماہا اپنے کمرے میں ہے، آج کے فنکشن کی وجہ سے اس کا بہت وقت ضائع ہوا ہے۔ پڑھ رہی ہے۔"

اقصیٰ! آج آپ بہت پیاری لگ رہی ہیں۔ میں نے تو نظر اٹھا کر آپ کو دیکھا بھی نہیں کہ کہیں آپ کو میری نظر نہ لگ جائے۔"

میں خاموش بیٹھی رہی، میرے دل میں لیکن کوئی ارتعاش پیدا نہیں ہوا۔ یہی بات جب پہلی بار دانش نے کہی تھی' تو میرے دل میں دھڑکنوں نے اودھم مچا دیا تھا' پورا وجود تپ اٹھا تھا۔

"اقصیٰ! پتا نہیں آپ اتنی برف کیوں ہیں آپ پر میرے جذبوں کا اثر کیوں نہیں ہوتا۔ شاید آپ کی فلاسفی صحیح ہو۔ بلکہ صحیح ہے، آپ صحیح کہتی ہیں کہ محبت آج کل جسٹ فار انجوائے منٹ کی جاتی ہے۔ لیکن اقصیٰ میں آپ کو۔ آپ کو کس طرح سمجھاؤں کہ میرے اندر جو جذبہ پیدا ہوا ہے وہ بالکل مختلف ہے۔ منفرد ہے مشام جاں کو معطر کرتا ہوا روح کو مہکاتا ہوا شاید آپ کو معلوم نہیں اقصیٰ کہ انکل نے کرم چچا سے آپ کے اور میرے متعلق بات کی تھی' بلکہ یہ بات تو آپ کی پیدائش کے وقت ہی طے پا گئی تھی۔ پاپا نے ایلا آنٹی سے کہا تھا' کہ اقصیٰ میری بہو ہے۔ مگر ایلا آنٹی نہ رہیں، عارف انکل آپ کو ساتھ لے گئے لیکن ابی جان مجھے اکثر یاد دلاتے رہتے تھے' کہ مجھے اپنے آپ کو آپ کے لیے بچا کر رکھنا ہے سو۔"

"تو یہ بات تھی۔"

میں نے سوچا۔ وہ ہاسپٹل میں ابا کی گفتگو، کرم ماموں کا انتظار ابی جان اور سلجوق کو ساتھ لانے کی خواہش اور پھر ابی جان اور سب کا کبھی کبھی یہ کہنا کہ تمہیں یہیں تو آنا تھا۔ تو یہ شخص سلجوق، میں نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں جیسے ستارے دمک رہے تھے' اور ہونٹوں پر بکھری مسکراہٹ میں خلوص کی لپک تھی۔

یہ اس قدر شاندار شخص، بھلا میں اس کے قابل ہوں۔ میں اقصیٰ عارف' جو انتہائی بے ترتیب اور بے ڈھنگی لڑکی ہوں اور جس نے سترہ سال کی عمر میں ہی محبت وجدائی کی ساری اذیتیں لی ہیں۔ جس کا دل خائن ہے۔ بھلا اس مخلص اور سادہ دل شخص کے قابل ہے۔

"آئی ایم سوری اقصیٰ! میں شاید غلط ہوں اور بے صبرا ہوں۔ مجھے اپنی محبتوں کا اظہار ابھی نہیں کرنا چاہیے تھا۔ ابھی مجھے اس کا Right (حق) نہیں تھا۔

مجھے آپ پر فخر ہے میں آپ کی سوچوں اور احساسات کو اپریشیٹ کرتا ہوں۔ لیکن اقصیٰ ایک بات بتا دیں، اس میں تو کوئی حرج نہیں ہے۔ ابی جان چاہ رہے ہیں کہ میری اور تمہاری منگنی کر دی جائے اور پھر ماہا کے ایگزام کے بعد شادی، تب تک عباد بھی اپنی تعلیم مکمل کر کے آ جائے گا۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہے، بخدا اقصیٰ! تمہاری پسند، تمہاری آرزو مجھے اپنی خواہشوں سے بڑھ کر ہے۔"

سلجوق بات کرتے کرتے تم پر اتر آئے تھے۔ میں سر جھکائے بیٹھی تھی' میں کیا کہتی۔ یہ ابی جان کی خواہش تھی۔ ابا کی مرضی تھی' شاید ابا نے اس لیے مجھے یہاں چلے آنے کو کہا تھا' لیکن میرا دل تو مر چکا تھا۔ میں اس اتنے اچھے، اتنے شاندار شخص کو کیا دے سکتی تھی۔

"پلیز اقصیٰ! آپ کے دل میں جو کچھ بھی ہے، کہہ دیں بخدا اگر آپ کا جواب نفی میں بھی ہوا تو بھی آپ ہم سب کو اتنی ہی عزیز رہیں گی۔"

مجھے اس شخص کو دھوکے میں نہیں رکھنا چاہیے، میں نے اس لمحے سوچا تھا' لیکن وہ آنکھیں جن میں، میں نے محبت و خلوص دیکھا تھا' ان آنکھوں میں نفرت، حقارت، غصہ کیا میں برداشت کر سکوں گی۔

میری ذات میں کوئی خوبی نہیں ہے، آپ کو شاید غلط فہمی ہو گئی ہے۔ سلجوق! میں بہت تھکی ہوں۔ مجھے زندگی کرنے کا ڈھنگ نہیں آتا میں آپ کو خوش نہیں رکھ سکوں گی۔"

"زندگی کرنے کا ڈھنگ ہم آپ کو سکھا دیں گے جناب اور رہی ہمارے خوش رہنے کی

بات تو جناب صرف آپ کے ساتھ کے احساس سے ہی ہم خوشی سے لہرا لیا کریں گے۔"

سلجوق یکدم شوخ ہو گئے تھے اور ان کی آنکھیں جذبے لٹانے لگی تھیں۔ میں یکدم اٹھ کھڑی ہوئی۔

"تھینک یو اقصیٰ۔" سلجوق بھی کھڑے ہو گئے۔

"خدا حافظ شب بخیر۔ اور سنیے آج رات مجھے سوچیے گا۔"

وہ گہری اور شوخ نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے ابی جان کے کمرے کی طرف چلے گئے۔
اور میں بہت دیر تک اپنے بیڈ پر بیٹھی سوچتی رہی۔ اپنے متعلق، سلجوق کے متعلق اور دانش کے متعلق۔

قسمت نے اپنی جھولی میں میرے لیے ہیرا چھپا رکھا تھا' اور میں اپنی کم فہمی میں کنکروں کی طرف لپک رہی تھی۔ میں خود کو بالکل بھی سلجوق کے قابل نہیں سمجھتی تھی' لیکن جب ابی جان نے مجھ سے سلجوق کے متعلق رائے پوچھی تو میں کچھ بھی نہ کہہ سکی اور پتا نہیں کہاں سے آنسو امڈ امڈ کر پلکیں بھگوتے چلے گئے، ابی جان نے بے اختیار مجھے گلے سے لگا لیا۔

"میری بچی۔ میری ایلا کی نشانی۔"

اور میں ابی جان سے کچھ نہ کہہ سکی اور ابی جان نے اسی شام جب مکرم ماموں، بینا مامی، عزم ماموں، ارقم ماموں سب ہی اکٹھے ہوئے میری اور سلجوق کی منگنی کا اعلان کر دیا۔

ماہا نے بے اختیار مجھے گلے سے لگا لیا۔

"میری خواہش ہے کہ اس سلسلے میں ایک چھوٹی سی تقریب ہو جائے اس طرح سب کو معلوم ہو جائے گا۔" ابی جان نے مکرم ماموں کی طرف دیکھا۔

"آپ کا کیا خیال ہے بیٹا؟"

"جی ابی جان! آپ صحیح کہہ رہے ہیں۔ ارقم بھائی اور بھابی کا جو خیال ہو۔"

میں انہیں باتیں کرتا چھوڑ کر باہر آ گئی۔ سنان اور ماہا اور کچھ دیر بعد حماد بھی میرے پیچھے ہی آ گئے۔

❋ ❋ ❋

اس روز میں بینا مامی کی طرف گئی تھی' کہ ڈرائنگ روم سے آتی اونچی اونچی آوازیں سن کر میں لاؤنج ہی میں ٹھٹھک کر رک گئی۔ نہ جانے کون ہے میں نے سوچا اور واپسی کے لیے پلٹی تب ہی سلجوق کی آواز سنائی دی۔

"ماما! آپ سمجھتی کیوں نہیں ہیں، یہ میری اپنی آرزو ہے میری اپنی خواہش ہے۔ میں خود کو ابی جان کی آواز پر قربان نہیں کر رہا ہوں۔"

"لیکن سلجوق! تم نے خود کہا تھا' کہ اگر ابی جان نے تمہیں مجبور کیا تو تم انکار کر دو گے۔" یہ ثمینہ مامی کی آرزو تھی۔

"ہاں کہا تھا، لیکن انہوں نے مجھے قطعی مجبور نہیں کیا۔ میں نے کہا تھا' کہ اگر اقصیٰ مجھے اچھی نہ لگی تو میں انکار کر دوں گا۔ ملا نہیں تھا۔ کچھ نہیں جانتا تھا' اس کے متعلق، اس کی نیچر اس کا مزاج، اس کی پسند ناپسند۔"

"اور اب اتنے سارے دنوں میں تم نے اسے جان لیا۔" ثمینہ مامی کی آواز میں طنز تھا۔

"ہاں، اقصیٰ بہت اچھی ہے۔ وہ بالکل ایسی ہی ہے' جیسی شریک زندگی کی خواہش میں نے کی تھی۔ پلیز ماما! اب کوئی مسئلہ مت کھڑا کریں۔"

"بھابی! یہ تو بہت بچپن سے طے تھا۔ ارقم بھائی نے خود ایلا سے کہا تھا۔" بینا مامی کا لہجہ سمجھانے والا تھا۔

"ہاں لیکن ایلا نے تب کہا تھا' کہ بچپن میں ایسے فیصلے کرنا دانش مندی نہیں ہے۔"

"ہاں مگر اب تو بچپن نہیں ہے ماما اور میں نے بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے اور میں اپنے فیصلے سے نہیں ہٹ سکتا۔" سلجوق کا لہجہ مضبوط اور صداقت سے پُر تھا۔

"اور افزا۔ افزا۔ اور تمہاری خالہ جان سے کیا کہوں میں۔"

"میں نے کبھی افزا کی اس سلسلے میں حوصلہ افزائی نہیں کی۔ اگر آپ نے کچھ کہا ہے تو آپ ہی بھگتیں۔"

تو یہ بات تھی' تب ہی ثمینہ ممانی مجھ سے زیادہ بات نہیں کرتی تھیں۔ عجیب نظروں سے دیکھتی تھیں۔ کبھی کبھی ان کی نظریں مجھے اماں کی نظروں کی طرح لگتی تھیں سپاٹ اور سرد نگاہیں۔

"نہیں۔" میں نے جیسے اپنے آپ سے کہا "میں منع کر دوں گی ابی جان کو، سلجوق کو۔ میں نے ساری عمر یہ سرد اور سپاٹ نگاہیں دیکھی ہیں' اب نہیں اور پھر مجھے کیا حق ہے کہ میں ممانی جان کے خوابوں کو چھین لوں، افزا ان کی بھانجی ہے، خوبصورت ہے۔"

میں نے سر گھٹنوں پر رکھ لیا تب ہی اپنے پیچھے سے مجھے سلجوق کی آواز سنائی دی۔

"اقصیٰ آپ یہاں کیا کر رہی ہیں؟"

"میں یونہی ادھر آ گئی تھی' بینا ممانی کی طرف اور یہاں بیٹھ گئی مجھے یہاں بیٹھنا اچھا لگتا

ہے۔"

میں نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ فل وردی میں وہ بہت شاندار لگ رہے تھے۔

"آپ کی طبیعت تو اچھی ہے۔"

"ہاں!" میں نے نگاہیں جھکالیں۔

"آپ رو رہی تھیں؟" انہوں نے پھر پوچھا۔

"سلجوق! آپ اپنی ماما کی بات مان لیں اور افزا سے شادی کرلیں۔"

"کیا کہہ رہی ہیں آپ، کیا ماما نے آپ سے کچھ کہا؟"

"نہیں۔" میں نے نفی میں سر ہلادیا۔

"اوہ۔ تو آپ ہماری گفتگو سن کر آرہی ہیں دیکھیں۔ اقصیٰ یہ کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے، افزا مما کی بھانجی ہے، وہ امریکہ میں پیدا ہوئی' وہاں ہی پلی بڑھی ہے۔ دو سال قبل وہ لوگ پاکستان منتقل ہوئے ہیں اور تب ہی سے مما کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ افزا کو اپنی بہو بنالیں۔ مگر میری خواہش اس میں شامل نہیں ہے۔"

"مگر ماما کی خوشی تو اسی میں ہے آپ۔"

"آپ اپنا مشورہ اپنے پاس رکھیں۔" وہ چڑ کر بولے۔

"یہ آپ کا دردِ سر نہیں ہے۔ فی الحال تو میں ایک سرکاری کام سے جارہا ہوں۔ واپس آکر آپ سے تفصیل سے بات کروں گا۔"

سلجوق چلے گئے مگر میں کسی کو ناراض نہیں کرنا چاہتی تھی۔ میں اس گھر میں کسی کی نفرت برداشت نہیں کرسکتی تھی، میں نے ابی جان سے بات کرنے کا فیصلہ کرلیا اور اسی وقت اٹھ کر ابی جان کی طرف آگئی۔ ابی جان نے میری ساری بات سنی اور مجھ سے کہا کہ مجھے اس سلسلے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں خود ارقم سے اور بہو سے بات کروں گا۔

"ابی جان! سلجوق مجھ پر ترس کھا کر شاید۔"

"کوئی تم پر ترس نہیں کھا رہا بیٹا، بھلا تم میں کیا کمی ہے۔ تم تو بیٹا! کسی کی بھی خواہش ہوسکتی ہو۔ یہ تو سلجوق کی خوش قسمتی ہے پھر بھی تمہاری تسلی کے لیے میں سلجوق سے بات کروں گا خود۔ اب بے فکر ہوجاؤ۔"

ابی جان مجھ سے بالکل دوستوں کی طرح بات کرتے تھے، ان کے پاس بیٹھ کر ان سے باتیں کرتے ہوئے مجھے ابا بہت یاد آتے تھے۔ ویسا ہی دوستانہ اور محبت بھرا لہجہ ہوتا تھا' ان کا۔

پتا نہیں ابی جان نے سلجوق سے کیا کہا تھا' ممانی اور ارقم ماموں سے کیا بات ہوئی تھی' مجھے ابی جان نے نہیں بتایا تھا۔ البتہ منگنی کی تقریب کی تاریخ مقرر ہوگئی تھی۔ ممانی خاموش اور اداس سی تھیں اور میں دل میں نادم، لیکن مجھ میں ابی جان اور سب کی خوشیوں کو چھیننے کی ہمت نہ تھی۔ سب ہی خوش تھے۔ سلجوق کسی سرکاری کام کے سلسلے میں بہت مصروف تھے، تاہم انہوں نے مجھ سے گلہ کیا تھا۔

"یہ آپ نے ابی جان سے کیا کہا ہے؟" میں خاموش رہی۔

"میں آپ کو اتنا احمق نہیں سمجھتا تھا' لیکن اب مجھے یقین ہوچلا ہے کہ آپ نے اپنے متعلق جو کچھ بتایا تھا، وہ صحیح تھا۔"

"تو پھر انکار کردیں۔"

"مجبوری ہے۔" ان کی آنکھوں میں شوخی تھی۔ "آپ نے اسیر کرلیا ہے۔ اب رہائی ناممکن ہے۔"

اس روز دیر تک سلجوق میرے پاس بیٹھے مجھے سمجھاتے رہے۔

"آپ بہت انمول ہیں اقصیٰ! اپنے آپ کو ڈی گریڈ نہ کیا کریں اور ماما کی طرف سے بے فکر ہوجائیں۔ کچھ دنوں میں وہ خود ہی ٹھیک ہوجائیں گی۔"

❁ ❁ ❁

ابی جان نے لاہور بھی فون کیا تھا۔ اور روحیل نے وعدہ کیا تھا' وہ لوگ منگنی کی تقریب میں آئیں گے۔ میں اس سے بہت ساری باتیں کرنا چاہتی تھی' لیکن وہ جلدی میں تھا۔ اور اس نے فوراً ہی فون رکھ دیا تھا۔

"ان شاء اللہ ملاقات پر بات کروں گا۔"

لیکن وہ، سمیعہ یا اماں کوئی بھی منگنی کی تقریب میں شریک نہیں ہوئے تھے۔

"شاید اماں نے منع کردیا ہو۔ سمیعہ اور روحیل آنا چاہتے ہوں۔"

ماہا میرے کان میں سرگوشیاں کررہی تھی۔ اور میں مسلسل سمیعہ اور روحیل کے متعلق سوچ رہی تھی۔

"یار! ذرا سا مسکراؤ مووی بن رہی ہے۔ اور ذرا اوپر دیکھو۔"

میں نے سر اٹھایا اور میری نگاہیں مووی بناتے حماد کے ساتھ کھڑے لڑکے پر پڑیں تو وہیں ساکت ہوگئیں' دل جیسے ایک لمحے کے لیے ڈوب گیا۔ گھبرا کر میں نے نگاہیں جھکالیں۔

وہ دانش تھا، اور بہت گہری نظروں سے مجھے ہی دیکھ رہا تھا۔

''یہ۔ یہ یہاں کہاں؟''

میرے ہاتھ پسینہ پسینہ ہو گئے تھے۔ اور ذہن و دل جیسے سن سے ہو گئے تھے۔ کب سلجوق نے مجھے انگوٹھی پہنائی۔ میرے اردگرد کیا ہو رہا تھا، مجھے کچھ خبر نہ تھی، میں خالی الذہنی کی سی کیفیت میں بیٹھی تھی۔ خدا جانے سلجوق نے کیا کہا تھا۔ میں نے سنا نہیں، ماہا کیا کہہ رہی تھی، سنان، حماد سب میرے گرد کھڑے ہنسی مذاق کر رہے تھے۔

''چلو میری بچی کو تنگ نہ کرو۔''

بینا مامی میرے قریب آ کر بیٹھ گئی تھیں اور میرے ٹھنڈے یخ ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لے لیا تو میرا ڈوبتا دل جیسے تیرنے لگا۔ مجھے تحفظ کا سا احساس ہوا، میں نے بینا مامی کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔ دانش کی نظریں اب بھی وقفے وقفے سے مجھے اپنے چہرے پر محسوس ہو رہی تھیں۔ پھر سب کھانے کے لیے اٹھے، بینا مامی اٹھنے لگیں تو میں نے ملتجی نظروں سے انہیں دیکھا۔

''میرا دل گھبرا رہا ہے۔ آپ یہیں رہیں میرے پاس۔''

میں نے بمشکل کہا تو وہ اٹھتے اٹھتے بیٹھ گئیں۔ میں نے دیکھا، انہوں نے منہ موڑ کر بے اختیار امڈ آنے والے آنسو کو پونچھا تھا۔ شاید انہیں ماما یاد آ گئی تھیں اور وہ یہی سمجھ رہی تھیں کہ مجھے اس وقت ابا اور ماما کا خیال آ رہا ہے۔ تب ہی ماہا جاتے جاتے پلٹ آئی اس کے ساتھ کوئی لڑکی تھی۔

''یہ عافیہ ہے اقصیٰ! اسے تم سے ملنے کا بہت شوق ہو رہا تھا' ہماری مامی کی خالہ زاد بہن کی بیٹی، ابھی کچھ عرصے پہلے اس کی شادی ہوئی ہے۔ تمہارے شہر میں بیاہ کر گئی تھی' لیکن میاں کو ساتھ لے آئی ہے۔ اکلوتی بیٹی ہے نا۔ سو ہم سب تو یہی کہتے ہیں کہ یہ دانش بھائی کو بیاہ کر گھر لائی ہے۔''

''آپ واقعی بہت پیاری ہیں اقصیٰ! ماہا نے آپ کی صحیح تعریف کی تھی۔'' اس نے خوش دلی سے کہا۔

''اب تو آپ سے ملاقات رہے گی ہی۔ ماہا! ان کو لانا نہ کسی دن گھر۔ یہ قریب ہی ہمارا گھر ہے اسی بلاک میں۔''

وہ مسکراتی ہوئی ماہا کے ساتھ کھانے کے لیے چلی گئی لیکن میرے اندر سے جیسے کسی نے ساری توانائی چھین لی تھی۔

''مامی! میری طبیعت خراب ہو رہی ہے۔'' میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ''میں اپنے کمرے میں چلی جاؤں۔''

''او کے میری جان۔'' بینا مامی میرے ساتھ ہی کمرے میں آئیں۔

''تم چینج کر لو میں کھانا ادھر ہی بھجوا دیتی ہوں۔''

''مجھے بھوک نہیں ہے۔ میں بس سو جاؤں گی۔ تو طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔''

''اچھا، میں دودھ بھجوا دیتی ہوں۔ بیٹا! اس موقع پر ماں باپ یاد آتے ہیں ان کی کمی محسوس ہوتی ہے، مگر انسان بہت بے بس اور بہت مجبور ہے۔''

انہوں نے میری پیشانی چومی۔

''زیادہ سوچنا نہیں اور سو جانا۔'' میں نے سر ہلا دیا لیکن مجھے نیند کیسے آتی۔ دانش کی نظریں، اس کے دیکھنے کا انداز سب مجھے ڈسٹرب کر رہا تھا' اگر اس نے سب کو بتا دیا کہ میں۔ تو یہ ساری محبتیں مجھ سے چھن جائیں گی' شاید سب مجھ سے نفرت کرنے لگیں۔

❋ ❋ ❋

ماہا کالج گئی ہوئی تھی۔ ابی جان اسٹڈی میں کہ غزالہ مامی نے مجھے بتایا کہ میرا فون ہے۔ شاید روحیل کا لیکن دوسری طرف دانش تھا۔

''یہ تم ہو نا اقصیٰ! کیسی ہو میری زندگی، اتنے دنوں بعد تمہیں دیکھا تو یقین کرو دل چاہ رہا تھا' تمہیں دل میں چھپا لوں، مجھے آج تک پتا نہیں چل سکا کہ تم نے اچانک کیوں تعلق توڑ لیا تھا۔ پلیز مجھ سے ملو، ایک بار، تڑپ رہا ہوں تم سے ملنے کے لیے۔'' میں جو اس کی آواز سن کر حیران سی ہو گئی تھی' ایک دم چونک پڑی۔

''میں تم سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔ آئندہ فون مت کرنا۔''

''اچھا۔'' اس کے لہجے میں طنز آ گیا۔

''بڑی شان ہے جناب، خیر ہم تو پرانے عاشق ہیں آپ کے۔ بتایئے کب مل رہی ہیں آپ۔ بلکہ یوں کریں اسی وقت گیٹ پر آ جائیں، میں پک کر لیتا ہوں۔ پھر کہیں چلتے ہیں جی بھر کے باتیں کریں گے۔''

میں نے ریسیور رکھ دیا، لیکن پھر بیل ہونے لگی، گھبرا کر میں نے پھر اٹھا لیا۔

''سنو اقصیٰ! تمہاری ایک تصویر بھی ہے میرے پاس یاد رکھنا۔ تم یقیناً یہ نہیں چاہو گی کہ سلجوق جیسے شخص سے تمہاری منگنی ٹوٹ جائے اور تم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہو۔''

مجھے لگا جیسے میری ٹانگوں سے جان نکل گئی ہے، میں ریسیور کریڈل پر ڈال کر وہیں پڑی چیئر پر بیٹھ گئی۔

کتنی ہی بار اس نے مجھ سے تصویر مانگی تھی۔

"تمہاری تصویر ہوگی' میرے پاس تو جب اداس ہوں گا تو دیکھ لیا کروں گا، جی چاہتا ہے کہ ہر وقت تم میری نگاہوں کے سامنے رہو۔"

اور تب میں نے اپنی تصویر اسے دے دی تھی۔ اور کتنی غلطی ہوئی تھی' مجھ سے جب ابا نے مجھ سے پوچھا تھا' کہ میں نے اسے کوئی تصویر وغیرہ دی ہے تو میں نے انکار کر دیا تھا۔ ابا کو بتا دیتی تو وہ ضرور اس سے میری تصویر لے لیتے۔ اب خدا جانے دانش کیا کرنے والا تھا۔

میں اس وقت کچھ بھی اندازہ نہیں کر پا رہی تھی' لیکن میرے اندر مسلسل خطرے کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ جو کچھ بھی ہونے والا تھا، وہ میرے حق میں ہرگز اچھا نہیں ہوگا۔ مجھے اس کا ادراک ہو چکا تھا' لیکن میرے سامنے کوئی راستہ نہ تھا۔ کاش ابا زندہ ہوتے۔

اس کے بعد بھی کئی بار دانش نے فون کیا لیکن میں نے اس کی بات سنے بغیر فون رکھ دیا۔

میری بھوک پیاس اڑ گئی تھی۔ جہاں بیٹھتی' وہاں ہی بیٹھی رہتی۔ زیادہ تر کمرے میں ہی رہتی۔ بینا مامی نے کتنی بار گلہ کیا تھا۔

"کیا ہو گیا ہے تمہیں اقصیٰ! آتی ہی نہیں ہو ادھر۔"

"وہ بس تیاری کر رہی ہوں امتحان کی۔"

حالانکہ میں نے اس روز کے بعد سے کسی کتاب کو چھو کر بھی نہیں دیکھا تھا۔ سلجوق اپنے کام کے سلسلے میں منگنی کے چند دن بعد ہی سندھ چلے گئے تھے۔ ڈاکوؤں کی گرفتاری کے سلسلے میں پنجاب سے جو پولیس آفیسر بھیجے گئے تھے' ان میں وہ بھی تھے۔ کئی بار سوچا امی جان کو بتا دوں ماما سے مشورہ لوں۔ لیکن پھر ہمت نہ ہوئی۔

میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا' اور دانش نے زندگی مشکل کر رکھی تھی۔ اب تو اس کے مطالبے میں سختی آ گئی تھی۔ دو تین بار وہ خود بھی عافیہ کے ساتھ آیا تھا' اور اس کی نظریں مجھے اپنے وجود میں کھبتی ہوئی محسوس ہوئی تھیں۔ میں نے اس کی منت کی کہ وہ میری غلطی کو معاف کر دے۔ تصویر واپس کر دے۔

"کر دوں گا لیکن ایک بار ملاقات کرو۔ بہت تشنہ ہوں، محبت کرتا ہوں تم سے۔"

اور یہ ایک ملاقات کتنی ملاقاتوں کا پیش خیمہ ہوگی، میں جانتی تھی۔ سو فون رکھ دیتی تھی'

لیکن ایک روز ڈاک سے ایک خط آ گیا۔

شاید روحیل نے یونیورسٹی سے رزلٹ کارڈ لے کر بھیجا ہو۔

یہ سوچتے ہوئے میں نے لفافہ کھولا اور دھک سے رہ گئی۔

"میری تصویر تھی' اور میرے ساتھ جو کوئی بھی تھا، میں اسے ہرگز نہیں جانتی تھی۔ اور اس شخص سے میں نے محبت کی تھی، اس گھٹیا شخص سے۔ میں نے کانپتے ہاتھوں سے تصویر کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ڈسٹ بن میں پھینک دیے۔

"یہ صرف ایک سیمپل ہے اقصیٰ۔"

اسی رات اس کا فون آ گیا، سنان نے اٹینڈ کیا۔

"اقصیٰ جی! وہ دانش بھائی کا فون ہے۔ وہ پرائیویٹ طور پر انگلش میں ایک ایم اے کرنا چاہتے ہیں۔ آپ سے معلومات لینی ہے۔"

کس قدر مکار تھا' وہ شخص۔

میں نے بے بسی سے سوچا اور سنان سے کہا۔

"میں نے تو ریگولر کیا ہے، مجھے بھلا کیا خبر۔"

"پھر بھی بات کر لو بیٹا! کسی کی مدد کر دینے میں کیا حرج ہے، کیا خبر کوئی بات بتا سکو۔"

امی جان بھی وہیں ہی تھے۔ میں نے ریسیور اٹھا لیا۔

"ہیلو!"

میرے ہیلو کہتے ہی اس نے دھمکی سے انداز میں کہا تھا۔

"ایک ہفتے بعد ایسی تصویریں سب کے پاس ہوں گی۔ سو بتا دو کہ کب ملاقات ہو رہی ہے۔"

"سوری، مجھے تو کچھ معلوم نہیں اس کے متعلق۔"

کہہ کر میں نے ریسیور رکھ دیا۔ لیکن میرے دماغ کی رگیں پھٹنے لگی تھیں۔ آگے پیچھے کہیں کوئی راستہ نہ تھا، وہ گھر جہاں میرا حق تھا' جو میرا تھا۔ میں وہاں سے آ چکی تھی' اور یہاں میرے لیے کوئی گنجائش نہ تھی۔ تو اب ایک ہی راستہ تھا' میرے سامنے۔

"موت۔ لیکن کیا عمر بھر جہنم میں جلوں۔ اتنی سی غلطی کی اتنی بڑی سزا۔"

ماما اپنے پیپرز میں مصروف تھی۔ سنان کرکٹ ٹیم کے ساتھ فیصل آباد گیا ہوا تھا۔ بینا مامی کی طبیعت ٹھیک نہ تھی۔ سو میری طرف کسی نے خاص توجہ نہ دی تھی' اور اس ایک ہفتے میں میری

آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے تھے۔ رنگت زرد ہو رہی تھی۔ ابی جان نے دو ایک بار پوچھا بھی لیکن میں نے ٹال دیا۔

تو اب کوئی راستہ نہیں رہا۔ ایک ہفتہ ہو لیا تھا' اور اب رسوائی و بدنامی۔''

اور یہ ساری محبتیں صرف تھوڑے عرصے کے لیے تھیں۔

ابی جان، سلجوق، بینا مامی، مکرم ماموں سب کیا سوچیں گے' جب وہ تصویریں دیکھیں گے۔

کون میری بات کا یقین کرے گا کہ یہ مرے اتنے قریب بیٹھا شخص اسے میں نے کبھی دیکھا تک نہیں۔ یہ تو دانش کی فوٹوگرافی کا کمال ہے۔

* * *

ماہا کالج جا چکی تھی۔ غزالہ مامی کچن میں تھیں۔ عزم ماموں کلینک میں۔ اور میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ میں یونہی بے دھیانی میں ابی جان کی اسٹڈی کی طرف جانے لگی کہ فون کی بیل بج اٹھی۔ میرا دل زور سے دھڑکا۔ غزالہ مامی نے کچن سے باہر جھانکا۔

''بیٹا! دیکھنا کس کا فون ہے؟'' میں نے ڈرتے ڈرتے ریسیور اٹھالیا۔

''ہا۔ ہا۔ ہا'' دوسری طرف دانش ہی تھا۔ میری آواز پہچان کر اس نے قہقہہ لگایا۔ تو اقصیٰ جی! آج شام میرے گھر ہی آ جائیں، عافیہ ایک دوست کی شادی میں شرکت کے لیے سرگودھا جا رہی ہے سو گھر پر ملاقات زیادہ محفوظ رہے گی۔ تو انتظار کروں؟''

''پلیز۔'' میں نے کچھ کہنا چاہا اس نے ٹوک دیا۔

''دوسری صورت میں صبح سب کے پاس اس تصویر کی کاپیاں ہوں گی۔''

''رانگ نمبر تھا۔''

ریسیور رکھ کر میں نے مامی کو بتایا اور مرے مرے قدموں سے اسٹڈی میں آ گئی۔ ابی جان اسٹڈی میں نہیں تھے۔ حالانکہ اس وقت وہ عموماً یہیں ہوتے تھے۔ شاید مکرم ماموں کی طرف گئے ہوں' بینا مامی کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں تھی' شاید۔ یا پھر ممکن ہے اپنے کمرے میں ہوں۔

''رائٹنگ ٹیبل پر اخبار پڑا تھا۔ میں چیئر پر بیٹھ گئی اور خالی خالی نظروں سے اخبار دیکھنے لگی۔

ادبی صفحے پر نظم لکھی تھی۔

مرگِ گل سے پیشتر
سب دریچے بند ہیں، تم کچھ کہو۔

(ہاں سب دریچے بند ہیں، کہیں روزن نہیں جہاں میں اپنی انگلیاں پھنسا سکوں۔ کوئی راستہ نہیں رہا سوائے ایک راستے کہ۔ اور وہ ایک راستہ۔)

میں نے جھرجھری سی لی۔

اور لوگ کیسے اتنی آسانی سے مر جاتے ہیں۔ خودکشی کر لیتے ہیں کاش میرا دل بند ہو جائے۔ خود بخود۔

میں نے بے آواز دعا کی۔ اور کتنی ہی دیر تک آنکھیں موندے بیٹھی رہی' جیسے میرا دل بند ہو جائے گا۔

اور خود اپنی زندگی ختم کرنا کتنا مشکل ہے۔

میں نے دراز کھینچی وہ لاک تھی' میز پر سے قلم اٹھایا اور جھک کر لکھنا شروع کیا۔

''محترم ابی جان!''

اور آنسوؤں نے یکدم آنکھوں کو دھندلا دیا۔ میں نے قلم رکھ کر کرسی کی پشت سے سر ٹیک لیا اور آنکھیں موند لیں۔ آنسو بہت آہستگی سے میرے رخساروں پر پھیل رہے تھے۔ جانے اس کیفیت میں کتنی دیر گزر گئی کہ مجھے اپنے پیچھے قدموں کی ہلکی سی آواز آئی۔ اور پھر سلجوق کی چہکتی آواز۔

''مجھے معلوم تھا، خاتون آپ یہاں ہی ہوں گی۔ سو آپ کو کمرے میں نہ پا کر سیدھا ادھر چلا آیا۔ آپ کو کیا خبر کہ کیسے گزارے ہیں یہ دن۔''

میں سیدھی ہو کر بیٹھ گئی لیکن میں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔

سلجوق کرسی کے پیچھے کھڑے ہو کر میری پشت پر ہاتھ رکھے ذرا سا جھکے اور اخبار میں چھپی نظم پڑھنے لگے۔

تم سمجھتے ہو ساری انگلیاں پتھر کی ہیں۔
تم سمجھتے ہو کہ خوابوں میں خیالوں کو لیے
لڑکھڑائیں گے ہمیشہ وصل کی خواہش میں یوں ہی بن پیے۔
اپنے ہونٹوں کو سیے۔
مرگِ گل سے پیشتر
میں لکھوں گا تیرے چہرے پر وہ انمٹ داستان
جو سب دریچے کھول دے۔

زندگی سچ بول دے۔

دلکش لہجہ

میں اندر سے بھیگتی جا رہی تھی' سلجوق کو کیا خبر کہ سب دریچے بند ہو چکے ہیں۔

"واہ۔ کیا خوب نظم ہے، گویا شعروں سے بھی دلچسپی رکھتی ہیں۔"

وہ سامنے آ گئے پھر یکدم ہی ان کی نظر میرے چہرے پر پڑی۔

"اقصیٰ! کیا ہوا ہے تمہیں، بیمار ہو تم کچھ۔" میں نے نفی میں سر ہلایا۔

"پھر یہ کیا حالت ہو رہی ہے تمہاری تمہیں میری قسم اقصیٰ مجھے بتاؤ۔ ماما نے کچھ کہا، لیکن ماما ایسی کوئی بات نہیں کر سکتیں پلیز بولو نا۔"

آنسو اسی روانی سے میرے رخساروں پر پھسل رہے تھے۔

"خدا کے لیے اقصیٰ! میں تمہاری آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا۔ تم نہیں جانتی ہو۔ تم کیا ہو میرے لیے۔ کیا کر دیا ہے تم نے مجھے پلیز بولو۔"

"یہ اتنی سچی اور بے لوث محبتیں میرا نصیب نہیں ہیں۔" میں نے ڈوبتے ہوئے ذہن کے ساتھ سوچا۔

اور شاید خدا نے میری دعا سن لی ہے اور میرا دل بند ہونے لگا ہے۔

"اقصیٰ۔ اقصیٰ۔ پلیز آنکھیں کھولو۔" سلجوق کی آواز میرے کانوں میں جیسے بہت دور سے آئی تھی' پھر مجھے کچھ خبر نہیں ہوئی تھی۔ جب میری آنکھ کھلی تو میں اسٹڈی میں ہی تھی۔ کارپٹ پر لیٹی ہوئی میرے سر کے نیچے کشن تھا' میں نے اٹھنے کی کوشش کی۔

"لیٹی رہو۔" سلجوق پریشانی سے میرے قریب بیٹھے تھے۔

میں شاید بے ہوش ہو گئی تھی۔ شاید تھوڑی دیر کے لیے، کاش میں ہوش میں نہ آتی۔ کاش میری آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند ہو جاتیں۔ آنسو پھر میری آنکھوں میں جمع ہونے لگے۔

"اب مت رونا اقصیٰ اور صحیح طرح سے بتاؤ مجھے کیا بات ہے۔ دانش کہاں مل گیا تمہیں؟ بے ہوشی میں تم نے اس کا نام لیا تھا۔ دھمکی دی ہے اس نے تمہیں؟"

اور پھر میں نے سب کچھ سلجوق کو بتا دیا۔

سلجوق خاموشی سے سب کچھ سنتے رہے۔ میں نے نگاہ اٹھا کر انہیں دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ مجھے معلوم تھا' کہ وہ آنکھیں' جن میں چند لمحے پہلے میرے لیے محبت وخلوص کے جذبے تھے۔ اب ان آنکھوں میں، نفرت، حقارت، بیزاری ہو گی۔

"اقصیٰ! جو گزر چکا، وہ ماضی تھا۔ جب مائیں نہ ہوں اور باپ دیار غیر میں ہوں' تو اس عمر میں کبھی کبھی آدمی بہک جاتا ہے۔ غلطی ہو جاتی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ بہت آگے جانے سے پہلے سنبھل گئیں۔ آج کے بعد یہ بات آپ اس طرح بھول جائیں' جیسے کبھی یہ لمحے آپ کی زندگی میں آئے ہی نہیں تھے۔

اور یہ دانش، دیکھ لوں گا اسے بھی، چلو اٹھو، منہ ہاتھ دھو لو اور۔"

سلجوق کیسے مرد تھے۔ سب کچھ جاننے کے باوجود بھی مجھے اپنانا چاہتے تھے۔ میں نے بے اختیار ان کی رفاقت پر فخر کیا۔

"مگر وہ شام۔" میں ہچکچائی۔

"دونوں چلیں گے ملنے اکٹھے محترم دانش سے۔ سوچا تھا، اب کے ملوں گا تو رنگ ہی اور ہوگا۔ ہمارے نام کی انگوٹھی پہن کر بھلا محترمہ کیسے ملیں گی سارے رستے سوچتا آیا تھا' مگر۔"

میں یونہی بیٹھی رہی۔

"پلیز اقصیٰ! میرا یقین کرو، میں ہوں نا تمہارے ساتھ ہر مشکل میں، شکر ہے ابی جان نے دراز لاک کر چھوڑا تھا' ورنہ، تمہارے بعد میں بھی نہیں رہتا اقصیٰ۔"

"خدا نہ کرے۔" بے اختیار میرے لبوں سے نکلا۔ تو سلجوق نے شوخ نظروں سے مجھے دیکھا۔ میں نے نگاہیں جھکا لیں۔

"چلو اب اٹھو، منہ ہاتھ دھو کر آؤ۔ میں اچھی طرح سے تمہیں دیکھنا چاہتا ہوں۔ یہ رونی شکل نہیں۔"

اور جب میں منہ ہاتھ دھو کر آئی تو سلجوق اسٹڈی کے دروازے میں کھڑے کسی سے باتیں کر رہے تھے۔

"لیجئے، آ گئیں آپ کی بجو۔"

"روحیل!"

میں تیزی سے آگے بڑھی۔

"روحیل!" میری آواز بھرا گئی۔

"بجو!" وہ بڑھ کر میرے گلے لگ گیا۔ "کیسی ہیں آپ؟ خوش ہیں نا۔"

"ہوں۔" میں نے سر ہلا کر پوچھا "سب کیسے ہیں سمیعہ، اماں؟"

"سب اچھے ہیں بجو، اور سمیعہ آپ کو بہت یاد کرتی ہے۔ آپ شاید ہم سے خفا ہوں گی۔"

"یار روحیل! کھڑے کھڑے ہی بات کرو گے چلو باہر چل کر بیٹھتے ہیں۔ میں ابی جان کو دیکھتا ہوں۔"

"یہ سلجوق ہیں۔" میں نے بتایا۔

"تعارف ہو چکا ہے۔" سلجوق نے جاتے جاتے مڑ کر کہا۔

"سوری بجو! ہم آپ کی منگنی پر نہ آ سکے۔ نہ آپ کی کامیابی کی خوشی میں شریک ہو سکے۔"

لاؤنج میں صوفے پر بیٹھتے ہوئے روحیل نے معذرت کی۔

"دراصل۔ سعیعہ کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا' بہت بری طرح زخمی ہو گئی تھی۔ بازوؤں میں، ٹانگوں میں فریکچر ہو گیا تھا۔"

"اب......اب کیسی ہیں وہ؟" میں بے چین ہو گئی۔

"اب اچھی ہے، گھر میں ہے۔ پہلے پلاسٹر چڑھا رہا' پھر تھراپی وغیرہ ہوتی رہی۔ پورے دو ماہ ہاسپٹل میں ایڈمٹ رہی۔ ابھی تھراپی ہو رہی ہے۔ لیکن تھینک گاڈ اب چل پھر رہی ہے۔"

"اور تم نے مجھے بتایا تک نہیں۔"

"آپ یوں ہی پریشان ہو جاتیں، پہلے ہی کچھ کم پریشان تھیں آپ، کیا ہم آپ کا کرب، آپ کا دکھ نہیں سمجھتے تھے۔ بہت ساری باتیں خود بخود ہم پر آشکار ہوئیں، میں آپ کی منگنی میں شریک ہونا چاہتا تھا' لیکن سعیعہ صرف فزیکلی ہرٹ نہیں ہوئی تھی' بلکہ مینٹلی بھی بہت اپ سیٹ تھی۔ جس کی وجہ سے پرابلم تھا۔ تھینک گاڈ کہ مشکل لمحے گزر گئے۔ سعیعہ نے آپ کے لیے گفٹ بھیجا ہے۔

اور آپ کی امانت بھی میں لایا ہوں۔" اس نے پاکٹ سے گاڑی کی چابی نکال کر دی۔

"یہ آپ کی گاڑی کی چابی ہے۔ یہ گاڑی ابا نے آپ کے لیے خریدی تھی۔ کچھ لیٹ ہو گیا ہوں لیکن۔"

"کیا خدا یوں بھی اچانک مہربان ہوتا ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے میں مرنے کا سوچ رہی تھی۔"

"ان شاء اللہ میں اور سعیعہ آپ کی شادی میں شریک ہوں گے۔"

"کیا اماں بھی؟" بے اختیار میرے لبوں سے نکلا۔

"ان کے بارے میں کچھ یقین سے نہیں کہہ سکتا۔"

روحیل نے آہستگی سے کہا' تب ہی سلجوق ابی جان کے ساتھ اندر داخل ہوئے۔ ان کے

پیچھے بینا مامی اور غزالہ مامی بھی تھیں۔

روحیل کھڑا ہو گیا۔

"میں تمہارا دادا بھی لگتا ہوں۔"

ابی جان روحیل کو گلے لگاتے ہوئے خوش دلی سے کہہ رہے تھے۔

"تمہارا باپ میرا بھانجا تھا۔ سگا بھانجا لیکن بیٹا ہی سمجھا میں نے اسے۔"

سلجوق میرے قریب کھڑے گنگنا رہے تھے۔

سب دریچے کھول دوں گا

مرگِ گل سے پیشتر

ان کی نظریں میرے چہرے پر تھیں' اور میرے اردگرد آس پاس چاروں اور زندگی رقص کر اٹھی تھی۔

وہ ہوا کے رخ بھی بدل گئے

اس کے میٹرک کے امتحان کا اختتام اور طیبہ پھوپھو کی آمد ایک ساتھ ہی ہوئی تھی۔ ادھر وہ آخری پرچہ دے کر گھر لوٹی' ادھر پھوپھو مع اپنے دو عدد صاحبزادگان کے آوارد ہوئیں۔ کاشف نے اسے جھنجوڑ کر جگایا۔

"اے اٹھو' بینو کی بچی' دیکھو تو کون آیا ہے۔"

وہ پھر کروٹ بدل کر سوگئی۔

"پھوپھو آئی ہیں۔"

وہ اس کے کان میں چیخا' تو اس نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔

"کیا مصیبت ہے کاشی' سونے دو نا۔"

"جناب پھوپھو آئی ہیں' ساتھ میں تیمور بھائی اور تنویر بھی ہیں' خوب مزا آئے گا۔"

"کیا خاک مزہ آئے گا۔" اس نے جل کر سوچا۔

"وہ جو اس کا پندرہ روزہ سونے کا پروگرام تھا' وہ تو غارت ہوا نا' اب ظاہر ہے پھوپھو آئی ہیں نا تو۔"

"ہیں کیا کہا تم نے پھوپھو آئی ہیں۔"

وہ اچھل کر بیٹھ گئی۔

"یعنی طیبہ پھوپھو نا۔ اپنی سگی والی پھوپھو جان حیدرآباد سے آئی ہیں۔"

"جی...... تو اتنی دیر سے کیا بک رہا ہوں۔"

کاشف نے برا سا منہ بنایا۔ اسے یوں پھوپھو کی آمد کا سن کر کوئی نوٹس نہ لیتے دیکھ کر

غصہ آگیا تھا۔

"دراصل میں نیند میں تھی نا' کچھ سمجھ ہی نہیں آیا۔ کب آئی ہیں پھوپھو؟"

اس نے ہاتھوں سے بالوں کو سمیٹ کر پیچھے کیا۔

"بس ابھی کچھ دیر پہلے' لیکن جناب تو گھوڑے گدھے بیچ کر سو رہی تھیں۔"

"کیسی ہیں پھوپھو جان؟"

اس نے اشتیاق سے پوچھا۔

"بھئی جیسی پھوپھو جان ہوتی ہیں۔ شفیق، مہربان اور محبت کرنے والی۔ پہلے کتنی بار تو تمہیں بتا بھی چکا ہوں کہ ہماری پھوپھو جان بہت پیاری ہیں' بہت اچھی۔"

سیدہ طیبہ بیگم ابا کی اکلوتی بہن تھیں' لیکن چونکہ وہ سندھ کے کسی دور دراز گاؤں میں رہتی تھیں' اس لیے کم ہی آنا ہوتا تھا۔ اس کے ہوش میں صرف دو بار پھوپھو آئی تھیں۔ ایک بار جب وہ چھ سال کی تھی تب' اور ایک بار کوئی دو برس پہلے۔ پہلی بار تو وہ اتنی چھوٹی تھی کہ اسے کچھ یاد نہیں تھا' کہ پھوپھو کیسی تھیں۔ بس اتنا ہی ذہن میں تھا کہ پھوپھو اسے بہت پیار کرتی تھیں' اور مزے مزے کی کہانیاں سناتی تھیں۔ اور اب جو دو برس پہلے وہ آئیں' تو وہ اور سمو آپا کرامت ماموں کے ہاں گئی ہوئی تھیں' اور کرامت ماموں کے ہاں اس کی طبیعت پر کتنا بار پڑتا تھا' لیکن سمو آپا بہت خوش رہتی تھیں۔ وہاں پپی اور ڈیزی تو انہیں گھاس بھی نہ ڈالتی تھیں۔ اور وہ مون اور چاند کیسے عجیب لڑکے تھے' کہ ذرا اچھے نہ لگتے تھے' اسے، اور آنٹی گلناز اور بدر باجی دونوں کتنی اکڑی اکڑی رہتی تھیں' اور اسے تو کرامت ماموں کے ہاں جانے کے خیال سے ہی تپ چڑھ جاتا تھا۔ اور اب تو پھوپھو آرہی تھیں' اس کا کوئی ارادہ نہیں تھا' لیکن سمو آپا اسے زبردستی لے گئی تھیں۔ ابا نے منع بھی کیا تھا۔

"تمہاری پھوپھو اتنے عرصے بعد آرہی ہیں۔"

لیکن وہ سمو آپا ہی کیا' جو کسی کی مان جائیں۔ کاشف پر تو ان کا زور نہیں چلتا تھا' لہٰذا اسے ہی گھسیٹ لے گئیں۔ اماں نے تاکید کی کہ جلدی لوٹ آنا۔

لیکن وہ اس وقت تک کرامت ماموں کے براجمان رہیں' جب تک پھوپھو واپس سندھ نہ لوٹ گئیں۔ دراصل سمو آپا کو اماں نے بڑے لاڈ سے پالا تھا۔ وہ ان سے سے پورے آٹھ برس چھوٹی تھی۔ اور کاشف اس سے ایک برس چھوٹا تھا۔ سو آٹھ برس تک تو تنہا ننھیال و ددھیال کے لاڈ اٹھواتی رہیں' اور پھر اس کے آجانے سے بھی ان کی اہمیت میں کوئی خاص فرق نہیں پڑا تھا۔ وہ

عام سی شکل وصورت کی تھی' جب کہ سموآپا بے حد حسین تھیں۔ سو کچھ ناز حسن بھی تھا' کچھ طبیعت بھی ایسی تھی کہ کسی کو خاطر میں نہ لاتی تھیں۔ اور پھوپھو سے یوں چڑ تھی کہ ایک بار کہیں انہوں نے ان کو بہو بنانے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔حالانکہ تیمور سموآپا سے پورے دو برس چھوٹے تھے۔لیکن پھوپھو کا خیال تھا اپنوں میں برس دو برس کی چھوٹائی بڑائی کیا۔سو اس لیے پھوپھو اب تک زیر عتاب تھیں۔ حالانکہ اس روز کے بعد انہوں نے پھر اس بات کا ذکر نہیں کیا تھا۔شاید زینت آرا کی نظر پہچان گئی تھیں۔

"اچھا بھئی میں تو چلا، تم آجانا۔ادھر سب بڑے کمرے میں ہیں۔"

کاشف نے جاتے جاتے کہا۔

تو وہ اٹھی اور جلدی جلدی منہ پر پانی کی چھینٹے مارے' کیونکہ آنکھیں بند ہوئی جارہی تھیں' اور کاشف کے پیچھے ہی بڑے کمرے کی طرف لپکی۔دروازے پر رک کر لمحہ بھر کے لیے اس نے کمرے کا جائزہ لیا۔

سموآپا کے سوا سب ہی موجود تھے۔پھوپھو نیچے قالین پر پاندان سامنے رکھے بیٹھی تھیں۔ ابا بھی ان کے قریب ہی بیٹھے تھے' اور ان کے چہرے پر مسکراہٹ تھی اور پورا چہرہ روشن روشن لگ رہا تھا اور ایک شریر بھوری آنکھوں والا لڑکا کاشف ان کے پاس کھڑا تھا۔اور زینت آرا بیگم بھی پھوپھو سے ذرا ہٹ کر خاموش بیٹھی تھیں۔کاشف کی تنویر کے ساتھ بہت بنتی تھی۔ابا جب بھی پھوپھو سے ملنے سندھ گئے' اسے ساتھ لے گئے تھے۔کاشف نے ہی پھوپھو کی اور تنویر کی تعریفیں کر کے اسے مشتاق بنا ڈالا تھا۔

"ارے مینو بیٹی آجاؤ نا۔وہاں کیوں کھڑی ہو گئی ہو۔دیکھو تمہاری پھوپھو آئی بیٹھی ہیں۔"

ابا نے اسے کھڑے دیکھ کر پکارا' تو وہ جھجکتے ہوئے آگے بڑھی۔

"ارے میری بچی' میری مینو۔"

پھوپھو نے اسے گلے لگا کر خوب بھینچ کر پیار کیا۔ایک وہ اماں کی رشتہ دار ہیں گلے بھی ملیں گی' تو یوں جیسے انہیں خطرہ ہو کہ جراثیم چمٹ جائیں گے۔امینہ نے سوچا۔پھوپھو مسلسل اسے پیار سے دیکھ رہی تھیں۔

"میری بچی اتنی بڑی ہو گئی۔ارے تنی ادھر تو آ۔بہن سے مل' کیا کھڑا گپیں لگا رہا ہے۔"

تنویر نے مسکراتے ہوئے اسے سلام کیا۔

وہ بھی مسکرا دی۔

ہے۔اور اب تمہاری لاڈلی کو اوڑھنے پہننے کا سلیقہ نہ ہو تو۔"

"زینت آرا...... زینت آرا۔"

انہوں نے کسی متوقع جنگ کے خیال سے فوراً بات کاٹی۔

"بخدا، ہمارا مطلب یہ نہیں تھا' جو آپ سمجھ رہی ہیں۔اور یہ آپ نے پھر تفرقہ کیا کہ ہماری تمہاری۔اللہ کی بندی دونوں ہماری بچیاں ہیں۔دونوں ہماری دو آنکھیں ہیں۔آپ بات کو سمجھتی نہیں ہیں اور......"

"یا اللہ...... یا اللہ۔"

اس نے آنکھیں بند کر کے دعا کی۔

"یا اللہ اس معرض وجود میں آنے والی عالمی بلکہ خانگی جنگ کو روک۔"

اور شاید یہ وقت، وقت قبولیت تھا' کہ اس کی دعا قبول ہوگئی اور اماں ابا کی بات کا جواب دیے بغیر پاندان اپنی طرف کھسکا کر پان بنانے لگیں۔

دراصل قصور کچھ زینت آرا کا بھی نہیں تھا۔یہ جو ان کے مزاج میں کچھ تعلّی اور اپنی بات منوانے والی بات تھی' تو اس کی وجہ ان کا خاندانی پس منظر تھا۔وہ نواب خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ان کے والد خاندانی نواب تھے۔پاکستان بننے کے بعد کراچی منتقل ہوئے۔یہاں بھی وہی آن بان تھی۔اگرچہ وہ نوابی تو نہ رہی تھی' لیکن پیسے، دولت کی ریل پیل تھی۔صدر ہاؤس تک رسائی تھی۔

سید جعفر علی شاہ اسٹیشن ماسٹر تھے۔لیکن اصلی اور سچے سید تھے۔نواب صاحب سے اچانک ملاقات ہوئی تھی۔نواب صاحب ان کے اخلاق سے متاثر ہوئے' اور جب پتا چلا کہ وہ بھی سید ہیں تو گھر بلایا۔زینت آرا بیگم اگرچہ خوش شکل تھیں' لیکن اصلی سید نہ ملنے کی بنا پر ان کی عمر نکلی جا رہی تھی۔سو نواب صاحب نے سید جعفر علی شاہ صاحب کی والدہ سے درخواست کی کہ وہ زینت آرا کو اپنی بہو کے طور پر قبول کرلیں۔شجرہ نسب دیکھا اور دکھایا گیا' اور یوں زینت آرا ایک شاندار گھر سے ایک نسبتاً چھوٹے گھر میں آگئیں۔خوشحالی تو یہاں بھی تھی' لیکن وہ بات نہ تھی۔ابا مسکین آدمی تھے' اور ان کی والدہ بھی سادہ دل خاتون تھیں۔

امینہ نے دل ہی دل میں اللہ میاں کا شکریہ ادا کر کے پھوپھو کی طرف دیکھا' اور پھر نگاہیں دروازے پر ہی لمحہ بھر کے لیے ٹک گئیں۔

"تیمور بھائی ہیں شاید۔"

تنویر اور کاشف تقریباً ہم عمر ہی تھے۔

"دیکھا تم نے جعفر علی شاہ، اپنی مینو بالکل اماں پر گئی ہے۔" پھوپھو کے چہرے پر مامتا اور شفقت تھی۔

"وہی ناک، وہی پیشانی، ویسی ہی آنکھیں۔"

"ہاں۔"

ابا نے بھی محبت پاش نظروں سے اسے دیکھا۔

"اس کی شکل وصورت ہی نہیں عادتیں بھی ساری اماں پر گئی ہیں۔ وہی سادگی اور قناعت اور ویسی ہی نرم خو اور ہمدرد فطرت' جو پہنایا پہن لیا' جو کھلایا کھا لیا۔ نہ کوئی نخرہ' نہ کوئی ضد اور نہ فرمائشیں۔ میری یہ بیٹی تو عطیہ ہے خدا کا۔"

"اے طیبہ بیگم تم نے عرصہ سے میری سمو کو نہیں دیکھا۔" اماں کو شاید ابا کی تعریف اچھی نہیں لگی تھی۔ اس لیے فوراً ہی بات کاٹ دی۔

"ہاں...... ہاں...... کہاں ہے' سمو ابھی تک آئی نہیں۔" پھوپھو نے اسے اِدھر اُدھر متلاشی نظروں سے دیکھا۔

"اوہ...... وہ تو آج صبح سے ہی کسی سہیلی کے ہاں گئی ہے، آتی ہی ہوگی۔"

اماں کس قدر صفائی سے جھوٹ بولتی ہیں۔ ابھی تو جب وہ پیپر دے کر آئی تھی' تو گھر پر موجود تھیں۔ امینہ نے مڑ کر کاشف کو دیکھا' تو کاشف نے اشارے سے بتایا کہ واقعی آپا گھر پر نہیں ہیں۔ گویا اماں پچاس فی صد سچ بول رہی تھیں' اور آپا یقیناً پھوپھو کی آمد کے بعد ہی کھسک لی ہوں گی۔ جانے آپا ابا کے رشتے داروں سے اتنی الرجک کیوں ہیں۔ شاید اس لیے کہ وہ بھی ابا کی طرح سادہ اور کھرے سچے لوگ ہیں۔ اماں کے رشتے داروں کی طرح ماڈرن' لیکن خود غرض اور شوباز نہیں ہیں۔

امینہ نے سوچا اور اماں کی طرف دیکھا' جو تھوڑا سا پھوپھو کے قریب کسک آئی تھیں۔

"سمو تو ساری کی ساری اپنے ننھیال پر گئی ہے۔"

"ہاں آپا۔ اپنی سمو کی عادتیں بھی وہی شاہانہ ہیں۔"

ابا نے مسکراتے ہوئے کہا' تو پتا نہیں اماں ان کی بات کو طنزیہ سمجھیں یا کیا، کہ تیر برساتی نگاہوں سے انہیں دیکھا۔

"لو بھلا اپنی سمو میں کیا برائی ہے۔ اس عمر میں اوڑھنے پہننے کا شوق تو سبھی لڑکیوں کو ہوتا

اس نے سوچا۔

لیکن کس قدر خوبصورت بالکل آپالو کا کوئی دوسرا روپ لگ رہے تھے۔ گیلے بالوں کو ہاتھوں سے پیچھے کرتے ہوئے وہ اندر آئے۔ شاید منہ دھو کر آئے تھے۔

"بیٹے! یہ مینو ہے۔"

"اچھا!" وہ مسکرائے۔

کیسی ہو بے بی اور یہ اس قدر حیرت سے کیوں دیکھ رہی ہو، یقین کرو ہم تمہارے کزن تیمور شاہ ہیں۔"

اس نے شرمندہ ہو کر پلکیں جھپکائیں۔

"سلام تیمور بھائی۔"

"دراصل تیمور بھائی کہ مینو اس لیے حیرت سے آنکھیں پھاڑ رہی تھی کہ یہ آپ غلطی سے اماں کے خاندان پر کیسے چلے گئے۔" کاشف نے کہا۔

اماں کو اپنے خاندان کے حسن پر ناز تھا۔

ابا تو اس کی بات سمجھ کر مسکرا دیے۔ اماں نے گھور کر اسے دیکھا' تو وہ جلدی سے اسے دیکھنے لگا۔ جو برے برے منہ بنا رہی تھی کہ لو اماں کے خاندان میں بھلا کہاں کوئی ایسا ہے؟ وہ چاند اور مون کیسی بندروں جیسی تو شکلیں ہیں ان کی' اور اس پر لباس کیسے بے تکے پہنتے ہیں۔

"تو یہ تو بالکل اپنے باپ پر ہے۔"

"سچ کیا پھوپھا ابا اتنے ہی خوبصورت ہیں۔"

اس نے بے اختیار پوچھا' اور پھر شرما کر دانتوں تلے زبان داب لی۔ تیمور زیرِ لب مسکرانے لگے۔

"عقل تو اس لڑکی کو چھو کر نہیں گئی ہے۔"

اماں بڑبڑائیں۔

"ایک وہ سمو ہے ہر بات سوچ سمجھ کر کرے گی۔ اس طرح نہیں کہ جو منہ میں آیا پھٹ سے کہہ دیا۔"

"ارے بچی ہے زینت آرا۔"

تب ہی بوا ٹرالی میں گلاس اور بوتلیں رکھے لے آئیں۔ پھوپھو کو کوک پکڑاتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"پھوپھو! آپ پہلے کبھی کیوں نہیں آئیں؟"

"اے بچی کیا کہوں۔ کیسا کیسا دل چاہتا ہے۔ پر کیا کروں ادھر بھی بڑا بکھیڑا ہے، زمینداری کا بڑا کام ہوتا ہے، اب بھی کلیجے پر ہاتھ رکھ کر آئی ہوں۔ تمہارے پھپھا ہارٹ کے مریض، لاکھ نوکر چاکر ہوں پر اپنی تو اور بات ہوتی ہے، اب بھی اماں کو خواب میں دیکھا، گلہ کر رہی ہیں کہ بھائی کو بھلا دیا۔ بس پھر دل نہ لگا تیمور سے کہا کہ جا کر سیٹیں بک کروائے اور جیسی بیٹھی تھی اٹھ کر چلی آئی۔"

انہوں نے تفصیل بتائی۔

"دیکھ بٹی! بوا بے چاری اکیلی لگی ہوں گی، آج وہ نمو بھی نہیں آیا۔"

ابا نے کہا تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور کچن میں آ کر بوا کا ہاتھ بٹانے لگی۔

❊ ❊ ❊

"سمو آپا!"

امینہ نے اپنے بیڈ پر لیٹے لیٹے مڑ کر سمینہ کی طرف دیکھا، جو ہارڈی کا کوئی ناول دیکھ رہی تھی۔

"آپ کو پھوپھو کیسی لگیں؟"

"کیوں.....؟ کوئی پہلی بار دیکھا ہے انہیں۔"

"اتنے عرصے بعد تو دیکھا ہے نا۔"

"ہاں۔ مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

"پھوپھو کس قدر محبتی ہیں۔ میرا تو اب بھی ان کے پاس سے اٹھنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔"

"ہوں! یہ جو متوسط طبقے کے لوگ ہوتے ہیں نا، ان کے پاس لٹانے کو بہت محبتیں ہوتی ہیں، خالی خولی محبتیں۔" سمینہ نے ناول اوندھا کر کے تکیے پر رکھ دیا، اور امینہ کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"مگر آپا۔"

امینہ اٹھ بیٹھی۔ اسے سمینہ کا پھوپھو کے بارے میں تبصرہ پسند نہیں آیا تھا۔

"پھوپھو کا اور ہمارا خاندان کوئی الگ تو نہیں ہے۔"

"ہے، ہم میں اور ان میں فرق ہے۔ ہماری رگوں میں نوابی خون بھی دوڑ رہا ہے۔ تمہیں نہیں پتا نانا ابا ایک پوری ریاست کے نواب تھے۔"

"لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے آپا، ہمارا نام، ہماری عزت و وقار تو ابا کے نام سے ہے، اور ہمارا خاندان تو وہ ہے نا جو ابا کا ہے۔"

"تم احمق ہو مینو، پتا ہے میری سب فرینڈز کو یہ پتا ہے کہ میں نواب آف راج گڑھ کی نواسی ہوں، اور سید عظمت علی شاہ اور سید کرامت علی شاہ میرے ماموں ہیں، اور میں تو سب سے اپنا تعارف نانا ابا کے حوالے سے ہی کرواتی ہوں۔ سب بہت متاثر ہوتی ہیں۔"

"مگر ہماری پہچان تو ابا ہیں آپا۔ ہماری شناخت تو ان سے ہے نا۔"

اس نے بڑے دکھ سے پوچھا، اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"آپ اپنی فرینڈز سے یہ کیوں نہیں کہتیں کہ آپ سید جعفر علی شاہ کی بیٹی ہیں۔ کیا آپ کو اس بات پر فخر نہیں ہے کہ آپ ابا کی بیٹی ہیں؟"

"دیکھو مینو!" سمینہ نے اس کو سمجھانے کے انداز میں کہا۔ "تم ابھی بہت چھوٹی ہو، تم ان باتوں کی نزاکت کو نہیں سمجھ سکتیں۔"

وہ اب اتنی چھوٹی بھی نہ تھی، آپا کی بات کو اچھی طرح سمجھ رہی تھی۔ اور اسے آپا کی یہ بات بالکل پسند نہیں آئی تھی، اور اس کا دل اندر ہی اندر عجیب سے درد سے دوچار ہو گیا تھا۔

"یہ آپا ایسا کیوں سوچتی ہیں؟"

اسے چپ دیکھ کر سمینہ ہولے سے ہنس دی۔

"میری بھولی بہن میں صحیح کہتی ہوں۔ تو ابھی ان نزاکتوں کو نہیں سمجھ سکتی، تجھے نہیں خبر کہ دنیا کس طرف جا رہی ہے، لوگ اسٹیٹس کے دیوانے ہیں، اور اب تو ہی بتا یہ اپنا تینی ہے نا۔ کس قدر فرق ہے تینی اور مون وغیرہ میں۔"

"بھلا تینی کا ان سے کیا مقابلہ؟"

تینی کے ذکر سے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

ذرا سی دیر میں ہی وہ اسے کاشف کی طرح عزیز ہو گیا تھا، بلکہ اس کی تو اچھی خاصی دوستی ہو گئی تھی تینی سے۔

"ہاں اب چاند اور مون کی زندگی میں کتنا گلیمر ہے، اور کس قدر تیز لڑکے ہیں وہ اور یہ تینی ایک دم سے ٹھس۔

"سلام آپا!" یوں ادب سے مجھے سلام کیا، جیسے میں اس کی کزن نہیں اس کی استانی ہوں۔ میں تو سمجھ رہی تھی شاید ابھی قاعدہ کھول کر مجھ سے قرآن کا سبق لینے بیٹھ جائے گا۔"

"دراصل وہ پہلی بار آپ سے ملا ہے نا، اس لیے شرما رہا تھا۔"
امینہ نے اس کی حمایت کی۔

"نہیں مینو! یہ متوسط طبقے کے لڑکے جو ہوتے ہیں نا، یونہی ہوتے ہیں جھینپو سے۔ ان میں جرأت نہیں ہوتی۔ ایک وہ چاند اور مون ہیں کس قدر فرینکلی بات چیت کرتے ہیں۔"

اس نے برا سا منہ بنایا' لیکن سمینہ کی بات کی تردید نہیں کی' اور لمحہ بھر کچھ سوچنے کے بعد ایک دم سے پوچھا۔

"اور...... اور تیمور بھائی وہ کیسے لگے آپ کو؟"

"بس ٹھیک ہی ہیں۔"

سمینہ نے پھر کتاب اٹھالی۔

"نہیں آپا! آپ نے دھیان سے انہیں نہیں دیکھا۔ وہ تو اتنے خوبصورت ہیں' اور وہ جو ٹی وی پہ ڈرامہ نہیں آیا تھا "بڑ بھیا" اس میں وہ جو بڑ بھیا بنے تھے' بالکل ویسے ہی ہیں۔"

"تم نے عظمت ماموں کے شوبی کو نہیں دیکھا۔ اس کے سامنے تو تمہارے یہ تیمور بھائی پانی بھرتے نظر آئیں۔"

سمینہ کے رخساروں اور آنکھوں میں ایک چمک سی آگئی۔

"اس قدر جولی ہیں نا شوبی۔ ایمان سے جب میں پچھلے برس کراچی گئی تھی نا' تو بہت مزا آیا۔ بہت انجوائے کیا' اور شوبی نے تو اس قدر ہمیں سیریں کرائیں کہ کیا بتاؤں' اور پھر وہ باتیں اتنی خوبصورت کرتا ہے کہ...... اور یہ تمہارے تیمور بھائی تو صرف مسکرانا ہی جانتے ہیں۔"

"نہیں تو۔" وہ بجھ سی گئی۔

"تیمور بھائی تو بہت مزے مزے کی باتیں کرتے ہیں۔"

"خاک!" سمینہ نے برا سا منہ بنایا اور کتاب لے کر لیٹ گئی۔

امینہ نے چپکے چپکے اسے دیکھا۔

سمو آپا کتنی خوبصورت ہیں، نیلے کانچ ایسی آنکھیں اور پھر رنگت کیسی فیئر ہاتھ لگاؤ تو میلی ہونے کا ڈر اور تیمور بھائی بھی۔ کتنا اچھا چاند سورج کا جوڑا ہوتا۔ پر سمو آپا کو تو تیمور بھائی پسند ہی نہیں ہیں' اور وہ شوبی بھائی...... یقیناً وہ بھی چاند اور مون ہی کی کوئی شے ہوں گے' بے ڈھنگے اور بے سُرے سے۔

اس نے دل ہی دل میں سوچا۔

اب کیا پتا کہ سمو آپا کو تیمور بھائی کیوں پسند نہیں آئے۔ شاید انہوں نے دھیان سے انہیں دیکھا ہی نہیں۔ آئی تھی تو کتنی دیر سے تھیں، جب کھانا لگ چکا تھا' اور پھوپھو بیچاری مارے محبت کے ہر پندرہ منٹ بعد پوچھتی تھیں سمو نہیں آئی۔ اور جب سمو آپا آئی تو کیسی رُکھائی سے ملی تھیں' اور تیمور بھائی کی طرف تو شاید اچھی طرح دیکھا ہی نہیں۔ البتہ کھانا کھاتے ہوئے اس نے تیمور بھائی کی چوری پکڑی تھی، وہ کتنی گہری نظروں سے سمو آپا کو دیکھ رہے تھے، شاید انہیں سمو آپا بہت اچھی لگی تھیں...... اور کیا پتا؟

اس کے دل میں اُمید کی ایک کرن سی جاگی۔

"سمو آپا کو بھی تیمور بھائی اچھے لگنے لگیں۔ ابھی تو پھوپھو پندرہ دن یہاں رہیں گی' اور ان پندرہ دنوں میں...... ناممکن تو نہیں ہے نا۔"

اور اس نے مسکراتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔ اور دل ہی دل میں دعا مانگنے لگی کہ سمو آپا کا دل پسیج جائے۔ لیکن اس کی دعائیں بے اثر ہی گئیں۔ سمو آپا نے ذرا بھی تیمور بھائی کو لفٹ نہیں کرائی تھی۔ وہ تو اکثر گھر سے ہی غائب ہو جاتیں، اور جتنی دیر گھر پر رہتیں اپنے کمرے میں ہی گھسی رہتیں۔ تعلیم سے فارغ ہو چکی تھی' ورنہ یونیورسٹی کا بہانہ بھی ہوتا۔ ایک دوبار انہوں نے دبے لفظوں میں اماں سے عظمت اور کرامت ماموں کے ہاں جانے کا کہا' لیکن اماں نے خلاف توقع ٹوک دیا۔

"اے لو سمو! تمہیں بے وقت ہی سوجھتی ہے۔ اب کیا کہیں گی تمہاری پھوپھو، اتنے سالوں بعد تو وہ آئی ہیں۔ چلی جائیں تو چلی جانا تم بھی۔"

"اے سنو مینو۔"

جانے سے ایک روز پہلے تیمور بھائی نے پوچھا۔

"یہ تمہاری آپا کیا پردہ نشین ہوگئی ہیں۔ دو تین روز سے نظر نہیں آرہیں۔"

"نہیں تو تیمور بھائی۔"

وہ کچھ گھبرا سی گئی۔

"آپ کو پتا ہے ان کی عادت کا۔ وہ کچھ کم گو سی اور تنہائی پسند سی ہیں۔" اس نے دل ہی دل میں کہا اور مسکرا دی۔

صاف جھوٹ۔

"اچھا!" تیمور بھائی نے معنی خیز انداز میں اچھا کہا۔

"تنہائی پسند لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ روز روز پارٹیاں اور فنکشن اٹینڈ کرتے ہیں۔"

"اوہ دراصل۔" اس نے سٹپٹا کر انہیں دیکھا۔

جھوٹ تو مجھ سے زندگی بھر کبھی بولا ہی نہیں جائے گا۔ لعنت ہو مجھ پر، ایک اماں اور آپا ہیں کس صفائی سے جھوٹ بولتی ہیں کہ سچ کا گمان ہوتا ہے۔ اس نے پوچھا۔

"بات یہ ہے تیمور بھائی کہ آپا کچھ مغرور سی ہیں۔" اس نے پیشانی سے پسینے کے قطرے صاف کیے۔

"اور انہیں ہم لوگ کچھ زیادہ پسند نہیں ہیں۔"

"کیا مطلب......؟" تیمور بھائی نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"میرا مطلب ہے......"

افوہ اب وہ کیا کہے، کیسے سمجھائے تیمور بھائی کو کہ آپا کو ابا کے متوسط طبقے سے متعلق ہونے پر سخت اعتراض ہے۔ اور ابا کے حوالے سے ابا کے رشتے دار بھی انہیں اچھے نہیں لگتے۔

"ہاں بھئی، کیا مطلب ہے تمہارا؟"

تیمور ایک دم سنجیدہ سے ہو گئے تھے۔

"وہ بات یہ ہے تیمور بھائی ہے کہ......"

اس نے سر کھجایا۔

"وہ جو آپا ہیں نا وہ اپنے کو رائل فیملی کا فرد سمجھتی ہیں۔"

"رائل فیملی۔"

"ہاں!" اس نے معصومیت سے سر ہلایا۔

"مگر ماموں تو......"

"ہاں ابا تو سیدھے سادے اسٹیشن ماسٹر ہیں' اور ان کی سات پشتوں میں کوئی نواب نہیں رہا ہوگا۔"

اس نے تیمور کی بات کاٹ دی۔

"ہاں نواب تو نہیں رہے' لیکن اماں بتاتی ہیں نانا ابا کی بڑی زمینداری تھی' اور کافی بڑی جاگیر تھی۔ وہ تو پاکستان بننے کے بعد سب کچھ ادھر ہی رہ گیا۔ تیمور بھائی آپ میری بات نہیں سمجھ رہے ہیں نا۔ آپا جو ہیں از خود کو نانا ابا یعنی نواب آف راج گڑھ کے حوالے سے متعارف کرواتی ہیں۔"

"اوہ......آئی سی۔"

"پتا نہیں مقابلے کا امتحان آپ کیسے دیں گے۔ اتنی سی بات تو آپ کی سمجھ میں آ نہیں رہی تھی۔"

اس نے برا سا منہ بنایا۔

"بس کیا کروں مینو گڑیا کچھ عقل ذرا موٹی ہے۔ بائے دا وے تمہاری یہ آپا اپنا مائنڈ چینج نہیں کر سکتیں؟"

"ناممکن......قطعی نہیں۔ دنیا اِدھر سے اُدھر ہو سکتی ہے' لیکن آپا نہیں بدل سکتیں۔"

کاشف نے اندر آتے ہوئے کہا۔

تنویر بھی اس کے ساتھ تھا۔

"یعنی بہت مایوس کن کنڈیشن ہے۔"

"ہوں، سو فی صد۔"

"خدا جب حسن دیتا ہے نزاکت آ ہی جاتی ہے۔"

تنویر ناک میں منمنایا۔

"اوہ تینی کے بچے کتنی بار تم سے کہا ہے یہ ناک میں من من مت کیا کرو۔ کسی دن میرے ہاتھوں خرچ ہو جاؤ گے۔"

تیمور اس کے ناک میں بولنے پر بہت چڑتے تھے' اور وہ بھی جان بوجھ کے انہیں چڑاتا تھا۔

"کوئی بات نہیں ظلِ الٰہی، شہید کہلاؤں گا' اور سیدھا جنت میں جاؤں گا۔"

"ارے مینو......مینو بھئی کہاں ہو تم؟"

سمو آپا اسے ڈھونڈتی اور پکارتی ہوئی ادھر ہی آ گئیں۔

"جی آپا!" وہ سعادت مندی سے بولی۔

"میں ادھر ہوں کاشی کے کمرے میں۔"

"اوہ یہاں ہو تم۔" پردہ ہٹا کر انہوں نے سب کو دیکھا' پھر اس کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

"اماں تمہیں بلا رہی تھیں' کہہ رہی ہیں کہ پھوپھو جان کے ناشتے کے لیے بوا کے ساتھ مل کر قیمے والے پراٹھے پکوا لو اور......"

"اس تکلف کی کیا ضرورت ہے۔ ٹرین میں سب کچھ مل جاتا ہے۔"

تیمور نے سمینہ کو مخاطب کیا۔

''ہاں ... لیکن اماں کا خیال ہے کہ گھر کے کھانے کی بات ہی اور ہوتی ہے۔''

وہ جانے کے لیے مڑیں' لیکن تنویر نے روک لیا۔

ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں۔

کاش پوچھو مدعا کیا ہے۔

''کیا مطلب ... ؟''

سمینہ کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

''مطلب وطلب کچھ نہیں قابل احترام سمو آپا' بس ایک گزارش ہے کہ ہم جو آپ کے سگے پھوپھی زاد ہیں' اور جو پندرہ دن سے یہاں پڑے ہیں' ہماری خواہش ہے کہ جانے سے پہلے آپ کچھ وقت ہم غریبوں کو بھی دے دیں، تا کہ جب جائیں تو یاد تو رہے کہ ہماری سمو آپا .....''

''اچھا!'' سمینہ جانے کس موڈ میں تھیں کہ ہنس کر بیٹھ گئیں۔

''چلو اب کرو باتیں۔''

''ہاں، اب ہوئی نا بات۔''

وہ وہیں پلنگ پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی' اور تیمور کھڑکی کے پاس کھڑے باہر دیکھتے رہے، سمو نے ان کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی تھی' خود انہوں نے بھی اسے مخاطب نہیں کیا۔ البتہ دو ایک بار کنکھیوں سے اسے دیکھا۔ وہ تنویر کے سنائے ہوئے لطیفوں پر ہنس رہی تھیں۔

''سمو اتنی مغرور بھی نہیں ہے۔'' انہوں نے سوچا۔

''اور اس کے ساتھ زندگی گزاری جا سکتی ہے۔ اس کے دل کے اندر کہیں کوئی گداز گوشہ ضرور ہے' ورنہ وہ تینی کے روکنے پر ہرگز نہ رکتی۔ زندگی کے سفر میں اتنا خوبصورت ساتھی مل جائے تو زندگی کتنی خوبصورت ہو جائے۔''

ہلکی سی مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر آ گئی۔

دراصل اماں کے ساتھ ان کے آنے کا مقصد بھی یہی تھا' کہ وہ سمو کو دیکھ لیں، پرکھ لیں۔ طیبہ بیگم کی دلی خواہش تھی کہ وہ سمو کو اپنی بہو بنائیں۔ اگرچہ تیمور ان سے دو برس چھوٹے تھے' اور ان کے تردد کی وجہ بھی شاید یہی تھی۔ اور انہوں نے اماں کو سمجھانے کی بہت کوشش کی تھی کہ مرد اور عورت کی عمر میں کم از کم چھ سات برس کا فرق ضرور ہونا چاہیے' اور اس حساب سے تو مینو پوری اترتی تھی' لیکن جب انہوں نے سمو کو دیکھا' تو بے اختیار اماں کے انتخاب کی داد دی' لیکن پھر اس

کے سرد رویے سے وہ کچھ مایوس سے ہو گئے تھے' مگر اب تینی کی باتوں پر ہنستی ہوئی وہ انہیں بڑی اپنی اپنی سی لگی' اور انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اماں کی بات مان لیں گے۔

''ارے تیمور بھائی آپ کے ہنسنے پر پابندی ہے کیا؟''

تنویر نے انہیں بلایا تو وہ چونکے۔

''کیوں ..... کیا ہوا؟''

''کچھ نہیں' لیکن میں نے اتنا اچھا لطیفہ سنایا' اور آپ مسکرائے تک نہیں۔''

''دراصل میں کچھ اور سوچ رہا تھا۔''

''ابھی آپ اتنے امیچور نہیں ہوئے تیمور بھائی کہ ہنسنے میں ہمارا ساتھ بھی نہ دے سکیں۔''

کاشف نے بازو پکڑ کر انہیں کھینچا تو وہ ہنستے ہوئے کھڑکی کے پاس سے ہٹ آئے۔

❋ ❋ ❋

اور پھر کتنے سارے دن گزر گئے۔ امینہ کو پھوپھو' تیمور بھائی اور تنویر بہت یاد آتے۔ اس کا بہت دل چاہتا کہ وہ چھٹیوں میں پھوپھو کے پاس جا کر رہے' لیکن ہر بار کوئی نہ کوئی بات ہو جاتی۔ ایک بار اماں بیمار پڑ گئیں' اور ایک بار سمو آپا اڑ گئیں کہ وہ تو عظمت ماموں کے ہاں جائیں گی۔ حالانکہ ان کے تین ووٹ تھے، وہ اور کاشف پھوپھو کے ہاں جانا چاہتے تھے، جب کہ اماں اور آپا عظمت ماموں کے ہاں اور ہمیشہ کی طرح سمو آپا اور اماں ہی جیتیں، کاشف ناراض ہو گیا۔

"مجھے نہیں جانا ان کے ہاں، ایسا لگتا ہے' جیسے کوئی گناہ کیا ہو ان کے ہاں جا کر۔ نوکر کھانا لگا دے گا، نوکر ناشتہ دے دے گا اور نوکر ہی۔"

"یہ تم نہیں تمہارا کمپلیکس بول رہا ہے کاشی۔"

سمینہ نے کہا تو وہ چڑ گیا۔

"کمپلیکس تو آپ کو ہے آپا۔"

اور اس سے پیشتر کہ جھگڑا طول کھینچتا ابا نے بیچ بچاؤ کر کے فیصلہ سنا دیا کہ کاشف سمینہ اور امینہ کو عظمت ماموں کے ہاں چھوڑ کر خود گاؤں پھوپھو کے ہاں چلا جائے گا' اور پھر واپسی پر ان کو لیتا آئے گا۔

"کیا ہی اچھا ہوتا کہ ابا اسے بھی کاشف کے ساتھ پھوپھو کے ہاں بھیج دیتے۔"

اس نے بے دلی سے سوچا تھا' اور چپکے چپکے دو چار آنسو بھی بہا ڈالے تھے۔

"مجھے تم سے دلی ہمدردی ہے مینو۔"

کاشف نے بڑی سنجیدگی سے کہا تھا' اور اس سے پہلے کہ وہ اسے مارنے کے لیے اٹھتی وہ بھاگ گیا تھا۔ اور وہ عظمت ماموں کے ہاں جا کر کس قدر بور ہوئی تھی۔ حسب معمول مہمان خانہ ان کے لیے کھول دیا گیا تھا۔ ماموں اور ممانی سے کبھی کبھار ہی ملاقات ہوتی۔ رہے بچے ٹینا، شینا اور نونی ان کی اپنی مصروفیات تھیں۔ دو تین بار وہ کرامت ماموں کے ہاں بھی گئیں' اور چچی

اور ڈیزی سے ہیلو ہائے کے سوا کوئی بات نہ ہوئی۔ مون اور چاند اپنے گروپ کے ساتھ کسی ورائٹی پروگرام میں حصہ لینے کے لیے لاہور گئے ہوئے تھے، وہ حد سے زیادہ بور ہو رہی تھی' اور چپکے چپکے دل ہی دل میں کاشف کے آنے کی دعائیں مانگتی' لیکن سمینہ بہت خوش تھی' کیونکہ شوبی اچانک ہی امریکہ سے آ گیا تھا۔

"ارے تم اچانک کیسے آ گئے شوبی۔"

سمینہ نے بے حد خوش ہو کر پوچھا۔

اس وقت وہ دونوں ناشتے کے لیے جا رہی تھیں کہ وہ اچانک ہی کوریڈور میں مل گیا۔

"سچ بتاؤں۔"

"ہوں۔"

"تم جو یہاں تھیں میرے دل نے کہا' اور میں بھاگا چلا آیا۔"

"اوہ نائی!" سمینہ نے سرخ ہوتے ہوئے کہا۔

"ایک دم فضول۔ یہ آپا اتنا بن بن کر کیوں بولتی ہیں۔" اس نے بیزاری سے سوچا۔

"یہ مینو ہے نا۔"

وہ اس کی طرف متوجہ ہو گیا' تو اس نے ادب سے سلام کیا۔

"سلام شعیب بھائی۔"

"وعلیکم السلام۔" وہ مسکرا دیا۔ "بڑی باادب بچی ہو۔"

تب اس نے پہلی بار سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ مون اور چاند کے مقابلے میں خاصا معقول لگ رہا تھا' لیکن تیمور بھائی کا اور اس کا کیا مقابلہ۔ آپا تو بس یونہی ہر چمکتی چیز کو سونا سمجھتی ہیں۔ اب وہ شوبی کے متعلق جو بھی رائے رکھتی تھی' لیکن اتنا ضرور ہوا کہ اس کے آنے سے اس کی بوریت کافی حد تک دور ہو گئی تھی۔ شوبی نے انہیں خوب تفریح کروائی تھی' اور انہوں نے خوب انجوائے کیا تھا۔ اکثر تو شوبی اور آپا تنہا ہی چلے جاتے تھے' وہ آپا کو دیکھ کر حیران ہوتی رہتی تھی۔ اور اسے پختہ یقین ہو گیا کہ آپا تو گردن گردن شوبی کی محبت میں ڈوب چکی ہیں' اور یہ کہ اب تیمور بھائی اور ان کا نجوک ناممکن ہے، بے چارے تیمور بھائی۔

وہ بڑی مایوس ہو کر واپس آئی تھی' اور اس نے دل ہی دل میں عہد کر لیا تھا' کہ اب کے چاہے کچھ بھی ہو اگلی چھٹیوں میں وہ ضرور پھوپھو کے ہاں جائے گی' اور وقتاً فوقتاً وہ اماں اور ابا کو یاد دہانی کراتی رہتی تھی کہ ان چھٹیوں میں اسے پھوپھو کے ہاں جانا ہے۔ سمو آپا نے بھی کوئی

اعتراض نہیں کیا تھا۔ یوں شوبی واپس جا چکا تھا۔

اس روز جب کالج میں اس نے سنا کہ چھٹیاں اس دفعہ وقت سے پہلے ہی ہو جائیں گی' کیونکہ شدید گرمی پڑ رہی ہے تو بے حد خوش ہوئی' اور کالج سے آ کر بجائے اپنے کمرے میں جانے کے' سیدھی اماں کے کمرے کی طرف گئی' تا کہ انہیں یاد دہانی کرا دے کہ ایک دو روز میں چھٹیاں ہونے والی ہیں' اور انہیں پھوپھو کے ہاں جانا ہے۔ دروازے کے پاس رک کر اس نے دوپٹہ درست کیا۔ اور کتابیں ساتھ پڑی کرسی پر رکھ دیں' تب ہی اندر سے اماں کی آواز آئی۔

''یہ کیسے ہوسکتا ہے' سمو تیمور کو پسند نہیں کرتی' اور پھر آپ خود اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس کا مزاج اور طرح کا ہے۔ وہ طیبہ کے ہاں خوش نہیں رہ سکے گی۔''

''تو پھر۔'' یہ ابا کی آواز تھی۔

میں وہیں کھڑی ہو کر سننے لگی۔

''میرا خیال ہے شوبی اور سمو کا جوڑ ٹھیک رہے گا۔''

''وہ تو ٹھیک ہے' لیکن کیا کبھی بھابی جان نے تم سے ایسی کوئی خواہش کی؟''

ابا پوچھ رہے تھے۔

''نہیں، لیکن ایک بار عظمت بھائی نے ذکر کیا تھا کہ شوبی اور سمو کی بہت انڈر اسٹینڈنگ ہے۔''

''اچھا، مگر اب آپا کو کیا جواب دوں؟ کتنے مان سے انہوں نے سمو کو تیمور کے لیے مانگا ہے۔''

''ہائے تو کیا پھوپھو کا خط آیا ہے۔'' اس نے سوچا۔

''تیمور پڑھا لکھا ہے، اچھی شکل وصورت کا ہے اور اب تو مقابلے کا امتحان بھی اس نے پاس کر لیا ہے۔ کیا جواز ہوا انکار کا؟''

سید جعفر علی پریشان سے تھے۔

''ہمیں اپنے بچوں کی بھی خوشی کا خیال رکھنا چاہیے نا' اور سمو کو میں اچھی طرح جانتی ہوں۔''

زندگی میں پہلی بار شاید اماں نے عقلمندی کی بات کی تھی۔

''آپ آپا کو لکھ دیں، مینو بھی تو ہماری بیٹی ہے۔ جیسی وہ' ویسی ہی مینو۔ وہ مینو کو تیمور کے لیے قبول کر لیں۔ کیونکہ سمو کے لیے ہم نے عظمت بھائی سے ہاں کر دی ہے۔''

''مگر ابھی ہاں تو نہیں کی۔''

''اوہو تو آپ لکھ دیں کہ سمو کو ان کو بیٹا پسند نہیں ہے۔'' اماں کی اوہو پر اسے ایک دم ہنسی آ گئی' اور جلدی سے دروازے کے پاس سے ہٹ آئیں۔ لیکن دل عجیب انداز سے دھڑک رہا تھا۔ دھک...... دھک...... دھک۔

اس نے بے اختیار دل پر ہاتھ رکھ لیا' ایسا تو اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اور اب یہ اماں کیا کہہ رہی تھیں' وہ دھڑ کتے دل کو سنبھالے اپنے کمرے میں آ گئی۔

یہ ایک نیا جذبہ تھا جس سے وہ روشناس ہوئی تھی۔ ایک انوکھا اور عجیب سا جذبہ' دل رہ رہ کر تیزی سے دھڑک اٹھتا اور رخسار دہکنے لگتے۔ وہ اور تیمور اور وہ۔ اور یہ احساس بڑا ہی خوش کن اور دلکش تھا کہ تیمور جیسا وجیہ اور اچھا شخص اس کی زندگی کا ساتھی بنے گا۔ کتنے سارے دن گزر گئے تھے' وہ اپنے میں مگن ہر وقت تیمور کے متعلق سوچا کرتی۔ گھر میں باری باری سب نے ہی اس کی خاموشی کو محسوس کیا' اور وجہ پوچھی' لیکن اس نے ٹال دیا' اب وہ کیا کہتی کہ اس کے اندر عجیب سے جذبوں نے ہلچل سی مچا رکھی ہے۔ ایسے جذبے' جن سے اس کے اندر رنگ ہی رنگ بکھر گئے ہیں۔ خوبصورت' خوشنما رنگ اور اس کے وجود میں ایک خوشبو سی پھیل گئی ہے' محبت کی خوشبو اور وہ ہرن کی طرح اپنی خوشبو میں مست ہوئی جا رہی ہے۔

''شاید مجھے تیمور بھائی سے محبت ہو گئی ہے۔'' اس نے کاپی پر آڑی ترچھی لکیریں مارتے ہوئے سوچا۔

مگر کیا محبت ایسی ہوتی ہے کہ دل کسی کے نام پر یکدم دھڑک اٹھے۔ تیز اور تیز جیسا کہ میرا دل تیمور بھائی کے تصور سے ہی دھڑک اٹھتا ہے۔

پتا نہیں ابا نے پھوپھو جان کو خط لکھا ہے یا نہیں' اور اگر لکھ دیا ہے تو جانے پھوپھو جان کیا جواب دیں' کیا پتا تیمور بھائی مجھ سے شادی کرنے سے انکار کر دیں۔ میں آپا جتنی خوبصورت بھی تو نہیں، اور پھر تیمور بھائی تو مجھے بچی سمجھتے تھے۔ اور اب تو دو سال میں میں خاصی بڑی ہو گئی ہوں۔ تیمور بھائی دیکھیں تو حیران رہ جائیں۔ لیکن سمو آپا۔

''مینو۔ مینو!'' کاشف اسے بلاتا ہوا اندر آ گیا۔

''یہ تم اعتکاف میں کیوں بیٹھی ہوئی ہو۔''

اس نے امینہ کے ہاتھ سے کاپی لے لی۔ وہ خالی خالی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس نے ایک نظر کاپی پر دیکھا' جہاں ٹیڑی میڑھی' آڑی ترچھی لکیریں ماری ہوئی تھیں' اور پھر یوں ہی کاپی ہاتھ میں پکڑے پکڑے اس کے قریب بیٹھ گیا' اور بڑے پیار سے پوچھا۔

"کیا بات ہے مینو، تم اتنی چپ چپ سی کیوں ہو۔" اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"نہیں کوئی بات تو ہے۔ کیا کوئی سہیلی ناراض ہو گئی ہے؟ یا پھر۔"

"نہیں کوئی بات بھی نہیں ہے کاشی۔"

اس نے بھاری آواز میں کہا' اور خود بخود ہی اس کی آنکھیں نم ہوئی جا رہی تھیں۔

"کوئی بات تو ہے مینو' کیا مجھے نہیں بتاؤ گی۔" کاشف نے بڑے خلوص اور محبت سے کہا' تو آنسو بے اختیار اس کی آنکھوں میں آ گئے۔

"کاشی! کیا میں سو آپا کے مقابلے میں بہت بدصورت ہوں۔"

"اوہ!" کاشف نے گہرا سانس لیا۔

"تو آپا نے کچھ کہا ہے۔ دیکھو مینو تم آپا کی بات کا برا نہ مانا کرو۔ وہ تو ہمیشہ سے ایسی ہی ہیں کچھ کچھ مغرور سی اور پھر اس میں آپا کا بھی کچھ قصور نہیں ہے۔ دراصل اماں نے ہی انہیں......"

"کاشی۔" اس نے اسے ٹوک دیا۔

"آپا دل کی بری نہیں ہیں مینو۔"

"مجھے پتا ہے۔"

اس نے انگلی کی پوروں سے اپنے آنسو پونچھے۔

"بس تم مجھے صرف یہ بتاؤ کہ کیا میری شکل بہت بری ہے؟"

"اگر میں کہوں ہاں تو تم کیا کر لو گی۔"

کاشف کو شرارت سوجھی۔

"میں، میں بھلا کیا کر سکتی ہوں۔"

اس نے دکھے دل سے کہا' اور ایک بار پھر آنسو اس کی آنکھوں میں آ گئے۔

"دیکھو مینو۔ تم بہت پیاری' بہت خوبصورت ہو' اور یہ تم سے کس نے کہہ دیا کہ تمہاری شکل بری ہے۔ کچھ خوبصورتیاں ایسی ہوتی ہیں' جو دکھائی دیتی ہیں' اور کچھ ایسی ہوتی ہیں' جنھیں صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ تمہاری خوبصورتی صرف نظر ہی نہیں آتی' محسوس بھی ہوتی ہے۔"

"اوہ!"

اس نے بڑی حیرت سے کاشف کو دیکھا' جو عمر میں اس سے چھوٹا تھا' اور فرسٹ ایئر کا سٹوڈنٹ تھا' لیکن کتنی بڑی بڑی باتیں کر رہا تھا۔

"تم سچ کہہ رہے ہو نا؟"

اس کی آنکھوں میں جگمگاہٹیں سی اتر آئیں۔

"یقین نہیں آتا تو آئینے میں دیکھ لو۔"

"ارے مینو کی بچی! تمہاری تو آنکھیں ہی اتنی خوبصورت ہیں کہ آپا کا سارا حسن ایک طرف اور تمہاری آنکھیں ایک طرف۔"

"اچھا سچ۔" اس نے ہولے سے اپنی آنکھوں پر ہاتھ پھیرا۔ لڑکیاں بھی تو اس کی آنکھوں اور اس کی پلکوں کی بہت تعریفیں کرتی تھیں۔

"چلو اب اٹھو۔ باہر چلو اور ایک کپ چائے بنا دو۔ مجھے سر میں درد ہو رہا تھا۔ ابا بے چارے آرام کر رہے ہیں' اور تمو شاید کہیں کام سے باہر گیا ہے۔"

"اچھا۔" وہ اٹھ کر چپل پہننے لگی۔

"اور وہاں یہ پھوپھو جان کے ہاں جانے کا چاؤ ختم ہو گیا؟" کاشف نے اس کے پلنگ پر دراز ہوتے ہوئے پوچھا۔

"کہاں تو صبح و شام ابا جان کو یاد دہانی کرائی جاتی تھی' اور کہاں اب چھٹیاں ہوئے دس دن بیت گئے ہیں' محترمہ نے ایک دفعہ بھی جانے کو نہیں کہا۔"

اب اسے کیا پتا کہ اماں میرے متعلق کیا سوچ رہی ہیں اور پتا نہیں......

"وہ تو اچھا ہوا ابا نے رات خود ہی مجھ سے کہا کہ پروگرام بنا لو۔" کاشف نے کہا۔

"سچ۔" بے اختیار اس نے مڑ کر اسے دیکھا۔

"ہاں ابا میں اور تم پھوپھو جان کے ہاں چلیں گے' اور اماں اور آپا کرامت ماموں وغیرہ کے ہاں جائیں گی۔"

"مگر۔ مگر کیا پھوپھو جان کا کوئی خط آیا ہے۔"

"نہیں۔ میرے خیال میں تو نہیں۔"

کاشف نے آنکھیں بند کر لیں' اور یونہی آنکھیں موندے موندے کہا۔

"سنو اگر سر درد کی ایک گولی مل جائے تو وہ بھی لیتی آنا۔"

"اچھا!"

وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔ لیکن میرے اندر پھر وسوسے سے جاگ اٹھے تھے۔

جانے پھوپھو کیا کہیں۔

کیا پتا وہ صرف سمو آپا کو ہی بہو بنانا چاہتی ہوں۔ لیکن نہیں' سمو آپا سے زیادہ تو وہ مجھ سے پیار کرتی تھیں۔

سمو آپا تو گھڑی دو گھڑی کے لیے کبھی ان کے پاس بیٹھتی تک نہ تھیں۔ بس سارا وقت کمرے میں ہی گھسی رہتی تھیں، پھوپھو کا کتنا دل چاہتا تھا کہ وہ ان کے پاس آ کر بیٹھیں' اور باتیں کریں۔ مگر آپا انہیں تو بس شوبی بھائی اچھے لگتے ہیں۔ شکر ہے وہ مون اور چاند کی طرح جوکر نہیں لگتے بس گوارا ہی ہیں۔ اس نے برا سامنہ بناتے ہوئے چائے کا پانی چڑھا دیا۔

تب ہی آپا بوکھلائی ہوئی سی اندر داخل ہوئیں۔

"ارے مینو۔ سنو۔ سنو تو۔"

"کیا ہوا آپا؟" وہ گھبرا کر مڑی۔

"وہ ...... وہ آئے ہیں مینو شوبی، آنٹی اور عظمت ماموں۔"

"کیا؟"

اسے بھی حیرت کا شدید جھٹکا لگا، کم از کم اس کے ہوش میں پہلی بار آنٹی اور شوبی ان کے گھر آئے تھے' البتہ کرامت ماموں اور عظمت ماموں ایک دو بار آئے تھے' ایک بار جب اماں شدید بیمار پڑی تھیں' اور ایک بار جب ابا کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔

"ہاں میں نے ابھی کھڑکی میں سے دیکھا ہے، وہ لوگ گاڑی میں سے سامان اتار رہے تھے۔ دیکھو مینو بیل ہو رہی ہے۔"

سمو بہت ایکسائیٹڈ ہو رہی تھیں۔

"کاشی ...... کاشی۔"

انہوں نے وہیں کچن کے دروازے میں سے آواز دی۔

"دیکھو باہر کون آیا ہے۔"

اور پھر امینہ کو وہیں حیران و پریشان چھوڑ کر وہ باہر کی طرف بھاگیں' تا کہ اماں کو ان کے آنے کی اطلاع دے سکیں۔

امینہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

ہو نہ ہو آنٹی ضرور سمو آپا کے لیے شوبی بھائی کا رشتہ لائی ہیں۔

اس نے سوچا اور تھوڑی دیر بعد جب آپا رات کے لیے کھانے کی ہدایت دینے کچن میں آئی' تو اس نے آپا سے بھی یہ بات کہہ دی۔

"آپا یہ آنٹی اور عظمت ماموں کہیں شوبی بھائی کا رشتہ لے کر تو نہیں آئے۔"

"شاید۔" سمو آپا کے رخساروں پر شفق دوڑ گئی۔

"سمو آپا! آپ کو شوبی بھائی بہت اچھے لگتے ہیں۔"

اس نے آہستگی سے پوچھا۔

"ہاں۔" سمینہ کی پلکیں جھک گئیں۔

"اور شوبی بھائی بھی آپ کو۔"

"ہوں۔" اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"شوبی تو کہتا ہے کہ وہ میرے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔"

"اچھا۔"

اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں کو مزید پھیلا لیا۔

"آپ وہاں عظمت ماموں کے گھر بہت خوش رہیں گی آپا۔"

سمینہ نے اس کی طرف دیکھا، اس کی یہ چھوٹی بہن کس قدر احمق اور بے وقوف سی تھی' اور کیسے الٹے سیدھے سوالات کرتی تھی۔

"مینو تم بھی بس۔"

"آپا، میری اچھی آپا!" اس نے سمینہ کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

"خدا آپ کو ہمیشہ خوش رکھے ہمیشہ اور شوبی بھائی بھی آپ کو ہمیشہ اسی طرح چاہتے رہیں۔"

اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

"پاگل ہو تم بھی مینو۔"

سمینہ نے اس کی بانہیں اپنے گلے سے نکالیں' اور بوا کو دیکھنے لگیں' جو ایک طرف بیٹھی پیاز چھیل رہی تھیں۔

امینہ نے ایک نظر سمینہ کی طرف دیکھا' اور پھر تیزی سے باہر نکل آئی۔ خوامخواہ ہی اس کا دل بھر آیا تھا۔ بس وہ ایسی ہی تھی' چھوٹی سی۔ بات بات پر رو دیتی تھی' اور چھوٹی چھوٹی باتیں ہی اسے خوش کر دیتی تھیں۔ اب اس وقت سمینہ سے جدائی کا خیال اس کے اندر ہی اندر پگھلا رہا تھا۔

"اللہ! آپا چلی جائیں گی تو کس قدر یاد آئیں گی۔" اس نے اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے سوچا۔

کاشف ٹوکری ہاتھ میں اٹھائے گنگناتے ہوئے اپنے کمرے سے باہر نکلا۔

"کدھر جا رہے ہو؟" امینہ نے پوچھا۔

"آم، آلو بخارے، آئسکریم۔"

وہ جیب سے لسٹ نکال کر پڑھنے لگا۔

"بس بس۔"

امینہ نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔

"لگتا ہے اماں آج ہی انہیں ساری ڈشز کھلا دیں گی، بھئی اب وہ لوگ آئے ہیں تو کچھ دن رکیں گے ہی نا۔"

"ہاں شاید۔"

وہ ٹوکری جھلاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

اس نے ذرا سا جھانک کر دیکھا۔ شوبی بھائی کاشف کے بیڈ پر لیٹے تھے۔ عظمت ماموں اور ممانی تو ابا کے کمرے میں آرام کر رہے تھے اور اماں بے چاری اکیلی بڑے کمرے میں بیٹھی پان بنا بنا کر کھا رہی تھی۔ اب ظاہر ہے ممانی تو ممانی تھیں' کوئی پھوپھو جان تو تھیں نہیں کہ سب کے ساتھ بڑے کمرے میں بیٹھی تھی اور سفر کی تھکان کے باوجود باتیں کیے جا رہی ہیں۔ حتیٰ کہ رات کو بھی ضد کر کے سب کے بستر بڑے کمرے میں لگوا دیئے تھے (سوائے سمو آپا کے) کہ سالوں بعد تو ملے ہیں جی بھر کر باتیں کریں گے' اور یہاں تو بڑی ممانی نے ڈھنگ سے بات تک نہ کی تھی۔ چائے وغیرہ سے فارغ ہو کر آرام کرنے چلے گئے تھے۔ وہ اپنے کمرے کی طرف جاتے جاتے پلٹ آئی۔

"اماں!" اس نے بڑے کمرے میں جھانکا۔

"آپ بھی تھوڑی دیر آرام کریں، ابا تو شاید دیر سے آئیں۔"

"لو بھلا اب کہاں آرام کا ٹائم ہے، چار تو بجنے والے ہیں۔ اور میں نے تو ابھی نماز بھی نہیں پڑھی۔"

"تو پھر جلدی کریں نا دیر ہو رہی ہے۔ ابا کہتے ہیں نماز میں دیر نہ کیا کرو۔"

"اچھا سبق نہ دے مجھے۔"

"اماں یہ اچانک ماموں جان کیسے آ گئے۔" اس نے تجسس سے پوچھا۔

"پہلے تو یہ لوگ کبھی نہیں آئے تھے ہمارے گھر۔"

"اے عظمت کوئی فارغ تو بیٹھے نہیں کہ جب دل چاہا اٹھ کے چل دیں' سو طرح کے کام ہوتے ہیں۔ اب دل چاہا ہوگا، فرصت ہوگی تو چلے آئے۔ بہن کا گھر ہے جم جم آئیں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے اماں لیکن۔"

بات تو اس کے دل میں اٹکی ہی نہ تھی، کھد بھد ہو رہی تھی کہ اپنے خیال سے اماں کو آگاہ کر دے۔

"وہ میرا خیال ہے اماں۔"

اس نے بڑی رازداری سے اِدھر اُدھر دیکھا۔

"ہو نہ ہو ماموں جان ضرور آپا کے لیے شوبی بھائی کا رشتہ لائے ہوں گے۔"

اماں کی آنکھوں میں جگمگاہٹیں سی اتر آئیں، مینو نے تو ان کے دل کی بات کہہ دی تھی۔

"چل ہٹ جو منہ میں آتا ہے بک دیتی ہے۔"

انہوں نے اپنی خوشی دل ہی میں چھپاتے ہوئے کہا۔

"نہیں سچ اماں۔"

وہ ان کے کندھے پر لٹک سی گئی۔

"جب ہم ماموں جان کے ہاں گئے تھے نا تو شوبی بھائی' سچی اماں شوبی بھائی اور سمو آپا کا جوڑا خوب رہے گا۔ اماں آپ سمو آپا کی شادی جلد کر دیں گی۔"

"مینو تو تو سچ پاگل ہے۔"

اماں اسے جھٹک کر کھڑی ہو گئیں۔

"نماز کو دیر ہو رہی ہے۔ ہاں سنو' کوفتے تم خود بنانا، بوا کوفتے یوں بناتی ہیں' جیسے کسی کا سر پھاڑنا ہوا ان سے۔"

"ٹھیک ہے' اماں بنا لوں گی۔"

وہ منمنائی۔

"لیکن اماں کیا عظمت ماموں اور آنٹی آپا کی منگنی کر کے جائیں گے۔ میں آپ کی منگنی پر اپنی سہیلیوں کو بھی بلاؤں گی۔"

"اوہو تمہاری تو وہ مثل ہے مینو کہ۔"

"پلیز اماں۔" اس نے اماں کو بات مکمل ہی نہ کرنے دی۔

"اچھا بابا بلا لینا اپنی سہیلیوں کو، دعا کرو کہ جو ہم سوچ رہے ہیں ویسا ہی ہو۔"

"ویسا ہی ہوگا اماں۔"

اس نے پورے یقین سے کہا۔

اب اماں کو کیا پتا کہ شوبی بھائی سمو آپا پر کیسے فدا ہوتے رہے تھے اور آپا۔ آپا تو بس شوبی بھائی کا دم بھرتی ہیں۔

وہ وہیں اماں کے تخت پوش پر لیٹ کر آپا کی شادی کے خواب دیکھنے لگی۔

لیکن یہ خواب ہی رہے۔ اور عظمت ماموں شوبی بھائی کا رشتہ ملک نذر احمد کی اکلوتی صاحبزادی ٹینا نذر سے طے کر کے واپس کراچی بھی چلے گئے۔ اسے تو یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ شوبی بھائی سمو آپا کو یوں نظر انداز کر دیں گے۔ کس قدر وہ سمو آپا کی تعریفیں کیا کرتے تھے' اور اب اماں تو کتنی ہی دیر تک گنگ بیٹھی عظمت ماموں کی طرف دیکھتی رہیں' اور بڑی دیر بعد بولیں بھی تو بس اتنا۔

"مگر سید عظمت علی شاہ یہ ملک نذر تو غالباً سید نہیں ہیں۔"

"ہاں ہاں تو کیا فرق پڑتا ہے۔ آج کل ذات پات کوئی نہیں دیکھتا۔ اور پھر یہ لڑکی ٹینا وہاں امریکہ میں اپنے شوبی کے ساتھ پڑھتی ہے۔ گرین کارڈ ہولڈر ہے' اس کے والدین عرصے سے وہیں مقیم ہیں۔ یہاں تو کبھی کبھار ملک صاحب اپنے والد سے ملنے چلے آتے ہیں۔ اور پھر شوبی میاں تو امریکہ ہی سیٹل ہونا چاہتے ہیں۔ آج کل بچوں کی پسند کو اولیت دی جاتی ہے۔ زندگی تو انہوں نے ہی گزارنی ہوتی ہے نا بجو۔"

اور اماں بے چاری تو بس چپ گھپ ٹکر ٹکر انہیں دیکھتی رہیں، ان کی عمر تو اسی خاندان کے چکر میں ہی گزر گئی تھی' اور اگر سید جعفر علی شاہ نہ ملتے تو شاید وہ تو بابل کی دہلیز پر ہی بیٹھی رہ جاتیں۔

ابا نے اس مسئلے پر کوئی خاص تبصرہ نہیں کیا تھا۔

"شکر ہے میں نے ابھی آپا کو جواب نہیں دیا تھا۔" انہوں نے محض اتنا ہی کہا۔

سب سے زیادہ دکھ تو سمینہ کو ہوا تھا۔ کتنے دن تو وہ کمرے سے باہر ہی نہ نکلیں۔

"بے چاری آپا!"

وہ بہانے بہانے ان کی دلجوئی کرنے کی کوشش کرتی' اور شوبی بھائی کو بے نقط سناتی۔

سمینہ کو کتنا شدید صدمہ پہنچا تھا' اور امین کے غم کی نوعیت کتنی گہری تھی، اس کا انہوں نے اظہار نہیں کیا تھا' لیکن وہ دل ہی دل میں بہن کے لیے کڑھتی رہتی۔ پورا گھر ہی اداس لگتا تھا۔

کاشف جو اس ساری صورتحال سے قطعی ناواقف تھا' وہ بھی نہ جانے کیوں خاموش سا تھا' اور اس خاموش فضا میں پھوپھو کے خط نے خوشی کی لہر سی دوڑا دی تھی۔ انہوں نے بڑے خلوص سے سب کو بلایا تھا۔

"بچوں کی چھٹیاں ہیں، اب کے ضرور انہیں بھیجو۔" اور جب جعفر علی شاہ نے سب کی رائے پوچھی تو سب سے پہلے سمینہ نے خوشی کا اظہار کیا۔

"ہاں ابا ہم ضرور جائیں گے' مجھے شوق ہے پھوپھو کے گھر جانے کا۔"

"ایں۔" کاشف اور امینہ نے بیک وقت حیرت سے سمینہ کی طرف دیکھا' لیکن وہ ان سے بے نیاز ابا سے پوچھ رہی تھیں۔

"ہاں تو ابا کب چلیں گے پھوپھو کے ہاں؟"

"ہوں!" مینو نے ہولے سے سر جھٹک کر کاشف کے کان میں سرگوشی کی۔

"یہ آپا ہمیشہ حیران کرتی ہیں۔"

یہ کایا پلٹ ہوئی کیسے؟ آپا تو پھوپھو جان کا نام سن کر ہی اچھل پڑی تھیں۔

کاشف نے بھی جواب میں سرگوشی کی۔

"بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے؟"

وہ بھی منمنائی۔

"اماں! آپ بھی چلیں نا ہمارے ساتھ۔"

"نہ بچو، تم آؤ۔ مجھے اپنے گھر کے سوا کہیں چین نہیں ملتا۔"

اماں سچ مچ اداس تھیں مینو کا دل ان کے لیے دکھ گیا۔

"اماں آپ کرامت ماموں کے ہاں چلی جائیں بہت عرصہ سے نہیں گئیں۔"

اس نے بڑے خلوص سے مشورہ دیا۔

"ارے بچو تم میری فکر نہ کرو، اپنی تیاری کر والیں' بس یہیں ٹھیک ہوں۔ تمہارے ابا چلے جائیں گے ایک دو روز کے لیے۔"

"میں!" جعفر علی شاہ نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں، آپ نے طیبہ کے خط کا جواب تو دیا نہیں تھا۔ اب سامنے ہی بات کر لیجیے گا۔"

"کیا بات؟"

انہوں نے پوچھا تو اماں نے مڑ کر سب کی طرف دیکھا۔

"ایک تو آپ کا حافظہ بڑا کمزور ہو گیا ہے۔"

"اوہ ہاں اچھا ٹھیک ہے۔" ابا کو بھی شاید یاد آ گیا تھا۔

مینو کا دل یکبارگی بڑے زور سے دھڑکا۔ اور اس کے رخسار تپ سے گئے۔ وہ ایک دم کھڑی ہو گئی۔

"تو ہم تیاری کریں۔"

"ہاں۔ ہاں میں کارڈ بنوا لوں گا۔"

اس کے پیچھے ہی ثمینہ اور کاشف بھی نکل آئے۔ اس نے بڑے غور سے آپا کے چمکتے ہوئے چہرے اور مسکراتی ہوئی آنکھوں کو دیکھا' جن میں ملال کے کوئی رنگ نہ تھے، دکھ کا کوئی شائبہ تک نہ تھا۔

"آپا آپ کو دکھ نہیں ہوا شوبی بھائی کی منگنی کا۔" ان کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"لعنت بھیجو سمو آپا اس دھوکے باز، فریبی۔ نفرت ہے مجھے ایسے مردوں سے۔"

"لیکن وہ تو کہتے تھے' آپ کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے' تو کیا اب زندہ رہ لیں گے وہ۔" اس نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"تم بہت بھولی ہوئی مینو۔" سمو آپا نے پیار سے اسے دیکھا۔

"یہ سب مرد ایسے ہی ہوتے ہیں۔ یونہی باتیں کرتے ہیں' لیکن مرتا ورتا کوئی نہیں۔"

"اور آپ آپا؟"

"میں۔" وہ ہولے سے ہنسیں۔

"ہاں آپ شوبی بھائی کے بغیر۔"

"میں ان بے وقوف لڑکیوں میں سے نہیں ہوں مینو۔ جو کسی بات کو روگ بنا لیتی ہیں۔ مجھے دکھ ضرور ہوا' لیکن میں بھی اس شوبی کے بچے کو بتا دوں گی کہ دنیا اس جیسے لوگوں سے بھری ہوئی ہے۔"

"ہاں ٹھیک ہے' سچ تو یہ ہے کہ مجھے تو شوبی بھائی ذرا پسند نہ تھے۔ وہ تو بس آپ کو پسند تھے' نا اس لیے میں بھی راضی ہو گئی تھی۔"

"ہاں تُو تو میری دادی اماں لگتی ہے نا۔" ثمینہ کو بے اختیار ہنسی آ گئی۔

وہ بھی ہنس دی۔

"ارے میری چوڑیاں۔"

اسے اچانک ہی یاد آیا کہ وہ اپنی چوڑیاں جو آج ہی کاشف نے اس سے منگوائی تھیں' وہیں بڑے کمرے میں چھوڑ آئی ہے۔

"آپا آپ چلیں' میں چوڑیاں لے کر آتی ہوں، اتنی پیاری سفید چوڑیاں ہیں کسی کے پاؤں کے نیچے آ کر ٹوٹ نہ جائیں۔"

وہ تیزی سے واپس پلٹی' لیکن پھر بڑے کمرے کے دروازے پر ہی ٹھٹک کر رک گئی۔

"شکر ہے آپ نے ابھی طیبہ کو مینو کے لیے نہیں لکھا تھا۔"

"ہاں ہر بات میں خدا کی مصلحت ہوتی ہے' لیکن ایک بات ہے زینت آرا میرا دل سمو کے لیے ڈرتا ہے، پتا نہیں وہ آپا کے گھر ایڈجسٹ بھی ہو گا یا نہیں۔ اس کا مزاج اور طرح کا ہے۔ آپا اور بچے بڑے سادہ ہیں اور اپنی سمو۔ مینو وہاں خوش رہتی۔"

"ارے چھوڑو جعفر علی مینو ابھی بچی ہے' اور کچھ خبر بھی ہے سمو پورے پچیس کی ہو چکی' اور اب اس عمر میں باہر سے کون پوچھے گا۔ لاکھ خوبصورت سہی لوگ تو عمر دیکھتے ہیں۔ میں نے ہی اس کمبخت شوبی کی امید میں کئی اچھے رشتے ہاتھ سے گنوائے۔ اور اللہ رکھے تیمور افسر ہیں' بیوی کو گاؤں میں تھوڑے ہی رکھیں گے۔ سنا ہے ان کی پوسٹنگ ملتان ہوئی ہے۔"

"تمہیں کس نے بتایا؟"

"کاشی بتا رہا تھا' شاید تنویر نے لکھا ہوا ہے۔ ہاں تو تم طیبہ سے بات کر لینا' بلکہ میں تو کہتی ہوں شادی کی تاریخ طے بھی کر آنا۔ اب دیر نہیں ہونی چاہیے۔ ارے مجھ کمبخت نے پہلے ہی وقت گنوا دیا۔"

"تم نے سمو سے بھی پوچھا؟"

جعفر علی نے دبے لہجے میں کہا۔

"ہوں پوچھ لیا۔"

اماں کی آواز میں خوشی کا تاثر تھا' اور باہر دروازے کے پاس کھڑے کھڑے مینو کو ایسا لگا کہ جیسے کسی نے اس کا دل نوچ لیا ہو۔ دل عجیب طرح سے بیٹھا جا رہا تھا۔

"یا اللہ اگر ایسا نہیں ہونا تھا' تو پھر میرے دل میں یہ خیال آیا ہی کیوں؟ کاش...... کاش! اماں نے اس روز تیمور کے ساتھ میرا نام نہ لیا ہوتا' اور اگر ایسا سوچا بھی تھا' تو میں نے ہی نہ سنا ہوتا۔"

وہ وہیں سے پلٹ آئی' اور اپنے کمرے میں جانے کے بجائے اوپر چھت پر چلی گئی اور نہ جانے کتنی دیر منڈیر سے ٹیک لگائے بیٹھی آنسو بہاتی رہی' لیکن دل پر پڑا بوجھ کم نہ ہوا۔ تب سب کی نظر بچا کر وہ اپنے کمرے میں آ گئی' اور سر درد کا بہانہ کر کے چادر اوڑھ کر لیٹ گئی۔

تو یہ تھا یک طرفہ محبت کا انجام۔

جو پندرہ دن پہلے خود بخود ہی کسی خود رو پودے کی طرح اس کے دل میں پھوٹ پڑی تھی۔

محض اماں کے ایک جملے سے۔

اور آج اماں کے ہی ایک جملے نے اس کے محبت بھرے دل کو ریزہ ریزہ کر دیا تھا۔

اوہ میرے خدا۔

اس نے زور سے اپنی آنکھیں بھینچ لیں۔

آخر یہ میرا دل اس طرح کیوں ٹکڑے ٹکڑے ہوا جاتا ہے۔ صرف پندرہ دن پہلے ہی تو تیمور کا خیال میرے دل میں آیا تھا۔ اور......

اور ایک آپا ہیں پورے پانچ برس تک شوبی بھائی کی محبت کا دم بھرتی رہیں۔

اور شوبی بھائی نے بھی تو انہیں کیسی کیسی امیدیں دلائی تھیں۔ کتنے وعدے کیے تھے، کتنی قسمیں کھائیں تھیں۔ پھر بھی آپا ان کی بے وفائی کے بعد بھی کتنی مطمئن ہیں۔

کس قدر شانت۔

اور ایک وہ ہے کہ نہ تو اس نے تیمور سے محبت کا اقرار کیا' اور نہ ہی تیمور بھائی نے کوئی قسمیں کھائی' کوئی وعدے کیے پھر بھی۔

پھر بھی، اس کا دل ریزہ ریزہ ہوا جاتا ہے' اور روح جیسے ٹکڑے ٹکڑے ہو رہی ہے۔

شاید میں بہت بے حوصلہ ہوں تھڑدلی۔

میرا دل کمزور ہے۔ میں آپا کی طرح مضبوط نہیں ہوں' اور شاید میرا دل اب عمر بھر یونہی پارہ پارہ رہے۔

اور میری روح یونہی ٹکڑے ٹکڑے ہوتی رہی' اور محبت کی یہ خلش، یہ تڑپ' یہ کسک شاید کبھی ختم نہ ہو۔

اوہ خدایا! ایسا کیوں ہوا میرے ساتھ؟ کیوں؟ اس کی بند آنکھوں میں آنسوؤں نے ایک بار پھر ہلچل مچا دی۔

''مینو۔ مینو تو کہاں رہ گئی تھی۔''

سمو نے باتھ روم سے باہر آتے ہوئے پوچھا۔

''میں سارے گھر میں دیکھ آئی تھی' اور یہ تو چادر اوڑھ کر کیوں لیٹ گئی۔ خیریت تو ہے نا۔''

''میرے سر میں بہت شدید درد ہے آپا۔ اس نے جلدی جلدی آنسو صاف کیے' لیکن آنسو تو بہے چلے جا رہے تھے۔

''ارے کہیں بخار تو نہیں ہو گیا۔''

یہ سمو نے اس کے چہرے سے چادر ہٹائی۔

''تو رو رہی ہے مینو پگلی رونے سے تو درد اور بھی بڑھ جائے گا۔''

''آپا بہت درد ہے' نا قابلِ برداشت۔''

وہ دونوں ہاتھ چہرے پر رکھ کر رونے لگی تو سمو گھبرا گئیں۔

''ارے ارے رو نہیں' میں ابھی کاشی کو بھیج کر ڈاکٹر صمد سے دوا منگواتی ہوں۔''

کبھی کبھی کوئی جھوٹ بھی کتنا کارآمد ہوتا ہے۔ سمو کے جانے کے بعد اس نے روتے روتے سوچا' لیکن نہیں جھوٹ کہاں۔

درد تو واقعی نا قابلِ برداشت ہے۔

یہ الگ بات تھی کہ یہ درد سر میں نہیں دل میں تھا' اور رہ رہ کر دل میں درد کی لہریں سی اٹھ رہی تھیں' اور درد کی اس شدت میں تو کئی دن گزرنے کے بعد بھی کمی نہیں آئی تھی۔ البتہ آنسو خشک ہو گئے تھے۔ سید جعفر علی نے ایک ہفتے کی چھٹی لے لی تھی۔ کاشف اور سمو نے بھی اپنی پیکنگ کر لی تھی۔ لیکن اس کا جانے کا موڈ نہیں ہو رہا تھا۔

ابھی درد نا قابلِ برداشت تھا۔

ابھی شاید زخم مندمل ہونے میں کچھ وقت لگے، پھر سہی۔ اگلے سال وہ پھوپھو جان کی طرف چلی جائے گی۔ تب تک شاید دل سنبھل جائے گا۔ اسے اقرار آ جائے گا۔ آخر ٹکڑے ٹکڑے دل کو جڑنے میں کچھ وقت تو لگتا ہی ہے نا۔

اس نے اماں سے کہا کہ......

وہ نہیں جائے گی' انہیں کے پاس رہے گی۔ لیکن کسی نے اس کی ایک نہ سنی۔

''اماں آپ اکیلی ہوں گی۔''

''بوا ہیں، نمو ہے' اور پھر وہ نمو اپنی بیوی کو بھی لے آئے گا۔ اکیلی کیسی؟''

اماں نے صاف انکار کر دیا۔

"کوئی رہنے کی ضرورت نہیں۔ بہن بھائی کے ساتھ جاؤ گھومو پھرو۔ کہاں تو سارا سال میرا کان کھاتی رہتی ہے۔ اور کہاں اب نہ بی بی مجھ پر ترس کھانے کی ضرورت نہیں۔ سدھارو اپنے ابا کے ساتھ ایک بار جی بھر کر رہ آؤ۔"

اور وہ بے حد اداس اداس اور چپ چپ سی چلی آئی۔

پھوپھو جان کا گھر بہت بڑا تھا۔ ان کے گھر سے بھی بڑا۔ ڈھیروں تو کمرے تھے وہاں' اور پھر پھوپھا جان بھی بہت اچھے تھے' بالکل ابا کی طرح نرم نرم لہجے میں ٹھہر ٹھہر کر بات کرتے۔ سب ہی ان کے آنے سے بہت خوش تھے۔ پھوپھو تو واری صدقے ہو رہی تھیں۔ اسے گاؤں' پھوپھو کا گھر' وہاں کا ماحول سبھی بہت اچھے لگے تھے۔ اور اس کا اداس دل کچھ بہل سا گیا تھا۔ تیمور بھی چھٹی لے کر آ گئے تھے۔ اور سمو کی آنکھوں میں قندیلیں سی جل اٹھی تھیں' اور وہ تیمور بھائی کے ساتھ اِدھر اُدھر کی ڈھیروں باتیں کرتیں' خوب ہنس ہنس کر اور مینو کو حیرت ہوئی۔

"یا اللہ! یہ سمو آپا ایک دم کتنی بدل گئی ہیں' انہیں تو تیمور بھائی ذرا اچھے نہیں لگتے تھے۔ شاید شوبی بھائی کی بے وفائی کی وجہ سے۔"

وہ اکثر سوچتی۔

تنویر اور تیمور دونوں نے ہی اس کی خاموشی اور اداسی کو محسوس کیا۔

"یہ...... مینو کچھ بدل نہیں گئی ہے۔"

ایک روز کھانا کھاتے ہوئے تیمور نے سمینہ سے پوچھا۔

"شاید۔"

سمو نے غور سے اسے دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں بیزاری سی تھی' شاید تیمور کا اس کی طرف متوجہ ہونا انہیں اچھا نہیں لگا تھا۔

"آپ کو نہیں پتا تیمور بھائی!"

تنویر نے شرارت سے اسے دیکھا۔

"یہ فلسفہ پڑھتی ہیں۔"

"اچھا!"

تیمور نے حیرت کا مصنوعی اظہار کیا۔

"کیوں مینو یہ فلسفہ پڑھنے کا مشورہ کس نے دیا تھا' اور اگر فلسفہ پڑھنا ہی تھا' تو فلسفی بننے کی ضرورت کیا تھی۔"

سنجیدہ سے تیمور سمو کی موجودگی میں شوخ ہو رہے تھے۔

"تم نے وہ لطیفہ سنا ہے مینو فلسفی والا۔"

"پلیز تیمور بھائی۔"

اس نے رندھی رندھی آواز میں کہا۔

"ارے برا مان گئی ہو۔ میں تو مذاق کر رہا تھا۔"

"نہیں۔"

اس نے نفی میں سر ہلا دیا' لیکن اس کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں' بڑی مشکل سے ضبط کیے وہ سر جھکائے کھانا کھاتی رہی۔

"اب آپ کو کیا پتا تیمور بھائی! اور شاید آپ کو ساری زندگی خبر بھی نہ ہو کہ کیسا کانٹا میرے دل میں چبھا ہے' اور مسلسل مجھے تکلیف دیے جا رہا ہے' کاش! اے کاش! میں اس کانٹے کو باہر نکال پھینکنے کی ہمت رکھتی اور۔"

اس نے انکھیوں سے انہیں دیکھا' وہ بڑی گہری نظروں سے سمو آپا کو دیکھ رہے تھے۔ ایسی نظریں، جن میں محبت تھی، وارفتگی تھی، اور بہت سی کہانیاں تھیں' جنہیں وہ آنکھوں کی زبان سے سنا رہے تھے' اور سمو آپا سن رہی تھیں۔ سرخ سرخ چہرے اور مسکراتی آنکھوں کے ساتھ۔ وہ ہاتھ پونچھ کر کھڑی ہو گئی۔

"ارے بیٹی تم نے تو کچھ نہیں کھایا۔"

"بس پھوپھو جان طبیعت نہیں چاہ رہی۔ دن کو شاید زیادہ کھا لیا تھا۔"

"مجھے نیند آ رہی ہے۔ میں چلی جاؤں پھوپھو جان۔"

"ضرور ضرور بیٹے اپنا ہی گھر ہے۔"

پھوپھو نے محبت سے کہا۔

"سوری۔"

اس نے سب سے معذرت کی اور باہر نکل گئی۔

"بچی مینو تو بہت سنجیدہ ہو گئی ہے۔ ہے نا۔"

اس کے جانے کے بعد تنویر نے تبصرہ کیا۔

"ہاں، دراصل مینو بہت حساس ہے۔" کاشف نے کہا۔

"وہ چھوٹی چھوٹی باتوں کو محسوس کرتی ہے۔"

"کیا یہاں کوئی بات ہوئی؟" تنویر نے پوچھا۔

"نہیں۔ بس پتا نہیں کیا سوچتی رہتی ہے۔"

کاشف خود اس کے اتنے چپ چپ رہنے پر حیران تھا۔ اسے تو اتنا شوق تھا' یہاں آئے گی' لیکن یہاں آ کر وہ کچھ بجھ سی گئی تھی۔ ضرور ابا نے کچھ کہا ہوگا۔

کاشف کو یقین تھا' لیکن اس نے اپنے اس یقین کا اظہار نہیں کیا' اور تیمور کی طرف متوجہ ہوگیا' جو سمو آپا کو کوئی بہت ہی دلچسپ قصہ سنا رہے تھے۔

"اے تینی! ذرا دیکھ تو آ مینو سوگئی ہے کیا؟ میرا دل ہول رہا ہے۔ کہیں بچی کی طبیعت ہی نہ خراب ہوگئی ہو۔"

کھانا کھانے کے بعد پھوپھو نے کہا' تو تنویر اٹھ کر چلا گیا۔ وہ سچ مچ سوگئی تھی' اور اسے تو پتا ہی نہ چلا کہ کب سمو آپا کھانا وغیرہ کھا کر کمرے میں آئی تھیں۔ اس کی آواز تو کسی کھٹکے سے کھلی تھی۔ شاید سمو آپا کا ہاتھ لگنے سے میز پر پڑا گلاس نیچے گرا تھا۔

"ٹوٹ گیا ہے شاید۔"

یہ تیمور کی آواز تھی۔

"نہیں، بس کچھ ایسے زاویے سے گرا ہے کہ ٹوٹا نہیں۔"

"ہاں کبھی کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ کوئی چیز بلندی سے گر کر بھی نہیں ٹوٹتی' اور کبھی ذرا سی ٹھیس لگنے سے ہی ٹوٹ جاتی ہے۔"

تیمور ہولے سے ہنسے۔

"ہاں، جیسے اس کا دل ذرا سی ٹھیس لگنے سے ٹوٹ گیا ہے' اور آپا کا دل اتنی بلندی سے گر کر بھی نہیں ٹوٹا۔"

اس نے آنکھیں مونڈے مونڈے سوچا۔

"میرا دل بہت نازک ہے سمو! ذرا سی ٹھیس لگنے سے بھی ٹوٹ جاتا ہے۔"

تیمور بہت جذباتی ہو رہے تھے۔

"اسے سنبھال کر رکھنا۔"

آپا نے جانے کیا کہا تھا' اس نے سنا نہیں۔ شاید لمحہ بھر کے لیے اس کا دھیان کہیں اور چلا گیا تھا۔

"شکریہ سمو! میں اس خوش نصیب لمحے کا انتظار بے چینی سے کروں گا۔ جب تم ہمیشہ کے

لیے یہاں آ جاؤ گی۔" اس کا دل ڈوبنے لگا۔

"یا اللہ! یا اللہ!"

اس نے اپنے دل پر ہاتھ رکھ لیا۔

"میں نے یہ سب نہیں چاہا تھا کبھی نہیں، لیکن ایسا ہوگیا۔ میری خواہش اور تمنا کے بغیر یہ شخص، یہ اس قدر خوبصورت اور وجیہہ شخص خود بخود میری تمنا بن گیا۔ جو میرے لیے نہیں تھا تو...... تو ربا! میرے درد محبت میں کمی کر دے۔" اس نے بڑے درد سے دعا مانگی۔

"مولا! مجھ سے یہ درد واپس لے لے۔ یہ کانٹا جو میرے دل میں چبھ کر رہ گیا ہے۔ اسے نکال دے کہ وہ میری بہن کا نصیب ہے۔ اس کا مقدر ہے' اور مجھے وہ دونوں ہی بہت عزیز ہیں۔ خدایا! میرے دل کی اس خیانت کو معاف کر' اور مجھے سکون دے۔ میری آپا کو بہت بہت خوشی اور مسرتیں دے کہ وہ پہلے ہی فریب خوردہ ہیں۔ ایک بار تو انہوں نے اپنے دل کو ٹوٹنے سے بچا لیا ہے۔ لیکن دوسری بار شاید ایسا نہ ہو سکے۔

ربا! میرے ٹوٹے دل کو جوڑ نہ جوڑ' لیکن مجھے خائن نہ بنا۔ اس کی محبت تو درکنار، اس کا تصور بھی اب میرے لیے گناہ ہے کہ وہ میرے آپا کی محبت ہے۔ آقا! میرے دل کو پتھر کر دے۔"

وہ دعائیں مانگتی رہی اور تیمور ہولے ہولے سرگوشیاں کرتے رہے۔

وعدے...... اقرار...... قسمیں اور مستقبل کے سنہرے خواب۔

"یا اللہ! یا اللہ! ان کی خوشیوں کو برباد نہ کرنا۔ ان کے وعدوں کو نبھانا' اور ان کے خوابوں کی تعبیر انہیں دینا۔"

وہ آنکھیں مونڈے بے آواز دعائیں کرتی رہی' اور آنسو بہت ہولے ہولے بہت نرمی سے اس کی آنکھوں کے کونوں سے نکل کر رخسار پر سے ہوتے ہوئے تکیے میں جذب ہوتے رہے۔

ہولے ہولے اس کے ٹوٹے دل کو قرار آ ہی گیا تھا۔ اب تیمور کو دیکھ کر نہ تو اس کا دل دھڑکتا تھا' اور نہ ہی درد کی ٹیسیں اٹھتی تھیں' لیکن پندرہ سولہ سال کی عمر کی اس پہلی محبت نے اس کے دل کو عجب گداز بخش دیا تھا۔ وہ بے حد سنجیدہ' بہت خاموش اور سوبری ہوگئی تھی۔ اس کی بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں میں بس جانے والے سوز نے انہیں اور بھی خوبصورت بنا دیا تھا۔ اور اب اس کی گندم گوں سنہری رنگت میں عجب ملاحت تھی۔ لمحہ بھر کے لیے تو نگاہیں اس کے چہرے پر

تک سی جاتی تھیں۔

"ارے یہ مینو بھی اتنی خوبصورت نکل آئی ہے۔" زینت آرا حیران ہو کر سوچتیں۔

سوکھی سڑی مریل سی مینو اب اتنی دلکش، اتنی پیاری ہو گئی تھی' کہ ایک بار چاند اپنے گروپ کے ساتھ ان کے شہر میں آیا تو اس کے گرد چکور کی طرح گھومتا رہا' اور اماں یہ سوچ سوچ کر خوش ہوتی رہیں کہ چلو سمو عظمت بھابی کی بہو نہ بن سکی تو نہ سہی' مینو کے لیے ضرور کوشش کریں گی کہ کرامت بھابی کی بہو بن جائے۔ چاند اچھا لڑکا ہے' بس ذرا اپنے بے تحاشا لمبے بالوں کو کٹوا لے تو اچھی خاصی شکل نکل آئے۔

زینت آرا پھر خواب دیکھنے لگی تھیں۔ لیکن ان کے خوابوں سے بے خبر مینو اپنے آپ میں مگن تھی۔ کبھی کبھی کسی بھولے بسرے خیال کی طرح اپنی حماقت کا خیال آتا' لمحہ بھر کے لیے دل میں جیسے کوئی کانٹا سا چبھو دیتا' لیکن دوسرے ہی لمحے وہ پورے خلوص سے دعا مانگنے لگتی۔

"مولا! میری آپا کو سکھی رکھنا۔ اور میرے دل سے احساس کا یہ آخری کانٹا بھی نکال دینا' جو کبھی کبھی چبھنے لگتا ہے۔" وہ تو ان کے سکھ اور ان کی اچھی زندگی کی دعائیں مانگ رہی تھی اور سمو آپا؟

انہیں تو ہمیشہ سے حیران کر دینے کی عادت تھی۔ وہ تو بچپن سے یہ یوں اچانک دھماکے کیا کرتی تھیں۔ اس بات سے بالکل بے خبر ہو کر کہ کسی کے دل پر کیا گزرتی ہے۔ اور اب کے تو انہوں نے جو دھماکہ کیا تھا۔ اس نے پورے گھر پر سکتہ طاری کر دیا تھا۔

اور سمو کو تو یوں لگا تھا جیسے کسی نے اس کے وجود کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہواؤں میں بکھیر دیا ہو۔

گھر میں ان کی شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ پھوپھو جان دو چار روز میں تاریخ طے کرنے آ رہی تھیں۔ اور ایسے میں سمو آپا کا یہ کہنا کہ وہ تیمور سے شادی نہیں کریں گی' ایک دھماکے سے تو کم نہ تھا۔

"اے لڑکی! تیرا دماغ تو نہیں چل گیا۔"

زینت آرا جب اس صدمے سے سنبھلیں تو انہوں نے سمینہ کو جھنجوڑ ڈالا۔

"نہیں اماں۔" انہوں نے بڑے رسان سے کہا۔ "میں نے بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے۔"

"تو کیا ساری زندگی میری دہلیز پر ہی بیٹھی رہے گی۔" وہ جھلا گئیں۔ "کبھی اپنی عمر کا

حساب لگایا کتنے برس گزر گئے۔"

"اماں بس میں نے کہہ دیا نا کہ مجھے تیمور پسند نہیں ہیں۔"

"لیکن پہلے تو پسند تھے۔"

"تب میرے سامنے کوئی متبادل راستہ نہ تھا۔"

"اور اب؟" اماں بحث پر اتر آئی تھیں۔

"اب۔"

اس نے دیکھا سمو آپا کی آنکھیں ہیروں کی طرح دمکنے لگی تھیں۔

"وہ میری سہیلی ہے نا زرتاج، اس کا بھائی ہے نادر۔ وہ امریکہ میں ہوتا ہے وہ...... وہ زرتاج مجھے اپنے بھائی کے لیے مانگنا چاہتی ہے۔"

اماں ان کی جرأت پر ششدر رہ گئیں۔

"اور پہلے کہاں تھی یہ زرتاج؟"

"اوہ اماں! نادر تو امریکہ میں تھا۔ ابھی دو ماہ پہلے ہی تو وہ آیا ہے۔ پلیز اماں......"

سید جعفر علی شاہ نے سنا تو وہ زرد پڑ گئے۔

"نہیں، نہیں زینت آرا اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ سمو سے کہہ دو اور میں نے اسی لیے کہا تھا کہ پہلے سمو سے پوچھ لو۔"

"مگر سمو!" زینت آرا نے کچھ کہنا چاہا۔

"کچھ نہیں زینت آرا، اب کچھ نہیں ہو سکتا۔"

ان کا لہجہ قطعی اور فیصلہ کن تھا۔

"سمو کی شادی تیمور سے ہی ہو گی۔"

کاشف جھلایا ہوا تھا۔

"آپا کا تو دماغ خراب ہے۔ شوبی بھائی کی طرح گرین کارڈ پر ریجھ گئی ہیں۔ میں نے دیکھا ہے اس نادر کے بچے کو بندروں جیسی تو اس کی شکل ہے۔"

اور...... وہ اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔

اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ آپا اتنی خود غرض' اتنی لالچی بھی ہو سکتی ہیں۔

کسی کو محبت کے خواب دکھا کر، وعدے اور قسمیں کھا کر مکر جائیں گی۔ یا اللہ' یا اللہ تیمور بھائی کے دل کو ٹوٹنے سے بچا۔ اس نے بڑی منتیں مانیں، بڑی دعائیں کیں۔ ساری ساری رات

جاگ کر نفل پڑھے لیکن سب کچھ بے کار اور بے سود تھا۔

سمو نے بھوک ہڑتال کر دی تھی' اور رو رو کر برا حال کر لیا تھا' اور زینت آرا کے پاؤں پکڑ کر التجا کی تھی۔

"اماں، خدا کے لیے میرا کچھ خیال کریں۔ آپ کو اپنی عزت اپنی بیٹی سے زیادہ عزیز ہے۔ میں تیمور کے ساتھ کبھی بھی خوش نہیں رہ سکتی۔ اس کے اور میرے خیالات میں زمین و آسمان کا فرق ہے، وہ دقیانوسی اور پینڈو ذہن کا ہے۔ وہ مجھے بھی قید کر لے گا۔ میں آزاد فضاؤں میں رہنا چاہتی ہوں، اماں! مجھے گاؤں پسند نہیں ہے۔ مجھے ان کے گھر سے مویشیوں کی لسی اور مکھن کی بو آتی ہے۔ میں یہ جانتی ہوں کہ تیمور افسر ہے، پڑھا لکھا ہے' خوبصورت ہے' لیکن مجھے اس کا بیک گراؤنڈ پسند نہیں ہے۔"

اور ہمیشہ کی طرح زینت آرا اس کے آنسوؤں کے سامنے ہار گئیں' اور جعفر علی شاہ کو بھی ہارنا پڑا۔

کیونکہ جب وہ محاذ پر ڈٹ جاتی تھیں' تو انہیں پسپائی اختیار کرنی ہی پڑتی تھی۔

"میں آپا کو کیا منہ دکھاؤں گا۔' وہ بہت افسردہ تھے۔

"خط لکھ دو۔" زینت آرا نے مشورہ دیا۔" سامنے بات کرنی مشکل ہو گی۔"

آپا خوش تھی' بے حد خوش' لیکن اس کا رنگ زرد پڑ گیا تھا' اور آنکھیں رو رو کر سوج گئی تھیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آپا نے ایسا کیوں کیا؟ کیا وہ تیمور بھائی کو بے وقوف بنا رہی تھیں' اور یہ نادر ہاشمی انہیں کب، کہاں اور کیسے ملا تھا۔ زرتاج تو اکثر آیا کرتی تھی۔ آپا بھی ان کے گھر جاتی رہتی تھیں وہ بھی دو ایک بار آپا کے ساتھ ادھر گئی تھی۔ لیکن یہ سب کب اور کیسے اور کہاں طے پایا تھا۔ اسے کچھ خبر نہ تھی۔ یہ آپا نے محبت کو بھی مذاق سمجھ رکھا ہے شاید، پہلے شوبی بھائی' پھر تیمور اور اب نادر ہاشمی۔

"آپا؟"

اپنے اندر کے دکھ اور کرب سے گھبرا کر اس نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔

"یہ آپ تیمور بھائی پر ظلم نہیں کر رہی ہیں۔"

"کیسا ظلم؟ مجھے اگر ان سے بہتر کوئی شخص مل رہا ہے' تو میں یہ چانس کیوں مس کروں۔"

"پھوپھو کو اور تیمور بھائی کا بدلہ لے رہی ہیں۔"

"نہیں، ایسی کوئی بات نہیں مینو! تو اپنے ذہن پر بوجھ مت ڈال۔ بس میں یہ سمجھتی ہوں

کہ میں تیمور کی نسبت نادر کے ساتھ زیادہ خوش رہوں گی۔"

"اور اگر نادر ہاشمی آپ کو تیمور بھائی سے شادی کے بعد ملتا تو۔"

اس کے لہجے میں تلخی سی آ گئی۔

"تب کی تب دیکھی جاتی مینو چاند، اب تو وہ مجھے مل گیا ہے نا' اور میں اسے کھونا نہیں چاہتی۔"

اور پھر زرتاج کے گھر والے آئے اور انہیں انگوٹھی پہنا گئے' اور وہاں پھوپھو جان تیمور بھائی کی شادی کی کر رہی ہوں گی' اور تیمور بھائی کس قدر خوش ہوں گے' لیکن جب۔ جب انہیں ابا کا خط ملے گا تو؟"

اور اس سے آگے وہ کچھ نہ سوچ پاتی' اور آنسو اس کے اندر گرنے لگتے قطرہ قطرہ کر کے۔

اور اس شام اس نے بے حد اداسی سے ابا سے پوچھا۔

"ابا! پھوپھو کو آپ کا خط مل تو گیا ہو گا نا۔"

"خط!" جعفر علی چونکے۔" ابھی تو میں نے خط لکھا ہی نہیں بیٹا۔ میری ہمت ہی نہیں ہو رہی' کیا لکھوں۔"

"سب صاف صاف لکھ دیں ابا۔ اب یہ تو اور بھی بری بات ہے نا' پھوپھو یہاں آ جائیں اور انہیں پتا چلے کہ سمو آپا کی منگنی آپ نے کہیں اور کر دی ہے؟"

"ہاں بیٹا! آج لکھ دوں گا یہ سمو نے تو آپا کے سامنے ہمیشہ کے لیے میرا سر جھکا دیا ہے۔"

لیکن ان کے خط لکھنے سے پہلے ہی پھوپھو تنویر کے ساتھ آ گئیں' ڈھیروں مٹھائی کے ساتھ۔

"یہ...... یہ سب کیا ہے آپا؟"

"مگر اس سب کیا کیا ضرورت تھی۔"

"واہ کیوں ضرورت نہیں تھی تیمور کی شادی کی تاریخ لینے آئی ہوں، تو کیا خالی ہاتھ چلی آتی۔"

"آپا۔" سید جعفر علی شاہ نے بے بسی سے انہیں دیکھا۔ اور ہونٹ کاٹنے لگے، اماں نے نگاہیں چرا لیں۔

"آپا! دراصل۔"

"پلیز ابا! ابھی نہیں۔ ابھی تو پھوپھو اتنا لمبا سفر کر کے پہنچی ہے' اور ابھی تو سفر کی تکان بھی

نہیں اتری اور آپ۔'' اس نے ملتجی نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔

اور انہوں نے کچھ کہتے کہتے بات بدل دی۔ شاید اس کی اور ابا کی فریکوئینسی یکساں تھی۔

''ہاں، تم لوگ کھانا وغیرہ کھاؤ، نہادھو کے آرام کرو۔ پھر باتیں ہوں گی۔''

اور پھر شام کو جب سمو آپا کے سوا سب ہی بڑے کمرے میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ سید جعفر علی شاہ نے سب کچھ صاف صاف طیبہ بیگم کو بتا دیا۔

''نہیں بھائی! کیسی بات کر رہے ہو۔'' انہیں یقین نہیں آ رہا تھا۔

''میں شرمندہ ہوں آپا بہت' لیکن سمو، وہ کسی صورت میں رضا مند نہیں ہو رہی۔''

''زہر کھانے کی دھمکی دیتی ہے' اور آپ جانتی ہیں کتنی ضدی ہے۔'' زینت آرا نے بات آگے بڑھائی۔

''نہ، نہ خدا نہ کرے کہ اسے کچھ ہو۔ جہاں رہے سکھی رہے، خوش رہے۔''

پھوپھو کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔ اس کی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ وہ پھوپھو کے چہرے کی طرف دیکھ سکے۔

''آپا! میں تو پہلے ہی خلاف تھا' مجھے پتا تھا کہ سمو کا مزاج اور طرح کا ہے۔ میری خواہش تھی کہ مینو کو آپ بہو بنا لیتیں' لیکن آپ نے سمو کی خواہش کی تھی۔''

اس نے تڑپ کر جعفر علی شاہ کی طرف دیکھا۔

''نہیں ابا پلیز نہیں، میرا نام مت لیجیے میں نے پہلے ہی بڑے دکھ سہے ہیں۔ بڑا کرب جھیلا ہے' اور اب کہیں جا کر میرے دل کو قرار آیا تھا۔''

''اور اب تو میں نے مینو کے لیے کرامت بھائی سے ہاں کر دی ہے۔'' زینت آرا نے جتایا۔

''چاند بہت پیارا بچہ ہے۔''

جعفر علی نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا' لیکن کچھ کہا نہیں۔ پھوپھو نے کوئی تبصرہ نہ کیا' وہ بس خالی خالی نظروں سے زمین کو تک رہی تھیں۔ اس کا دل پھوپھو کے لیے کٹ رہا تھا۔ وہ زیادہ دیر وہاں نہ بیٹھ سکی اور اٹھ آئی۔ آپا کمرے میں ہی تھیں' اور شاید نادر سے باتیں کر رہی تھیں۔ وہ اپنے کمرے کی طرف جانے کے بجائے کاشف کے کمرے میں چلی آئی۔ تھوڑی دیر بعد کاشف اور تنویر بھی آ گئے۔ دونوں بہت افسردہ ہو رہے تھے۔

''یہ سمو آپا نے ایسا کیوں کیا مینو؟''

تنویر نے افسردگی سے پوچھا۔

''تیمور بھائی کو تو یقین ہی نہیں آئے گا۔ آپ کو شاید نہیں علم، تیمور بھائی سمو آپا کو کس قدر چاہنے لگے تھے۔ مجھے تو ڈر ہے وہ یہ دکھ برداشت نہ کر سکیں گے۔ انہیں کچھ ہو نہ جائے مینو۔''

''نہیں خدا نہ کرے، تینی! تم انہیں تسلی دینا، دلاسا دینا' ان کا حوصلہ بڑھانا۔ دنیا میں سمو آپا سے کہیں زیادہ خوبصورت لڑکیاں ہیں۔''

''میں جتنا تیمور بھائی کو جانتا ہوں مینو! آپ نہیں جانتیں، وہ آپ ...... آپ کیوں نہیں سمجھاتی سمو آپا کو۔''

''ہم سب نے انہیں بہت سمجھایا ہے' لیکن ہم انہیں مجبور نہیں کر سکتے۔ وہ اپنی مرضی کی مالک ہیں تینی! اور انہوں نے بچپن سے لے اب تک ہمیشہ وہی کیا ہے' جو انہوں نے چاہا، بس تم تیمور بھائی کو سمجھانا' اور ان کی کسی بہت اچھی لڑکی سے شادی کر دینا۔''

''یہ نادر ہاشمی کیا تیمور بھائی سے زیادہ اچھے ہیں؟'' تنویر نے مایوسی سے پوچھا۔

''خاک اچھے ہیں تینی، یہ جو ہماری سمو آپا ہیں نا۔''

کاشف نے جل کر کہا۔ ''انہوں نے ہمیشہ گھاٹے کے سودے کیے ہیں' اور پھر نقصان کو کبھی محسوس ہی نہیں کیا' بلکہ اسے نفع ہی جانتی ہیں۔''

اس نے زور سے مٹھیاں بھینچیں۔

''دل چاہتا ہے اس نادر ہاشمی کے بچے کا گلا گھونٹ دوں جا کر۔''

''کیا فائدہ؟'' اس نے دکھ سے سوچا۔

''سمو آپا کسی اور نادر ہاشمی کو ڈھونڈ لیں گی۔'' اسے آپا پر سخت غصہ تھا' اور وہ دل ہی دل میں ان کی اس خودغرضی پر ان سے سخت خفا تھی۔

''میں آپا سے بات کروں؟'' تنویر نے پوچھا۔

''کر کے دیکھ لو۔''

اس نے سر اٹھا کر تنویر کی طرف دیکھا۔

''اگرچہ کوئی فائدہ نہیں۔''

وہ دونوں آپا کی طرف چلے گئے۔ اور وہ وہیں کاشف کے کمرے میں ہی گھٹنوں پر سر رکھ کر رونے لگی' اور پھر طیبہ بیگم واپس جانے کے لیے تیار ہو گئیں۔ سید جعفر علی شاہ نے بہت روکا۔

"آپا رک جائیں۔ اب سمو کی شادی میں شریک ہو کر ہی جایئے گا، وہ لوگ جلدی کر رہے ہیں۔ لڑکے کو واپس امریکہ جانا ہے۔"

"نہیں، ابھی نہیں بھائی، پھر آ جاؤں گی۔"

پھوپھو رو رہی تھیں۔

آتے ہوئے وہ کتنی خوش تھیں، کتنی مسرور تھیں۔

"نہیں نہیں، پھوپھو پلیز روئیے نہیں، اس طرح مت روئیے۔"

دروازے سے لگے لگے اس نے سوچا۔

اس کا دل کٹنے لگا۔ پتا نہیں کیوں اسے یوں لگا' جیسے پھوپھو اب جا رہی ہیں' تو پھر کبھی نہیں آئیں گی کبھی نہیں۔ اور وہ ایک تعلق ایک ناتا سا جو تھا' وہ ٹوٹ جائے گا۔

وہ دوڑ کر پھوپھو سے لپٹ گئی۔

"پھوپھو! آپ اس طرح مت جایئے ناراض ہو کر' خفا ہو کر۔ ہم سب کو آپ سے محبت ہے۔ مجھے کاشف کو اور ابا کو، پلیز پھوپھو۔ آپ یقین کریں۔"

"نہیں، نہیں میں خفا نہیں ہوں۔"

اور پھوپھو کے سینے سے لگے لگے اس محسوس ہوا کہ واقعی پھوپھو کے دل میں کوئی میل نہیں ہے' کوئی ناراضگی نہیں ہے۔ بس یہ تو غم ہے' دکھ ہے، کاش! اے کاش پھوپھو نے سمو آپا کو نہ چاہا ہوتا۔

پھوپھو نے اس کی پیشانی چومی، اس کے ہاتھوں کو آنکھوں سے لگایا۔

"خدا تمہیں سکھی رکھے۔"

"آپا!" جعفر علی شاہ بے بسی سے بہن کو دیکھ رہے تھے۔

"میں سچ سچ بہت شرمندہ ہوں' اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیسے اس کا اظہار کروں؟ یقین کریں یہ میری دلی خواہش تھی کہ تیمور کو میں اپنا بیٹا بناتا۔"

"تقدیر کی بات ہے جعفر علی شاہ، تمہارا کیا قصور ہے۔" وہ اداسی سے بولیں۔

"اب ابا ہزار معذرتیں بھی کریں تو کیا فائدہ۔ پھوپھو کے دل پر جو زخم لگا ہے' وہ اتنی جلدی مندمل تو نہیں ہوگا؟ اس نے آنسو بھری آنکھوں سے انہیں دیکھا۔

"تیمور کے لیے کوئی لڑکیوں کی کمی تو نہیں۔ ماشاء اللہ افسر ہیں، خوبصورت ہیں، خاندانی ہیں۔"

زینت آرا نے ان کے زخموں پر مرہم رکھنے کی کوشش کی۔

"ہاں بھابی! تیمور کو ایک سے ایک لڑکی مل جائے گی، پر وہ میرے بھائی کی بیٹی تو نہ ہوگی۔"

پھوپھو کی آنکھوں میں پھر آنسو بھر آئے اور وہ جلدی سے مڑ گئیں۔

"مینو' تم تیمور بھائی کے لیے دعا کرنا۔"

تنویر نے جاتے جاتے التجا کی۔

"وہ بہت حساس ہیں مینو!"

"میں دعا کروں گی تنی! میرا رُواں رُواں ان کے لیے دعا کرے گا۔ یہ دکھ تو ہم نے ہی انہیں دیا ہے کہ آپا بھی تو ہم میں سے ہی ہیں نا۔"

اور وہ دعائیں کرتی رہی' لیکن پہلے کب اس کی دعائیں قبول ہوئی تھیں' جواب ہو جاتیں۔

تیمور سچ سچ اس دکھ کو نہیں سہار سکے تھے۔ انہیں یقین نہیں آتا تھا کہ سمو جس نے ان کے ساتھ زندگی گزارنے کی قسمیں کھائی تھیں۔ اس طرح اچانک بدل جائے گی۔ ان کی حالت پاگلوں جیسی ہو رہی تھی، جب ایک شام اچانک انہوں نے دروازے پر دستک دی تھی۔ دروازہ اسی نے کھولا تھا۔

"تیمور بھائی آپ؟" وہ انہیں دیکھ کر ششدر رہ گئی۔ وہ کس قدر کمزور اور بیمار لگ رہے تھے۔

"ہاں، میں۔" انہوں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"کیا اندر نہیں آنے دو گی؟"

"آیئے آیئے تیمور بھائی۔" وہ ایک طرف ہٹ گئی۔

"آپ اچانک کیسے آ گئے؟"

"کیوں کیا میں یہاں نہیں آ سکتا مینو' کیا یہ میرے ماموں کا گھر نہیں ہے؟"

"اوہ سوری تیمور بھائی!"

وہ انہیں لے کر اندر آ گئی۔

"آپ نہا دھو لیں بوا کو چائے کا کہتی ہوں۔"

"نہیں میں نہاؤں گا نہیں۔ ہاں چائے پلوا دو' اور ماموں جان کہاں ہیں؟ باقی لوگ بھی نظر نہیں آ رہے۔"

اس نے غور سے انہیں دیکھا۔ وہ پرسکون نظر آنے کی کوشش کر رہے تھے' لیکن پرسکون نہیں تھے۔

"اماں اور ابا کراچی گئے ہیں، واپسی پر آپ کے گھر بھی جائیں گے وہ...... وہ دراصل۔"

اس نے نگاہیں جھکالیں۔

"سمو آپا کی شادی کی تاریخ طے پا گئی ہے نا' تو بلاوا دینے گئے ہیں۔ آپ کو تو پتا ہے وہ اماں کے رشتہ دار خط اور کارڈ بھیج دینے سے کہاں شریک ہوتے ہیں۔"

وہ جان بوجھ کر بولے چلی گئی' تاکہ تیمور کا دھیان ہٹ سکے۔

"اور وہ کاشی میچ دیکھنے گیا ہے، شام تک آ جائے گا۔"

"سمو کہاں ہے مینو؟ میں اس سے ایک بار ملنے آیا ہوں۔ اور اپنے کانوں سے سننا چاہتا ہوں کہ اس نے مجھے ٹھکرا دیا ہے۔"

"وہ گھر پر ہی ہیں، میں انہیں بتاتی ہوں آپ کے آنے کا۔"

"مینو تم! تمہیں کچھ پتا ہے' خبر ہے کہ سمو نے یہ اتنا بڑا ظلم کیوں کیا مجھ پر؟"

"تیمور بھائی۔"

اس سے کچھ نہ کہا گیا' وہ چپ چاپ زمین کی طرف دیکھنے لگی۔

"مینو!" انہوں نے مضطرب ہو کر پہلو بدلا۔

"اگر اسے یوں ہی راستہ بدل لینا تھا' تو پھر مجھے منزل کے خواب کیوں دکھائے تھے؟ کیوں مجھ سے عمر بھر ساتھ نبھانے کے وعدے کیے تھے؟"

"تیمور بھائی! پلیز، آپ حوصلہ کریں۔"

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس طرح انہیں تسلی دے۔

"آپ بیٹھیں تیمور بھائی میں آپا کو آپ کے آنے کا بتاتی ہوں۔"

وہ بوا کو چائے کا کہہ کر سمو کی طرف چلی گئی وہ تیار ہو رہی تھیں۔

"آپا وہ تیمور آئے ہیں۔"

"پھر؟" مسکارا لگاتے ہوئے انہوں نے مڑ کر دیکھا۔

"آپ ملیں گی نہیں ان سے؟ وہ دراصل آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔"

"مگر اس وقت تو میں نادر کے ساتھ باہر جا رہی ہوں۔ وہ میری پسند سے زیور خریدنا چاہتا ہے۔ واپس آ کر مل لوں گی۔ ظاہر ہے' اب وہ آیا ہے تو کچھ دن رہے گا ہی نا۔"

وہ بے نیازی سے بات کر کے آئینے میں دیکھنے لگیں۔

"پلیز آپا! وہ۔"

"مینو! تنگ نہ کرو جاؤ تم بیٹھو اپنے تیمور بھائی کے پاس۔ مجھے پہلے ہی بہت دیر ہو رہی ہے۔ نادر انتظار کر رہا ہوگا۔"

اور وہ چپ چاپ واپس آ کر بیٹھ گئی۔ تیمور ٹیک لگائے آنکھیں موندے بیٹھے تھے۔

"تیمور بھائی، چائے لے لیں۔"

اس نے بوا سے ٹرالی لے کر اپنے قریب کر لی۔

تیمور نے آنکھیں کھول کر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

اس نے نگاہیں جھکالیں۔

"لیجئے نا تیمور بھائی چائے لیں۔"

اس نے نمکو اور بسکٹ آگے بڑھائے۔

"نہیں مینو، بس صرف ایک کپ چائے۔"

"سمو کہاں ہے؟"

چائے لیتے ہوئے انہوں نے پوچھا۔

"وہ اس وقت باہر جا رہی ہیں۔ دراصل وہ کچھ زیورات خریدنے تھے انہوں نے' میرا مطلب ہے ان کے سسرال والوں نے۔ وہ واپس آ کر آپ سے ملیں گی۔"

"تم نے بتایا نہیں تھا میرا۔"

"بتایا تھا۔"

آنسوؤں نے اس کے حلق کو نمکین کر دیا۔ تیمور کی حالت پر اس کا دل کٹ رہا تھا، پگھل رہا تھا۔

"وہ پھر بھی نہیں رکی مینو؟" تیمور نے انتہائی مایوسی سے پوچھا۔

"وہ...... انہیں دیر ہو رہی تھی نا تیمور بھائی اس لیے۔ آپ کی چائے میں چینی ٹھیک ہے نا؟"

تیمور نے سر ہلا دیا۔ ان کی آنکھیں سلگ رہی تھیں۔

"تیمور بھائی یہ آپ نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے۔ مرد اس طرح تو نہیں ہوتے۔ وہ تو بڑے بڑے غم بہادری سے سہ لیتے ہیں' اور پھر یہ تو کوئی ایسی بڑی بات نہیں۔ آپ کو سمو آپا سے

کہیں زیادہ اچھی لڑکی مل جائے گی۔" اس نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔

"تو نہیں جانتی، تو نہیں سمجھ سکتی مینو۔" انہوں نے بڑے کرب سے کہا۔

"یہ کتنی بڑی بات ہے، کتنا بڑا صدمہ ہے' ایک دل کا بس کر اجڑ جانا' ایک تصویر کا بن کر مٹ جانا۔ نہیں مینو تو نہیں سمجھ سکتی، دل کیسے ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے۔ روح میں کیسے شگاف پڑ جاتے ہیں۔"

"میں جانتی ہوں تیمور بھائی، مجھے پتا ہے کہ وجود میں کیسے دراڑیں پڑ جاتی ہیں، دل کیسے پارہ پارہ ہو جاتا ہے۔ کیسی ٹیسیں رہ رہ کر اٹھتی ہیں۔"

اس نے بڑے درد سے کہا۔

"تو مینو! تو۔" انہوں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"تو کیسے جانتی ہے یہ سب؟ تجھے ریزہ ریزہ دل کے درد کا کیسے پتا؟"

"میں۔" وہ ذرا سا گھبرائی۔

اب وہ بھی انہیں کیا بتاتی کہ اس نے بھی دل ریزہ ریزہ ہونے کا عذاب سہا ہے' اور وہ بھی کرب کی ان منزلوں سے گزری ہے۔

"مجھے تیمور بھائی دوسروں کے دکھ کا ایسے ہی احساس ہوتا ہے' جیسے وہ اپنا دکھ ہو' اور میں آپ کے کرب کو ایسے ہی محسوس کر رہی ہوں' جیسے میرا دل ریزہ ریزہ ہوا ہو' اور میری روح پارہ پارہ ہوئی ہو۔ پھر بھی تیمور بھائی میں آپ سے کہوں گی اپنے آپ کو سنبھالیے' مجھے یقین ہے ہولے ہولے آپ کے بے قرار دل کو قرار آ جائے گا۔ آپ کی مضطرب روح پُرسکون ہو جائے گی۔ اپنے لیے نہ سہی تیمور بھائی' پھوپھو جان کے لیے پلیز۔"

"مینو! یہ تو اتنی بڑی کب سے ہو گئی ہے کہ نصیحتیں کرنے لگی ہے۔"

وہ ہولے سے ہنسے۔

"آپ بتائیں تیمور بھائی میں آپ کے لیے کیا کروں' میں اس دکھ کا کفارہ کیسے ادا کروں' جو آپا نے آپ کو دیا ہے؟"

اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"تو رو رہی ہے مینو! مت رو۔ دیکھ میری طرف میں تو نہیں رو رہا۔"

اس کے آنسو اور تیزی سے بہنے لگے۔

"میں آپ کا دکھ بانٹنا چاہتی ہوں' لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں۔"

"مینو۔" تیمور اٹھ کر اس کے قریب چلے آئے۔

"تم میرے لیے کچھ بھی نہ کرو مینو! بس صرف دعا کرتی رہو کہ خدا مجھے حوصلہ دے' اور میرے دل کو پتھر کر دے۔"

انہوں نے اس کے آنسو پونچھے اور اس کے سر کو ہولے سے تھپتھپایا۔

"چلو شاباش اٹھو۔ اب منہ دھو کر آؤ اور میرے لیے ایک کپ اور چائے بنا دو۔"

وہ سعادت مندی سے اٹھ کر چلی گئی۔ اور جب منہ ہاتھ دھو کر واپس آئی تو کاشف ہاکی گھماتا آ رہا تھا۔

"اوہ شکر ہے' تم آ گئے ہو۔"

وہ اسے تیمور کے پاس چھوڑ کر خود کچن میں چلی گئی۔ بہت دیر تک سمو کا انتظار کرنے کے بعد وہ کھانا کھانے کے لیے بیٹھ گئے۔

"شاید زرتاج باجی نے آپا کو کھانے پر روک لیا ہو۔" اس نے یونہی اپنے آپ سے کہا۔

اور کبابوں کی ڈش تیمور کی طرف بڑھائی۔

"لیجئے نا تیمور بھائی۔"

وہ تینوں خاموشی سے سر جھکائے یوں کھانا کھا رہے تھے' جیسے تینوں میں سے کسی کو بھوک نہ ہو' اور وہ محض رسم ہی پوری کر رہے ہوں۔

"آپا کو اتنی دیر نہیں کرنی چاہیے تھی۔"

کاشف نے کچھ دیر بعد کہا۔ تب ہی باہر گاڑی رکنے کی آواز آئی۔

"اوہ! شاید آپا آ گئی ہیں۔"

اس نے تیمور بھائی کی طرف دیکھا جن کا رنگ یکدم بدل گیا تھا۔

"خدا حافظ نادر! اندر نہیں چلو گے۔"

سمو کی چہکتی ہوئی آواز آئی۔

"اوہ نہیں ڈیئر!"

"اچھا بائے۔"

اور پھر ہلکی ہلکی سرگوشیاں۔

اور ایک ملا جلا قہقہہ اور پھر ایڑی کی کھٹ کھٹ ڈرائنگ روم کے باہر آ کر رکی۔ سمو نے پردہ ہٹا کر اندر جھانکا۔

خوشی ان کی آنکھوں سے اور ان کے چہرے سے پھوٹ رہی تھی۔

"اوہ سوری' تم لوگوں کو کھانے پر میرا انتظار کرنا پڑا۔"

"بس ابھی کھانا شروع کیا تھا۔ آپ آ جائیں۔" امینہ نے کہا۔

"میں تو نادر کے ساتھ باہر ہی کھانا کھا آئی ہوں۔ تم لوگ کھاؤ۔"

انہوں نے ایک اچٹتی سی نظر تیمور پر ڈالی۔

"ہیلو تیمور کیسے ہیں آپ؟"

تیمور جواب تک اسے دیکھے جا رہے تھے' یکدم چونکے۔

"سمو! تم۔"

ان کی آنکھوں میں ہزاروں شکوے مچل رہے تھے۔

"مجھے تم سے بہت کچھ کہنا ہے، پوچھنا ہے۔"

وہ کھڑے ہو گئے تھے۔

"میں اس وقت بہت تھکی ہوئی ہوں تیمور، صبح بات کر لینا۔ سمو نے بڑی ادا سے کہا' اور ٹھک ٹھک کرتی باہر چلی گئیں۔

تیمور نے ایک نظر مڑ کر ان دونوں کو دیکھا' اور سمو کے پیچھے ہی باہر نکل گئے۔

پھر نہ جانے تیمور نے سمو سے کیا کہا اور سمو نے کیا جواب دیا' لیکن جب تیمور واپس آئے تو ان کی آنکھیں دھواں دھواں ہو رہی تھیں۔ اور رنگ خطرناک حد تک زرد ہو رہا تھا۔ وہ لمحہ بھر کو ڈرائنگ روم کے دروازے پر رکے، کاشف اور مینو کو دیکھا۔

"خدا حافظ۔"

"آپ اس وقت اتنی رات گئے کہاں جا رہے ہیں؟"

امینہ تڑپ کر کھڑی ہو گئی۔

"کہیں بھی۔" وہ مڑے۔

"نہیں، میں اس وقت آپ کو کہیں نہیں جانے دوں گی۔" وہ ان کے راستے میں کھڑی ہو گئی۔

"مینو مجھے مت روکو پلیز۔"

"نہیں تیمور بھائی' میں آپ کو نہیں جانے دوں گی۔ اس وقت نہیں صبح چلے جائیے گا۔ آپ کو پھوپھو کی قسم۔ تینی کی قسم۔"

"مینو!" وہ نڈھال سے ہو کر وہیں کرسی پر گر گئے۔

"مجھے اتنی بڑی قسموں کے جال میں مت جکڑو۔"

"مینو صحیح کہتی ہے تیمور بھائی! یہ بھی بھلا کوئی جانے کا وقت ہے۔"

کاشف بھی باہر آ گیا تھا۔

"آپ چلیں، آرام کریں۔"

کاشف انہیں بازو سے پکڑ کر اپنے کمرے میں لے گیا۔ اور پھر زبردستی انہیں نیند کی گولیاں کھلا دیں۔

"بس اب آنکھیں بند کر لیں اور سونے کی کوشش کریں۔"

وہ ان کے پاس بیٹھ کر ہولے ہولے ان کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا اور وہ مطمئن سی ہو کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ سمو بڑی پر سکون اور مطمئن لگ رہی تھیں۔ اس نے ایک نظر انہیں دیکھا۔ اور شیلف پر سے کتاب اٹھالی۔

"سونے کا ارادہ نہیں ہے کیا؟"

سمو نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔

"کچھ پڑھوں گی نیند نہیں آ رہی۔"

"تم ٹیبل لیمپ جلا لو مینو' مجھے بہت نیند آ رہی ہے پلیز۔"

"اچھا!"

اس نے لائٹ آف کر دی اور سوچا۔ کسی کا دل توڑ کر، اسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے بھی آپا کتنی مطمئن، کتنی شانت ہیں۔ جیسے کسی دل کا ٹوٹنا' کرچی کرچی ہو جانا کوئی بات ہی نہ ہو۔

اس نے کتاب کھول لی اور پڑھنے کی کوشش کرنے لگی۔ صبح ابھی سمو سو ہی رہی تھیں کہ تیمور جانے کے لیے تیار ہو گئے۔

"تیمور بھائی پلیز اپنے آپ کو سنبھالیے گا اور اسے ایک حادثہ سمجھ کر بھول جائیے گا۔"

اس نے جاتے جاتے نصیحت کی۔

"مینو، تم بہت اچھی ہو، میرے لیے دعا کرتی رہنا۔ میں کوشش کروں گا اپنے آپ کو سنبھالنے کی اور جب کبھی بے حوصلہ ہونے لگوں گا' تو شاید یہ خیال مجھے حوصلہ دے کہ اس چھوٹے شہر میں ایک پیاری سی لڑکی میرے لئے دعا کرتی ہے۔"

"تیمور بھائی۔" اس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔

"مجھے یقین ہے آپا آپ کو دکھ دے کر خوش نہیں رہ سکیں گی، وہ ضرور پچھتائیں گی۔"

"نہیں مینو، اپنوں کو بد دعا نہیں دیتے، وہ لوگ جنہیں ہم چاہتے ہیں، جن سے ہم محبت کرتے ہیں' ان کے سکھ اور ان کی خوشیوں کی دعا کرتے ہیں۔ سمو بھی سدا خوش رہے۔"

انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور کاشف سے ہاتھ ملا کر چلے گئے۔

تھکے تھکے نڈھال قدموں سے۔

اور ان کے جانے کے بعد وہ کتنی دیر تک روتی رہی۔ اور اس کے آنسو تو اس دن بھی نہیں تھمے تھے۔

جب آپا نادر ہاشمی کے ساتھ رخصت ہو رہی تھیں' سب ہی ان کے حسن کی تعریفیں کر رہے تھے۔ وہ تیمور کے متعلق سوچ رہی تھی۔ جانے ان کا کیا حال ہوگا۔ کیسے ہوں گے وہ۔ ان کے گھر سے شادی میں کوئی شریک ہونے کے لیے نہیں آیا تھا۔ بس پھوپھو نے بہت ساری دعاؤں کے ساتھ سمو کے لیے پانچ ہزار روپے بھیجے تھے' کہ وہ اپنی مرضی سے کچھ خرید لے گی۔ تنویر نے لکھا تھا کہ تیمور بھائی بہت بیمار ہیں۔ اس لیے وہ لوگ شادی میں شریک نہیں ہو سکتے' اور وہ تیمور کی صحت وسلامتی کی دعائیں مانگتی رہی۔ سمو رخصت ہو کر چلی گئیں' اور کچھ عرصہ بعد نادر نے انہیں بھی امریکہ بلوا لیا۔

***

اور پھر بہت سارے دن گزر گئے۔ اس نے ایم اے کر کے ایک کالج میں جاب کر لی۔ کاشف اعلیٰ تعلیم کے لیے باہر چلا گیا۔ پھوپھو کے گھر سے بھی کبھی کوئی اطلاع نہ ملی۔ کتنا دل چاہتا تھا اس کا کہ وہ ادھر جائے' پھوپھو کے پاس رہے' تنویر اور تیمور بھائی سے ملے' لیکن کتنے فاصلے پیدا ہو گئے تھے' ان کے درمیان، باہر جانے سے پہلے کاشف، تنویر سے ملنے گیا تھا' تو اس نے آ کر بتایا تھا کہ تیمور بھائی بہت عرصہ بیمار رہے۔ جاب چھوڑ دی تھی' کسی سے کچھ نہیں کہتے تھے' بس چپ چاپ اپنے کمرے میں بیٹھے رہتے تھے۔ اب کچھ سنبھلے ہیں تو ملک سے باہر چلے گئے ہیں۔ غالباً سعودی عرب' تب اس نے بڑے خلوص سے ان کے لیے دعا کی تھی' کاشف چلا گیا تو پھر کوئی رابطہ ہی نہ رہا تھا۔ پتا نہیں اب وہ کیسے تھے؟ کہاں تھے' وہ اکثر سوچتی۔

سمو آپا تو بہت خوش تھیں۔ کبھی کبھی ان کا خط آ جاتا تھا۔ وہ تو ایک بچی کی ماں بھی بن گئی تھیں۔ فیری کے ڈھیروں فوٹو انہوں نے بھیجے تھے۔ بہت پیاری تھی وہ بالکل سمو آپا کی طرح۔

وہ سب کے لیے سوچتی تھی۔

سب کے لیے دعائیں کرتی تھی۔

لیکن خود اپنے لیے اس نے کبھی نہیں سوچا تھا۔

بس کبھی کبھی ایک خلش سی دل میں جاگ اٹھتی تھی۔

پہلو میں درد سا ہوتا۔

مدھم مدھم درد اور بس۔

اماں نے بہت کوشش کی تھی کہ اس کا اور جائد کا بیاہ ہو جائے۔ جائد بھی خواہش مند تھا اور اس نے کرامت ماموں کو بھی رضا مند کر لیا تھا' لیکن وہ خود کو آمادہ نہ کر سکی۔ ابا اماں اسے سمجھا سمجھا کر تھک گئے تھے' لیکن وہ شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"اماں پلیز میں نے کبھی آپ سے کچھ نہیں مانگا، کبھی کوئی ضد نہیں کی۔ پلیز میری یہ بات مان لیں، مجھے شادی کرنے کے لیے مجبور نہ کریں، میں ابھی اپنے آپ کو اس کے لیے تیار نہیں پاتی۔"

"کیا تو کہیں، کسی اور سے شادی کرنا چاہتی ہے۔"

اماں نے شک سے پوچھا۔

"نہیں اماں! ایسی کوئی بات نہیں ہے' بس میں شادی ہی نہیں کرنا چاہتی۔ جب کبھی میں نے اپنے آپ کو اس کے لیے آمادہ پایا تو آپ کو بھی بتا دوں گی۔ پھر جہاں آپ کا دل چاہے گا۔"

"کیا بڑھاپے میں تیرا دل آمادہ ہوگا مینو؟"

امی بڑبڑاتی رہی تھیں' لیکن انہوں نے اسے مجبور نہیں کیا تھا۔ اب وہ بڑے مزے سے جاب کر رہی تھی۔ اور یوں اس نے پندرہ طویل برس بتا دیے۔ اب تو اماں نے بھی اسے کچھ کہنا چھوڑ دیا تھا۔ کاشف کی شادی بھی ہو گئی تھی' اور اس کے دو پیارے پیارے بیٹے تھے۔ اور وہ بھی امریکہ میں ہی سیٹل ہو گیا تھا۔ بس کبھی کبھار برس دو برس بعد چکر لگا جاتا۔ البتہ سمو آپا کو تو امریکہ کچھ زیادہ ہی پسند آیا تھا کہ وہ پلٹ کر بھی نہ آئیں۔ شاید تیمور بھائی کی اور تینی کی بھی شادی ہو گئی ہوگی۔

وہ کبھی کبھی سوچتی۔

شاید ان کے مضطرب دل کو قرار آ گیا ہوگا۔ اور شاید اب وہ سمو آپا کو یاد نہ کرتے ہوں۔

ان کی بیوی اچھی سی، پیاری سی اور محبت کرنے والی ہو۔

بچے ہوں خوبصورت سے، شریر آنکھوں والے۔
اور ان کی محبت میں گم ہو کر تیمور بھائی سمو آپا کا دیا ہوا دکھ بھول گئے ہوں۔
لیکن اس کا خیال غلط تھا۔
تیمور نے سمو کو نہیں بھلایا تھا۔ اور نہ ہی شادی کی تھی۔ پندرہ برس بعد اچانک وہ اسے نظر آ گئے تھے۔ وہ کالج کی لڑکیوں کو تعلیمی ٹور پر ٹیکسلا لے کر گئی تھی، اور وہ وہیں اس سے ملے تھے۔
"تیمور بھائی، تیمور بھائی۔"
وہ انہیں پکارتی ہوئی یوں ان کی طرف بھاگی، جیسے ایک ذمہ دار لیکچرار نہیں پندرہ برس پہلے کی سترہ سالہ مینو ہو۔
"مینو تم۔" تیمور مڑ کر حیرت سے اسے دیکھنے لگے تھے۔
"آپ کیسے ہیں تیمور بھائی۔ آپ نے پھر مڑ کر اپنی خبر ہی نہ دی۔" اس نے شکوہ کیا۔
اس کی آنکھیں نم ہوئی جا رہی تھیں۔
"میں نے خبر نہیں دی تو تم نے کون سی خبر لی۔" وہ مسکرائے۔ افسردہ سی مسکراہٹ۔
"میں۔ میں کیسے خبر لیتی تیمور بھائی۔ کاشی چلا گیا تو پھر رابطہ ہی ٹوٹ گیا۔ وہ تو وہیں بس گیا ہے امریکہ میں ہی۔ آپ بتائیں پھوپھو کیسی ہیں؟ تینی کا کیا حال ہے؟"
"سب ٹھیک ہیں مینو۔"
انہوں نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔
اور وہیں عجائب گھر کی سیڑھیوں میں بیٹھ گئے۔ اس نے مڑ کر مسز پراچہ کو بتایا کہ یہ اس کے کزن ہیں، اچانک مل گئے ہیں، اور وہ کچھ دیر ان سے باتیں کرنا چاہتی ہے۔
"کوئی بات نہیں، آپ اطمینان سے باتیں کریں۔"
مسز پراچہ لڑکیوں کو لے کر آگے بڑھ گئیں، تو وہ ان کے پاس ہی آ کر بیٹھ گئی۔ تیمور بہت سوبر اور سنجیدہ سے لگ رہے تھے، ان کی خوبصورت آنکھوں میں ایک بے نام سی اداسی کا تاثر تھا۔
"آپ یہاں کیسے تیمور بھائی؟"
"میں آج کل اسلام آباد میں ہوں۔ کچھ دوست زبردستی لے آئے وہ اندر، میں یہاں آ گیا اور تم یہاں کیسے آئی ہو؟"
"میں کالج کی لڑکیوں کے ساتھ آئی تھی، پڑھاتی ہوں۔"
"اچھا!"

انہوں نے غور سے دیکھا۔
ان پندرہ برسوں میں وہ کچھ زیادہ نہیں بدلی تھی، بس کچھ سنجیدہ ہو گئی تھی۔
"ماموں جان کیسے ہیں؟"
"ابا ریٹائرڈ ہو گئے ہیں، ان کا دل بہت چاہتا ہے آپ سے، پھوپھو سے ملنے کو لیکن وہ اب بھی پھوپھو سے شرمندہ ہیں۔ جب سے کاشی نے انہیں بتایا تھا کہ آپ بیمار پڑ گئے تھے، تب سے وہ خود کو مجرم سمجھنے لگے ہیں۔"
"نہیں بھلا ان کا کیا قصور، یہ تو مقدر کے کھیل ہوتے ہیں مینو! کوئی ہار جاتا ہے، کوئی جیت جاتا ہے۔ اپنی قسمت میں ہار ہی سہی۔"
"تیمور بھائی! آپ ابھی تک سمو آپا کو نہیں بھولے۔"
اس نے جھجکتے جھجکتے پوچھا۔ لیکن تیمور نے کوئی جواب نہ دیا۔
وہ پاؤں کے قریب اُگی ہوئی گھاس کو پاؤں سے مسلتے رہے، تو اس نے ذرا دیر بعد پوچھا۔
"آپ سعودی عرب سے کب آئے تیمور بھائی؟"
"تینی کی شادی پر آیا تھا، پھر اماں نے جانے ہی نہ دیا۔ اور میں نے جاب کر لی۔ حال ہی میں میرا ٹرانسفر یہاں اسلام آباد ہوا ہے۔ زندگی گزارنے کا کوئی حیلہ تو ہونا چاہیے نا، مینو تو بتا تیرا میاں کیسا ہے۔ کس کا گھر بسایا ہے تو نے۔"
"میں نے شادی نہیں کی تیمور بھائی۔"
اس نے گھاس کی پتیاں نوچتے ہوئے کہا۔
"کیوں؟" تیمور کو حیرت ہوئی۔
"اماں تو کہہ رہی تھیں کہ تم چاند سے۔"
"بس دل ہی آمادہ نہیں ہوا تیمور بھائی۔"
"کیوں مینو! تیرے دل کو کیا ہوا؟"
"کچھ نہیں، بس یوں ہی۔"
اس نے بات بدل دی، اور انہیں کاشی کے بچوں کے بارے میں بتانے لگی۔
اور پھر وہ دونوں تب تک وہیں بیٹھے رہے، جب تک کہ لڑکیاں عجائب گھر کی سیر کر کے واپس نہ پلٹ آئیں۔ آنے سے پہلے اس نے تیمور سے اسلام آباد کا پتا لے لیا تھا۔
"کسی دن ابا کو لے کر آؤں گی۔"

اس نے وعدہ کیا یہ جان کر اسے بہت دکھ ہوا تھا' کہ تیمور نے شادی نہیں کی تھی۔ اس کے استفسار پر وہ ہنس دیے تھے۔ افسردہ سی ہنسی۔

"شادی تو زندہ لوگ کرتے ہیں مینو! اور میں اسی دن مر گیا تھا' جب سمو نے مجھے ٹھکرا دیا تھا' اور یہ جو میں تمہیں چلتا پھرتا دکھائی دے رہا ہوں نا' صرف اماں کی اور تمہاری دعاؤں کے طفیل، مجھے یقین ہے مینو! تو میرے لئے دعا کرتی ہو گی۔"

"ہوں!" اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"میں نے آپ کے سکون اور سکھ کے لیے بہت دعائیں مانگیں' لیکن شاید میری دعائیں بے اثر تھیں۔"

"نہیں مینو، یہ تمہاری دعائیں ہی تو ہیں' جن سے میرا بے قرار اور مضطرب دل ٹھہر سا گیا ہے، ورنہ پتا ہے۔"

پھر وہ ہنسے۔ ٹوٹی ہوئی دل گرفتہ سی ہنسی۔

"میرا تو دل چاہتا تھا۔ گریبان چاک کر کے صحراؤں کو نکل جاؤں۔ اچھا تو بتا سمو کیسی ہے؟ خوش ہے نا۔ کتنے بچے ہیں اس کے؟"

"ہاں خوش ہے وہ تو ایسی گئیں کہ پھر لوٹ کر ہی نہ آئیں۔ ایک بیٹا اور بیٹی ہے ان کی۔" اس نے تفصیل سے بتایا۔

"اچھا خوش رہے۔"

انہوں نے دعا دی۔

"آپ آئیے گا نا تیمور بھائی! یہ تین گھنٹے کا تو راستہ ہے۔"

"آؤں گا۔"

انہوں نے وعدہ کر لیا' اور پھر کتنے دن گزر گئے وہ انتظار کرتی رہی' لیکن وہ نہ آئے۔

کئی بار اس نے سوچا وہ ہی کسی دن تیمور سے مل آئے۔ ابا کو ساتھ لے کر لیکن ابا کی طبیعت ذرا سنبھلی تھی۔ اور وہ اسلام جانے کا پروگرام بنا رہی تھی کہ اچانک اس کی ٹرانسفر کے آرڈر آ گئے۔ اس نے ٹرانسفر رکوانے کی بہت کوشش کی' لیکن اسے اسلام آباد جانا ہی پڑا۔ اچھی طرح ایڈجسٹ ہونے کے بعد ایک روز وہ تیمور کا ایڈریس لے کر ان کے گھر پہنچ گئی۔ اور لمحہ بھر کو تو حیران رہ گئی۔ کتنا شاندار گھر تھا' نہ جانے کتنے کنال کے رقبے پر پھیلا ہوا تھا۔

شاید تیمور نے سعودی عرب میں بہت پیسہ کمایا ہے۔

اس نے گیٹ پر لگی ہوئی تختی کو دیکھا۔

"تیمور مراد شاہ"

وہ صحیح جگہ پہنچی تھی۔ یہ شاندار اور خوبصورت گھر انہی کا تھا۔ تیمور گھر پر ہی تھے' لان میں کرسی بچھائے آنکھیں موندے جانے کیا سوچ رہے تھے۔ اسے دیکھ کر خوش ہو گئے۔

"ارے مینو تم، اکیلی کیسے آ گئی ہو؟ ماموں جان نہیں آئے؟"

"آپ جو نہیں آئے تو میں نے سوچا چلو میں ہی مل لوں۔"

"سوری مینو!" وہ شرمندہ ہو گئے۔

"میرا تو دل چاہ رہا تھا ماموں سے ملنے کو' لیکن وہ تینی اور بچے آ گئے تھے۔ ابھی کل ہی گئے ہیں۔ تمہیں میں نے بتایا تھا نا تینی آج کل لاہور ہوتا ہے۔ تین بچے ہیں اس کے، اس کی بیوی بہت اچھی ہے۔ انگریز چچا کی بیٹی شنو۔"

"آپ تینی کو بھی لے آتے۔"

"تینی ...... تمہیں نہیں پتا مینو، وہ بڑا غصیلا ہے۔ وہ تو تم سب لوگوں سے ناراض ہے، خفا ہے۔ میری بے مقصد زندگی کا ذمہ دار وہ تم سب کو سمجھتا ہے۔ پاگل ہے نا۔"

"غلط تو نہیں سمجھتا۔ آپ کی تباہی کے ذمہ دار ہم ہی تو ہیں۔" اس نے افسردگی سے کہا۔

"نہیں، نہیں مینو! ایسا مت کہو' میں نے کہا تھا نا۔ یہ مقدر کے کھیل ہوتے ہیں۔ غلطی شاید میری تھی' جو میں نے سمو کے کھیل کو دل کا روگ بنا لیا تھا۔ اچھا خیر چھوڑو اس موضوع کو، یہ بتاؤ تمہارا سامان کہاں ہے۔ رہو گی نا' یا آج ہی واپس چلی جاؤ گی۔"

"میرا ٹرانسفر ہو گیا ہے یہاں۔"

"اوہ پھر تو آتی رہو گی نا۔ تم سے مل کر عجیب سا سکون ملا مجھے۔"

تیمور سچ مچ بہت خوش ہو گئے تھے۔ انہوں نے وہیں بیٹھ کر چائے پی اور ادھر ادھر کی ڈھیروں باتیں کیں، اپنا گھر دکھایا۔

"آپ کا گھر بہت خوبصورت ہے، بالکل خوابوں کا سا۔"

"یہ سب تینی کی ضد ہے۔ اس نے یہ گھر خریدا ہے' وہ میرے اردگرد خوشیوں کے ڈھیر لگا دینا چاہتا ہے۔ پاگل ہے نا۔ نہیں سمجھتا کہ جب اندر کے رنگ پھیکے پڑ جائیں تو باہر کتنے بھی رنگ بھر لو زندگی کے رنگ پھیکے ہی رہتے ہیں۔ تم تو سمجھتی ہو نا مینو!"

"ہاں۔" اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اور پھر رات کے کھانے کے بعد تیمور خود اسے ہاسٹل چھوڑ آئے۔ ایک طویل عرصہ زندگی میں تھوڑی سی تبدیلی آ گئی تھی۔

وہ چھٹی والے دن تیمور کی طرف چلی جاتی‘ اور پھر سارا دن وہاں ہی گزارتی۔ اپنے ہاتھوں سے کھانا پکاتی، ان کا کمرہ صاف کرواتی‘ اور پھر وہ کسی بھی موضوع پر گھنٹوں باتیں کرتے‘ موسیقی سنتے، کتابیں پڑھتے، حیرت انگیز حد تک دونوں کی پسند ملتی تھی۔ اور اگر کبھی وہ نہ جاتی تو تیمور خود اسے لینے پہنچ جاتے۔

”تم نہیں آئی ہو تو دل اداس ہو گیا ہے۔“

اور وہ سارے کام چھوڑ کر چل پڑتی۔

تیمور اکثر باتیں کرتے کرتے غور سے اسے دیکھنے لگتے تھے۔ انہیں لگتا کہ جیسے اس کی آنکھوں میں کسی دکھ کا رنگ منجمد سا ہو گیا ہے‘ اور چہرے پر ملال کے موسم بسیرا کیے ہوئے ہیں۔

پتا نہیں اتنی اچھی، اتنی محبت کرنے والی، نرم دل لڑکی کو کیا دکھ ہے۔ اور پھر اس نے شادی تو نہیں کی۔ حالانکہ کوئی بھی اسے اپنا شریک زندگی بنا کر فخر محسوس کر سکتا تھا۔ کئی لوگوں نے اس کی رفاقت کی تمنا کی ہو گی۔ خود تینی نے بھی تو ایک بار ایسی ہی خواہش کی تھی، جب وہ اور سمو ان کے گھر آئے تھے تب، کہیں ...... کہیں مینو اور تینی ؟

انہوں نے سوچا‘ اور ان کے دل پر ایک بوجھ سا آ گرا۔

”سمو! تم نے میرے ساتھ ساتھ شاید مینو کی زندگی بھی تباہ کر ڈالی ہے۔ کاش مجھے پہلے ہی احساس ہو جاتا تو میں مینو اور تینی کے لیے کچھ کرتا۔“ اور وہ اس کے لیے دکھی ہو گئے۔

”مینو!“ ایک روز انہوں نے اس سے پوچھا۔

”ایک بات بتاؤ گی؟“

”ہاں پوچھیے۔“

”تمہیں کیا دکھ ہے۔“

”مجھے!“ حیرت سے انہیں دیکھنے لگی۔

”مجھے بھلا کیا دکھ ہو سکتا ہے۔“

”مینو! تمہیں یاد ہے، تم نے ایک بار جب میں آخری بار تمہارے گھر گیا تھا‘ تو مجھ سے کہا تھا کہ میں تمہیں اپنا دوست سمجھوں اور تم اچھے دوستوں کی طرح ہمیشہ میرے لیے دعا کرتی رہو گی۔“

”ہاں تیمور بھائی! میں نے ہمیشہ آپ کے لیے دعا کی۔“

”کیا اب بھی تم مجھے اپنا دوست سمجھتی ہو مینو؟“

”ہاں۔“

”تو پھر دوست تو دوستوں سے کچھ نہیں چھپاتے۔ میں نے تو اپنا سینہ تمہارے سامنے کھول کر رکھ دیا تھا، پھر تم مجھ سے کیوں چھپاتی ہو؟“

”نہیں تیمور بھائی‘ مجھے کوئی دکھ نہیں ہے۔ پتا نہیں آپ کو یہ خیال کیوں آیا؟“

وہ ہنس دی۔ لیکن دل میں وہ برسوں پرانا چبھا کانٹا پھر کسک دینے لگا تھا۔ اب وہ انہیں کیا بتاتی کہ پندرہ برس قبل کی تصوراتی لڑکی نے محض ایک بے بنیاد سی بات پر کتنے بڑے محل کھڑے کر لیے تھے‘ اور جب یہ محل حقائق کی تیز آندھی سے گر گئے تھے‘ تو اس کے دل کی دنیا ویران ہو گئی تھی‘ اور آج بھی اس دن کی طرح ویران ہے‘ اور کبھی کبھی اس ویرانے میں تیز ہوائیں چلنے لگتی ہیں‘ اور بگولے اٹھتے ہیں‘ اور ایسے میں اس کا دل چاہتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے اس المیے پر چیخیں مار مار کر روئے۔

”نہیں مینو!“

تیمور نے اس کے سوچ میں ڈوبے ہوئے چہرے کی طرف دیکھا۔

”مجھے لگتا ہے جیسے تم نے۔“

وہ ذرا جھجکے۔

”تم نے بھی کسی سے محبت کی ہے‘ اور پھر اس محبت کے بچھڑنے کا کرب سہا ہے، عذاب جھیلا ہے۔ تمہیں یاد ہے، تم نے کہا تھا کہ تم ریزہ ریزہ دل کا کرب اور پارہ پارہ روح کا دکھ جانتی ہو جیسے تمہارا اپنا دل ریزہ ریزہ ہوا ہو‘ اور تمہاری اپنی روح پارہ پارہ ہو گئی ہو۔ یہ اتنی بڑی بات کوئی یوں ہی تو نہیں کہہ دیتا۔ سترہ برس کی عمر میں تم نے کیسے یہ دکھ محسوس کر لیا تھا؟ مینو کہیں تم تینی سے؟“

”نہیں۔“ اس نے تڑپ کر اس کی طرف دیکھا۔

”میں نے تینی کو ہمیشہ کاشی کی طرح جانا ہے‘ اور اس کی کامیابیوں اور خوشیوں کے لیے ایسے ہی دعائیں کی ہیں۔ جیسے کاشی کے لیے۔“

وہ شاید سچ کہہ رہی تھی۔

تیمور نے اسے غور سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں پر اور اس کے چہرے پر سچ تھا۔ وہ شرمندہ

سے ہو گئے۔

"سوری مینو' دراصل کبھی کبھی بیٹھے بیٹھے تم یوں کھو سی جاتی ہو' اور تمہاری آنکھوں سے ایسا کرب جھانکنے لگتا ہے' جیسے کوئی گہرا درد تمہارے دل کو چھیل رہا ہو۔ بالکل ایسا ہی درد' جیسا میرے دل میں ترازو ہو گیا ہے۔"

"میں دراصل کبھی کبھی آپ کی ناکام زندگی کے بارے میں سوچنے لگتی ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کس طرح آپ کی اس ناکام زندگی میں خوشیاں بکھیر دوں۔ کس طرح آپ کے دل سے درد کے اس کانٹے کو کھینچ لوں۔ جو پندرہ برس سے اسی طرح آپ کے دل میں پیوست ہے۔ آپ کتنا بھی مطمئن دکھائی دینے کی کوشش کریں تیمور بھائی' میں آپ کے سینے کے زخم دیکھ سکتی ہوں۔ آپ کی آنکھوں میں کروٹیں لیتے درد کو محسوس کر سکتی ہوں۔ آپ کی مجروح ہنسی کا کانچ میرے دل میں چبھتا ہے' اور مجھے آپ کی آنکھوں میں آسیبی سائے منڈلاتے دکھائی دیتے ہیں۔"

"پاگل ہو تم مینو!"

وہ ہنس دیے۔ وہی مجروح ہنسی' جس کا کانچ اس کے دل میں چبھتا تھا۔

"میں دکھ کے اس گہرے سمندر میں ضرور گر گیا تھا' اور اسے پاٹنے میں مجھے بہت وقت لگا' لیکن اب میں سطح پر ہوں' اور ڈوبنے کا کوئی خدشہ نہیں رہا۔ ہاں البتہ طوفانوں نے جس طرح میرے وجود کو لیر لیر کیا ہے' اس کے آثار تو رہیں گے نا۔"

"لیر لیر وجود جڑ بھی سکتا ہے نا تیمور بھائی۔" اس نے بڑی دردمندی سے کہا۔

"آپ شادی کیوں نہیں کر لیتے۔ کسی بہت اچھی، بہت مخلص لڑکی سے۔"

"شادی!" انہوں نے اسے حیرت سے دیکھا۔

"میرے پاس کیا ہے کسی کو دینے کے لئے سوائے ایک شکستہ دل اور ٹوٹے پھوٹے وجود کے۔"

"پتا نہیں کیوں مجھے یقین ہے تیمور بھائی کہ کوئی بہت اچھی، بہت مخلص لڑکی، آپ کی زندگی کے آسمان پر چھائے ہوئے دکھ کے اس غبار کو ختم کر دے گی۔ پھر آپ سچی ہنسی ہنسیں گے۔ اور......"

وہ کہتی رہی بڑے جذب سے اور تیمور آنکھیں کھولے اسے دیکھتے رہے اور سوچتے رہے۔

ہمدرد، مخلص، سچی اور نرم خو۔

اس نے سچے دوستوں کی طرح میرے لیے دعائیں کی ہیں' اور کتنی دردمندی سے میرا درد بانٹا ہے۔ اور کیسے ٹھنڈی اور نرم رو چاندنی کی طرح میری زندگی میں در آئی ہے۔

"تمنی اب آئے تو مجھے ضرور بتایئے گا۔ میں اس سے کہوں گی کہ وہ آپ کے لیے کوئی اچھی سی لڑکی۔"

"وہ لڑکی تم نہیں ہو سکتیں مینو؟"

بالکل غیر ارادی طور پر انہوں نے سوچا' اور پھر خود ہی نادم ہو گئے۔

یہ میرے ذہن میں ایسا خیال کیوں آیا؟

کیا سوچے گی وہ؟

انہوں نے اپنے آپ کو تنبیہ کی' لیکن اس تنبیہ کے باوجود اکثر راتوں کی تنہائی میں انہیں اس کا خیال آ جاتا' اور وہ بڑی دردمندی سے سوچتے کہ وہ اور مینو اگر زندگی کے باقی ماندہ سفر کو مل کر طے کر لیں' تو سفر سہل ہو جائے گا۔ مگر وہ اس سے یہ سب کہنے کی ہمت نہیں پا رہے تھے۔ کئی بار انہوں نے ارادہ باندھا اور توڑ دیا۔ کئی بار وہ اس سے کہتے کہتے رک گئے' اور مینو ان کے اندر کی کشمکش سے بے نیاز اسی دردمندی اور خلوص سے ان کا درد بانٹتی رہی' اور کالج میں موسم سرما کی چھٹیاں ہو گئیں۔ تیمور اس کے جانے سے اداس ہو گئے تھے۔ کئی بار تیمور کا خیال آیا۔ زینت آرا کو پتا چلا کہ تیمور نے ابھی تک شادی نہیں کی تو ان کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

"ارے سنیں جعفر علی شاہ! اگر تیمور اور مینو کی شادی ہو جائے تو......؟"

انہوں نے سرگوشی کی' جسے مینو نے صاف سنا' لیکن جعفر علی شاہ خاموش ہی رہے۔ انہوں نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ اب وہ ان کی باتوں پر خاموش ہی رہتے تھے۔

"ویسے جعفر علی شاہ! یہ تمہارے تیمور ہیں بڑے بے مروت، یہ چار قدم پر رہتے ہیں' اور کبھی خبر تک نہ لی کہ ماموں کس حال میں ہیں۔"

"آپ نے کون سی خبر لے لی اماں۔" اس نے جل کر کہا۔

"زخم تو آپ نے لگائے تھے' پھر مرہم بھی تو آپ کو ہی تلاش کرنا چاہیے تھا۔"

اس نے سوچا اور وہاں سے چلی آئی۔

زینت آرا بڑبڑا رہی تھیں۔

"یہ لڑکی پھوپھو کی حمایت میں ہمیشہ مجھ سے یوں لڑی ہے' جیسے ان کی کوکھ سے ہی جنم لیا ہو۔"

اس نے اماں کی بات پر کوئی دھیان نہیں دیا تھا کہ وہ تو ہمیشہ سے ہی ایسے الٹے سیدھے جوڑ ملاتی آئی تھیں۔لیکن خود ایک روز تیمور۔ کے بارے میں سوچتے ہوئے اس پر انکشاف ہوا کہ محبت کا وہ پودا' جسے اس نے اپنی دانست :۔ں جڑ سے اکھاڑ پھینکا تھا' پھر سے ہرا ہو گیا ہے۔اس انکشاف نے لمحہ بھر کے لیے تو اسے ششدر کر دیا۔اب اس عمر میں یہ ایسی انہونی خواہشیں کیوں میرے دل میں پیدا ہو رہی ہیں۔''

اس نے پریشانی سے سوچا اور عہد کیا کہ اب وہ تیمور سے زیادہ نہیں ملے گی۔بس کبھی کبھی جایا کرے گی' لیکن وہ اپنے اس عہد پر پورا نہ اتر سکی' اور اسلام آباد پہنچتے ہی سیدھے تیمور کی طرف گئی۔تنویر بھی آیا ہوا تھا۔تنویر کو دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئی۔

''ارے تینی! تم کیسے ہو؟''

''ٹھیک ہوں۔'' اس نے بڑی رکھائی سے جواب دیا۔

''ناراض ہو گیا؟'' وہ ہنس دی۔

''اپنوں سے خفا نہیں ہوتے تنویر۔ میں نے تو تم سب لوگوں کو بہت یاد کیا۔ اور تم سب کے لیے بہت دعائیں کیں۔''

لیکن تنویر نے اس سے زیادہ بات نہیں کی۔ وہ شاید ان سب سے بہت خفا اور ناراض تھا۔

''خیر منا لوں گی۔''

اس نے سوچا اور تیمور کو ابا اور اماں کے متعلق بتانے لگی کہ وہ سب اسے یاد کرتے ہیں۔

وہ اور تیمور باتیں کرتے رہے اور تنویر روٹھا روٹھا سا بیٹھا میگزین دیکھتا رہا' اور جب کسی کام سے تیمور باہر گئے تو وہ اچانک اس کی طرف مڑا۔

''مینو، میں آپ کو اس طرح تیمور بھائی کے دل سے کھیلنے کی اجازت نہیں دوں گا؟''

''تینی!'' وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

''کیا کہہ رہے ہو تم؟''

''دلوں سے کھیلنا تو شاید آپ لوگوں کی ہابی ہے' لیکن یہ کھیل کسی کی زندگی تباہ کر سکتا ہے۔ آپ سے کس نے کہا ہے کہ آپ یہاں آ کر اپنی محبتیں اور ہمدردیاں بانٹیں اور جب آپ کی یہ محبتیں کسی دل کو اسیر کر لیں تو آپ اسی دل کو پاؤں تلے روندتی ہوئی چلی جائیں۔ میں آپ سے التجا کرتا ہوں مینو! کہ میرے بھائی کی راہ سے ہٹ جائیں' انہیں معاف کر دیں کہ ان کا کمزور دل مزید کوئی صدمہ نہیں سہہ سکتا۔''

''تنویر!'' اس کی آواز حلق میں پھنسنے لگی۔

''تم ......تم نے مجھے کتنا غلط سمجھا۔ کس قدر۔''

وہ ایک دم اٹھی اور تقریباً بھاگتی ہوئی باہر نکل گئی' اور پھر اپنے کمرے میں آ کر وہ خوب روئی۔

''تنویر ایسا سمجھتا ہے مجھے۔ اسے کیا پتا کہ میں۔ میں نے کتنی گہری اور شدید محبت کی ہے تیمور سے۔ بغیر کسی غرض، بغیر کسی لالچ کے۔''

رونے سے اس کے سر میں درد ہونے لگا تھا۔ وہ چائے بنانے کے لیے اٹھی تو مائی نے بتایا۔

''آپ کے مہمان آئے ہیں۔''

ایک بار تو اس کا دل چاہا کہہ دے اسے کسی سے نہیں ملنا۔ اس اجنبی شہر میں اور کون آ سکتا ہے سوائے تیمور کے۔ یقیناً وہی ہوں گے اور تینی کے رویے کی معذرت کرنے آئے ہوں گے۔ لیکن پھر جانے کیا سوچ کر وہ باہر چلی آئی۔

تیمور کی گاڑی سے ٹیک لگائے تنویر کھڑا تھا۔

''تم تنویر......''

''ہاں میں آپ کو لینے آیا ہوں۔''

''مگر......''

''اگر مگر کچھ نہیں۔''

تنویر نے بڑی تکلفی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر گاڑی کی طرف دھکیلا۔

''چلیں، بیٹھیں اندر۔''

''آپ اس طرح چلی آئیں تو تیمور بھائی بہت خفا ہوئے مجھ پر' کہ میں نے ان کی پیاری سی دوست کو ناراض کر دیا ہے' اور میں نے سوچا کہ چلو میں نے خفا کیا ہے' میں ہی منا لاتا ہوں۔''

''آپ روتی رہی ہیں مینو؟''

ڈرائیو کرتے ہوئے اس نے اس کی سرخ سرخ آنکھوں کو دیکھا۔

''میں بہت شرمندہ ہوں کہ میرے رویے سے آپ کو دکھ پہنچا' لیکن آپ نہیں جانتیں مینو، آپ نے تیمور بھائی کی وہ دیوانگی نہیں دیکھی' ان کا وہ حال نہیں دیکھا۔ اماں تو ان کے غم میں چارپائی سے جا لگی تھیں۔ پھر شاید خدا کو ہماری حالت پر رحم آ گیا تھا کہ تیمور بھائی سنبھل گئے۔''

"میں جانتی ہوں تینی، اور میں نے تمہاری باتوں کا برا نہیں منایا۔"

"تو آپ اب ناراض نہیں ہے نا مجھ سے۔"

معصومیت سے اس کی طرف دیکھتا ہوا۔ تنویر اسے آج پندرہ سولہ برس پہلے کا تنویر لگا۔

"نہیں، میں تم لوگوں سے ناراض نہیں ہو سکتی تینی۔"

"اچھا تو پھر ایک بات کہوں؟" اس نے سنجیدگی سے کہا۔

"ہوں کہو"

"آپ۔" وہ ذرا سا جھکا۔

"آپ تیمور بھائی سے شادی کر لیں۔ آپ ان کی غم آشنا ہیں۔ اور آپ نے ان کے دکھ کو شیئر بھی کیا ہے' آپ جس طرح انہیں سمجھ سکتی ہیں۔ شاید کوئی اور لڑکی نہ سمجھ سکے۔"

"کیسی باتیں کر رہے ہو میں اس عمر میں شادی کرتی اچھی لگوں گی؟"

"کیا ہوا ہے آپ کی عمر کو؟"

تنویر نے شوخی سے اس کا جائزہ لیا۔

"ایمان سے پچیس برس سے زیادہ کی نہیں لگتیں' اور اگر جو میں تین بچوں کا باپ نہ ہوتا تو یقیناً میرا دل بھی آپ کو دیکھ کر بے ایمان ہو گیا تھا۔ بڑی مشکل سے سنبھالا ہے۔"

اس کے رخساروں پر شفق سی دوڑ گئی۔

"شرارت نہیں تنویر۔"

"میں سنجیدہ ہوں مینو اور مجھے یقین ہے کہ آپ تیمور بھائی کی زندگی کی الجھی ہوئی ڈور کو سلجھا سکتی ہیں' اور ان کی ڈوبتی ہوئی نیا کو کنارے پر لا سکتی ہیں۔ سال بھر پہلے کے اور آج کے تیمور بھائی میں' میں نے بہت فرق محسوس کیا ہے' وہ آپ سے ملنے کے بعد بہت بدلے ہیں۔ ایسا لگا ہے مجھے، جیسے ان کی زندگی پر چھائے ہوئے غم کے بادل اتنے گھرے نہ رہے ہوں' اور ان کے ارد گرد منڈلاتے آسیبی سائے گم ہو گئے ہوں۔ خدا کی قسم مینو وہ دن بدن زندگی سے دور ہوتے جا رہے تھے' لیکن آپ انہیں زندگی کی طرف لا رہی ہیں۔"

"مگر تیمور وہ...... وہ شاید اسے پسند نہ کریں۔" اس نے آہستگی سے کہا۔

"ان کی آپ فکر نہ کریں، انہوں نے اپنی زندگی کی باگ ڈور میرے ہاتھ میں دے دی ہے۔"

اس نے قہقہہ لگایا۔

"بس، آپ اپنی کہیں، اس ٹوٹے ہوئے شکستہ آدمی کا ساتھ منظور ہے آپ کو؟"

"میں......" اس کی آواز بھیگ گئی۔

"میری تو ہمیشہ یہ خواہش رہی ہے تنویر کہ میں کسی طرح اس دکھ کا کفارہ ادا کر سکوں' جو آپا نے تم سب لوگوں کو دیا تھا۔"

"تو بس پھر کفارہ ادا کیجئے میں بہت جلد اماں کو لے کر آؤں گا۔" وہ گنگنانے لگا' اور اس نے مطمئن سا ہو کر سیٹ کی پشت پر سر ٹیک لیا۔

لیکن اس سے پہلے کہ پھوپھو آتیں، سید جعفر علی شاہ بیمار پڑ گئے۔ انہیں دل کا دورہ پڑا تھا۔ اور ڈاکٹر ان کی حالت سے مطمئن نہ تھے۔ تیمور اور تنویر ان کی حالت کا سن کر اس کے ساتھ ہی آئے تھے۔ اور ان کے آنے سے اسے بڑی ڈھارس ملی تھی۔ زینت آرا بھی بار بار ان کا شکریہ ادا کرتی تھیں' ایک شام اچانک ہی ان کی حالت بگڑ گئی۔ ڈاکٹر انہیں ایمرجنسی میں لے گئے۔ تو تنویر طیبہ بیگم کو لینے چلا گیا۔

"اگر ماموں جان کو کچھ ہو گیا' تو اماں بہت ناراض ہوں گی کہ ہم نے انہیں اطلاع نہیں دی۔" اور پھر جب تنویر انہیں لے کر آیا تو ابا کی طبیعت کافی سنبھل چکی تھی' اور ان کے اور پھوپھو کے ملنے کا منظر...... پھوپھو اس قدر روئیں اور سید جعفر علی شاہ بھی کہ خود اس کی بھی ہچکی بندھ گئی' سب کی آنکھیں نم تھیں۔ اور ان آنسوؤں میں دل کا میل ڈھل گیا' اور وہ سب آپس میں اس طرح گھل مل گئے' جیسے کبھی ان کے درمیان کوئی خلیج پیدا ہی نہیں ہوئی تھی۔ اور کوئی ناراضگی نہ تھی۔

تنویر جعفر علی شاہ کے گھر آ جانے کے بعد لاہور چلا گیا تھا۔ البتہ پھوپھو اور تیمور وہاں ہی تھے۔ اس نے بھی ایک ماہ کی مزید چھٹی لے لی تھی۔ کاشف ابا کی بیماری کا سن کر آیا' تو سمو آپا اور فیری بھی ان کے ساتھ تھیں۔

سمو پورے سترہ برس کے بعد آئی تھیں۔ فیری بہت خوبصورت تھی۔ سمو آپا سے بھی کہیں زیادہ، نیلی نیلی متجسس آنکھیں' کبھی وہ مینو کے پاس بیٹھی ہوتی، کبھی تیمور کے گرد گھوم رہی ہوتی اور کبھی سید جعفر علی شاہ کے پاس بیٹھی انہیں لطیفے سنا رہی ہوتی۔

مینو کو وہ بہت اچھی لگی تھی۔ شوخ و شریر اور حساس سی' تیمور سمو آپا کے آنے کے کچھ دن بعد واپس اسلام آباد چلے گئے تھے۔ اور پھوپھو چونکہ افراتفری میں آئی تھیں' اس لیے وہ کچھ دنوں بعد پھر آنے کا کہہ کر چلی گئی تھیں۔

سمو مستقل طور پر ہی آ گئی تھیں۔ نادر نے اپنے کسی دوست کے توسط سے اسلام میں گھر

لے لیا تھا' اور اب نادر کے آنے کے بعد وہ اسلام آباد منتقل ہو جاتے۔ سمو بہت خوش اور مطمئن تھیں' اور ان کی زندگی میں دور دور تک کسی پچھتاوے کا شائبہ تک نہ تھا۔ وہ سارا دن امریکہ کی باتیں کرتی رہتیں۔ وہاں کے کلچر کی اور وہاں کی رنگینی کی۔

''ایک شخص کی زندگی کو تباہ کر کے بھی یہ کتنی مطمئن ہیں۔''

مینو حیران ہو کر سوچتی۔

''اور کتنی خوش۔''

سید جعفر علی شاہ کی طبیعت سنبھلی تو ایک روز زینت آرا نے دبے لفظوں میں سمینہ سے کہا۔

''میں سوچ رہی ہوں کہ اب تم آئی تو مینو کے فرض سے بھی سبکدوش ہو لوں۔ بہت ضد مان لی اس کی۔''

وہ قریب ہی بیٹھی بیگ میں کپڑے رکھ رہی تھی۔ کیونکہ اس کی چھٹی ختم ہونے والی تھی۔

''کوئی لڑکا ہے آپ کی نظر میں؟''

''ہاں اپنا تیمور اور کون؟'' طیبہ نے سرسری سا ذکر کیا تھا۔

تمہارے ابا کی بیماری کی وجہ سے کھل کر بات نہیں کی' اب کے شاید آئیں تو باقاعدہ رشتہ دیں۔''

سمو حیران سی انہیں دیکھ رہی تھیں۔

''تیمور سے، کوئی اور نہیں ہے آپ کی نظر میں۔''

''باؤلی ہوئی ہے لڑکی' اب اس عمر میں باہر سے رشتے آئیں گے' وہ تو بس شاید اس کے نصیب سے ہی تیمور نے اب تک شادی نہیں کی تھی۔ ورنہ۔''

''مگر اماں، یہ مناسب نہیں ہے۔''

سمو نے احتجاج کیا' تو مینو کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔

''کیوں مناسب نہیں ہے؟''

زینت آرا نے جھلا کر انہیں دیکھا۔

''اپنا خون ہے، نہ خاندان پوچھنے کی ضرورت اور نہ۔''

''یہ بات نہیں ہے اماں آپ سمجھ نہیں رہی ہیں میرا مطلب یہ تھا کہ اس گھر سے ایک بار تیمور کو انکار ہوا ہے' اور اب کہیں وہ مینو سے انتقام نہ لیں۔''

''ارے چھوڑو سمو بے کار کے وسوسے نہ پالو۔''

''وہ آپ کی طرح نہیں ہیں۔ تنگ دل اور کم ظرف۔''

مینو نے جل کر سوچا اور بیگ اٹھا کر باہر نکل آئی' لیکن اس کے کان ادھر ہی لگے ہوئے تھے۔ سمو اس کی اور تیمور کی شادی کی زبردست مخالفت کر رہی تھیں' اور اپنی بات کی مضبوطی کے لیے ایک کے بعد ایک دلیل دے رہی تھیں، انہیں تیمور پر بہت سے اعتراض تھے۔

''بہر حال۔'' اس نے ہولے سے سر جھٹکا۔

''مجھ سے اماں نے پوچھا تو میں صاف کہہ دوں گی کہ مجھے تیمور کا ساتھ منظور ہے، خواہ وہ جیسے بھی ہیں۔ خالی ہاتھ ہیں یا خالی دامن۔ مجھے دینے کے لیے ان کے پاس کچھ نہیں' تو نہ سہی، میرے پاس تو بہت کچھ ہے انہیں دینے کے لیے محبتیں چاہتیں اور خلوص۔''

وہ آپا کے اس رویے سے بڑی بددل ہو کر اسلام آباد آئی۔ سمو نے اسے بھی ورغلانے کی بڑی کوشش کی تھی' لیکن اس نے ان کی کسی بات کی پروا تک نہیں کی تھی۔ تیمور بہت ڈسٹرب تھے۔ اتنے سارے سالوں اچانک سمو کو دیکھ کر ان کے زخموں کے منہ کھل گئے تھے۔ تنویر ان کے پاس ہی تھا۔

''تیمور بھائی بہت مضطرب ہیں۔'' اس نے مینو کو بتایا۔

''میں چاہتا تھا کہ آپ جلد از جلد بھیا کی زندگی میں شامل ہو جائیں۔ آپ کی رفاقت شاید ان کیلئے مرہم ثابت ہو' لیکن اماں وہاں گاؤں جا کر پھنس گئی ہیں، ابا کو معمولی بخار ہے۔ لیکن وہ اس عمر میں نازک مزاج ہو گئے ہیں کہ اماں کو اپنے پاس سے ہٹنے ہی نہیں دیتے۔ میں گیا تھا ایک دن کے لیے، اماں جلد آئیں گی۔''

''مگر؟''

مینو نے غور سے تنویر کو دیکھا' جو تیمور کی وجہ سے بہت پریشان تھا۔

''مگر کیا؟'' تنویر نے پوچھا۔

''آپا بہت مخالفت کر رہی ہیں۔''

''کیوں؟'' تنویر نے تیوری چڑھائی۔

''انہیں کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ دوسروں کی زندگی کے فیصلے کریں۔ آپ کو اپنی زندگی پر پورا حق ہے مینو، اسے دوسرے کے ہاتھوں میں کھلونا مت بننے دیجئے' آپ بچی نہیں ہیں، آپ اپنی زندگی کا فیصلہ خود کر سکتی ہیں، کہہ دیجئے ماموں جان سے کہ آپ تیمور بھائی سے' بخدا مینو اگر سمو آپا نے ایک بار پھر میرے بھائی کو موت کے اندھیروں کی طرف دھکیلا تو میں انہیں کبھی معاف نہیں

کروں گا۔"

"جذباتی نہ بنو تنویر۔"

"یہ جذباتیت نہیں ہے مینو۔ میں سمو آپا کو اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔ وہ نہیں چاہتیں کہ تیمور بھائی شادی کر کے خوشی حاصل کریں۔ ان کی خواہش یہی ہے کہ تیمور بھائی ان کے جوگ میں دنیا تیاگ دیں' اور ان کی انا کو تسکین ملتی رہے کہ ایک شخص نے ان کی خاطر جوگ لے لیا۔ آپ وعدہ کریں مجھ سے مینو۔"

اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔

"کہ آپ سمو آپا کے کسی بھی غلط فیصلے کے سامنے سر نہیں جھکائیں گی۔"

"وعدہ۔" وہ مسکرائی اور اپنا ہاتھ اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ پر رکھ دیا۔

"میں آج ہی اماں کو خط لکھتا ہوں کہ وہ جتنی جلدی ہو سکے ماموں جان کے پاس جائیں اور اگر کوئی مسئلہ بن گیا تو مجھے بلا لیجئے گا۔ میں سب سے نبٹ لوں گا۔"

"بہت بہادر ہو گئے ہو۔"

وہ خوش دلی سے ہنس دی' وہ جو آپا کی شدید مخالفت سے اس کے دل پر غبار سا چھا گیا تھا' تنویر کی اس جذباتی سی گفتگو سے خود بخود چھٹ گیا۔

اس نے تیمور کی دلجوئی کی پوری کوشش کی اور تیمور کافی سنبھل بھی گئے تھے۔ تنویر مطمئن ہو کر واپس چلا گیا تھا کہ وہ وہاں ہے اور تیمور کی دیکھ بھال کرتی رہے گی۔ لیکن بالکل اچانک اس کی ٹرانسفر کے آرڈر آ گئے۔ اس کا ٹرانسفر واپس اپنے شہر میں ہی ہو گیا تھا۔ جانے سے ایک روز پہلے تیمور نے اس سے کہا۔

"مینو۔" تنویر نے میرے اور تمہارے میں جو کچھ سوچا ہے تمہیں اس پر کوئی اعتراض تو نہیں؟"

"نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

تیمور نے دیکھا اس کی آنکھوں میں ملال کے رنگ پگھل رہے تھے۔ اور دکھ کے موسم رخصت ہو رہے تھے۔

"یہ جاننے کے باوجود کہ میں ایک تھکا ہوا، ہارا ہوا شخص ہوں' اور میں نے اپنی زندگی کے بہترین سال ایک ایسی لڑکی کی محبت میں گزار دیئے' جس کے نزدیک محبت ایک کھیل تھا' اور میں اپنے سارے خوبصورت جذبے پہلے ہی کسی کی نذر کر چکا۔"

"ہاں یہ جاننے کے باوجود۔" اس کی پلکیں جھک گئیں۔

"البتہ آپ۔ آپ کو تو تنویر نے مجبور نہیں کیا کہیں آپ تو۔"

"نہیں۔ نہیں مینو مجھ پر کسی نے جبر نہیں کیا۔ میں بہت تھک گیا ہوں مینو اور اب میں چاہتا ہوں کہ کوئی ایسا ساتھی ہو' جو ایک ایک کر کے میری ساری سوئیاں نکال دے' اور تم سے بہتر مجھے کوئی رفیق نہیں ملے گا۔ میں پوری کوشش کروں گا مینو کہ تمہیں وہ سب کچھ دے سکوں جو تمہارا حق ہو گا' لیکن پھر بھی اگر مجھ سے کہیں کوئی کوتاہی ہو جائے تو معاف کر دینا۔"

"مجھے کچھ نہیں چاہیے تیمور کچھ بھی نہیں۔"

پتا نہیں کیسے وہ کہہ گئی۔

"بس آپ کی رفاقت ہی میرے لیے بہت ہے۔ آپ کا ساتھ مل جائے مجھے کسی اور چیز کی تمنا نہیں۔"

"مینو۔"

تیمور حیران ہو کر اس کے چہرے پر پھیلتے سمٹتے رنگوں کو دیکھنے لگا' اور وہ ان کے اس طرح دیکھنے سے یوں گھبرا گئی' جیسے وہ سولہ سترہ برس کی لڑکی ہو' اور ایک دم خدا حافظ کہہ کر باہر نکل آئی۔

وہ گھر پہنچی تو اسے پتا چلا کہ نادر ہاشمی امریکہ سے آ چکے ہیں' اور سمو اسلام آباد جانے کے لیے سامان باندھ رہی تھیں۔ پھر دو ایک روز بعد وہ اسلام آباد شفٹ ہو گئیں۔

"تیمور سے ضرور ملنا سمو۔ اب ان لوگوں نے پرانی رنجشیں بھلا دی ہیں' تو تم کیوں دل میں میل رکھتی ہو' اور سچ تو یہ ہے کہ زیادتی تو ہماری طرف سے ہی ہوئی تھی۔"

زینت آرا نے تیمور کا پتا دیتے ہوئے تاکید کی۔ سمو نے بے دلی سے ایڈریس لے کر پرس میں رکھ لیا۔

"اونہہ۔ خوامخواہ ہی اماں ان کے دل میں محبت پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہیں، بھئی اب وہ تیمور سے نہیں ملنا چاہتیں تو نہ سہی۔"

اس نے سوچا۔

لیکن سمو آپا نہ صرف یہ کہ تیمور سے ملنے گئیں بلکہ ان کی تعریفیں کیں کہ وہ حیران رہ گئی۔

"یا اللہ یہ سمو آپا کیسے پل پل بدلتی ہیں۔"

خط پڑھ کر اس نے اماں کو واپس کر دیا۔

"چلو اچھا ہوا۔ اب کم از کم وہ مخالفت تو نہیں کریں گی۔"

وہ مطمئن ہوگئی۔ لیکن اس کا یہ اطمینان اس روز رخصت ہوگیا' جب ایک شام اچانک ہی سمو ٹیپو کو لے کر آ گئیں اور بہت دیر تک اماں کے گھٹنے سے جڑ کر بیٹھی سرگوشیاں کرتی رہیں اور......

اماں ہونقوں کی طرح منہ اٹھائے انہیں یوں دیکھ رہی تھیں' جیسے وہ کوئی بڑی انہونی بات کر رہی ہوں۔ وہ باہر برآمدے میں تخت پوش بیٹھی لڑکیوں کے ٹیسٹ چیک کر رہی تھیں۔ کبھی کبھی اماں کی حیرت بھری ہنکار اس کے کانوں میں پڑتی تھی۔ ٹیپو اس کے قریب بیٹھا اسے بتا رہا تھا کہ وہ اکثر تیمور ماموں کے ہاں جاتے ہیں۔ وہ اور فیری' اور فیری کو تو تیمور کا ماموں کا گھر بہت پسند ہے۔ آپ نے دیکھا ہے ان کا گھر کتنا شاندار ہے۔ امریکہ میں تو ایسے گھروں میں لارڈز رہتے ہیں اور نوکر کتنے ہیں۔ تیمور انکل بھی تو لارڈ ہیں۔ انہوں نے بتایا تھا گاؤں میں ان کی زمینیں ہیں۔ آموں کے باغات ہیں اور بڑا سا گھر ہے۔

"ہوں۔"

وہ ٹیپو کی باتیں بے دھیانی سے سن رہی تھی، اس کا ذہن سمو آپا کی اس غیر متوقع آمد میں الجھا ہوا تھا۔ پھوپھو بھی ابھی تک نہیں آئی تھیں۔ شاید پھوپھا ابا کی طبیعت زیادہ خراب ہوگئی ہو اور اس پر سمو آپا کی یہ پراسرار آمد اور اماں سے سرگوشیاں اس کا دل مضطرب سا ہوگیا۔ اس نے پین بند کر کے تخت پوش پر رکھ دیا۔ اور اٹھ کر اندر چلی گئی' سمو اسے دیکھ کر خاموش ہوگئیں۔ زینت آرا نے عجیب یاس بھری نظروں سے اسے دیکھا۔

"کیا بات ہے اماں؟ کوئی پریشانی کی بات ہے کیا؟ نادر بھائی اور فیری تو خیریت سے ہیں نا۔"

"ہاں، ہاں۔" سمو آپا چہکیں۔

"سب خیریت ہے مینو میں تو بس یوں ہی ابا کو دیکھنے چلی آئی ہوں۔ اور ساتھ ہی سوچا اماں سے مشورہ بھی کرلوں۔"

"کیسا مشورہ آپا؟"

اس نے اماں کے پاس بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"میں نے سوچا ہے مینو، فیری کی شادی کر دوں۔"

"لیکن آپا وہ تو ابھی بچی ہے صرف سولہ سترہ برس کی تو ہے۔"

"ہاں لیکن مینو تجھے پتا ہے آج کل رشتوں کا کتنا پرابلم ہے۔ اور نادر تو فیری کی شادی کی

غرض سے ہی پاکستان سیٹل ہوئے ہیں۔"

"اچھا تو کوئی لڑکا ہے نظر میں؟"

"ہاں مجھے تیمور بہت پسند ہے، گھر کی بات ہے اور پھر میں فیری کا رشتہ اس لیے بھی تیمور کو دینا چاہتی ہوں کہ...... تلافی کرسکوں۔"

مینو کو سمو کی آواز بہت دور سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اور انہیں تو ہمیشہ سے حیران کر دینے کی عادت تھی۔ اور وہ اسے حیران کر کے چلی گئی تھیں۔ اور وہ یوں ساکت بیٹھی تھی' جیسے پتھر کی ہوگئی ہو۔ اس کا ذہن سائیں سائیں کر رہا تھا۔

"باؤلی ہوگئی ہے۔"

بڑی دیر بعد اماں کی آواز اس کے کانوں میں پڑی' تو اس نے چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا تو سمو باہر جا چکی تھیں' اور شاید باہر ٹیپو سے الجھ رہی تھیں۔

"فیری کی اور تیمور کی عمروں میں کتنا فرق ہے سوچتی ہی نہیں۔ کہتی ہے مردوں کی عمر کون دیکھتا ہے۔"

اس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ وہ بہت کچھ کہنا چاہتی تھی' لیکن لفظ اس کے اندر ہی کہیں گم ہوگئے تھے۔ وہ اماں سے پوچھنا چاہتی تھی' کہ آخر کار یہ یکا یک تیمور کے لیے ان کی محبت کیوں امڈ آئی ہے۔ اور یہ وہی تیمور تو ہیں' جنہیں انہوں نے ٹھکرا دیا تھا۔

اور ابھی کل تک تو وہ ان کی شدید مخالفت کر رہی تھیں' اور مینو کے لیے وہ انہیں نامناسب لگ رہے تھے۔ اور اب ان میں ایکا ایکی ایسے کیا سرخاب کے پر لگ گئے تھے' کہ وہ فیری اور اس کی عمر کا فرق بھی بھول گئی تھیں۔

"اے بولتی کیوں نہیں مینو؟"

"کیا بولوں اماں؟" اس نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔

"سچ تو یہ ہے کہ مجھے سمو کی بات دل کو نہیں لگی، ارے میں تو کچھ اور ہی سوچ رہی تھی۔ طیبہ نے تمہاری خواہش کی تھی کھل کر تو نہیں بات کی' لیکن میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ تیمور کے لیے تمہیں مانگنا چاہتی ہیں' اور تیمور کا رجحان بھی دیکھا میں نے' پر اب یہ سمو۔ میں تو دل سے چاہتی تھی کہ تمہارا اور تیمور کا رشتہ ہو جاتا' ہماری زندگی میں ہی تم اپنے گھر کی ہو جاتیں۔"

انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس لی' اور گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر کھڑی ہوگئیں۔

"دیکھوں۔ بوا نے تمہارے ابا کے لیے سوپ بنایا ہے یا نہیں۔"

"خدا اس لڑکی کو عقل دے، اسے تو ہمیشہ نئی نئی سوجھتی ہے۔"

وہ بڑبڑاتی ہوئی باہر نکل گئیں۔

عقل تو انہیں اچھی طرح تھی' اور وہ سارے نفع نقصان کا حساب لگا کر آئی تھیں۔ اتنا اچھا، اعلیٰ پوسٹ پر فائز خاندان اور سب سے بڑھ کر اتنا دولت مند داماد انہیں کہاں ملتا۔

مینو کا دل ڈوبا جا رہا تھا۔

یوں جیسے اب ڈوبا تو پھر کبھی نہ ابھر سکے گا

سید جعفر علی شاہ نے سنا تو غصے سے کانپنے لگے۔

"دماغ خراب ہو گیا ہے اس کا' کہہ دو اس سے کہ میں نے مینو کا رشتہ تیمور سے طے کر دیا ہے، جاتے جاتے طیبہ نے مجھ سے بات کی تھی۔"

کاشف الگ خفا تھا۔

"بڑی جلدی آپ کو تلافی کا خیال آیا، آپا۔"

"آ تو گیا نا۔"

وہ بھی ایک دم ڈھیٹ تھیں۔

"آپ نے تیمور بھائی سے بھی بات کی، وہ کیا کہتے ہیں انہیں یہ رشتہ منظور بھی ہے یا نہیں؟"

"اس کا کیا ہے اس سے میں بات کر لوں گی' پہلے اماں اور ابا تو مانیں۔"

"آپ کو ابا اور اماں کی رضامندی کی ایسی کیا ضرورت ہے۔"

"دراصل میں چاہتی ہوں اماں خود بات کریں پھوپھو سے کہ وہ مینو کے بجائے فیری کا رشتہ دینا چاہتی ہیں۔"

"فیری کو بہت اچھے اچھے رشتے مل جائیں گے آپ مینو سے دشمنی نہ کریں آپا۔"

کاشف نے انتہائی دردمندی سے کہا۔

وہ صرف مینو کی خاطر ہی تو رکا ہوا تھا۔ ابا نے اسے روکا تھا کہ وہ ایک دو ماہ کے اندر اندر مینو کو رخصت کرنا چاہتے ہیں۔

"دشمنی کیسی بھیا؟ مینو کی اب کوئی شادی کی عمر تو ہے نہیں، پینتیس برس کی تو ہو چکیں۔ شادی کی نہ کی، برابر ہے۔ اپنا کماتی ہیں انہیں کیا ڈر ہے۔"

"آپا......" کاشف کو ان کے اس رویے پر بے حد دکھ ہوا۔

لیکن وہ سب کے جذبات سے بے نیاز اپنے محاذ پر ڈٹی ہوئی تھیں۔ اور مینو کو یقین تھا کہ بالآخر جیت انہی کی ہو گی۔

وہ خاموش تماشائی بنی سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ وہ کالج سے آ کر سیدھی اپنے کمرے میں گھس جاتی۔ آپا کیا کیا کرتی پھر رہی تھیں اسے اس کی خبر نہ تھی۔ ایک بار پھر اس کا دل ریزہ ریزہ ہوا جاتا تھا۔ اور وجود پارہ پارہ ہو رہا تھا۔ جانے میرے نصیب میں کیا لکھا ہے۔

وہ سوچتی۔

اس نے تو بغیر جنگ کیے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ لیکن شاید سمو کو پتا نہیں تھا' اس لیے ایک روز وہ اس کے کمرے میں چلی آئیں۔

"مینو" انہوں نے بڑے پیار سے اسے بلایا۔

"سارا دن کمرے میں گھسی رہتی ہو، اس طرح بیمار پڑ جاؤ گی۔"

"بس کالج میں پڑھا کر تھک جاتی ہوں آپا۔"

"ہاں۔ اب اس عمر میں زیادہ محنت تھکا دیتی ہے نا۔"

اس نے ایک نظر انہیں دیکھا۔ وہ بڑی تر و تازہ اور فریش نظر آ رہی تھیں۔ جب کہ وہ ان سے پورے آٹھ برس چھوٹی تھی۔ اب وہ ان سے کیا کہتی کہ یہ تھکن جسمانی نہیں، ذہنی ہے۔

"مینو" انہوں نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔

"فیری تجھے کیسی لگتی ہے؟"

"وہ آپ کی بیٹی ہے آپا اور ظاہر ہے مجھے بھی عزیز ہو گی۔"

"مجھے پتا ہے مینو۔ تو مجھے' ہم سب کو کتنا چاہتی ہے۔"

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے آپا۔"

"مجھے پتا ہے مینو کہ تجھے فیری کا مستقبل بھی عزیز ہے' تو یقیناً فیری کی بہتری کے لیے ہی سوچے گی۔"

"جی۔" اس نے آہستگی سے کہا۔

"فیری تیمور کو پسند کرنے لگی ہے مینو۔ وہ پاگل لڑکی تیمور کے علاوہ کسی سے شادی نہیں کرنا چاہتی' وہ بڑی تصوراتی لڑکی ہے۔ میں نے اسے بڑے لاڈ سے پالا ہے کبھی اس کی کوئی خواہش رد نہیں کی' اور اب اگر اس کی یہ خواہش پوری نہ ہوئی تو وہ ٹوٹ جائے گی۔ مینو تو جانتی ہے اس عمر کی محبتیں بڑی دیوانی ہوتی ہیں۔"

"بھلا اس سے بہتر کون جان سکتا ہے کہ وہ بھی تو اسی عمر میں۔"
"پھر؟" اس نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔
"اماں نے تیمور سے بات کی تھی۔"
"تو اماں ہار گئیں۔"
اس نے سوچا۔
"لیکن تیمور نے فیری سے شادی کرنے سے انکار کر دیا ہے' وہ تم سے شادی کرنا چاہتا ہے۔"
"تیمور اماں کو کہاں ملے؟"
"تیمور آج تمہارے کالج میں جانے کے بعد آئے تھے۔ اس وقت کہیں باہر گئے ہیں۔ پھوپھو بھی ایک دو روز میں آنے والی ہیں۔ تم بات کرو نا تیمور سے، شاید تمہاری بات وہ مان لیں۔ میں نے دیکھا ہے' وہ تمہاری بہت عزت کرتے ہیں۔"
اور تنویر نے کہا تھا کہ تم سمو آپا کے کسی غلط فیصلے کے سامنے سر نہ جھکانا۔
اور وہ تنی میں کیا کروں۔
اس نے بے بسی سے سوچا۔
"دیکھو مینو۔ فیری ابھی کم عمر ہے۔ اس کے ہنسنے کھیلنے اوڑھنے پہننے کے دن ہیں' اور معاف کرنا تم تو اپنی عمر گزار چکیں اور اب اس عمر میں تم اگر شادی نہ بھی کرو گی تو......"
اس کے سینے میں خنجر سا آ کر لگا۔
سمو آپا چاروں طرف سے حملہ کرنے میں ماہر تھیں۔
"آپ ٹھیک کہتی ہیں آپا۔" اس کی آنکھوں کے آئینے دھندلا گئے۔
"اب یہ میری عمر کوئی شادی کرنے کی تو نہیں۔ میں تیمور کو سمجھاؤں گی۔ فیری خوبصورت ہے، کم عمر ہے اور پھر آپ کی بیٹی ہے، وہ مان جائیں گے آپا۔"
اس نے دل پر ہاتھ رکھ لیا۔
"اور تنی مجھے معاف کر دینا میں اپنا وعدہ ہار گئی ہوں۔"
سمو آپا مسرور سی، کسی فاتح جرنیل کی طرح سر اٹھائے باہر چلی گئیں اور اس کی آنکھیں برس پڑیں۔
تو یہ تھے اس کے نصیب، کتنے عجیب' منزل ایک بار پھر گم ہو گئی تھی۔

وہ سوچتی رہی اور خود کو تیمور سے بات کرنے کے لیے تیار کرتی رہی' اور تیمور خود ہی اس کے کمرے میں چلے آئے۔
"مینو بھئی تم کہاں چھپی ہوئی ہو۔ اور یہ اندھیرا کیوں کیا ہوا ہے؟"
انہوں نے لائٹ جلا دی۔
"بس یوں ہی کالج سے آ کر تھک سی گئی تھی' اور آپ کا تو مجھے ابھی پتا چلا ہے۔ آپا نے بتایا تھا' اور میں بس آپ کی طرف آ ہی رہی تھی۔"
"مینو۔" وہ اس کے سامنے ہی کرسی کھینچ کر بیٹھ گئے۔ مینو نے ایک نظر ان پر ڈالی وہ کچھ الجھے الجھے سے لگ رہے تھے۔
"تم...... تمہیں پتا ہے یہ ممانی جان کیا کہہ رہی ہیں۔"
"ہوں۔" اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
"کیسی بچوں جیسی باتیں کر رہی ہیں وہ"
"کچھ غلط تو نہیں کہہ رہی ہیں وہ۔" اس نے آہستگی سے کہا۔
"مینو۔" تیمور نے اسے حیرت سے دیکھا۔
"ہاں، فیری بہت اچھی لڑکی ہے، کم عمر ہے، خوبصورت ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ آپ کو پسند کرتی ہے' اور اب میری عمر کوئی شادی کی تو نہیں رہی نا۔"
"کیسی باتیں کر رہی ہو مینو۔"
وہ مزید الجھ سے گئے۔
"انسان کو محض اپنے ہی لیے تو نہیں سوچنا چاہیے۔ اردگرد کے لوگوں کا بھی ان کی زندگی پر حق ہوتا ہے۔"
اس نے دھیرے دھیرے اپنی پلکیں اٹھائیں' تیمور الجھے الجھے سے اسے ہی دیکھ رہے تھے۔
"تیمور آپ...... آپ فیری سے شادی کر لیں پلیز!" اس نے ایک دم کہا اور نگاہیں جھکا لیں۔
"آپ اماں کی بات مان لیں، وہ ٹھیک کہتی ہیں، آپ کو اور مجھے اس کے لیے ضرور سوچنا چاہیے۔ آپ نہیں جانتے اس عمر کی محبتیں بڑی ظالم ہوتی ہیں، ریزہ ریزہ کر دیتی ہیں، اس عمر میں آدمی بڑی بے غرض محبت کرتا ہے' اس کی جڑیں اندر تک چلی جاتی ہیں۔ اور فیری تو بہت نازک

اور حساس سی لڑکی ہے۔ وہ یہ دکھ برداشت نہیں کر سکے گی تیمور۔"

تیمور خالی خالی نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ اور اس کی کہی ہوئی باتوں کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اب بھلا یہ کس قدر احمقانہ بات تھی، جو وہ کر رہی تھی۔ وہ اور فیری۔ وہ تو آج تک اس سے بچیوں کی طرف ٹریٹ کرتے رہے تھے' اور فیری۔ قطعی نہیں۔ یہ سب سمو کے اپنے ذہن کی اختراع ہے۔ فیری تو انہیں انکل کہتی ہے اور......

"پلیز۔" مینو نے پھر التجا کی۔

"آپ نے کہیں نہ کہیں تو شادی کرنا ہی ہے نا سمو آپا کے بعد چاہے وہ کوئی بھی ہو۔ میں نہ سہی فیری سہی، آپ کو تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا نا۔ اور فیری کا دل ٹوٹنے سے بچ جائے گا۔ یہ شکست وریخت اسے توڑ دے گی تیمور' ہر لڑکی مینو نہیں ہوتی جو ٹوٹ ٹوٹ کر جڑتی اور جڑ جڑ کر ٹوٹتی رہے۔"

"تم۔" تیمور نے گہری نظروں سے اسے دیکھا۔

"تم محبت کے درد سے آشنا ہو مینو میں نے غلط تو نہیں کہا تھا۔"

"جن کا اپنا دل ٹوٹا ہوتا ہے' وہ دوسروں کے دل کو ٹوٹنے نہیں دیتے، آپ بھی تو درد آشنا ہیں' پھر کیوں نہیں فیری کے دل کو ٹوٹنے سے بچا لیتے۔"

"میں اس کے لیے خود کو تیار نہیں پاتا مینو۔" انہوں نے قطعی انداز میں کہا اور کھڑے ہو گئے۔

"یہ الگ بات ہے کہ تمہیں میری رفاقت منظور نہیں۔ کوئی جبر کی بات نہیں ہے مینو اگر تمہارا دل اس ساتھ کو نہیں مانتا تو نہ سہی، میں جانتا ہوں کہ کسی کی محبت کو دل میں بسا کر کسی دوسرے کا ساتھ دینا بہت مشکل ہوتا ہے۔"

"نہیں۔" اس نے تڑپ کر انہیں دیکھا۔

"آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔ آپ نہیں جانتے آپ کو کیا خبر میرے دل......"

اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ تیمور کی نظریں اسے ہی کھوج رہی تھیں۔ جو پوری آنکھیں کھولے انہیں دیکھ رہی تھیں۔

روئی روئی سرخ آنکھیں

کیا کہہ رہی تھیں؟

انہیں سمجھنے کی کوشش کی۔

وہ قیامت آنکھیں۔

وہ بلا کی خطیب آنکھیں۔

کیا کہہ رہی تھیں؟

کیا بتا رہی تھیں؟

وہ سمجھے تو انکشاف کا یہ لمحہ انہیں یک دم امر کر گیا۔

یہ ساعت، یہ ایک ساعت

یہ سارا کمال اسی ایک ساعت کا تھا۔

لمحوں میں انہوں نے عمروں کا حساب کر لیا تھا۔

انہیں دکھ ہوا کہ انہوں نے یونہی سترہ برس ایک سراب کے تعاقب میں گزار دیے تھے۔ جب کہ ٹھنڈے ٹھنڈے پانی کے چشمے تو قریب ہی ابل رہے تھے۔ کیا اندھے تھے وہ، کہ انہیں کچھ دکھائی نہیں دیا تھا۔

اور اگر محبت کے عذابوں کو کوئی جزا بھی ہوتی ہے تو یہ لمحہ یہ ساعت ان کی محبت کی جزا تھی۔

وہ اشک جو برسوں ان کے سینے میں گھٹے رہے تھے' ان کی آنکھوں میں تیرنے لگے' وہ ایک قدم آگے بڑھے اور بے اختیار اس کے ہاتھ تھام لیے۔

"مینو...... تم نے مجھ سے کہا کیوں نہیں؟ مجھے بتایا کیوں نہیں؟"

اس نے بے بسی سے انہیں دیکھا' اور اپنے ہونٹوں کو بے دردی سے دانتوں تلے کچل ڈالا۔

یہ کیا ہو گیا؟ کیسے جان لیا انہوں نے وہ راز' جسے سترہ برس سے اس نے چھپایا ہوا تھا۔

"اچھی دوست تھیں تم۔"

وہ ہولے سے ہنسے۔

"دوستی کا دعویٰ بھی کرتی رہیں' اور اپنے راز بھی چھپاتی رہیں، راز بھی' وہ جن کا تعلق براہ راست مجھ سے ہی تھا۔"

"اب جو بھی ہو۔"

اس نے اپنے ہاتھ ان کے ہاتھوں سے چھڑا لیے۔

"آپ وعدہ کریں کہ آپ فیری سے۔"

"میں ایسا کوئی وعدہ نہیں کر سکتا مینو۔" انہوں نے سختی سے کہا۔

"اور کم از کم اب تو اپنے آپ کو مزید دھوکا نہ دو' اور یہ تم فیری سے ہمدردی نہیں دشمنی کر رہی ہو۔ وہ مجھ سے آدھی عمر کی بھی نہیں ہے' اور یہ جو سمو نے تم سے کہا ہے نا تو یہ سب ان کے اپنے ذہن کی اختراع ہے۔ فیری کے دل میں ایسا کوئی خیال نہیں ہے۔ سمجھیں تم۔"

وہ تیزی سے باہر نکل گئے' اور وہ وہیں کھڑی آنسو بہاتی رہی۔

اب وہ سمو آپ کو کیا منہ دکھائے گی۔ کیا کہیں گی وہ اور بے چاری فیری۔ نہیں میں اس کا دل نہیں ٹوٹنے دوں گی۔ میں سمو آپا سے کہتی ہوں کہ وہ خود بات کریں اس سے وہ یقیناً سمو آپا کی بات نہیں ٹالیں گے۔

وہ دونوں ہاتھوں سے آنسو پونچھتی ہوئی باہر نکلی' اور پھر وہیں ٹھٹک کر رک گئی۔ برآمدے میں ہی سمو آپا اور تیمور کھڑے تھے۔ تیمور غصے میں دکھائی دیتے تھے۔ وہ وہاں سے ہی پلٹ آئی۔

جانے سمو آپا نے کیا کہا تھا' اور تیمور نے کیا جواب دیا تھا۔ اسے خبر نہ تھی۔ شاید تیمور مان گئے ہوں، شاید نہ مانا ہو۔ وہ اپنے کمرے میں ہی بیٹھی سوچتی رہی۔ رات کھانے کے لیے بھی باہر نہ آئی۔ بوا سے اس نے کہہ دیا تھا کہ اسے بھوک نہیں ہے' اور صبح بھی وہ سب کے اٹھنے سے پہلے ہی ناشتہ کر کے کالج چلی گئی' اور کالج سے آ کر کمرے میں گھس گئی اسے کچھ خبر نہ تھی کہ تیمور چلے گئے ہیں یا ابھی یہاں ہی ہیں۔

پھر دو تین دن یوں ہی گزر گئے۔ اماں سے اسے پتا چلا تھا کہ سمو اور ٹیپو چلے گئے ہیں، وہ کالج گئی ہوئی تھی۔ تو نادر آ کر اسے لے گئے تھے۔ وہ چاہتے ہوئے بھی تیمور کا نہ پوچھ سکی' اور نہ ہی اماں نے کچھ بتایا۔ وہ تھوڑی دیر بیٹھ کر چلی گئیں۔ تو اس کا دل بھر آیا۔ یقیناً سمو آپا نے تیمور کو منا لیا ہوگا۔ اور اب فیری کی شادی کی تیاریاں کر رہی ہوں گی۔

سارا دن اس کا دل ڈوب ڈوب کر ابھرتا رہا۔

تو یہ تھے اس کے نصیب

ایک سمو آپا تھیں کہ بچپن سے اب تک جو کچھ انہوں نے چاہا پا لیا۔ اور ایک وہ تھی کہ جو چاہا پا نہ سکی۔ ہمیشہ سے بچپن سے ہی آپا اس کی پسند کی چیزیں ہتھیاتی آئی تھیں۔ اور اب خود محاذ سے ہٹ گئی تھیں تو اپنی بیٹی کو آگے بڑھا دیا تھا۔ جیت تو ہمیشہ انہی کی ہوتی تھی' وہ جب اور جس مہرے کو چاہتیں پیٹ لیتی تھیں۔

وہ رات اچھی طرح سو نہ سکی تھی۔ اس لیے صبح اس کا کالج جانے کا موڈ نہ تھا۔ وہ یونہی بستر پر پڑی رہی۔ بوا چائے رکھ گئی تھی۔ وہ بھی میز پر پڑے پڑے ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ اس نے کروٹ

بدل کر میز پر رکھی ہوئی چائے کو دیکھا اور اٹھ بیٹھی۔ نگاہیں بے اختیار دروازے کی طرف اٹھ گئیں۔ تنویر دروازے میں کھڑا شاکی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"تینی تم کب آئے؟"

"ہم رات سے آئے ہوئے ہیں۔"

"اوہ مجھے کسی نے بتایا ہی نہیں۔" وہ نادم سی ہو گئی۔

"آؤ نا۔"

"مینو میں آپ سے سخت ناراض ہوں، آپ نے اچھا وعدہ نبھایا۔"

"سوری تنویر۔" وہ افسردہ سی ہو گئی۔

"بات ہی کچھ ایسی ہو گئی ہے، تم بے فکر رہو' فیری بہت اچھی ہے۔ تیمور بہت خوش رہیں گے اس کے ساتھ۔"

"اور آپ بھی خوش ہیں۔"

تنویر اسے بغور دیکھ رہا تھا۔

"ہاں میں...... ظاہر ہے میں بھی خوش ہوں۔" اس کی آواز بھیگ گئی۔

"اوہ مینو۔"

اس نے مٹھیاں بھینچیں۔

"آپ بہت بے وقوف بلکہ ایک دم پاگل ہیں۔ میں نے آپ سے کہا نہیں تھا' کہ اگر حالات آپ کے اختیار میں نہ ہوں تو مجھے بلا لیجیے گا۔ میں سب ٹھیک کر لوں گا۔ وہ تو اچھا ہوا کہ اماں اور میں سیدھے یہاں آنے کے بجائے پہلے تیمور بھائی کے ہاں چلے گئے اور ان سے آپ کی حماقت کا پتا چلا' پھر وہاں فون پر ہی ماموں جان سے مذاکرات ہوئے اور سب کچھ طے پا گیا۔ لہٰذا۔"

اس نے شوخی سے اسے دیکھا۔

"آج کالج سے چھٹی کریں' بلکہ ہمیشہ کے لیے ہی چھٹی کر لیں آج رات کو آپ کا اور تیمور بھائی کا نکاح ہے۔ رخصتی دو چار روز میں ہوگی۔ کیونکہ نکاح ذرا ہنگامی بنیادوں پر ہو رہا ہے۔"

"اور وہ فیری؟"

اس نے اٹک اٹک کر کہا۔

"وہ...... وہ تو بہت خوش ہے کہ اس کے تیمور انکل اور مینو آنٹی کی شادی ہو رہی ہے' اور وہ ایک پاکستانی شادی میں شریک ہو سکے گی۔ اسی لیے تو رخصتی میں کچھ دن رکھے ہیں تا کہ ساری رسمیں ہو سکیں۔ ورنہ تیمور بھائی تو رخصتی بھی نکاح کے ساتھ ہی......"

"اور سمو آپا وہ تو بہت ناراض ہوں گی؟"

"ہاں لیکن ان کی ناراضگی کی پروا کسے ہے۔ تیمور بھائی اپنا ٹرانسفر کروا رہے ہیں اور وہ آپ کو لے کر کراچی جائیں گے، سمو آپا کی دسترس سے دور' جناب بھابی صاحبہ آیا آپ کی سمجھ شریف میں۔"

منزلیں ایک دم سہل ہو گئی تھیں' اور ہواؤں کے رخ بدل گئے تھے۔

اس کے چہرے پر دھنک رنگ پھیل گئے۔

اور تیمور جو ابھی ابھی اندر آئے تھے' اس کے چہرے پر پھیلتے رنگوں کو دلچسپی سے دیکھنے لگے۔

❋❋❋